ڈائری

۱۹۸۹-۱۹۹۰

مولانا وحید الدین خاں

آغاز کلام

ڈائری، اپنے عام مفہوم میں، کسی آدمی کے ذاتی مشاہدات اور تجربات کا روزنامچہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں ڈائری کو تاریخی یا سوانحی اعتبار سے بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ ڈائری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آدمی بےتکلف انداز میں بہت سی ایسی باتیں لکھ دیتا ہے جن کو وہ کتاب میں لکھنا پسند نہیں کرتا۔

ڈائری لکھنے کا طریقہ بہت پرانا ہے۔ مثلاً رومیوں کے یہاں اس کا رواج پایا جاتا تھا۔ تاہم پہلے یہ تھا کہ ڈائری اور یادداشتوں (memoirs) میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ قرون وسطیٰ کے آخر میں دونوں کو الگ الگ انداز سے مرتب کیا جانے لگا۔ پریس کے دور نے ڈائری کی اہمیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

انگلستان میں پہلا قابل ذکر ڈائری نگار وہائٹ لاک (Bulstrode Whitelocke) ہے جس کا زمانہ ۱۶۷۵ — ۱۶۰۵ تھا۔ فرانس کا ابتدائی ڈائری نگار (Marquis de Dangeau) ہے جس کا زمانہ ۱۷۲۰ — ۱۶۳۸ تھا۔

تاہم دورِ جدید میں جس کی ڈائری کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی وہ سموئیل (Sameuel Pepys) ہے۔ اس نے یکم جنوری ۱۶۶۰ سے اپنی ڈائری لکھنا شروع کیا جو کہ ۳۱ مئی ۱۶۶۹ تک جاری رہی۔ اسی طرح جذباتی تحریر کے اعتبار سے ڈبلن کے مسٹر سویفٹ (Jonathan Swift) کی ڈائری بہت مشہور ہے۔ وہ ۱۷۱۰ اور ۱۷۱۳ کے درمیان لکھی گئی۔

اس کے بعد بہت سے لوگوں کی ڈائریوں نے شہرت حاصل کی۔ مثلاً فینی برنی (Fanny Burney) جیمس باسویل (James Boswell) سر والٹر اسکاٹ (Sir Walter Scott) رابنسن (Henry Crabb Robinson) اور اسی طرح گوئٹے، شیلر، ورڈس ورتھ، کولرج، وغیرہ۔

بیسویں صدی میں ڈائری لکھنے کا عام رواج ہو گیا۔ تعلیم یافتہ دنیا کا تقریباً ہر قابل ذکر آدمی اپنی ڈائری لکھنے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ قابل تقلید عادت اور کوئی نہیں،

اہل علم کے لئے بھی اور عام لوگوں کے لئے بھی (III/524)

راقم الحروف کو ڈائری لکھنے کا خیال بہت عرصہ سے تھا۔ اور میں کچھ لکھتا بھی رہتا تھا۔ تاہم باقاعدہ صورت میں ڈائری کا اہتمام میں نے یکم جنوری ۱۹۸۳ سے شروع کیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک کوئی نہ کوئی بات یا کوئی نہ کوئی احساس یا تجربہ ہر روز قلم بند کرتا رہا ہوں۔ اس طرح میری ڈائریوں کا ایک وسیع ذخیرہ اکٹھا ہو گیا ہے۔ ان ڈائریوں کو دو دو سال کے مجموعہ کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

میری یہ ڈائریاں معروف انداز کی ڈائریوں سے کسی قدر مختلف ہیں۔ یہ ایک طرح کا ذاتی ریکارڈ ہے جس میں اس قسم کے اندراجات بھی ہیں جو عام طور پر ڈائری سے متعلق سمجھے جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ وہ چیزیں بھی ہیں جن کو خواطر کہا جا سکتا ہے۔

میری پوری زندگی پڑھنے، سوچنے اور مشاہدہ کرنے میں گزری ہے۔ فطرت کا بھی اور انسانی تاریخ کا بھی۔ مجھے کوئی شخص تفکیری حیوان کہہ سکتا ہے۔ میری اس تفکیری زندگی کا ایک حصہ وہ ہے جو الرسالہ یا کتابوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔ اس کا دوسرا، نسبتاً غیر منظم حصہ، ڈائریوں کے صفحات میں اکٹھا ہوتا رہا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ میری تمام تحریریں حقیقۃً میری ڈائری کے صفحات ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ لمبی تحریروں نے مضمون یا کتاب کی صورت اختیار کر لی۔ اور چھوٹی تحریریں ڈائریوں کا جزء بن گئیں۔

ڈائری کا لفظ بظاہر یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ کسی شخص کی روزانہ زندگی کا ریکارڈ ہے۔ حالانکہ نہ ایسا ہے اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ ایک انسان کی زندگی اتنی زیادہ گہری اور وسیع ہے کہ الفاظ کا کوئی بھی مجموعہ اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ کسی شخص کی ڈائری کو پڑھ کر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے اس کی زندگی کو پڑھ لیا۔ انسان اپنے پورے وجود کے اعتبار سے کیا ہے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو الفاظ کے کسی بھی مجموعہ کی پکڑ میں نہیں آتی۔ حتی کہ اگر کوئی شخص ایک کتاب لکھے جس کا نام ہو "میری زندگی، اے سے زیڈ تک" تب بھی وہ اس کی زندگی کی ادھوری کہانی ہوگی نہ کہ مکمل کہانی۔

وحید الدین ۲۹ مئی ۱۹۹۶

١٩٨٩

یکم جنوری ۱۹۸۹

کشمیر کے دو صاحبان سے ملاقات ہوئی۔ دونوں تبلیغی تھے۔ انھوں نے کہا کہ کشمیر میں مسلمانوں کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے۔ ان کو ان کا جائز حق نہیں دیا جاتا۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ ایک ایسی مسجد میں جائیں جہاں مخالفین تبلیغ کا غلبہ ہو اور وہ آپ کو مسجد سے نکال دیں تو آپ ان کی شکایت نہیں کرتے، بلکہ ان کے حق میں دعا کرتے ہیں۔ انھوں نے پُرفخر طور پر کہا کہ ہاں۔

میں نے کہا کہ یہ طریقہ جو آپ مسلمانوں کے حق میں عملاً اختیار کئے ہوئے ہیں یہی آپ کو ہندوؤں کے معاملہ میں بھی اختیار کرنا چاہئے۔ یعنی ان کی زیادتیوں کے باوجود صبر کرنا اور ان کے حق میں دعا کرنا۔ میں نے کہا کہ یہ دراصل داعیانہ اخلاق ہے۔ آپ لوگ مسلمانوں کو اپنا مدعو سمجھتے ہیں اس لئے ان کے ساتھ آپ داعیانہ اخلاق برتتے ہیں۔ مگر ہندوؤں کو آپ اپنا مدعو نہیں سمجھتے، اس لئے آپ ان کے ساتھ داعیانہ اخلاق بھی نہیں برت پاتے۔

۲ جنوری ۱۹۸۹

امریکہ میں دس دن رہ کر آج صبح فجر سے پہلے واپس دہلی پہنچا۔ ایرپورٹ سے پری پیڈ ٹیکسی (prepaid taxi) لے کر گھر آیا۔ اس کا کرایہ ایک سو ایک روپیہ تھا۔ گھر پہنچ کر ٹیکسی والے نے کہا کہ "۲۰ روپیہ اور دیجئے"۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیسا۔ اس نے کہا کہ نائٹ سروس کا۔ میں نے کہا کہ اچھا اندر آؤ۔ میں ابھی ایرپورٹ ٹیلی فون کر کے پوچھتا ہوں۔ اگر وہ لوگ کہیں گے کہ ۲۰ روپیہ اور دینا ہے تو ضرور میں دے دوں گا۔ جب میں نے یہ کہا تو ٹیکسی ڈرائیور کرایہ کی چٹ دیکھتے ہوئے بولا: اچھا اس میں نائٹ سروس کا پیسہ شامل ہے: یہ کہہ کر روانہ ہو گیا۔

امریکہ میں ہر چیز سسٹم کے مطابق ہے۔ انڈیا میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ انڈیا کی زمین پر اترنے کے بعد یہ پہلا ناخوشگوار تجربہ تھا جو مجھے پیش آیا۔

۳ جنوری ۱۹۸۹

مولانا اسرار الحق صاحب (ناظم جمعیۃ علماء ہند) اور مسعود حسن صدیقی صاحب (چیئرمین جمعیۃ ٹرسٹ سوسائٹی) تشریف لائے۔ جمعیۃ بلڈنگ (دہلی) میں میرے پاس کرایہ پر دو کمرے ہیں،

اس کی بابت انھوں نے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آپ اس کو کسی اور کو دینا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ لوگوں نے ان کمروں کو لینے کی خواہش ظاہر کی، مگر میں نے انکار کر دیا۔

پھر میں نے کہا کہ وہ ہماری اپنی ضرورت ہے۔ کیوں کہ ہمارا چھپائی وغیرہ کا سارا کام پرانی دہلی سے ہوتا ہے۔ اور ان کمروں کو ہم اپنے سب آفس کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ دونوں صاحبان نے کہا کہ جب آپ ان کمروں کو خود اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ آپ انھیں اپنے پاس رکھیں۔ آپ کے اپنے پاس رہنے پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ البتہ اگر آپ انھیں کسی اور کو دینے والے ہوتے تو ہم خود ان کو لینا پسند کرتے۔

پوری گفتگو بہت اچھی فضا میں ہوئی۔ جاتے ہوئے میں نے دونوں صاحبان کو "تعبیر کی غلطی" کا ایک ایک نسخہ بطور ہدیہ پیش کیا۔

۴ جنوری ۱۹۸۹

قومی آواز (۴ جنوری ۱۹۸۹) میں جناب ریاض الرحمٰن شروانی (حبیب منزل، علی گڑھ) کا مراسلہ اردو زبان کے مسئلہ پر شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

"حصول آزادی سے قبل ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مولوی عبدالحق کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس میں طے پایا تھا کہ آزاد ہندستان کی قومی زبان ہندستانی ہوگی جو دیوناگری اور فارسی لپیوں میں لکھی جائے گی۔ جب حصول آزادی کے بعد یہ مسئلہ دستور ساز اسمبلی کی اس کمیٹی کے سامنے آیا جو اس غرض سے تشکیل دی گئی تھی تو اردو والے جن میں پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد شامل تھے، یہی چاہتے تھے کہ اس فارمولے پر عمل کیا جائے۔ لیکن جب انھوں نے محسوس کیا کہ تقسیم ہند نے صورت حال میں تبدیلی کر دی ہے تو وہ اس مطالبہ سے دستبردار ہو گئے کہ قومی زبان کا نام ہندستانی ہو اور انھوں نے یہ مان لیا کہ اسے ہندی کہا جائے۔ لیکن اس پر بدستور اصرار کرتے رہے کہ وہ دیوناگری اور فارسی دونوں لپیوں میں لکھی جائے۔ اس معاملہ میں ان کو جنوبی ہندستان کے نمائندوں کی تائید بھی حاصل تھی۔ لیکن ہندی پریمیوں کی تنگ نظری اتنے پر بھی آمادہ نہیں ہو سکی اور کمیٹی میں ایک ووٹ کی اکثریت سے طے ہو گیا کہ

قومی زبان کا نام ہندی ہوگا اور وہ صرف دیوناگری لپی میں لکھی جائے گی۔ اس مسئلہ پر مولانا ابوالکلام نے تو کمیٹی کی رکنیت سے استعفا بھی دے دیا تھا"۔

مراسلہ نگار نے جس چیز کو ہندی پریمیوں کی "تنگ نظری" کہا ہے، وہ خود ان کی تنگ نظری ہے۔ مسلمانوں نے سب سے بڑی تنگ نظری کرکے ملک کو بٹوایا۔ اب وہ خود اپنے عمل کے نتائج کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہی موجودہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

۵ جنوری ۱۹۸۹

نظام الدین (دہلی) میں میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوں۔ باہر سے آواز سنائی دیتی ہے: "پرانی پلاسٹک والا، پرانی پلاسٹک والا"۔ دہلی میں اور دوسرے ہندستانی شہروں میں ہر روز بے شمار "کباڑی والے" گھروں سے پلاسٹک کے پرانے سامان خریدتے ہیں۔ یہ پرانی پلاسٹک کارخانوں میں دوبارہ پگھلائی جاتی ہے اور ان سے دوبارہ مختلف قسم کے سامان بنائے جاتے ہیں۔ یہ سامان نہ صرف مضر ہوتے ہیں بلکہ وہ بے حد کمزور بھی ہوتے ہیں۔

پچھلے ہفتہ جب کہ میں امریکہ میں تھا، وہاں میں نے اس کے برعکس منظر دیکھا۔ وہاں بے شمار چیزیں پلاسٹک سے بنتی ہیں۔ مگر یہ تمام چیزیں ایک بار استعمال ہوکر کوڑے میں ڈال دی جاتی ہیں۔ ہر گھر کے سامنے صبح کے وقت بڑے بڑے تھیلے نظر آتے ہیں جن میں پلاسٹک کے استعمال شدہ سامان بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ سرکاری گاڑیاں ان کو اٹھاکر لے جاتی ہیں تاکہ انھیں ضائع کر دیا جائے۔ کتنا فرق ہے ایک ملک میں اور دوسرے ملک میں۔

۶ جنوری ۱۹۸۹

آج رات کو ساڑھے بارہ بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اٹھایا تو آواز آئی کہ میں نیویارک سے ابراہیم مامون بول رہا ہوں (ٹیلی فون نمبر 7064 898-718) وہ اصلاً گجرات کے رہنے والے ہیں اور آجکل نیویارک میں مقیم ہیں۔ انھوں نے اپنا پتہ لکھوایا اور کہا کہ انگریزی الرسالہ ان کے نام جاری کر دیا جائے اور انگریزی کتابیں انھیں روانہ کر دی جائیں۔ ان کے ذریعہ وہ وہاں کے غیر مسلم صاحبان میں اسلام کی دعوت پہنچانا چاہتے ہیں۔

آج دن میں عبدالغفور صاحب (موجودہ ایم پی، سابق چیف منسٹر بہار) کا ٹیلیفون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ میں الرسالہ پابندی سے پڑھتا ہوں اور آپ کے یہاں کی تمام کتابیں قیمت دے کر خریدنا چاہتا ہوں۔ میرے یہاں سب کتابیں بھجوا دی جائیں (ٹیلیفون 3017739)

اس طرح ہر روز ایسے واقعات سامنے آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ کا مشن خدا کے فضل سے تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اور وسیع پیمانہ پر لوگوں کو متاثر کر رہا ہے۔ ۶۴ سال کی عمر کو پہنچ کر اب میری صحت کافی کمزور ہو گئی ہے۔ تاہم امید ہے کہ ان شاء اللہ میرے بعد اب یہ مشن ختم نہیں ہوگا، بلکہ برابر جاری رہے گا۔

۷ جنوری ۱۹۸۹

اردو زبان شاید دنیا کی واحد زبان ہے جس میں لفظی کرشمے دکھانے کا نام ادب ہوتا ہے۔ اور فرضی خیال آرائی کا نام انشا پردازی۔ اس کی ایک دلچسپ مثال پچھلے چند مہینوں کے درمیان نظر سے گزری۔ میں نے چند مضامین پڑھے جن میں مضمون نگار نے اپنی کسی محبوب شخصیت کو "عہد ساز شخصیت" قرار دیا تھا۔ مثلاً :

اندرا گاندھی : عہد ساز شخصیت

ابو الکلام آزاد : عہد ساز شخصیت

ابو الاعلیٰ مودودی : عہد ساز شخصیت

ان مضمون نگاروں سے کوئی پوچھے کہ تمہاری محبوب شخصیت نے جو عہد پیدا کیا تھا وہ کہاں ہے۔ تو ساری دنیا میں کوئی ملک تو درکنار، وہ کسی ایک شہر کا نام بھی نہ بتا سکیں گے جہاں عہد سازی کا یہ کارنامہ انجام پایا ہو، حتی کہ ان شخصیتوں کے اپنے گھر میں بھی نہیں۔

میں خدا کے فضل سے کئی زبانیں جانتا ہوں۔ مگر اس قسم کے ہوائی مضامین میں نے کسی اور زبان میں کبھی نہیں پڑھے۔ کیسے عجیب ہوں گے وہ لوگ جنھوں نے "عہد ساز" شخصیتیں تو بے شمار پیدا کر رکھی ہوں مگر خود "عہد" کا کہیں پتہ نہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ کا سب سے زیادہ غیر حقیقت پسند گروہ اردو بولنے والوں کا گروہ ہے اور اس کی وجہ اردو زبان کی یہی انوکھی خصوصیت ہے۔

۸ جنوری ۱۹۸۹

مولانا اکبر الدین قاسمی (حیدر آباد) آئے۔ انھوں نے بتایا کہ ۲۹ دسمبر ۱۹۸۸ کو حیدر آباد میں "پیام انسانیت" کا اجتماع تھا جس میں مولانا ابوالحسن علی ندوی نے خطاب کیا۔ اس کے بعد یکم جنوری ۱۹۸۹ کو محمد ہاشم قاسمی کی دعوت پر وہ مرکز اسلامی (حمایت نگر، حیدر آباد) گئے۔ وہاں مولانا موصوف کے ساتھیوں سمیت تقریباً ۲۰ آدمی تھے۔ ان سے گفت گو کے انداز میں انھوں نے خطاب کیا اور "مسلمانوں کو قرآن فہمی کا مشورہ دیا۔" ۲ جنوری ۱۹۸۹ کو حیدر آباد کے اخبار سیاست میں مولانا کے اس پروگرام کی خبر مختصر طور پر شائع ہوئی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی (عرف علی میاں) اور ان کے سب ساتھیوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ مرکز اسلامی (حمایت نگر، حیدر آباد) اسلامی مرکز دہلی کی ملکیت ہے اور محمد ہاشم قاسمی نے خیانت اور غصب کا معاملہ کرکے اس پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اس کے باوجود ان کا محمد ہاشم قاسمی کی دعوت پر اس مرکز میں جانا بلاشبہ جرم عظیم ہے۔

مولانا علی میاں کو اقبال کا یہ تصور مسلم بہت پسند ہے کہ: ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات۔ وہ اپنی تقریروں میں اس کو دہراتے رہتے ہیں۔ حیدر آباد کی تقریر میں بھی انھوں نے یہ بات کہی۔ اب کوئی ان سے پوچھے کہ آپ کے "احتساب کائنات" کی فہرست میں حیدر آباد کے خائن اور غاصب کا احتساب شامل ہے یا نہیں۔

۹ جنوری ۱۹۸۹

۲۹ دسمبر ۱۹۸۸ کو میں امریکہ (انا ہائم، کیلی فورنیا) کے ایک مسلم اجتماع میں شریک تھا۔ اس اجتماع کا انتظام ایک اسلامک سنٹر (مسجد اور اسکول) کی طرف سے کیا گیا تھا۔ ایک مقرر اسٹیج پر آئے انھوں نے سنٹر کے لئے چندہ کی اپیل کی اور نہایت پرجوش انداز میں تقریر کرنا شروع کیا۔

یہ ایک امریکی ہوٹل کا ہال تھا۔ مقرر نے مجمع سے اللہ اکبر کا نعرہ لگانے کی اپیل کی۔ وہ بار بار کہتے "تکبیر"۔ مگر مجمع کی طرف سے "اللہ اکبر" کی چند ہلکی آوازوں کے سوا اور کچھ سنائی نہ دیتا۔ وہ بار بار حاضرین کو اکساتے رہے کہ سب مل کر بلند آواز سے نعرہ لگائیں۔ مگر انھیں کامیابی

نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ انھوں نے پرجوش طور پر کہا:

I want to shake this hall

مگر ہال کا ہل جانا تو درکنار وہ گونجا بھی نہیں۔ مذکورہ مقرر اپنے لہجہ اور شکل وصورت کے اعتبار سے کوئی ہندستانی یا پاکستانی معلوم ہوتے تھے۔ امریکہ، ہندستان یا پاکستان سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں سائنٹفک انداز میں بات کہنے کی قیمت ہے نہ کہ پرجوش طور پر نعرہ لگانے کی۔ مگر ہندستان اور پاکستان کے مسلمان امریکہ میں بھی اپنا ایک الگ جزیرہ بنانا چاہتے ہیں۔

۱۰ جنوری ۱۹۸۹

آج خواب میں دیکھا کہ میں کچھ لوگوں کے سامنے ایک حدیث کی تشریح کر رہا ہوں۔ وہ حدیث مشکوٰۃ (کتاب الرقاق) میں ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابن مسعود ان النبی صلی اللہ وسلم نام علی حصیر فقام وقد اثّر فی جسدہ فقال ابن مسعود: یارسول اللہ، لو أمرتنا أن نبسط لک و نعمل۔ فقال: مالی وللدنیا۔ وما أنا و الدنیا إلا کراکب استظل تحت شجرۃ ثم راح وترکھا (صفحہ ۱۴۴۳)

خواب میں میں نے کہا کہ اینٹ پتھر کے محل صرف سطحی لوگوں کو مطمئن کرتے ہیں۔ فکری انسان صرف فکری محل میں جی سکتا ہے۔ اینٹ پتھر کے محل میں جینا ایک فکری انسان کے لئے ممکن نہیں۔ اور یہ فکری انسان اگر ربانی انسان ہو تو اس کے بعد اس کا معاملہ بے حساب حد تک بڑھ جائیگا۔

۱۱ جنوری ۱۹۸۹

ایک بزرگ کا قول ہے: الحق لا یعرف بالرجال (حق کو آدمیوں سے نہیں پہچانا جاتا) موجودہ زمانہ کے جس مسلمان سے کہئے، وہ پرجوش طور پر اس کی تائید کرے گا۔ مگر میرا تجربہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں ایسے لوگ نایاب ہیں جو فی الواقع اس اصول کو مانتے ہوں۔

اس کا زندہ ثبوت میں خود ہوں۔ میرے جتنے بھی مخالفین ہیں وہ سب کے سب صرف ایک وجہ سے میرے مخالف ہیں۔ یہ کہ میں نے ان کے اکابر پر تنقید کیوں کی۔ میں اپنی ہر تنقید کے ساتھ قرآن و حدیث کے دلائل پیش کرتا ہوں۔ آج تک کسی نے میرے دلائل کا تجزیہ کرکے

ان کو رد نہیں کیا۔ اس کے باوجود وہ میرے مخالف بنے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ حق کو رجال سے پہچانتے ہیں نہ کہ خدا اور رسول کے کلام سے۔ وہ واضح طور پر دیکھتے ہیں کہ میرا نقطۂ نظر قرآن وحدیث سے ثابت ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ صرف اس لئے اس کو نہیں مانتے کہ ان کے مفروضہ اکابر کی تائید اسے حاصل نہیں۔

۱۲ جنوری ۱۹۸۹

امریکہ کے سفر (دسمبر ۱۹۸۸) میں میری ملاقات ایک مسلمان سے ہوئی۔ وہ پاکستان سے آکر امریکہ میں آباد ہوئے، اور اب یہیں کے شہری ہو چکے ہیں۔ اس سے پہلے ان کے پاس امریکہ میں دس اسٹور تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان میں نو اسٹور کو فروخت کر کے اس کی رقم انھوں نے شیئر زمین اور جائدادوں وغیرہ میں لگا دی ہے۔ اب اپنے پاس صرف ایک اسٹور رکھا ہے جہاں عام ضرورت کا سامان فروخت ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اللہ کے فضل سے اب میرے اور میرے بچوں کے لئے کھانے پینے کا انتظام ہو گیا ہے۔ اب تو مجھے جنت کا ٹکٹ چاہئے۔ اب میں صرف جنت کے ٹکٹ کی تلاش میں ہوں۔

مسلمانوں میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو اس نفسیات سے دوچار ہیں۔ وہ جنت کا ٹکٹ چاہتے ہیں۔ مگر اکثر لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ جنت کا سستا ٹکٹ چاہتے ہیں۔ اس نفسیات کی بنا پر اکثر وہ ان لوگوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں جو خود ساختہ ٹکٹ (Fake ticket) لے کر جگہ جگہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ ان میں سے کوئی "ٹکٹ" خرید کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے لئے جنت کا انتظام کر لیا۔ حالاں کہ یہ خود فریبی کے سوا اور کچھ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جنت کا ٹکٹ کسی دکان پر نہیں بکتا۔ جنت کا ٹکٹ آدمی کا خود اپنا وجود ہے۔ یہی واحد قیمت ہے جس کو ادا کر کے آدمی جنت کا مستحق بن سکتا ہے۔

۱۳ جنوری ۱۹۸۹

آج عمر فاروق (Umar Faruuk) ملاقات کے لئے آئے۔ وہ ترک ہیں اور استانبول کے رہنے والے ہیں۔ آجکل اسلام آباد (پاکستان) میں ریسرچ کر رہے ہیں۔ ہندستان میں اسلامی تنظیموں کا مطالعہ کرنے کے لئے آئے ہیں۔ وہ عربی اور انگریزی دونوں زبان

روانی کے ساتھ بول رہے تھے۔

ان کو میں نے الرسالہ ستمبر ۱۹۸۸ کا صفحہ ۱۳ دکھایا۔ اس میں عصمت الونو کا ایک قول عربی میں نقل کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بالکل انھیں الفاظ میں ان کا یہ قول میں نے نہیں پڑھا ہے، مگر معناً وہ صحیح ہوسکتا ہے۔ اس قول کو ترکی زبان میں انھوں نے اس طرح لکھا:

Laiklik ektik islam buyudu cikti

گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ آپ کو اپنی سوانح عمری لکھنا چاہئے۔ بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی یہ بات کہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میری زندگی کے دو حصے ہیں۔ ایک ابتدائی زندگی، دوسری بعد کی زندگی۔ اگر میں اپنی ابتدائی زندگی کے حالات لکھ دوں تو بعد کی زندگی کے حالات مجھے خود لکھنا ضروری نہ ہوگا۔ اس دوسرے حصہ کو کوئی بھی شخص محنت کر کے لکھ سکتا ہے۔ کیوں کہ میری بعد کی زندگی کے حالات کتابوں اور مضامین میں، نیز ڈائری، سفرنامہ، خط وکتابت اور "خبرنامہ اسلامی مرکز" کی صورت میں کافی حد تک موجود ہیں۔

۱۴ جنوری ۱۹۸۹

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ خدا مومن پر مصیبت ڈالتا ہے اور غیر مومن کو چھوٹ دیدیتا ہے۔ اسی طرح بتایا گیا ہے کہ موت کے وقت مومن کی روح آسانی سے نکلتی ہے اور غیر مومن کی مشکل سے۔ اس قسم کی حدیثوں پر غور کرنے کے بعد ایک بات میری سمجھ میں آتی ہے۔

دودھ میں مکھن ملا ہوتا ہے مگر جب دودھ کو خوب بلویا جائے تو دودھ الگ ہوجاتا ہے اور مکھن الگ۔ اس کے بعد مکھن میں چھاچھ اور گھی ملا ہوا ہوتا ہے۔ جب اس کو آگ پر رکھ کر پکاتے ہیں تو دوبارہ چھاچھ اور گھی ایک دوسرے سے اس طرح الگ ہوجاتے ہیں کہ نہایت آسانی سے دونوں کو جدا کیا جاسکے۔

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مومن کی ذات میں مصیبتوں کے ذریعہ یہی علیحدگی کا عمل جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار روح اور جسم ایک دوسرے سے علیحدہ ہوجاتے

ہیں۔ اس وقت موت کا فرشتہ آتا ہے اور نہایت آسانی کے ساتھ اس کے مادی جسم کو چھوڑ کر اس کی روح کو اٹھا لے جاتا ہے۔ اس کے برعکس غیر مومن کی ذات میں روح اور جسم باہم ایک دوسرے کے ساتھ شدت سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب اس کی عمر پوری ہوتی ہے اور موت کا فرشتہ روح قبض کرنے کے لئے آتا ہے تو وہ زبردستی کھینچ کر اس کی روح کو اس کے جسم سے جدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی جان مشکل سے نکلتی ہے۔

۱۵ جنوری ۱۹۸۹

میرے چچا زاد بھائی اقبال احمد سہیل (ایم اے) شاعر تھے۔ اسی کے ساتھ وہ خاندان کے سب سے زیادہ تعلیم یافتہ شخص تھے۔ ان کے اثر کے تحت گھر میں شعر وشاعری کا تذکرہ رہتا تھا۔ چنانچہ ابتدائی زندگی میں میں بھی شعر پسند ہوگیا۔ غور وفکر کرنے کا ذوق میرے اندر فطری تھا۔ چنانچہ میں اکثر اشعار پر غور کرتا رہتا۔ اس کی وجہ سے اشعار کے نئے نئے معانی میرے اوپر کھلتے رہتے تھے۔ ۱۹۴۵ کے لگ بھگ زمانہ میں جب کہ میں جونپور (چہار سو بازار) میں تھا، ایک صاحب باقاعدہ مجھ سے دیوان غالب پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔

۱۹۴۸ سے میرے اندر تبدیلی ہوئی اور شاعری وغیرہ چھوڑ کر میں اسلام کی طرف پوری طرح مائل ہوگیا۔ اب میرا ذہن قرآن وحدیث پر غور کرنے لگا۔ پہلے میرے ذہن پر اشعار کے معانی کھلتے تھے۔ اب مجھ پر قرآن وحدیث کے معانی کھلنے لگے۔ پچھلے ۴۰ سال سے یہ سلسلہ خدا کے فضل سے مسلسل جاری ہے۔

آج صبح ابھی میں بستر پر تھا کہ حدیث ذہن میں آئی۔ ایک حدیث قدسی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ فَلْیَظُنَّ بِیْ خَیْرًا (میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں تو اس کو چاہئے کہ وہ میرے ساتھ اچھا گمان کرے)

اس حدیث پر غور کرتے ہوئے میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی صفاتِ کمال کا اعتبار کرتے ہوئے بندہ ایسا کرے کہ وہ احتمالاتِ شر کے مقابلہ

میں احتمالاتِ خیر کو ترجیح دے۔ وہ گمان کرے کہ اللہ اپنے بندے کی کوتاہیوں کو جرم کے خانہ میں ڈالنے کے بجائے نادانی کے خانہ میں ڈال دے گا۔ وہ اس کے ساتھ گرفت کے بجائے درگزر کا معاملہ فرمائے گا۔ وہ اس کی غلط کاری کو عجز پر محمول کرکے چھوڑ دے گا نہ کہ سرکشی پر محمول کرکے اس کو سزا دے۔ وہ اس کے ساتھ بحیثیت محاسب معاملہ نہ فرمائے گا بلکہ بحیثیت صمد معاملہ فرمائے گا۔ بندے کے پاس اگر حسن عمل کا کوئی ذرہ ہے تو وہ اس کے بقیہ اعمال نامہ کو اس کے تابع کردے گا نہ کہ ذرہ کو بقیہ اعمال نامہ کے تابع کر دے۔

۱۶ جنوری ۱۹۸۹

نیویارک سے نکلنے والا ہفتہ وار میگزین ٹائم (Time) ۱۹۲۳ میں جاری ہوا تھا۔ شروع ہونے کے بعد پورے ۶۵ سال تک اس کا نام صرف "ٹائم" رہا۔ اس کی اشاعت بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ واقعی معنوں میں ایک عالمی میگزین (Global magazine) بن گیا۔ وہ پانچ ملین کی تعداد میں چھپ کر ہر ملک اور ہر قوم میں پڑھا جانے لگا۔ اب اس کے مالکوں نے فیصلہ کیا کہ اس کے نام کے ساتھ انٹرنیشنل کا لفظ بڑھا دیا جائے۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۸ کو اس کا جو شمارہ نکلا، اس میں اس کا نام ٹائم انٹرنیشنل (Time International) لکھا ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اس کا یہی نام لکھا جا رہا ہے۔

یہ سیکولر لوگوں کا حال ہے۔ وہ جو نام رکھتے ہیں، واقعہ کے مطابق رکھتے ہیں۔ ان کا نام ان کے لئے امر واقعہ کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسری طرف موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی آرزوؤں اور خوش فہمیوں کو نام کی صورت دے دیتے ہیں۔ وہ جب کوئی پرچہ نکالتے ہیں تو اول دن ہی سے اس کا نام انٹرنیشنل ہوتا ہے۔ خواہ ان کے اپنے مخصوص حلقہ کے باہر وہ خود مسلمانوں میں بھی نہ پڑھا جاتا ہو۔ ان کی حکومت کا نام اسلامی جمہوریہ ہوتا ہے، خواہ پہلے ہی الکشن میں سیکولر پارٹی ملک میں غالب آجائے۔ وہ اپنے اکابر کو شیخ الہند، امام الہند، مفکر عالم اور عہد ساز شخصیت کا لقب دیتے ہیں۔ خواہ عالمی معیار کے لحاظ سے ان بزرگوں کی حیثیت ایک معمولی مصنف یا مقرر کی کیوں نہ ہو۔

۱۷ جنوری ۱۹۸۹

احمد دیدات صاحب گجرات کے باشندے ہیں۔ ان کے والدین ساؤتھ افریقہ جاکر وہاں بس گئے۔ آجکل احمد دیدات صاحب نے مسیحیوں سے مناظرہ میں کافی شہرت حاصل کی ہے۔ بمبئی کے ایک صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بمبئی میں احمد دیدات صاحب کی تقریر سنی تھی اور ان کے ویڈیو کیسٹ دیکھے تھے۔ وہ احمد دیدات صاحب کی کافی تعریف کرنے لگے۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں وہ سب سے بڑے داعی اسلام ہیں۔

میرے پاس احمد دیدات صاحب کا لٹریچر آتا رہتا ہے۔ حال میں ڈاک سے ان کا انگریزی پرچہ البرھان (دسمبر ۱۹۸۸) مجھے ملا ہے۔ اس میں احمد دیدات صاحب کا مفصل انٹرویو چھپا ہے۔ میں نے انھیں دکھایا کہ وہ کس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ اس انٹرویو میں مسیحیوں کے بارہ میں کہتے ہیں کہ انھیں پیچھے دھکیل دو، ان کے اوپر بلڈوزر چلا دو:

Suprersede them all, Bulldoze them all.

میں نے کہا کہ کیا داعی کی زبان یہی ہوتی ہے، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہی زبان بولتے تھے۔ میں نے رسول اللہ کی بہت سی مثالیں دے کر کہا کہ داعی کا طریقہ مدعو کا دل جیتنا ہوتا ہے نہ کہ ان کے اوپر بلڈوزر چلا کر انھیں کچل ڈالنا۔ پھر میں نے کہا کہ احمد دیدات صاحب ایک مناظر ہیں نہ کہ داعی۔ اور مناظرہ کرنا داعی کا طریقہ نہیں۔

۱۸ جنوری ۱۹۸۹

پاکستان سے ایک ماہنامہ "اشراق" نکلتا ہے۔ اس کا شمارہ جنوری ۱۹۸۹ ہمارے سامنے ہے۔ اس کے ایک مضمون میں کہا گیا ہے کہ "خلیفہ" کو جنات کا جانشین کے معنی میں لینا صحیح نہیں۔ "خلیفہ" عربی زبان میں اصلاً اس شخص کے لئے آتا ہے جو کسی کے بعد اس کے اختیار و اقتدار کے مالک کی حیثیت سے اس کی جگہ لے۔ پھر یہ لفظ کسی کے بعد اس کی جگہ لینے کے مفہوم سے مجرد ہو کر محض اختیار و اقتدار کا مالک کے معنی میں مستعمل ہوا۔ لغت عرب میں اس معنی کے نظائر موجود ہیں... لفظ کے معنی میں اس طرح کے تصرفات کی مثالیں عربی

زبان میں عام ہیں۔ قرآن کی آیت انی جاعل فی الارض خلیفۃ (البقرہ) میں لفظ خلیفہ صاحب اقتدار ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے" صفحہ ۵۲۔

مگر پورے مضمون میں لغت یا کلام عرب سے کوئی ایک مثال بھی نہیں دی گئی ہے کہ خلیفہ کا لفظ مجرد ہو کر محض اختیار و اقتدار کا مالک ہونے میں مستعمل رہا ہے۔ ہمارے علماء اکثر ایسی باتیں کہتے ہیں جن کے متعلق وہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے ثابت کر دیا۔ حالاں کہ خالص علمی اعتبار سے وہ ثابت شدہ نہیں ہوتا۔

یہ ایک غیر سائنسی استدلال ہے جو موجودہ زمانہ میں قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے علماء کے لئے سائنٹفک لاجک کا مطالعہ بے حد ضروری ہے، تاکہ وہ جانیں کہ ثابت شدہ ہونے کا مطلب کیا ہے اور غیر ثابت شدہ ہونے کا مطلب کیا۔ ہمارے علماء کی اس کمی نے موجودہ زمانہ میں ان کے پیدا کردہ لٹریچر کو جدید انسان کے لئے بے معنی بنا دیا ہے۔

۱۹ جنوری ۱۹۸۹

کشمیر کے دو صاحبان ملاقات کے لئے آئے۔ ان سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے جن لوگوں کو اپنا لیڈر بنایا، وہ سب کے سب مقرر تھے، ان میں سے کوئی بھی شخص مدبر نہ تھا۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان ہر طرف ناکام اور برباد نظر آتے ہیں۔ قوموں کی رہنمائی کے لئے مدبر شخص چاہئے، مقرر شخص کبھی قوم کی رہنمائی نہیں کر سکتا۔

۲۰ جنوری ۱۹۸۹

ٹائمس آف انڈیا (۱۹ جنوری ۱۹۸۹) میں ہندستانی وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی کا ایک انٹرویو چھپا ہے۔ اس کا خلاصہ اس کی سرخی کے مطابق یہ ہے کہ ہندستان کی صنعت کو بیرونی مقابلہ کا سامنا کر کے جینا پڑے گا:

Industry to face foreign competition

آزادی (۱۹۴۷) کے بعد جو لوگ ملک کے حکمراں بنے، ان کا نظریہ یہ تھا کہ ملکی

صنعت کو تحفظ دینا ضروری ہے، ورنہ وہ بیرونی مقابلہ میں برباد ہو جائے گی۔ مگر ۴۰ سال کے تجربہ میں معلوم ہوا کہ تحفظ نے ملکی صنعت کے معیار کو گرا دیا۔ سابق حکمرانوں نے بیرونی مقابلہ میں خطرہ کے پہلو کو دیکھا مگر وہ اس میں افادیت کے پہلو کو نہ دیکھ سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ مقابلہ اور مسابقت زندگی کی اعلیٰ ترقی کے لئے بے حد ضروری ہے۔ مقابلہ کو ختم کرنے کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ معیار ختم ہو جائے۔

۲۱ جنوری ۱۹۸۹

کویت کے عربی ماہنامہ الوعی الاسلامی (جمادی الآخرۃ ۱۴۰۹، جنوری ۱۹۸۹) میں دکتور وہبۃ الزحیلی کے قلم سے مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے: اقلیمیۃ الشریعۃ والقضاء فی دیار الاسلام۔ صاحب مضمون بتاتے ہیں کہ اس معاملہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ دار الاسلام میں جس طرح مسلمانوں کے اوپر "حقوق الآدمیین" میں حدود و تعزیرات کا اجرا کیا جاتا ہے، کیا اسی طرح غیر مسلموں کے اوپر بھی کیا جائے گا۔ پھر وہ لکھتے ہیں:

ذھب جمھور الفقھاء (مالك والشافعي واحمد) الی انه یخیر القاضی المسلم بین الحکم والاعراض عن الحکم بین غیر المسلمین فی المعاملات لقوله تعالیٰ: فان جاؤك فاحکم بینھم او اعرض عنھم (المائدہ ۴۲) والظاھر ھو الرأی الاول۔ لأن ھٰذہ الآیۃ منسوخۃ بالآیۃ المتقدمۃ: وان احکم بینھم (صفحہ ۲۱)

اسلام میں جس چیز کو نسخ کہا گیا ہے، وہ حقیقۃً وہی ہے جس کو موجودہ زمانہ میں تدریج کہا جاتا ہے۔ مگر بعد کے زمانہ میں مسلم علماء نے یہ رائے قائم کر لی کہ جو حکم منسوخ ہوا وہ مطلق طور پر منسوخ ہو گیا۔ اس رائے کے نتیجے میں اسلام کی بعد کی تاریخ زندگی کی ایک اہم حقیقت سے محروم ہو گئی اور وہ حکمت تدریج ہے۔

غیر مسلموں پر اسلامی قانون کے نفاذ کے بارہ میں سورۂ المائدہ کی آیت ۴۲ بے حد اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں پر نفاذ احکام کے معاملہ میں حالات کی رعایت کی جائے گی۔ مثلاً انٹرنیشنل قانون کا لحاظ، ان کے اوپر خود ان کے جج کا تقرر یا ان سے

معاہدہ کرنا اور پھر اس کے مطابق معاملہ کرنا۔

۲۲ جنوری ۱۹۸۹

ایک عالم ملاقات کے لئے آئے۔ وہ ایک بڑے عربی دینی مدرسہ سے فارغ ہیں اور مدرسہ کے چندہ کے لئے ہر سال سفر کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اس سلسلہ میں کئی بار انڈمان جا چکے ہیں۔ انڈمان کے لئے کلکتہ سے پانی کے جہاز کے ذریعہ جانا ہوتا ہے۔ یہ مسلسل پانچ دن کا سفر ہے۔ بڑے جہاز میں ڈھائی ہزار آدمی ہوتے ہیں۔ پانچ سو آدمی صرف عملہ کے ہوتے ہیں۔ اس میں پولیس کے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں۔

اس طرح کی بہت سی معلوماتی باتیں انھوں نے بتائیں۔ میں نے کہا کہ آپ نے کئی بار سمندر کے ذریعہ انڈمان کا سفر کیا ہے۔ کسی سفر میں کوئی خاص سبق آموز بات جو آپ کو ملی ہو، وہ بتائیے۔ مگر وہ کوئی سبق کی بات نہ بتا سکے۔

اسلامی نظام کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کے تمام ادارے اور اس کی سرگرمیاں (Education oriented) ہوں۔ مدرسہ، مسجد، اجتماع، قیادت اور صحافت سب اس طرح چلائے جائیں کہ ان سے مسلمانوں کا شعور بیدار ہوتا رہے۔ مگر یہی وہ اصل چیز ہے جس سے ہمارے تمام ادارے بالکل خالی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا کوئی ادارہ بھی شعور کی تربیت کا کام نہیں کر رہا ہے۔ یہ بلاشبہ موجودہ مسلمانوں کی سب سے بڑی کمی ہے۔

۲۳ جنوری ۱۹۸۹

دو صاحبان آئے جو تبلیغی جماعت سے متاثر تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم تبلیغ کو ایک اچھی تحریک سمجھتے ہیں۔ مگر کیا وجہ ہے کہ تبلیغ کے ذریعہ کوئی گہری تبدیلی نہیں ہوتی۔ میں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ تبلیغ کے رہنماؤں نے اپنے کام کی بنیاد فضائل پر رکھی، جب کہ پیغمبرانہ طریقہ یہ ہے کہ اصلاحی کام کی بنیاد تعمیر شعور پر رکھی جائے جس کو قرآن میں تزکیہ کہا گیا ہے۔

پھر میں نے کہا کہ یہ معاملہ صرف تبلیغی جماعت کا نہیں۔ موجودہ زمانہ کی تمام مسلم تحریکوں کا ہے۔ ان رہنماؤں نے اس مفروضہ پر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں اپنا کام

شروع کیا کہ ایمان تو ان کے اندر موجود ہی ہے، اب ہمیں صرف اس کے اوپر عمل کی چھت تیار کرنا ہے۔ مگر یہ مفروضہ غلط تھا۔

ایمان محض تقلیدی عقیدہ یا تلفظ کلمہ کا نام نہیں، ایمان زندہ شعور کا نام ہے۔ ایک لفظ میں ایمان کو ذہنی انقلاب کہہ سکتے ہیں۔ جو ایمان ذہنی انقلاب ہو، اس کے اوپر اسلامی عمل کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے مسلمانوں کے اندر زندہ ایمانی شعور پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے دوسری دوسری زمینوں پر اسلامی عمل کی عمارت کھڑی کرنا شروع کر دیا۔

کسی نے فضائل کی داستانوں پر اپنی عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کی۔ کسی نے تاریخی فخر پر۔ کسی نے سیاسی غلبہ کے شوق پر۔ کسی نے غیر مسلموں کے خطرہ کا احساس دلا کر۔ مگر یہ سب گویا ریت کے اوپر دیوار کھڑی کرنا ہے۔ مسلمانوں کو دوبارہ مطلوبہ مسلمان بنانے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ تعمیر شعور سے ان کے اندر اصلاحی کام کا آغاز کیا جائے۔

۲۴ جنوری ۱۹۸۹

جمادی الاولیٰ (۱۴۰۹ھ) میں کویت میں ایک نہایت اہم اجتماع ہوا۔ اس کی کارروائیاں کویت کے ہلٹن ہوٹل میں انجام پائیں۔ اس میں عرب سربراہ اور مسلم حکومتوں کے نمائندے شریک تھے۔ پاکستان سے شمس الدین پیرزادہ نے شرکت کی جن کی حیثیت وزیر کی ہے۔ اس اجتماع میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اعلیٰ پیمانہ پر مجمع الفقہ الاسلامی قائم کی جائے جس کا ہیڈ کوارٹر جدہ ہو۔

اعلان کردہ مقاصد کے اعتبار سے یہ ایک نہایت اہم ادارہ ہے۔ مگر یقینی ہے کہ اس کا کوئی بھی فائدہ نہ ہوگا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اس کے "المادة السابعة" کے مطابق، مجمع الفقہ الاسلامی میں المؤتمر الاسلامی سے تعلق رکھنے والی ہر مسلم مملکت کا ایک ممبر ہوگا اور اس ممبر کا تعین متعلقہ حکومت کرے گی (یکون لکل دولة من دول منظمة المؤتمر الاسلامی عضو عامل فی المجمع ویتم تعیینه من قبل دولته، صفحہ ۱۲۱)

جو ادارہ مسلم حکومتوں کے نامزد کردہ افراد پر مشتمل ہو، وہ یقینی طور پر ایک رسمی ادارہ بن کر رہ جائے گا، وہ کوئی زندہ کام نہیں کر سکتا۔ مگر دوسری مشکل یہ ہے کہ مسلمانوں کے جو غیر حکومتی ادارے

ہیں وہ اختلافات کا شکار ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اجتماعی ادارے دو میں سے کسی ایک کمزوری میں مبتلا ہیں۔ اگر وہ حکومت کی سرپرستی میں ہیں تو وہ رسمی ہو کر رہ گئے ہیں اور اگر وہ آزاد ہیں تو اندرونی اختلافات کا شکار ہیں۔

۲۵ جنوری ۱۹۸۹

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی جو تحریر بھی میں پڑھتا ہوں، وہ مجھے فخر سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کوئی شخص براہ راست فخر کے الفاظ بولتا ہے، کسی کی تحریر میں فخر کا لفظ نہیں ہوتا، مگر اس کو دیکھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ فخر کی نفسیات کے تحت لکھی گئی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے اسلام کو اپنا فخر بنا لیا ہے۔ ان کا یہی احساس ان کی گفتگو اور تحریر میں جھلکتا رہتا ہے۔

مثلاً ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ) میں ایک تفصیلی مضمون (الاعیاد بین التعظیم والتقلید) شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک جملہ یہ ہے: من مفاخر الاسلام انه دین مسئول ... ومن مفاخر الاسلام ایضاً انه لیس رهبانیة وانما هو دین حیاة معتدلة (اسلام کی قابل فخر باتوں میں سے یہ ہے کہ وہ مسئولیت کا دین ہے۔ اسی طرح اسلام کی قابل فخر باتوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ رہبانیت کا دین نہیں، وہ معتدل زندگی کا دین ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے اصحاب نے کبھی فخر کی زبان استعمال نہیں کی۔ یہ صرف موجودہ زمانہ کے مسلمان ہیں جو اس قسم کی زبان بولتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے چوں کہ اسلام کو اپنے فخر کی چیز بنا رکھا ہے، اسی لئے وہ ان کے یہاں عمل کی چیز نہ بن سکا۔ فخر کی نفسیات صرف جھوٹی تعلّی کا جذبہ ابھارتی ہے، وہ آدمی کے اندر کبھی عمل کا جذبہ بیدار نہیں کرتی۔

۲۶ جنوری ۱۹۸۹

تبلیغی جماعت کے دو عالم ملاقات کے لئے آئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ تبلیغ کے ذریعہ لاکھوں مسلمانوں کی اصلاح ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں میں اصلاح کا

کام تو تبلیغی جماعت کر رہی ہے، مگر غیر مسلموں میں دعوت کا کام اس نے چھوڑ رکھا ہے۔ حالانکہ غیر مسلموں کی دعوت کے بغیر مسلمانوں کو خدا کی وہ مدد نہیں مل سکتی جس کا وعدہ غیر مسلموں کے مقابلہ میں کیا گیا ہے۔

انھوں نے کہا کہ ابھی تو مسلمان خود اصلاح یافتہ نہیں ہیں، پھر وہ غیر مسلموں میں دعوت و تبلیغ کا کام کس طرح کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں عام مسلمانوں کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ ان مسلمانوں کی بات کر رہا ہوں جو تبلیغ کے ذریعہ اصلاح یافتہ ہو چکے ہیں، اور ایسے لوگوں کی تعداد خود آپ کے بیان کے مطابق لاکھوں ہے۔

پھر میں نے کہا کہ غیر مسلموں میں دعوت کا کام کرنے کی یہ کوئی شرعی شرط نہیں ہے کہ سارے مسلمان اصلاح یافتہ ہو چکے ہوں، اس کے بعد ان کے اندر کام کا آغاز کیا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل بہت زیادہ بگڑ چکے تھے۔ اس کے باوجود حضرت موسیٰ نے مصر کے قبطیوں پر دعوت کا عمل جاری کیا۔ نبوت ملنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اذهب الى فرعون انه طغىٰ، تو حضرت موسیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ پہلے بنی اسرائیل کی اصلاح ہو جائے، اس کے بعد فرعون پر دعوتی کام کیا جائے گا۔ بلکہ نبوت ملنے کے بعد فوراً فرعون کے دربار میں پہنچے، اور اس پر دعوتی عمل کا آغاز کر دیا۔

۲۷ جنوری ۱۹۸۹

پاکستان کے قیام (۱۹۴۷) کے بعد نواب زادہ لیاقت علی خاں (۱۹۵۱ - ۱۸۹۵) اس کے پہلے وزیر اعظم بنائے گئے۔ مگر پاکستان کے قیام کے فوراً بعد وہاں قانون اسلامی کے نفاذ کی مہم چل پڑی۔ جماعت اسلامی کے رہنما اور دوسرے اسلامی لیڈروں نے ان کے خلاف تقریریں شروع کیں۔ یہاں تک کہ ایک جنونی آدمی نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ کو انھیں راولپنڈی میں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

جس زمانہ میں لیاقت علی خاں کے خلاف اسلامی مطالبہ کی مہم جاری تھی، دار العلوم دیوبند کے سابق مہتمم مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی (۱۹۸۳-۱۸۹۵) پاکستان گئے۔ وہاں ایک "اسلام پسند" صاحب ان سے ملے۔ ان کی داڑھی مونڈی ہوئی تھی۔ انھوں نے قاری طیب

صاحب سے کہا کہ آپ پاکستان میں قانون اسلامی کے نفاذ کی مہم کی کھل کر تائید کیوں نہیں کرتے۔ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے۔ اس لئے حکمرانوں کا فرض ہے کہ وہ یہاں فوراً اسلامی قانون کو نافذ کریں۔ قاری طیب صاحب خاموشی سے ان کی گفتگو کو سنتے رہے۔ اس کے بعد مذکورہ اسلام پسند کی داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: آپ اپنے چہرہ کی اس چند انچ جگہ پر تو اسلام کو نافذ نہ کر سکے، پھر سارے ملک میں آپ اسلام کو کس طرح نافذ کریں گے۔

موجودہ زمانہ میں اسلامی حکومت کے علمبرداروں پر یہ تبصرہ نہایت صادق آتا ہے۔ ان کی زندگیاں حقیقی اسلام سے خالی ہیں اور وہ ساری دنیا میں اسلامی اقتدار قائم کرنے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ سطحی اسلام پسندی کا یہ منظر اس سے پہلے آسمان نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔

۲۸ جنوری ۱۹۸۹

۲۷ جنوری کو جمعہ تھا۔ ایک امریکی پروفیسر رالف سسن (Dr Ralph R. Sisson) ہمارے مرکز میں آئے۔ وہ اسلامی عبادت کے بارہ میں جاننا چاہتے تھے۔ میں نے نماز کی کچھ تفصیلات ان کے سامنے رکھیں۔ انھوں نے بہت دلچسپی لی۔ پھر میں نے کہا کہ اگر آپ پسند کریں تو ہمارے ساتھ مسجد میں چلیں اور ہمارے ساتھ صف میں شریک ہو کر نماز پڑھیں تاکہ آپ کو اس کا پورا اندازہ ہو جائے۔

وہ فوراً راضی ہو گئے۔ چنانچہ ایک بجے میں ان کو لے کر کالی مسجد (نظام الدین) گیا۔ وہاں انھوں نے ہمارے ساتھ کھڑے ہو کر دو رکعت جمعہ کی نماز پڑھی۔ واپسی پر میں نے ان سے تاثر پوچھا تو انھوں نے بہت اچھے تاثر کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ میرے لئے نماز کو دیکھنے اور اس کے عمل میں شریک ہونے کا پہلا موقع تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کہ میں نے اپنا سر اور پیشانی اس طرح سجدہ میں رکھا۔ اس سے میری روح میں ایک عجیب اہتزاز پیدا ہوا۔

مغرب کے لوگ ہر معاملہ میں بے حد سنجیدہ ہوتے ہیں۔ اگر انھیں تعمیری انداز میں اسلام سے متعارف کرایا جائے تو وہ بہت جلد اسلام سے قریب آ جائیں گے۔ مذکورہ امریکی پروفیسر کو مرکز کی کچھ انگریزی مطبوعات دی گئیں۔

۲۹ جنوری ۱۹۸۹

ٹائمس آف انڈیا میں ہر روز اڈیٹوریل کے صفحہ پر ایک مقولہ درج کیا جاتا ہے۔ اس کے شمارہ ۲۸ جنوری ۱۹۸۹ میں جو مقولہ نقل کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ کیوں اکثر لوگ مواقع کو پہچاننے میں ناکام رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مواقع ہمیشہ سخت محنت کے بھیس میں آتے ہیں:

The reason many people fail to recognise opportunity is because it comes disguised as hard work.

یہ نہایت صحیح بات ہے جو اس چھوٹے سے فقرہ میں کہی گئی ہے۔ مواقع سے فائدہ اٹھانا حقیقی عمل چاہتا ہے، اور حقیقی عمل ہمیشہ دیر طلب اور محنت طلب ہوتا ہے۔ لوگ مواقع کو جاننے کے باوجود اس سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے، کیوں کہ وہ لمبی مدت تک سخت محنت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

۳۰ جنوری ۱۹۸۹

فرانسیسی مفکر ارنسٹ رینان (Ernest Renan) ۱۸۲۳ میں پیدا ہوا، اور ۱۸۹۲ میں پیرس میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ دور جدید کے مشہور فلسفیوں میں سے ہے۔ عرصہ ہوا میں نے کہیں پڑھا یا سنا تھا کہ جمال الدین افغانی نے، جب کہ وہ پیرس میں تھے، ارنسٹ رینان کو اسلام کا پیغام دیا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ سید جمال الدین نے کم از کم ایک صحیح کام کیا۔ مگر حال ہی میں میری یہ خوش فہمی ختم ہوگئی۔

جنیوا (سوئزرلینڈ) سے ایک مجلہ انگریزی اور عربی میں نکلتا ہے۔ اس کا نام العروۃ الوثقیٰ ہے۔ یہ سید جمال الدین افغانی کے عربی جریدہ کا احیاء ہے جو اسی نام سے پیرس سے جاری ہوا تھا۔ اس کے شمارہ نمبر ۵۰ (۱۹۸۸) میں چھ صفحہ کا ایک مضمون ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۸۸۳ میں ارنسٹ رینان کا ایک بیان پیرس کے ایک فرانسیسی جریدہ (Journal des Debats) کے شمارہ ۱۸ مئی ۱۸۸۳ میں شائع ہوا تھا۔ سید جمال الدین افغانی نے اس کا عربی ترجمہ پڑھا اور اس سے متاثر ہو کر ایک مضمون مذکورہ فرانسیسی جریدہ

کے نام روانہ کیا۔ سید جمال الدین افغانی کے اس مضمون یا جواب کا مکمل انگریزی ترجمہ العروۃ الوثقیٰ کے مذکورہ نمبر میں شائع ہوا ہے۔ میں نے اس کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ جمال الدین افغانی کا مذکورہ جواب حقیقت میں اسلامی دعوت نہ تھا بلکہ وہ اسی قسم کی ایک دفاعی تحریر تھی جیسا کہ ان کی دوسری تحریریں ہیں۔

اس جواب میں انھوں نے لکھا تھا کہ مسٹر رینان کی بحث دو بنیادی موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔ ممتاز فلسفی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلم مذہب اپنی حقیقت کے اعتبار سے سائنسی ترقی کا مخالف ہے۔ اور یہ کہ عرب لوگ اپنی طبیعت کے اعتبار سے مابعد الطبیعیاتی علوم سے دلچسپی رکھتے تھے اور نہ فلسفہ سے:

> Mr Renan's talk covered two principle points. The eminent philosopher applied himself to proving that the Muslim religion was by its very essence opposed to the development of science, and that the Arab people, by their nature, do not like either metaphysical sciences or philosophy. (p. 28)

جمال الدین افغانی نے اپنے جوابی مضمون میں انھیں دونوں "الزامات" کا دفاع کیا ہے۔ اس کا حقیقی اسلامی دعوت سے کوئی تعلق نہیں۔

۳۱ جنوری ۱۹۸۹

دکتور عبد الحلیم عُویس ریاض کی جامعۃ الامام میں علوم اجتماعیہ کے پروفیسر ہیں۔ وہ میری تحریروں کے بہت قدر داں ہیں اور سعودی عرب کے اونچے حلقوں سے قریبی روابط رکھتے ہیں۔ اپریل ۱۹۸۶ کے دوسرے ہفتے میں وہ دہلی آئے اور ہمارے مرکز میں ٹھہرے۔ ان کے اس قیام دہلی کا ایک واقعہ الرسالہ اپریل ۱۹۸۷ (صفحہ ۸) میں شائع ہوا ہے۔

دکتور عبد الحلیم عویس کی اس آمد کا مقصد یہ تھا کہ الرسالہ کے عربی اڈیشن کے معاملات طے کریں۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں کو انھوں نے راضی کر لیا کہ وہ ترجمہ اور ایڈٹ کرنے کا کام کریں گے۔ انھوں نے پیش کش کی کہ اس کا سارا خرچہ مکمل طور پر سعودی عرب سے پورا کیا جائے گا اور تمام عالم عرب میں اس کو پھیلایا جائے گا۔

تاہم میں اس پیشکش کو منظور نہ کرسکا۔ کیوں کہ اس میں میرے لئے ذاتی شہرت کا موقع تو بہت تھا۔ مگر میرا اصل مقصد اس سے حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ اور اس کی وجہ ان کی یہ شرط تھی کہ اس عربی الرسالہ میں ۵۰ فیصد مضامین میرے ہوں گے اور ۵۰ فیصد مضامین دوسروں کے ہونگے۔ یہ میرے نزدیک رکون (ہود ۱۱۳) کے ہم معنی تھا، اس لئے میں اس کو قبول نہ کرسکا۔

۵۰ فیصد کی اس تقسیم کے بعد الرسالہ کا نقشہ کیا ہوتا، اس کی ایک مثال مسلمانوں کے دوسرے پرچے ہیں جن میں ہمیشہ دعوت کے ساتھ غیر دعوت بھی موجود رہتی ہے۔ مثلاً ریاض کے ہفت روزہ الدعوۃ (جمادی الآخرۃ ۱۴۰۹ھ، ۱۶ جنوری ۱۹۸۹) میں دکتور عبدالحلیم عویس کا ایک مضمون ہے جس میں دعوت کو المفتاح العظیم بتایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ مسلمان داعی بن کر دوسری قوموں کے اوپر فتح حاصل کریں (صفحہ ۵۰) دوسری طرف اسی پرچہ میں ۶ صفحات کا ایک اور مضمون ہے جس کا عنوان ہے: الاقلیات المسلمۃ تواجہ خطر الذوبان (مسلم اقلیتوں کو پگھلنے کے خطرہ کا سامنا)

یہ خطرہ کس کی طرف سے ہے۔ یہ انھیں غیر مسلم قوموں کی طرف سے ہے جن کے اوپر دعوت کا کام کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ لوگ جن کو مدعو کہا جاتا ہے۔ گویا ایک ہی پرچہ میں ایک طرف مسلمانوں کو داعی بننے پر ابھارا جا رہا ہے اور اسی پرچہ میں دوسری طرف کہا جا رہا ہے کہ تمہارا مدعو خطرہ ہے۔ یہ بات داعیانہ نفسیات کے سراسر خلاف ہے۔ جو لوگ اس طرح کی نفسیات میں مبتلا ہوں، وہ کبھی دعوت کا کام نہیں کرسکتے۔

یکم فروری ۱۹۸۹

ہندستان کی آزادی (۱۹۴۷) کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کو ملک کا وزیر اعظم مقرر کیا گیا تو انھوں نے "پانچ سالہ منصوبوں" کے تحت ملک کی ترقی کا پروگرام بنایا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ہماری اقتصادی پالیسی کا نشانہ یہ ہے کہ ہر ایک کو خوش حالی نصیب ہو۔

Our economic policy aims at plenty for all.

نہرو کے بعد ان کی صاحبزادی اندرا گاندھی وزیر اعظم کی کرسی پر بیٹھیں تو انھوں نے بھی "غریبی ہٹاؤ" کے نعرہ کے تحت اس منصوبہ کو مزید عزم کے ساتھ آگے بڑھانے کا اظہار کیا۔ جلد ہی

آزادی کے ۴۵ سال پورے ہوجائیں گے اور ملک کی اقتصادی ابتری ختم نہ کی جاسکی۔

قومی آواز (۳۱ جنوری ۱۹۸۹) میں صفحہ ۷ پر ایک خبر کی سرخی یہ ہے: ' بیسویں صدی کے اختتام تک دنیا بھر کے ۵۰ فیصد غریب ہندستان میں ہوں گے ' ترپوندرم کے ایک سرکاری ادارہ کے تحت پروفیسر جی مورے موہن لال نے طویل ریسرچ کے بعد ایک کتاب (غربت میں کمی، ہندستان کا تجربہ) شائع کی ہے۔ اس کتاب میں مثالوں اور اعداد و شمار کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ ملک میں اقتصادی عمل کی جو رفتار ہے، اس کے مطابق موجودہ صدی کے ختم ہونے تک دنیا بھر کے افلاس زدہ عوام میں سے ۵۰ فیصد ہندستان میں ہوں گے۔

کتاب میں بتایا گیا ہے کہ چھٹے پانچ سالہ پلان میں ۲۵۰۷ کروڑ روپے کی رقم غریبی ختم کرنے کے پروگراموں پر خرچ کرنے کے لئے رکھی گئی تھی۔ مگر اس رقم میں چھ روپیہ میں سے پانچ روپیہ راستہ ہی میں دوسرے لوگوں نے خورد برد کرلیا، وہ غریبوں تک نہیں پہنچا۔ یہی آزادی کے بعد سے اب تک ملک کی تمام اقتصادی سرگرمیوں کا حال رہا ہے۔

خوبصورت الفاظ بولنا انتہائی آسان ہے، مگر خوبصورت الفاظ کو خوبصورت واقعہ بنانا انتہائی مشکل۔

۲ فروری ۱۹۸۹

جیمز فری مین کلارک (James Freeman Clarke) نے کہا کہ ایک سیاست داں اگلے الکشن کے بارہ میں سوچتا ہے، ایک مدبر اگلی نسل کے بارہ میں سوچتا ہے:

A politician thinks of the next election, a statesman of the next generation.

یہ مقولہ سچے لیڈر اور جھوٹے لیڈر کا فرق بہت اچھی طرح واضح کر رہا ہے۔ جھوٹے لیڈر کے سامنے اپنی ذاتی لیڈری ہوتی ہے، اس لئے وہ قوم کو فوری نعروں میں الجھا دیتا ہے۔ تاکہ فوری تائید سے ذاتی کامیابی حاصل کرسکے۔ مگر جو سچا لیڈر ہے، اس کو قوم کے مستقل مفاد کا درد ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ دوررس پروگرام کی بات سوچتا ہے، خواہ اس میں اسے ذاتی مقبولیت حاصل نہ ہوسکے۔

۳ فروری ۱۹۸۹

لینکلاٹ اینڈریوز (Lancelot Andrews) کا قول ہے کہ چرچ جتنا زیادہ قریب ہو اتنا ہی زیادہ آدمی خدا سے دور ہوگا:

The nearer the church, the farther from God.

دوسرے مذاہب میں جو بگاڑ اور تحریف ہوئی، اس کے نتیجہ میں ان کے عبادت خانوں کا حلیہ اتنا بگڑ گیا کہ وہ انسانی فطرت کے لئے خدا سے دوری کا سبب بن گئے۔ تاہم موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال بھی اس معاملہ میں بہت زیادہ مختلف نہیں۔ دوسرے مذاہب میں تحریف کے نتیجہ میں ان کا حلیہ بگڑا تھا، موجودہ مسلمانوں نے اپنی اخلاقی گراوٹ کے نتیجہ میں اپنے مذہبی اداروں اور اپنے عبادت خانوں کا حلیہ بگاڑ رکھا ہے۔ حتی کہ مسلمانوں کے موجودہ مذہبی ادارے خدا کے بندوں کو دین سے بیزار کرنے کا سبب بن رہے ہیں، بجائے اس کے کہ وہ ان کو دین سے قریب کرنے کا ذریعہ ثابت ہوں۔

۴ فروری ۱۹۸۹

دکتور عبداللہ عزام کی ایک کتاب ہے جس کا نام المنارۃ المفقودۃ ہے۔ یہ کتاب مصطفیٰ کمال اتاترک (۱۸۸۰ - ۱۹۳۸) کے خلاف ہے۔ اس میں ترک لیڈر کے بارہ میں انور پاشا کا ایک قول ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے جو انھوں نے انجمن اتحاد و ترقی کے لوگوں سے کہا تھا: لیکن فی علمکم أنّ مصطفیٰ کمال اذا ترقی الیٰ رتبتہ الباشا فانہ یرغب ان یکون سلطاناً، و اذا اصبح سلطاناً فانہ یرغب ان یکون الٰھاً (صفحہ ۸)

(تم کو جان لینا چاہئے کہ مصطفیٰ کمال اگر پاشا کے مرتبہ تک پہنچ جائیں تو وہ سلطان بننا چاہیں گے اور اگر وہ سلطان ہو جائیں تو وہ چاہیں گے کہ وہ خدا بن جائیں)

مصطفیٰ کمال کی نفسیات کے بارہ میں ان کے ساتھی کے اس تبصرہ پر مجھے کوئی اعتراض نہیں تاہم میں اس میں اضافہ کرنا چاہوں گا کہ، کم از کم موجودہ زمانہ میں، تمام مسلم لیڈروں کی نفسیات یہی ہے۔ مسلمانوں کے رہنما، خواہ وہ بے ریش ہوں یا باریش، سب کے اندر یہی نفسیات پائی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں صرف مصطفیٰ کمال کو مورد الزام ٹھہرانا درست نہیں۔ مصطفیٰ کمال اور

دوسروں میں صرف یہ فرق ہے کہ کسی کی اس نفسیات کا اظہار ایک دائرہ میں ہو رہا ہے اور کسی کا دوسرے دائرہ میں۔

۵ فروری ۱۹۸۹

قومی آواز (نئی دہلی) سرکاری نقطۂ نظر کا ترجمان سمجھا جاتا ہے۔ اس کے شمارہ ۳۱ جنوری ۱۹۸۹) کے صفحہ اول پر یہ سرخی تھی: ہند بڑے پیمانہ پر اسلحہ برآمد کرے گا۔" اس سرخی کے تحت ہندستانی وزیر دفاع مسٹر کے سی پنت کا یہ اعلان' نقل کیا گیا تھا کہ ماضی میں ہندستان چند پڑوسی ملکوں کو کچھ چھوٹے ہتھیار برآمد کرتا رہا ہے۔ اب ملک کی اسلحہ ساز فیکٹریاں اس صلاحیت کی حامل ہو چکی ہیں کہ وہ زیادہ بڑے پیمانہ پر بڑے ہتھیار باہر کے ملکوں کے ہاتھ فروخت کر سکیں۔ اس مقصد کے لئے ہتھیار کی عالمی منڈیوں میں ہم زبردست کوشش کر رہے ہیں۔ ہتھیاروں کی اس تجارت کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ ہندستان اس کے ذریعہ سے بڑی مقدار میں زرمبادلہ حاصل کر سکتا ہے۔

اس خبر کے صرف چند دن بعد قومی آواز (۴ فروری ۱۹۸۹) میں صفحہ اول پر یہ سرخی درج ہے: "جنگوں اور ہتھیاروں سے پاک نئے عالمی نظام کا قیام"۔ اس سرخی کے تحت بتایا گیا ہے کہ ہندستان کے وزیر اعظم راجیو گاندھی اور فرانس کے صدر مسٹر متراں (Francois Mitterrand) نے بمبئی میں ۳ فروری کو ایک اجتماع میں مشترکہ طور پر اس بات کا عہد کیا کہ وہ ثقافت اور جدید ٹکنالوجی کے امتزاج سے ایک ایسے نئے عالمی نظام کی کوشش کریں گے جو جنگوں اور ہتھیاروں سے پاک ہو اور جس میں انسانیت ایک خاندان کی طرح رہ سکے"۔

دونوں باتوں میں واضح تضاد موجود ہے۔ یہی موجودہ زمانہ کے تمام لیڈروں (خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم) کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا سارا عمل مفاد کے تحت ہے نہ کہ اصول کے تحت۔ ایک جگہ اگر مفاد ہتھیار بیچنے میں ہے تو وہاں ہتھیار بیچ رہے ہیں۔ دوسری جگہ ہتھیاروں کے خلاف تقریر کرنا مفید ہے تو وہاں "ہتھیاروں سے پاک نظام" پر تقریر کر رہے ہیں۔

بد قسمتی سے یہی دوعملی مذہبی طبقہ میں بھی عام ہو گئی ہے۔

۶ فروری ۱۹۸۹

الرسالہ (اردو ، انگریزی) کے شمارہ فروری ۱۹۸۹ میں اعلان کیا گیا تھا کہ مالی مشکلات کی وجہ سے انگریزی الرسالہ کو اپریل ۱۹۸۹ سے بند کیا جا رہا ہے۔ اس پر خلاف توقع لوگوں کی طرف سے بہت ہمت افزا پیغامات ملے۔ سب سے پہلے بمبئی کی ایک خاتون (مسز روشن ٹانک) نے اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے پانچ ہزار روپیہ روانہ کیا ، وغیرہ۔

ہندو بھائیوں کے بھی متعدد پیغامات ملے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا ٹیلی فون مسٹر ارن شرما کی طرف سے موصول ہوا۔ وہ انگریزی کے اعلیٰ درجہ کے جرنلسٹ ہیں۔ انھوں نے اپنی طرف سے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔ آج وہ خود ہمارے دفتر میں آئے اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے یہ پیشکش کی کہ میں بلا معاوضہ پورے رسالہ کے ترجمہ کا کام کروں گا۔ انھوں نے کہا کہ اگر اس سے کام نہ چلے تو ہم مزید مالی تعاون کے حصول کی بھی کوشش کریں گے۔

یہ واقعات بہت حوصلہ افزا ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انگریزی الرسالہ کا بند ہونا منظور نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں ڈالا جا رہا ہے کہ وہ تعاون کرکے اس کے جاری رکھنے کا انتظام کریں۔

۷ فروری ۱۹۸۹

شفیع الدین صاحب (ایم اے) ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے الرسالہ مشن کے سلسلہ میں بعض شبہات کا اظہار کیا۔ اس کا انھیں جواب دیا گیا۔ وہ مطمئن ہو گئے۔ آخر میں میں نے انھیں "میوات کا سفر" بطور ہدیہ پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ اس پر کچھ نصیحت کے الفاظ لکھ دیجئے۔ میں نے حسب ذیل الفاظ لکھ دئے :

"دلیل کے آگے جھکنا خدا کے آگے جھکنا ہے۔ وہی شخص خدا کو پاتا ہے جو دلیل کے آگے جھکنے پر راضی ہو ، خواہ وہ اس کی خواہش کے خلاف ہو ، خواہ اس کو ماننے میں اس کی انا پر بلڈوزر چل جائے۔"

پھر میں نے کہا کہ مجھ میں اور دوسرے لوگوں میں یہ فرق ہے کہ وہ لوگ دوسروں کے اوپر

بلڈوزر چلانے کا نعرہ لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (Bulldoze them all) ۔ اس کے برعکس میرا پیغام یہ ہے کہ آدمی خود اپنے آپ پر بلڈوزر چلائے۔ دوسروں کا نعرہ ’احتساب کائنات‘ ہے اور میرا پیغام ’احتساب خویش‘۔

۸ فروری ۱۹۸۹

۳۰ مارچ ۱۹۸۷ کو ہندستان کے مسلم لیڈروں نے بابری مسجد اجودھیا کے نام پر ریلی نکالی۔ مسلمان بڑی تعداد میں آکر نئی دہلی میں جمع ہو گئے۔ اس وقت مسلمانوں نے ریلی کی تعداد کو نہایت پرفخر انداز میں پیش کیا تھا: ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، ہندستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا اجتماع "۔

اس کے بعد ہندو پریس نے مسلسل ماحول بنانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ فروری ۱۹۸۹ کا کمبھ میلا (الٰہ آباد) آگیا۔ ہندوؤں کا قومی جوش اس موقع پر ظاہر ہوا۔ اور ملک بھر سے ہندوؤں کی اتنی بڑی تعداد الٰہ آباد (پریاگ) میں گنگا اشنان کے لئے جمع ہوئی کہ مسلمانوں کا ہر اجتماع اس کے مقابلہ میں چھوٹا ہو کر رہ گیا۔

قومی آواز (۷ فروری ۱۹۸۹) نے اس میلے کی سرخی ان الفاظ میں لگائی ہے: "کمبھ میلہ میں ڈیڑھ کروڑ عقیدت مندوں کا اشنان، سوم وتی اماوس کے مقدس موقع پر بے نظیر اجتماع" ٹائمس آف انڈیا (۷ فروری ۱۹۸۹) کی سرخی کے الفاظ یہ تھے:

Biggest human gathering on earth.

اصل یہ ہے کہ مقداری نوعیت کی چیزوں میں تقابل کرنا ہی سرے سے غلط ہے۔ تقابل درحقیقت معنوی چیزوں میں ہونا چاہئے نہ کہ مقداری چیزوں میں۔

۹ فروری ۱۹۸۹

کچھ لوگ ملاقات کے لئے آئے۔ ان سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا ـــــ جو چپ رہنا جانے، وہی بولنا جانتا ہے۔ جو پیچھے ہٹنا جانے، وہی آگے بڑھنا جانتا ہے۔

پھر میں نے کہا کہ یہ کوئی شاعری اور لفاظی نہیں۔ یہ زندگی کی سنگین حقیقت ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ بولنا اور عمل کرنا دونوں شعوری افعال ہیں۔ اگر آپ محض جذبات کے تحت بولیں تو

آپ بولنے کے وقت بھی بولیں گے اور چپ رہنے کے وقت بھی بولیں گے۔ اس کے برعکس اگر آپ شعور کے تحت کام کریں اور سوچ کر زندگی گزاریں تو آپ جانیں گے کہ کب بولنا ہے اور کب نہیں بولنا ہے۔ کب اقدام کرنا ہے اور کب اقدام نہیں کرنا ہے۔

۱۰ فروری ۱۹۸۹

سید عبدالحفیظ صاحب (۳۲ سال) محبوب نگر (آندھرا پردیش) کے رہنے والے ہیں۔ وہ سول انجنیئر ہیں اور ۶ سال سے سعودی عرب میں ملازم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میرے ادارہ میں میرے جیسی ڈگری کا ایک امریکن چار گنا تنخواہ پاتا ہے۔ میری تنخواہ چار ہزار ریال ماہانہ ہے تو اس کی تنخواہ ۱۶ ہزار ریال ماہانہ۔ اور ہمارے ادارہ میں جو امریکن منیجر ہے، اس کی تنخواہ ۴۲ ہزار ریال ماہانہ۔ مزید یہ کہ امریکنوں کو مختلف قسم کی مزید سہولتیں ملتی ہیں جو ہندستانیوں اور پاکستانیوں کو نہیں ملتیں۔

میں نے کہا کہ مجھے سعودی عرب کے اس امتیاز کے بارہ میں کچھ نہیں کہنا ہے، کیوں کہ وہ ان کے اپنے انتظام کی بات ہے۔ البتہ میں کہوں گا کہ ہندستان کے لوگ عرب ملکوں میں جاکر وہاں اس قسم کے امتیاز کو برداشت کرکے رہتے ہیں۔ اور ہندستان میں وہ اس سے کم تر درجہ کی چیزوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہندستانی مسلمان جس طرح عرب ملکوں میں جاکر وہاں کے نظام سے موافقت کر رہے ہیں، اسی طرح اگر وہ ہندستان کے نظام سے موافقت کرکے رہیں تو یہاں بھی ان کے لئے ترقی کے وہی مواقع ہیں جو عرب ملکوں میں ان کے لئے پائے جاتے ہیں۔

۱۱ فروری ۱۹۸۹

سلطان احمد صاحب (پیدائش ۱۹۵۴) مظفر پور بہار کے رہنے والے ہیں۔ وہ وہاں تجارت کرتے ہیں۔ وہ ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ چھ ماہ پہلے مظفر پور کے اسٹوڈینٹس اسلامک آرگنائزیشن (ایس آئی او) کے نوجوانوں کو جوش آیا۔ انھوں نے شہر کی بعض دیواروں پر یہ نعرہ لکھ دیا: "مورتی پوجا پاپ ہے"۔ ہندوؤں پر بھی اس کا ردعمل ہوا۔ انھوں نے سارے شہر کی دیواروں پر کئی گنا زیادہ تعداد میں یہ الفاظ لکھ دئے:

" قبر کی پوجا ہسا پاپ ہے "

یہی نہیں۔ ہندوؤں نے اور بھی بہت سے اشتعال انگیز جملوں سے شہر کی دیواریں کالی کر دیں۔ مثلاً بھارت میں رہنا ہو گا تو بندے ماترم کہنا ہو گا۔

میں نے اس واقعہ کو سنا تو مجھے بے حد دکھ ہوا۔ میں نے کہا کہ دعوت کا کلمہ دلوں پر لکھا جاتا ہے نہ کہ دیواروں پر۔ دوسروں کے دلوں پر کلمۂ حق لکھنے کے لئے پہلے خود اپنے دل پر کلمۂ حق لکھنا پڑتا ہے۔ جو لوگ اپنے دلوں پر کلمۂ حق نہ لکھ سکیں وہی اس کو دیواروں پر لکھتے ہیں۔ اور جو لوگ دیواروں پر کلمۂ حق لکھیں وہ صرف فساد برپا کرنے والے ہیں۔ ان کو دعوت دینے والا نہیں کہا جا سکتا۔

۱۲ فروری ۱۹۸۹

حدیث میں آیا ہے کہ دو باتیں ایسی ہیں جن کے بارہ میں تمام اگلے اور پچھلے لوگوں سے پوچھا جائے گا۔ ایک یہ کہ تم کس کی عبادت کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا (کلمتان یُسأل عنھا الاولون والآخرون ـــــ ماذ اکنتم تعبدون، وماذا اجبتم المرسلین)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبر آخر الزماں کے بعد پیدا ہونے والے لوگوں کا امتحان ماذا اجبتم المرسلین کے بارہ میں کیسا ہے۔ آپ کے بعد کوئی رسول آنے والا نہیں۔ پھر کیا بعد کے لوگوں سے امتحان ساقط کر دیا گیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ امتحان جاری ہے۔ پہلے یہ امتحان رسول کی سطح پر لیا جاتا تھا، اب یہ امتحان " نائب رسول " کی سطح پر لیا جائے گا۔ مگر نائب رسول سے مراد رسمی قسم کے علماء نہیں ہیں۔ اس سے مراد وہ افراد ہیں جو حقیقی معنوں میں رسول کی دعوت لے کر اٹھیں۔ جو واقعی طور پر اپنے زمانہ میں رسول کی نمائندگی کریں۔

۱۳ فروری ۱۹۸۹

حسن الہضیبی مرحوم الاخوان المسلمون کے لیڈر تھے۔ ان کے لڑکے مامون الہضیبی (پیدائش ۱۹۲۱) آجکل اخوان کے مستشار ہیں۔ مامون الہضیبی کا ایک انٹرویو قاہرہ کے ماہنامہ المختار

الاسلامی (جمادی الثانیہ ۱۴۰۹ھ، جنوری ۱۹۸۹) میں شائع ہوا ہے۔

انٹرویور نے موصوف سے ایک سوال یہ کیا کہ حسن البنا، حسن الہضیبی اور عمر التلمسانی، ان تینوں میں سے کس کو آپ اپنے لئے مثالی نمونہ سمجھتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ امام حسن البنا ایک بے نظیر قائد تھے۔ جن کے ذریعہ اللہ امت کو اور دین کو ہر دور میں زندہ کرتا ہے۔ اور وہ حقیقی معنوں میں امت کے معمار ہیں:

(الامام الشہید حسن البنا ھو الامام الفذ الذی یحیی بہ اللہ الامة والدین کل قرن من الزمان وھو البنا حقاً، صفحہ ۱۴)

حسن البنا نے ۱۹۴۸ میں فلسطین میں جہاد کیا۔ مگر یہودی اس کے بعد فلسطین میں اور بھی زیادہ مستحکم ہو گئے۔ ۱۹۴۲ میں انھوں نے مصر کے الکشن میں حصہ لیا، مگر وہ ناکام رہے۔ جولائی ۱۹۵۲ میں حسن البنا کی جماعت الاخوان المسلمون فوجی افسروں کا ساتھ دے کر شاہ فاروق کی حکومت ختم کرنے میں شریک تھی۔ مگر اس کے بعد عملاً مصر میں فوجی افسروں کا اقتدار قائم ہو گیا جو تاحال باقی ہے۔ اخوانی حضرات کا موجودہ انجام یہ ہے کہ مصر میں انھوں نے جس "ملوکیت" کو برداشت نہیں کیا، اسی قسم کی ملوکیت کے زیر سایہ آج وہ سعودی عرب میں پر امن زندگی گزار رہے ہیں۔

ان سب کے باوجود ان کے معتقدین کی نظر میں حسن البنا معمار ملت ہیں۔ انھوں نے ملت اسلامیہ کو نئی زندگی عطا کی ہے۔ خوش عقیدگی بھی کیسی عجیب چیز ہے، وہ ایسی دنیا میں اپنا خیالی قلعہ کھڑا سکتی ہے جہاں واقعہ کے اعتبار سے ایک اینٹ بھی موجود نہ ہو۔

۱۴ فروری ۱۹۸۹

ابوذر قاسمی جونپوری نے دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد وہ جامعہ اسلامیہ (مدینہ) میں داخل ہوئے اور وہاں کا کورس مکمل کیا۔ وہاں انھوں نے عربی ادب کے امتحان میں پوری جامعہ میں ٹاپ کیا۔ اس کے بعد انھیں ۲ لاکھ ریال بطور انعام دئے گئے۔ آجکل وہ جامعہ دار السلام عمر آباد میں مبعوث کے طور پر ہیں اور وہاں عربی ادب پڑھا رہے ہیں۔ (ریاض الجنۃ، جونپور، جنوری ۱۹۸۹، صفحہ ۱۰)

عربی زبان کے ساتھ اس طرح کا معاملہ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مزید اہتمام ہے تاکہ یہ زبان زندہ رہے، کیوں کہ قرآن کے محفوظ رہنے کے لئے اس کی زبان کا محفوظ رہنا بھی ضروری ہے۔ شاید اسی مصلحت کی خاطر اللہ تعالیٰ نے عربی کے ساتھ مادی فائدہ شامل کر دیا ہے۔

۱۵ فروری ۱۹۸۹

مولانا محمود علی قاسمی (عمر ۳۸ سال) ملاقات کے لئے آئے۔ وہ بلال پور (ضلع میدک) کے رہنے والے ہیں۔ اور کوہیر میں پھل کی دکان کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۸۷ کے رمضان میں بلال پور کے ہندوؤں کو وشو ہندو پریشد نے اکسایا۔ بلال پور کی آبادی تقریباً ۲۰۰۰ ہے۔ اس میں ۱۵۰۰ ہندو ہیں اور ۵۰۰ مسلمان۔

پہلے انھوں نے مسلمانوں کے قبرستان میں زبردستی مندر بنانے کی کوشش کی۔ اس میں وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے عید سے پہلے مسلمانوں کا معاشی بائیکاٹ کیا۔ وہ بھی ناکام رہا۔ آخر انھوں نے مسلمانوں کی ایک زمین کو مندر کی زمین بتا کر اس پر قبضہ کرنا چاہا۔ یہاں ایک کنواں تھا۔ انھوں نے اس کو پتھروں سے بھرنا شروع کیا اور کہا کہ یہاں ہم مندر بنائیں گے۔

ان کارروائیوں کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان مشتعل ہو کر کوئی جارحانہ کارروائی کریں اور پھر وشو ہندو پریشد کو فساد کرنے کا بہانہ مل جائے۔ مولانا محمود علی قاسمی نے بتایا کہ پہلے میں بہت جذباتی تھا۔ مگر اب الرسالہ پڑھنے سے میرا مزاج بدل گیا ہے۔ چنانچہ میں نے مسلمانوں کے جوش کو ٹھنڈا کیا اور فوراً پوسٹ آفس جاکر کوہیر کے پولیس اسٹیشن کو ٹیلی گرام بھیج دیا۔ اس وقت کوہیر میں زیادہ سپاہی نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے ہیڈ کوارٹر سے ربط قائم کیا۔ اور مزید پولیس گاڑی منگوا کر ایک گھنٹہ میں بلال پور پہنچ گئے۔

اس وقت ہندو لوگ ابھی مسلمان کی زمین میں موجود تھے اور کنویں کو آخری طور پر بھر رہے تھے۔ پولیس نے ان کو Red handed پکڑ لیا۔ ان کے چودہ آدمیوں پر مداخلت بیجا اور ایذا رسانی وغیرہ کے مقدمات قائم کر دئے۔ حتی کہ ان کی ضمانت بھی نہ ہو سکی۔ آخر میں مولانا محمود علی قاسمی نے عدالت میں جاکر ان لوگوں کی معافی کا بیان دے دیا، ورنہ ان کی سزا یقینی تھی۔ اس واقعہ کے بعد بلال پور کی فضا بالکل بدل گئی۔

۱۶ فروری ۱۹۸۹

ایک صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ وہ مسقط (عرب) میں رہتے ہیں۔ انھوں نے ہندستان میں مسلمانوں کی مظلومیت کا ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ یہ مظلومیت کا معاملہ نہیں، یہ نادانی کا معاملہ ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ مسقط میں ایسا کر سکتے ہیں کہ سلطان مسقط کے خلاف تقریر کریں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ اسی کا نام ایڈجسٹمنٹ ہے آپ مسقط میں کامیاب ہیں۔ کیوں کہ آپ وہاں کے ملکی حالات سے مطابقت کر کے رہ رہے ہیں۔ ہندستان کے مسلمان یہاں کے حالات سے مطابقت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے وہ ظلم کا شکار ہوتے ہیں۔

میں نے کہا کہ ہندستان کے ہندو جلوس نکالتے ہیں۔ اس قسم کے جلوسوں کا رواج عرب میں یا مغربی ملکوں میں نہیں ہے۔ ہندوؤں کا جلوس جب مسجد کے سامنے سے گزرتا ہے تو مسلمان مشتعل ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اپنا جلوس دوسرے روٹ سے لے جاؤ۔ یہ حالات سے مطابقت نہ کرنا ہے۔ جس طرح آپ مسقط میں وہاں کے بادشاہ کے خلاف نہیں بولتے۔ اسی طرح ہندستان میں ہندو جلوس کے خلاف نہ بولئے۔ اس کے بعد یہاں آپ کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

۱۷ فروری ۱۹۸۹

جم کاربٹ (Jim Corbett) مشہور انگریز شکاری ہے۔ وہ صرف شکاری نہیں تھا۔ بلکہ شیر کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس کا غیر معمولی ماہر بن چکا تھا۔ وہ جنگل میں کسی مقام پر ہو اور شیر کی آواز سنائی دے تو وہ درمیانی فاصلہ کا نہایت صحیح اندازہ کر لیتا تھا۔ اور اس کے بعد اس کی دوسری آواز سن کر جان لیتا تھا کہ شیر کس رفتار سے کس رخ پر جا رہا ہے۔

کمایوں (Kumaon) پہاڑیوں میں ایک شیرنی مردم خور ہو گئی۔ اس نے مجموعی طور پر ۲۳۴ آدمیوں کی جان لی۔ اس تعداد میں بہت سے شکاری بھی ہیں۔ آخر کار جم کاربٹ نے اس کو ہلاک کیا۔ اسی کے نام پر کمایوں میں "کاربٹ پارک" بنایا گیا ہے۔

جم کاربٹ نے شیر کے گہرے مطالعہ کے بعد ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب میں وہ شیر کی

عظمت کا اعتراف ان لفظوں میں کرتا ہے ـــــ فراخ دل شریف آدمی، بے حساب دلیری والا :

Large hearted gentleman with boundless courage

جم کاربٹ نے جو کچھ شیر کے بارہ میں کہا ہے، وہی ایک بہادر انسان کے بارہ میں بھی صحیح ہے۔ بہادر انسان کی عین وہی صفت ہوتی ہے جو بہادر شیر کے اندر پیدائشی طور پر پائی جاتی ہے۔

۱۸ فروری ۱۹۸۹

نئی دہلی کے انگریزی اخبار "ٹائمس آف انڈیا نے اپنے شمارہ ۸ا فروری ۱۹۸۹ میں "شیطانی آیات" کے مصنف سلمان رشدی کے معاملہ پر اڈیٹوریل لکھا ہے جس کا عنوان ہے :

satanic fall-out

اس اڈیٹوریل میں ایران کے آیات اللہ خمینی کے اس "فتویٰ" پر تنقید کی گئی ہے کہ سلمان رشدی کو مسلمان قتل کر دیں۔ اخبار کے اڈیٹر دلیپ پیڈ گاؤنکر نے لکھا ہے کہ ایک فارن نیشنل جو فارن لینڈ میں رہتا ہو، اس کے خلاف اس قسم کی کارروائی دہشت گردی (Terrorism) کے ہم معنی ہے۔

اسی کے ساتھ اڈیٹر نے ایک بہت قیمتی بات لکھی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ـــــ اسلام کو آیات اللہ کی جامد، غیر روادار اور جارحانہ تعبیر دین کے ہم معنی قرار نہیں دیا جاسکتا :

Islam cannot be equated with the Ayatollah's rigid, intolerant aggressive interpretation of it.

اس کا مطلب یہ ہے کہ خمینیت الگ چیز ہے اور اسلام الگ چیز۔ بلاشبہ حقیقت واقعہ یہی ہے۔ مگر ٹائمس آف انڈیا کے اڈیٹر کی زبان سے اس حقیقت کا اعتراف بتاتا ہے کہ اس ملک میں اگر کچھ متعصب لوگ بستے ہیں تو اس کے ساتھ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو تعصب اور فرقہ واریت سے اوپر اٹھ کر سوچتے ہیں۔

یہ روشن پہلو ہمارے لئے امید اور اعتماد کا خزانہ ہے۔

۱۹ فروری ۱۹۸۹

رفیع احمد قدوائی (۱۹۵۴-۱۸۹۴) کانگریس کے لیڈروں میں سے تھے۔ آزادی (۱۹۴۷) کے بعد وہ اترپردیش کی کیبنٹ میں وزیر بنائے گئے۔ بعد کو وہ دہلی بلا لئے گئے اور آخر وقت تک مرکزی کیبنٹ میں وزیر رہے۔ مصطفیٰ کامل قدوائی موصوف کے قریبی عزیزوں میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون (قومی آواز ۱۹ فروری ۱۹۸۹) میں لکھا ہے کہ:

"جب ہندستان آزاد ہو رہا تھا اور رفیع صاحب گھر آئے تو ہم بھائیوں نے ان سے پوچھا کہ اب تو لڑائی ختم ہوگئی۔ اب آپ کیا کریں گے۔ انھوں نے جواب میں کہا ـــــ لڑائی ختم نہیں ہوئی۔ ہم اب آپس میں لڑیں گے نیا ہندستان بنانے کے لئے"

"آزاد ہندستان" کے بارہ میں رفیع احمد قدوائی کی یہ بات نہایت صحیح ثابت ہوئی۔ تاہم یہ صرف ہندستان کا معاملہ نہیں۔ یہی ہر ملک اور ہر ادارہ کا معاملہ ہے۔ لوگ ایک "نظام" کو غلط بتا کر اس کے خلاف اٹھتے ہیں اور جب یہ نظام ٹوٹ جاتا ہے تو نیا نظام بنانے کے لئے دوبارہ آپس میں لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑائی ختم ہوتی ہے بے نفسی سے، اور بے نفسی کا کہیں وجود نہیں۔

۲۰ فروری ۱۹۸۹

امریکہ کے ۴۱ ویں پریسیڈنٹ جارج بش (George H.W. Bush) پر ٹائم میگزین (۳۰ جنوری ۱۹۸۹) نے ایک مفصل رپورٹ شائع کی تھی۔ ٹائم کے شمارہ ۲۰ فروری ۱۹۸۹ میں اس کے بارہ میں خطوط شائع ہوئے ہیں۔ تمام خطوط چھوٹے چھوٹے ہیں۔ ایک خط صرف ایک لائن کا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

Kind words, gentle words, but still only words.

اس کے مقابلہ میں اردو اخبارات میں چھپنے والے خطوط کو دیکھئے۔ وہ عام طور پر اتنے لمبے ہوتے ہیں کہ میرے جیسا آدمی بمشکل ان کو پڑھ سکتا ہے۔ ٹائم کے ایک سطر کے خط میں پوری بات ہے، جب کہ اردو اخبار کے لمبے لمبے خط میں بھی تلاش کرنے کے بعد کوئی بات نہیں ملتی۔

یہی اردو زبان کی اصل کمی ہے۔ انگریزی زبان کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کو اعلیٰ علمی حلقوں

کی ریڈرشپ حاصل ہے۔ اس کے برعکس اردو زبان کی بدقسمتی یہ ہے کہ اب وہ صرف کم تر قسم کے لوگوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ اردو زبان کو ترقی دینے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ اس میں اعلیٰ ادب تخلیق کیا جائے تاکہ اعلیٰ ذہنی طبقہ کے لوگ اس کو پڑھنے کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ اس کے سوا اردو زبان کو ترقی دینے کی اور کوئی صورت نہیں۔

۲۱ فروری ۱۹۸۹

۱۷ فروری ۱۹۸۹ کو ٹائمس آف انڈیا اور دوسرے اخبارات میں صفحہ اول پر یہ خبر تھی کہ ایران کے امام خمینی نے اعلان کیا ہے کہ "سیٹنک ورسز" کے مصنف سلمان رشدی کو قتل کر دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ایرانی سلمان رشدی کو قتل کرے گا تو اس کو ۲۶ لاکھ ڈالر (\$ 2.6 million) انعام دیا جائے گا۔ اور اگر غیر ایرانی قتل کرے گا تو اس کو ۱۰ لاکھ ڈالر (\$ 1 million) دئے جائیں گے۔

سلمان رشدی انگلینڈ کے شہری ہیں۔ خمینی کے اس اعلان کے بعد ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ آخر کار ۱۹ فروری کو یہ خبر آئی کہ سلمان رشدی نے اپنی مذکورہ نزاعی کتاب پر معافی مانگ لی۔ اگرچہ ایرانی حکومت نے اس کے بعد بھی اس کی جاں بخشی نہیں کی۔

اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر ارن شرما (دہلی کے انگلش جرنلسٹ) نے کہا کہ خمینی نے اس بات کو یقینی بنا دیا کہ اب صدیوں تک یہ کتاب چھپتی رہے:

Khomeini has ensured reprint of Satanic Verses for centuries to come.

ٹائمس آف انڈیا (۲۱ فروری ۱۹۸۹) میں صفحہ آخر پر ایک رپورٹ درج ہے جس میں سلمان رشدی کی کتاب پر مختلف لوگوں کے تبصرے نقل کئے گئے ہیں۔ خوشونت سنگھ نے کہا کہ ناول کی حیثیت سے بھی شیطانی آیات کوئی پڑھنے کے قابل کتاب نہیں:

Even as a novel 'The Satanic Verses' is not readable.

مسلمان اگر اس کے خلاف شور وغل نہ کرتے تو یہ کتاب اپنے آپ ختم ہو جاتی۔ مگر انھوں نے

شور وغل کرکے غیر ضروری طور پر اس کتاب کو زندگی دے دی۔

۲۲ فروری ۱۹۸۹

ٹائم میگزین (۶ فروری ۱۹۸۹) کی کور اسٹوری کا عنوان تھا ـــــ ہتھیار بند امریکہ (Armed American) اس میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں ہتھیاروں کی کھلی اجازت ہونے کی وجہ سے گھر گھر ہتھیار ہو گئے ہیں۔ حتیٰ کہ امریکہ کی سڑکیں گولی چلانے کے لئے کھلے اور آزاد علاقے (Free-fire zones) بن گئے ہیں۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۱ فروری ۱۹۸۹) میں واشنگٹن کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ امریکی راجدھانی واشنگٹن میں قتل کی واردات اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ اب واشنگٹن کو موت کی راجدھانی (Death capital) کہا جانے لگا ہے۔ ۱۹۸۸ میں واشنگٹن میں ۳۷۲ قتل کے واقعات ہوئے۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ زیادہ تر قتل نشہ سے تعلق رکھنے والے (Drug-related) ہوتے ہیں۔ امریکہ کی ترقی نے اسے آزادی تک پہنچایا۔ آزادی نے منشیات تک اور منشیات نے قتل تک۔

۲۳ فروری ۱۹۸۹

آجکل ساری دنیا میں مسلمان سلمان رشدی کی کتاب (سیٹنک ورسز) کے خلاف ہنگامہ کھڑا کئے ہوئے ہیں۔ آیات اللہ خمینی اور ایرانی حکومت کی طرف سے انعام کے اعلان کے بعد اس میں مزید شدت آگئی ہے۔

اس نے اخباروں کو ایک نیا پرشور عنوان دے دیا ہے۔ کیوں کہ اس طرح کی چیزیں عوام میں خوب پڑھی جاتی ہیں۔ جائزہ سے معلوم ہوا ہے کہ اخباروں میں جو اڈیٹوریل ہوتے ہیں، ان کو صرف ۳ فیصد لوگ پڑھتے ہیں۔ جب کہ بڑے بڑے جرائم کی خبریں صدفی صد پڑھی جاتی ہیں۔ Readability factor کے لحاظ سے کرائم (جرم) کو اخباری صفحات میں ٹاپ کی جگہ حاصل ہے۔ اخباروں کا یہی مزاج ہے جس نے سلمان رشدی کے خلاف مسلمانوں کے ہنگاموں اور توڑ پھوڑ اور قتل کے منصوبوں کو اخبارات کے صفحہ اول پر جگہ دے دی۔

اب فرض کیجئے کہ ایک مسلمان ٹیلیفون پر سلمان رشدی سے ملاقات کا اپائنٹمنٹ لیتا۔ وہ رات کو نمازیں پڑھ کر اللہ سے دعا کرتا کہ خدایا، تو سلمان رشدی کو ہدایت عطا فرما۔ اس کے بعد وہ اگلے دن سلمان رشدی سے ملاقات کرتا اور تنہائی میں دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ اس کو نصیحت کرتا۔ اگر کوئی مسلمان ایسا کرتا تو اللہ کی نظر میں وہ سب سے بڑا واقعہ ہوتا۔ مگر اخبار والوں کے نزدیک وہ اتنا غیر اہم ہوتا کہ گوشہ کی چند سطری خبر میں بھی اس کو جگہ نہ ملتی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان ان کاموں کو تو بہت دھوم کے ساتھ کر رہے ہیں جو اخبار والوں کے نزدیک اہم ہیں۔ مگر ان کاموں سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں جو اللہ تعالیٰ کے یہاں اہمیت رکھتے ہیں۔ بلاشبہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

۲۴ فروری ۱۹۸۹

اخبار قومی آواز (۲۲ فروری ۱۹۸۹) میں ایک مسلم لیڈر کا مراسلہ چھپا ہے۔ وہ سلمان رشدی کی کتاب (The Satanic Verses) کے خلاف غم وغصہ کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مسلمان اپنے رسول کی توہین کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا۔

آجکل ہر مسلم اخبار یا رسالہ میں اسی قسم کے الفاظ چھپ رہے ہیں۔ میرے نزدیک یہ مسلمانوں کا اپنا بنایا ہوا دین ہے۔ اس کا خدا اور رسول کے دین سے کوئی تعلق نہیں۔ خدا اور رسول کے دین میں اصل اہمیت دعوت کی ہے۔ نہ کہ ان چیزوں کی جن کو موجودہ مسلمان اہمیت دئے ہوئے ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ مسلمان دعوت کے مواقع کی بربادی کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں نے سلمان رشدی کے خلاف جو شور وغل کیا ہے۔ اس کا واحد نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دعوت کے مواقع ناقابل تلافی حد تک برباد ہو گئے۔ سلمان رشدی نے مذکورہ کتاب لکھ کر اپنے آپ کو بدنام کیا تھا مگر مسلم رہنماؤں نے اس کے خلاف ہنگامہ کر کے اسلام کو بدنام کیا ہے۔ اصل اہمیت کی چیز مواقع دعوت کا تحفظ تھا نہ کہ "توہین رسول" پر بھڑک کر قتل وغارت گری شروع کر دینا۔

اسلامی عمل وہ ہے جو انجام کو سامنے رکھ کر کیا جائے۔

۲۵ فروری ۱۹۸۹

ٹائمس آف انڈیا (۲۴ فروری ۱۹۸۹) کی رپورٹ کے مطابق، دہلی میں انگریزی ادیبوں اور اڈیٹروں کا ایک فیسٹیول (Festival) ہوا۔ اس موقع پر مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ مسٹر خوشونت سنگھ نے اپنی تقریر میں کہا کہ لکھنے والے کو ہمیشہ تخلیقی چیز لکھنا چاہئے:

A writer should only do creative writing.

مگر حالات آدمی کو تخلیقی بننے نہیں دیتے۔ انھوں نے کہا کہ ہم میں سے کچھ لوگ جنھوں نے تخلیقی ادب کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا، وہ سستی صحافت میں چلے گئے۔ ایسا انھیں محض پیسہ کی خاطر کرنا پڑا:

Some of us who started out as creative writers went into journalism, mainly because of money.

یہی معاملہ آجکل ہر ایک کا ہو رہا ہے۔ مسلم رہنما ابتداءً تعمیری کام کا جذبہ لے کر اٹھتے ہیں۔ مگر جلد ہی وہ دیکھتے ہیں کہ تعمیری کام کے ذریعہ وہ قوم کے اندر اپنا مقام پیدا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جلد ہی وہ جذباتی سیاست کی طرف مڑ جاتے ہیں۔ اور پھر موت تک اسی پر قائم رہتے ہیں۔ نہ کوئی شخص ایسا کر پاتا کہ وہ غیر مقبولیت کو برداشت کرتے ہوئے تعمیری نقشہ پر قائم رہے۔ اور نہ کوئی ایسا نظر آتا جو ایک بار انحراف کرنے کے بعد دوبارہ اپنے سابقہ موقف کی طرف لوٹے۔

اس کی وجہ میرے نزدیک معرفت کی کمی ہے۔ جن لوگوں نے ابتداءً تعمیری کام کرنا چاہا، ان کے اس ارادہ کے پیچھے کوئی گہرا عرفان شامل نہ تھا۔ گہرا عرفان اپنی قیمت آپ ہوتا ہے۔ جو شخص گہرے عرفان کی بنیاد پر اٹھے، اس کا یہ احساس ہی اس کے اطمینان کے لئے کافی ہوتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ ایسے شخص کو یہ خارجی واقعہ کبھی متزلزل نہیں کرتا کہ وہ لوگوں کے اندر مقبولیت کا درجہ حاصل نہ کر سکا۔

۲۶ فروری ۱۹۸۹

روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ میری بخشش نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ میں نے بہت زیادہ گناہ (ذنب) کئے ہیں۔ آپ نے کہا کہ تمہارا

گناہ بڑا ہے کہ زمین (ذنبک اعظم ام الارض) اس نے کہا کہ میرا ذنب زمین سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ پھر آپ نے کہا کہ تمہارا گناہ بڑا ہے کہ آسمان (ذنبک اعظم ام السماء) اس نے کہا کہ میرا گناہ آسمان سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تمہارا گناہ بڑا ہے کہ عرش (ذنبک اعظم ام العرش) اس نے کہا کہ میرا گناہ عرش سے بھی بڑا ہے۔ آخر میں آپ نے فرمایا کہ تمہارا گناہ بڑا ہے یا اللہ (ذنبک اعظم ام اللہ) اب آدمی کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہ تھا۔ اس نے کہا کہ یقیناً اللہ ہر چیز سے زیادہ بڑا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

یہ روایت سند کے اعتبار سے قوی نہیں۔ مگر معنی کے اعتبار سے بالکل درست ہے۔ یہ اس انسان کی نفسیات کو بتاتی ہے جو گناہ کرنے کے باوجود اللہ سے ڈرتا ہو۔ اگر اس کا احساس واقعۃً اسی درجہ کا ہے جو اوپر کی مثال میں نظر آتا ہے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمادیں گے۔

۲۷ فروری ۱۹۸۹

مغل حکمراں شاہجہاں نے ایک بار کوئی منظر دیکھا۔ اس کے زیر اثر اس کی زبان پر یہ فقرہ آگیا: نیمے دروں نیمے بروں (آدھا اندر، آدھا باہر) شاہجہاں نے اپنے دربار کے لوگوں سے کہا کہ اس فقرہ کو ملا کر ایک پورا شعر بناؤ۔ ہر ایک نے کوشش کی۔ مگر بادشاہ کے شایان شان کوئی شعر نہیں بنا۔ آخر ایک شاعر نے ایک شعر موزوں کیا جو شاہجہاں کو پسند آیا۔ اور اس نے اس شاعر کو بہت انعام دیا۔ وہ شعر یہ تھا:

از ہیبت شاہجہاں لرزد زمین و آسماں انگشت حیرت در دہاں نیمے دروں نیمے بروں

لفظی خیال آرائی کی دنیا میں سارے زمین و آسمان شاہجہاں کی ہیبت سے کانپ اٹھے تھے۔ مگر حقیقت کی دنیا میں شاہجہاں اتنا کمزور ثابت ہوا کہ خود اس کے لڑکے (اورنگ زیب) نے اس کو گرفتار کرکے جیل خانہ میں بند کر دیا۔ اور اسی قید کی حالت میں اس کا انتقال ہوگیا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان اسی طرح لفظوں کے آسمانی قلعے بناتے رہے۔ مگر جب حقیقت سے ٹکراؤ ہوا تو معلوم ہوا کہ ان کے قلعے کی حیثیت ایک غبارہ سے زیادہ نہ تھی۔

۲۸ فروری ۱۹۸۹

ڈاکٹر شاہد رشید صابری (امیٹھی) نے ۲۱ جنوری ۱۹۷۷ کو امیٹھی میں مطب شروع کیا۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۷۸ کو ان کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ اپنے مطب میں اکیلے تھے۔ ایک ہندو نوجوان (عمر ۲۵ سال) ان کے مطب میں داخل ہوا۔ وہ رندھیری (ضلع سہارنپور) کا رہنے والا تھا۔ اس کو مقعد میں زخم کی بیماری تھی۔ تقریباً دس سال سے مواد جاری تھا۔ مختلف علاج کے بعد آخر کار وہ ڈاکٹر شاہد کے پاس آیا۔

ڈاکٹر شاہد نے مواد سکھانے کے لئے پنسلین کا انجکشن دیا۔ اس کے بعد جب وہ مطب سے اٹھ کر جانے لگا تو چند قدم چلتے ہی وہ گر پڑا اور بیہوش ہوگیا۔ اس کے منھ سے جھاگ نکلنے لگا۔ ڈاکٹر شاہد کی پریکٹس ابھی جمی نہیں تھی۔ وہ اچانک اس حادثے سے گھبرا اٹھے۔ دوبارہ افاقہ کے لئے انھوں نے مختلف انجکشن دینے شروع کئے۔ یہاں تک کہ ۲۴ مختلف انجکشن دے ڈالے۔

انھوں نے بتایا کہ مریض کی نبض اور دل کی حرکت بالکل بند ہوگئی۔ بظاہر وہ مر گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی موت خود میرے مطب کی موت ہے۔ چنانچہ میں نے دل سے دعائیں شروع کیں۔ مسلسل اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتا رہا اور انجکشن لگاتا رہا اور دل کی مالش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ مریض کے اندر حرکت پیدا ہوئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گویا کہ ایک مرا ہوا شخص زندہ ہوگیا۔ میرے مطب سے واپس جانے کے بعد وہ شخص نارمل حالت میں زندہ رہا۔ اس کے چار ماہ بعد اچانک اس کا انتقال ہوگیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی دعا اللہ تعالیٰ نے سنی اور مذکورہ ہندو نوجوان کی عمر میں چار ماہ کا اضافہ کر دیا۔ یہ واقعہ بظاہر اس حدیث کے مطابق ہے جو ترمذی میں ان الفاظ میں آئی ہے: لایرد القضاء الا الدعاء، ولا یزید فی العمر الا البر۔ (اللہ کے فیصلہ کو دعا کے سوا اور کوئی چیز نہیں ٹالتی۔ اور عمر میں نیکی کے سوا کسی اور چیز سے اضافہ نہیں ہوتا۔ (مشکوۃ، جلد ثانی صفحہ ۶۹۳)

یکم مارچ ۱۹۸۹

ڈاکٹر شاہد صابری (پیدائش ۱۹۵۱) ملاقات کے لئے آئے۔ وہ امیٹھی (ضلع سہارنپور)

میں مطلب کرتے ہیں۔ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ یہاں کی تمام کتابیں بھی پڑھ چکے ہیں۔ وہ نہ صرف الرسالہ کے مشن سے متفق ہیں بلکہ اس پر پوری طرح عامل بھی ہیں۔

انھوں نے اپنے کئی واقعات بتائے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے امیٹھی میں چار ایکڑ رقبہ کی ایک زمین خریدی۔ اور ناپ کر اس کی مینڈ بنوا دی۔ یہ ۱۹۸۷ کا واقعہ ہے۔ یہ زمین ہندوؤں کے مرگھٹ سے ملی ہوئی تھی۔ چنانچہ جن سنگھ ہندوؤں نے یہ مشہور کیا کہ ڈاکٹر شاہد نے مرگھٹ کی زمین اپنے کھیت میں ملالی۔ بڑے جذباتی انداز میں میرے خلاف پروپگنڈا کیا گیا۔ مثلاً یہ کہ ڈاکٹر شاہد نے ہمارے مردوں کے اوپر ٹریکٹر چلوا دیا۔ وغیرہ۔ ڈاکٹر شاہد نے جنوری ۱۹۷۷ میں یہاں پریکٹس شروع کی تھی۔ ان کی پریکٹس بہت کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔ چنانچہ بعض ہندو ڈاکٹروں کو جلن ہوئی اور انھوں نے ان کی پریکٹس کو ڈاؤن کرنے کے لئے یہ فرقہ وارانہ شوشہ چھوڑا۔

ڈاکٹر شاہد اس پر برہم نہیں ہوئے۔ وہ ٹھنڈے طریقہ سے ہندو پٹواری کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ آپ چل کر زمین کو ناپ دیں اور اگر اس میں مرگھٹ کی زمین نکلتی ہے تو میں اس کو فوراً واپس کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مقامی جن سنگھی لیڈر حکم چند جین سے بھی انھوں نے یہی بات کہی۔

پٹواری اور دوسرے ہندو مقرر وقت پر وہاں آئے اور زمین کی پیمائش کی گئی تو معلوم ہوا کہ جن سنگھی لوگوں کی شکایت بالکل غلط تھی۔ بلکہ پیمائش کے مطابق خود ڈاکٹر شاہد صاحب کی زمین کا کچھ حصہ مرگھٹ کی زمین میں نکلا۔ انھوں نے کہا کہ میں اس کو مرگھٹ کے لئے چھوڑ دیتا ہوں۔ جن سنگھی لیڈر حکم چند جین ڈاکٹر صاحب کی شرافت کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ اس نے کہا کہ واقعہ یہ ہے کہ ہمیں لوگ غلطی پر تھے۔ آپ یقیناً ایک سچے آدمی ہیں۔ یہ تاثر اتنا بڑھا کہ نومبر ۱۹۸۸ میں امیٹھی میں چیرمین کی جگہ کے لئے الکشن ہوا تو حکم چند جین ایک سابق ایم ایل اے کو لے کر ڈاکٹر شاہد صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ ہم سب آپ ہی کو چیرمین کے لئے سب سے بہتر سمجھتے ہیں۔ آپ اس کے لئے کھڑے ہو جائیے۔ ہم آپ کو اطمینان دلاتے ہیں کہ کوئی ہندو آپ کے مقابلہ میں نہیں کھڑا ہوگا۔ اور آپ یقیناً جیت جائیں گے۔ ڈاکٹر شاہد نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ آپ کا شکریہ۔ مگر میں سیاست سے بہت دور رہنا چاہتا ہوں۔

۲ مارچ ۱۹۸۹

ایک صاحب نے کہا کہ اس وقت امت کی اصل ضرورت اتحاد ہے، اور اس کے لئے آپ کچھ نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ آپ کے خیال سے کیا کرنا چاہئے۔ اس کے لئے انھوں نے کہا کہ تمام مسلم اکابر کو جمع کیجئے اور اتحاد کے مسئلہ پر لوگوں کو توجہ دلائیے۔ میں نے کہا کہ کانفرنسوں سے اگر اتحاد قائم ہو سکتا تو اب تک اسے قائم ہو جانا چاہئے تھا۔ کیوں کہ ملت کے اندر اتحاد کانفرنسیں اتنی زیادہ ہو چکی ہیں کہ ان کی گنتی نہیں کی جا سکتی۔

انھوں نے کہا کہ پھر اتحاد کی تدبیر کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اتحاد کے لئے اتحاد کا شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت اصل مسئلہ یہ ہے کہ ملت کے اندر وہ استعداد موجود نہیں جس پر اتحاد کی تعمیر ہوتی ہے۔

انھوں نے کہا کہ استعداد سے آپ کی مراد کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس سے مراد ہے ملت کے افراد کے اندر اس شعور کی موجودگی کہ اتحاد اس وقت آتا ہے جب کہ لوگ اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا راز جان گئے ہوں۔ صحابۂ کرام بلاشبہ اتحاد کی غیر معمولی مثال ہیں۔ مگر ان کا اتحاد اختلاف کے باوجود متحد ہونے کی زمین ہی پر قائم ہوا تھا۔

میں نے کہا کہ حضرت عمر نے خلیفۂ اول ابو بکر صدیق کا ایک فرمان بر سر عام پھاڑ کر پھینک دیا۔ مگر وہاں کوئی کہرام نہیں مچا۔ آج اگر کوئی شخص ندوہ میں کھڑا ہو کر مولانا علی میاں کی ایک کتاب پھاڑ کر پھینک دے تو وہاں ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ حضرت عمر تقریر کر رہے تھے کہ ایک عام آدمی نے کھڑے ہو کر کہا کہ ہم نہ تمہاری بات سنیں گے اور نہ تمہاری اطاعت کریں گے مگر اس سے کوئی برہمی پیدا نہیں ہوئی۔ آج اگر کوئی شخص ایک اسلامی ادارہ میں ایسا کرے تو وہ وہاں سے نکال دیا جائے گا۔

اس تقابل سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام کے اندر اتحاد کی استعداد تھی، آج کے مسلمانوں میں اس کی استعداد نہیں۔ ایسی حالت میں پہلا کام ذہنی استعداد پیدا کرنا ہے نہ کہ کوئی جذباتی اشو کھڑا کر کے بھیڑ جمع کرنا۔

بھیڑ اور اتحاد کے فرق کو نہ جاننے والے ہی بھیڑ پر خوش ہو سکتے ہیں۔

۳ مارچ ۱۹۸۹

میں نے ایک موضوع پر کچھ معلومات جمع کی تھیں اور اس کے کچھ ابواب تیار کئے تھے۔ تاہم مجھے احساس تھا کہ کتاب ابھی مکمل نہیں ہے۔ خواہش تھی کہ مزید معلومات جمع کرکے اس کو مکمل کرلوں۔ اس کے بعد اس کو شائع کروں۔

اس کتاب کا نام میں نے "اسلام دور جدید کا خالق" تجویز کیا تھا۔ مگر دوسری مصروفیات کی وجہ سے اس کی تکمیل کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ آخر کار میں نے طے کیا کہ وہ جس حال میں ہے اسی حال میں اسے شائع کردوں۔ چنانچہ چھوٹے چھوٹے تقریباً ۲۰ ابواب مرتب کرکے کاتب کو برائے کتابت دے دئے۔

کارڈینال نیومین (Cardinal Newman) کا قول ہے کہ آدمی کوئی کام نہیں کرسکتا، اگر وہ اس انتظار میں رہے کہ وہ اتنا اچھا کام کرے کہ کوئی شخص اس میں کوئی غلطی نہ پاسکے:

A man could do nothing, if he waited until he would do it so well that no one could find fault with what he has done.

۴ مارچ ۱۹۸۹

مسٹر ارن شرما ملاقات کے لئے آئے۔ وہ نئی دہلی کے ایک انگلش جرنلسٹ ہیں۔ نسلی اعتبار سے وہ برہمن ہیں۔ میرے سوالات کے جواب میں انھوں نے ہندو مذہب میں برہمن کی مختلف قسمیں اور ان کی سماجی حیثیت کی تفصیل بیان کی۔ اس گفت گو کے دوران انھوں نے کئی بار یہ الفاظ کہے: اس وقت میں پیور لی ورن سسٹم پر بات کر رہا ہوں۔ یہ مت سمجھئے کہ یہ میری اپنی تھنکنگ ہے۔

اسی طرح ۲۸ فروری کو میں دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں گیا تھا۔ وہاں رشدی خمینی اشو پر جلسہ تھا۔ سیتارام گوئل نے لمبی تقریر کی۔ وہ آر ایس ایس کے آدمی ہیں۔ ان کی پوری تقریر اسلام کے خلاف تھی۔ تاہم ہندو پیشواؤں کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار ان کی زبان سے یہ فقرہ نکلا: محمد صاحب کی شخصیت دوسرے مذہبی پیشواؤں کی طرح، اتھالوجیکل فیگر نہیں ہے، وہ پوری طرح ایک ہسٹاریکل فیگر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہمارے پڑوسی مسٹر پرمود بترا اکثر رامائن کا سیریل دیکھنے کے لئے بلاتے رہتے ہیں۔ جنوری

۱۹۸۹ کے ایک اتوار کو میں ان کے یہاں گیا۔ ٹی وی پر رامائن کی ایک قسط شروع سے آخر تک دیکھی۔ اس میں عجیب وغریب مناظر تھے۔ مثلاً ایک موقع پر کرشن کو ان کے دشمن تلوار سے کو مارتے ہیں۔ تلوار ان کے جسم کو کاٹ کر اس پار سے اس پار چلی جاتی ہے۔ اس کے باوجود وہ نہیں مرتے۔ اس طرح کے مناظر سامنے آتے تو مسٹر تبراسکا کر کہتے: یہ کوئی ہسٹری نہیں، یہ مائتھالوجی ہے۔

ہندوؤں کے پڑھے لکھے طبقے کے بارے میں میرا تجربہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کے بارہ میں معذرت خواہ (Apologetic) رہتے ہیں۔ یہ دراصل مسلم نفرت ہے جو ان کو اپنے مذہب سے وابستہ کئے ہوئے ہے۔ اگر مسلمان یک طرفہ صبر کے ذریعہ مسلم نفرت کے اسباب ختم کر دیں تو اچانک ہندو مذہب کی عمارت خود ان کے درمیان گر پڑے گی۔

۵ مارچ ۱۹۸۹

رابطۃ العالم الاسلامی (سعودی عرب) کی طرف سے ایک ہفتہ وار اخبار "اخبار العالم الاسلامی" کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ ۲۱ فروری ۱۹۸۹ میں روسی مسلمانوں کے بارہ میں ایک مفصل رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ بلاد مسلمین پر روسی استعمار کا آغاز ۴۵۰ سال پہلے ہوا جب کہ ایفان سوم (IVAN III) نے ۱۵۵۲ میں قازان کی مسلم حکومت ختم کر دی۔ اس کے بعد ۱۹۱۷ میں وہاں اشتراکی انقلاب آیا۔

اس پوری مدت میں روس کے علاقہ میں بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ ہر قسم کا ظلم کیا جاتا رہا ہے اور ان کی اسلامی حیثیت اور شناخت کو مٹانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اس کے باوجود روسی علاقہ کے مسلمان ابھی تک ۹۵ فیصد سے زیادہ اپنے دین اور اپنے عقیدہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہیں (۹۵-۹۹ فی المائۃ من المسلمین السوفیت مازالوا متمسکین باسلامهم وعقیدتهم، صفحہ ۸-۹)

ہندستان کی مذہبی قیادت آجکل سب سے زیادہ جس موضوع پر تقریریں کر رہی ہے وہ یہی ہے کہ ہندستانی مسلمانوں سے ان کی اسلامی شناخت مٹائی جا رہی ہے، اور اگلی نسلوں کے مسلمان بحیثیت مسلمان باقی نہیں رہیں گے۔ ان لوگوں کو مذکورہ واقعہ سے نصیحت لینا چاہئے۔ جو واقعہ روسی جبر کے تحت نہیں ہوا وہ ہندستانی جمہوریت میں کیسے ہو جائے گا۔

۶ مارچ ۱۹۸۹

بعد کے مسلم علماء نے یہ مسئلہ بنالیا ہے کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن کرے وہ لازماً قتل کیا جائے۔ اس مسئلہ کے حق میں کوئی صریح نص قرآن و حدیث میں موجود نہیں ہے۔ یہ مسئلہ تمام تر قیاسی اور استنباطی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں عرب کے بے شمار لوگوں نے آپ پر طعن کیا۔ مگر آپ نے انھیں قتل نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ ایسا کرتے تو اسلام کی تاریخ ہی نہ بنتی۔ کیوں کہ یہی لوگ تھے جو بعد کو مومن ہو کر اسلام کی طاقت کا ذریعہ بنے۔

ابن قیم نے اپنی کتاب زاد المعاد (۶۱/۵) میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قدیم عرب میں ایسے لوگ تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت پر قدح کیا۔ مگر آپ نے انھیں قتل نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو اس کا حق حاصل تھا۔ آپ کو آزادی تھی کہ خواہ ایسے شخص کو سزا دیں یا اسے چھوڑ دیں۔ مگر آپ کی امت آپ کے حق کی وصولی کو ترک نہیں کر سکتی (فذالك ان الحق له فله ان يستوفيه وله ان يتركه۔ وليس لامته ترك استيفاء حقه صلى الله عليه وسلم)

ابن قیم کی یہ توجیہہ نہایت کمزور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اس قسم توجیہہ کو شریعت میں معتبر مان لیا جائے تو شریعت کا سارا نظام بگڑ کر رہ جائے گا۔

۷ مارچ ۱۹۸۹

حبیب بھائی (حیدرآباد) آج ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے اپنے کاروبار کو اب کافی بڑھا لیا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ کو ذہنی سکون حاصل ہے۔ انھوں نے کہا کہ بالکل نہیں۔

میں نے کہا کہ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں ذہنی سکون کو کوئی آئیڈیل چیز نہیں سمجھتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ تمام بڑے بڑے کام کرنے والے وہ لوگ تھے جو ذہنی سکون سے محروم تھے۔ ذہنی سکون میرے نزدیک اس دنیا میں ممکن نہیں۔ مزید یہ کہ تاریخ بتاتی ہے کہ انھیں لوگوں نے تمام بڑے بڑے کام کئے جو ذہنی بے اطمینانی کا شکار ہوئے۔ پرسکون ذہن نے کبھی اس دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کیا ہے۔

منکن (H.L. Mencken) ایک امریکی جرنلسٹ تھا۔ وہ ۱۸۸۰ میں بالٹی مور میں

پیدا ہوا، اور وہیں ۱۹۵۶ میں وفات پائی۔ منکن نے اسی بات کو ان لفظوں میں کہا کہ معلوم انسانی تاریخ میں کبھی کوئی مسرور فلسفی پیدا نہیں ہوا:

There is no record in human history of a happy philosopher.

۸ مارچ ۱۹۸۹

عبدالقادر مغربی مصر کے ایک مشہور عالم اور صاحب قلم تھے۔ ۱۹۰۷ میں انھوں نے ایک عربی مقالہ شائع کیا جس کا عنوان تھا: مصر و السیاسۃ۔ اسی طرح انھوں نے ایک اور مقالہ "مصر والاقطار العربیۃ" کے نام سے شائع کیا۔

ان مقالوں میں انھوں نے کہا تھا کہ عالم اسلام اور عالم عرب کی قیادت وسیادت کی ذمہ داری مصر پر عائد ہوتی ہے، کیوں کہ وہ مادی اور معنوی دونوں قسم کی دولت سے مالامال ہے۔ مصر عالم عرب کے وسط میں واقع ہے۔ اس کا ایک شاندار ماضی ہے۔ اس بنا پر اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی ذمہ داری اور قیادت اسی کو کرنا چاہئے۔

اس میں اگر لفظ "مصر" کو حذف کر دیجئے تو موجودہ زمانہ کے تمام مسلم رہنما اسی قسم کی باتیں کہتے رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کو ان کا "شاندار ماضی" یاد دلا کر یہ کہتے رہے ہیں کہ وہ اٹھیں اور دوبارہ عالمی قیادت کا کام سنبھالیں۔

یہ بات میرے نزدیک احمقانہ حد تک لغو ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے بہادر شاہ ظفر کی اولاد کو یا سلطان عبدالحمید ثانی کی بقایا نسل کو مخاطب کر کے کہا جائے کہ تم لوگ اٹھو اور ایشیا اور افریقہ میں اپنی کھوئی خاندانی سلطنت کو دوبارہ بحال کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ مسلم نسلیں مسلمانوں کی زوال یافتہ نسلیں ہیں۔ ان کے اوپر اسلام کی عمارت کھڑی کرنے کا خواب دیکھنا دیمک زدہ لکڑی کے اوپر کثیر منزلہ عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ موجودہ زمانہ میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ دوسری قوموں سے نفرت اور کشمکش کی فضا ختم کی جائے اور ان کے درمیان وسیع پیمانہ پر اسلام کی اشاعت کی جائے۔ اب دوسری قوموں ہی سے وہ "مسلم امت" تیار ہو سکتی ہے جو دوبارہ اسلام کی تاریخ بنائے۔

۹ مارچ ۱۹۸۹

سکھوں کے ایک بابا ساون سنگھ تھے۔ ان کے جانشین سنت کرپال سنگھ ہوئے۔ اب اس کے موجودہ جانشین درشن سنگھ ہیں۔ بابا درشن سنگھ کی ایک کتاب ۴۶ صفحات پر شائع ہوئی ہے۔ اس کا نام ہے "ایک آنسو اور ایک ستارہ" (A Tear and a Star) یہ انگریزی کتاب "خواطر" کے انداز میں ہے۔ اس کے ہر صفحہ پر بابا جی کے خود اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا کوئی مقولہ درج ہے۔ تمام اقوال کسی نہ کسی اعتبار سے امن اور محبت کے بارے میں ہے۔ مثلاً صفحہ ۲ پر یہ فقرہ درج ہے ـــــ محبت کا صرف آغاز ہے، اس کا کوئی خاتمہ نہیں:

Love has only a beginning; it has no end.

سکھ نوجوان پچھلے تقریباً ۵ سال سے پنجاب میں اور دوسرے علاقوں میں دہشت گردی کر رہے ہیں۔ انھوں نے ہزاروں بے گناہوں کو ہلاک کیا ہے۔ مگر اس کے خلاف کوئی سکھ رہنما نہیں بولتا۔ البتہ امن اور محبت کی باتیں ہر ایک کرتا ہے۔ مگر صرف اس قسم کا کلام کسی شخص کو امن اور محبت کا پرچارک نہیں بناتا۔ کریڈٹ صرف اس شخص کو مل سکتا ہے جو امن کی بات کرنے کے ساتھ بے امنی کا عمل کرنے والوں کی مذمت بھی کرے۔

ٹھیک یہی حال مسلم رہنماؤں کا بھی ہے۔ مسلم رہنما اپنے بیان اور تقریروں میں امن اور محبت اور انسانیت کی باتیں کرتے ہیں مگر ان کی اپنی قوم کے لوگ (مسلمان) جب بے امنی کا فعل کرتے ہیں تو وہ ان کی مذمت نہیں کرتے۔ غیر قوم کے ظلم کی مذمت کرنے کے لئے ہر شخص بہادر ہے، مگر اپنی قوم کے ظلم کی مذمت کرنے کے لئے کوئی شخص بہادر نہیں۔

۱۰ مارچ ۱۹۸۹

محمد حسین ہیکل مصر کے مشہور عالم اور ادیب تھے۔ انھوں نے سیرت پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "حیاۃ محمد" ہے۔ انھوں نے کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ فرانسیسی زبان میں انھوں نے وہ کتابیں پڑھیں جو یورپی مورخوں نے سیرت کے موضوع پر لکھی ہیں۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کتابوں میں پیغمبر اسلام کی تصویر کو بگاڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ اس قسم کی چیزوں کو پڑھ کر ان کے اندر سخت ردعمل پیدا ہوا۔ اور انھوں نے مذکورہ کتاب لکھ ڈالی۔ چنانچہ اس کتاب کا تقریباً

نصف حصہ مستشرقین کے جوابات پر مشتمل ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے سیرت کے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں ان سب کا حال کم و بیش یہی ہے۔ میرے علم کے مطابق کوئی ایک بھی مسلمان نہیں جس کا یہ حال ہو کہ اس کو یہ احساس بے تاب کرے کہ لوگ گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ انھیں سچائی کا راستہ دکھانے کے لئے تڑپ اٹھے اور اس تڑپ کے تحت ہادی برحق کی زندگی کے بارے میں ایک کتاب تیار کرے۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی تمام کتابیں دفاع سیرت ہیں نہ کہ حقیقی معنوں میں دعوت سیرت۔ ہزاروں کتابوں کے ہجوم میں کوئی ایک بھی ایسی کتاب نہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو سادہ اور فطری انداز میں بیان کیا گیا ہو۔ اور وہ عام انسانوں کو مطالعہ سیرت کے لئے دی جا سکے۔

۱۱ مارچ ۱۹۸۹

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم سے جب میری کوئی بات بیان کی جائے تو اس کو اللہ کی کتاب پر جانچ کر دیکھو۔ اگر وہ اس کے مطابق ہو تو اس کو لے لو، ورنہ اسے رد کر دو (اذا روی لکم عنی حدیث فاعرضوہ علی کتاب اللہ تعالیٰ فان وافقہ فاقبلوہ والا فردوہ)

یہ مطلب نہیں کہ جو حدیث بظاہر قرآن سے متعارض دکھائی دے اس کو رد کر دیا جائے۔ اس سے مراد ظاہری تعارض نہیں بلکہ معنوی تعارض ہے۔ ہر معاملہ کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں کبھی ایک پہلو سے بات کہی جاتی ہے اور کبھی دوسرے پہلو سے۔ اس بنا پر بظاہر کلام میں فرق ہو جاتا ہے۔ لیکن فرق یا اختلاف کا فیصلہ ظاہری بنیاد پر نہیں کیا جائے گا بلکہ معنوی اور حقیقی بنیاد پر کیا جائے گا۔

۱۲ مارچ ۱۹۸۹

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے متعلق ایک عربی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ان کے حیرت انگیز حالات پڑھتے ہوئے بے اختیار آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ میں نے کہا: اصحاب رسول بلاشبہ دنیا کے بہترین لوگ تھے۔ مکہ میں یک طرفہ صبر کی ضرورت تھی تو انھوں نے آخری

حد تک صبر کیا۔ مدینہ میں قربانی کی ضرورت پیش آئی تو انھوں نے آخری حد تک قربانی دی۔

میرے اندر صبر کی طاقت ہے اور نہ قربانی کی طاقت۔ البتہ میں ان پاک نفوس کی عظمت کا اعتراف کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اگر یہ غیر معمولی کردار ادا نہ کیا ہوتا تو دنیا سے کبھی شرک کا دور ختم نہ ہوتا۔ اور انسان ہمیشہ کے لئے گمراہی کے اندھیرے میں بھٹکتا رہتا جس طرح وہ ان سے پہلے اندھیروں میں بھٹک رہا تھا۔

یا اللہ، میرے پاس کوئی عمل نہیں۔ مجھے صرف اس لئے بخش دیجئے کہ میں نے آپ کا اعتراف کیا اور آپ کے ان بندوں کا اعتراف کیا جو بلاشبہ آپ کے محبوب بندے ہیں۔

۱۳ مارچ ۱۹۸۹

ٹائم میگزین دنیا کا سب سے زیادہ کثیر الاشاعت پرچہ ہے۔ اس کے ۹ انٹرنیشنل ایڈیشن مختلف مقامات سے نکلتے ہیں۔ اس کی ہر اشاعت کے شروع میں آدھے صفحہ کا ایک نوٹ پبلشر From the publisher کے تحت ہوتا ہے۔ اس کی اشاعت ۱۳ مارچ ۱۹۸۹ میں جو نوٹ ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ہم ہمیشہ اپنے قارئین کو اپنے ذہن میں رکھتے ہیں۔ اور اشاعت کے لئے انھیں کہانیوں کا انتخاب کرتے ہیں جس سے انھیں دلچسپی ہو۔

We keep our readers in mind and select the stories that will interest them.

یہ صرف "ٹائم" کی بات نہیں۔ یہی تمام صحافیوں اور قائدین کا اصول ہے۔ وہ عوام کے مزاج کو دیکھ کر لکھتے اور بولتے ہیں۔ اس سے انھیں ذاتی فائدہ یقیناً حاصل ہو جاتا ہے مگر قوم کی تعمیر کا کام نہیں ہوتا۔

الرسالہ میں ہمارا اصول اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہم لوگوں کے انٹرسٹ یا ان کے رجحان کو نہیں دیکھتے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ صحیح بات کیا ہے۔ ہم وہی بات لکھتے ہیں جو قرآن و حدیث کے مطابق صحیح ہو خواہ وہ کسی کے موافق پڑے یا اس کے خلاف۔ اس فرق کا مطلب ایک لفظ میں، یہ ہے کہ "ٹائم" ایک تجارت ہے، اور الرسالہ اس کے مقابلہ میں اعلان حق۔

اس دنیا میں دو چیزوں کے فرق کو جاننا آدھا علم ہے۔

۱۴ مارچ ۱۹۸۹

عرب ملکوں کے تعاون سے مسلم اقلیات کے بارہ میں ایک ادارہ قائم ہے۔ اس کا نام لجنۃ الاقلیات الاسلامیۃ ہے۔ اس کا صدر دفتر لندن میں ہے۔ اس ادارہ کے صدر الشیخ یوسف ہاشم الرفاعی ہیں۔ وہ اس سے پہلے کویت میں وزیر رہ چکے ہیں۔

صدر موصوف نے اپنی ایک رپورٹ میں ہندستان کی مسلم اقلیت کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد ۱۰۰ ملین سے زیادہ ہے۔ وہ متعصب ہندوؤں کے نرغہ میں ہیں۔ ہندو یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان ان کے جیسے نام رکھیں، ان کا لباس پہنیں، اپنی لڑکیوں کی شادی ہندو لڑکوں سے کریں، ورنہ انھیں پاکستان بھاگنے پر مجبور کر دیا جائے۔ ہندوؤں نے مرکزی حکومت سے یہ حکم حاصل کر لیا کہ عظیم تاریخی مسجد جس کا نام بابری مسجد ہے، اس کو بند کر دیں اور اس پر قبضہ کر لیں۔ کیوں کہ ان کے دعوی کے مطابق وہ ایک قدیم ہندو مندر کو توڑ کر اس کی جگہ بنائی گئی ہے:

وتحدث عن مسلمی الهند فاوضح ان مسلمی الهند الذین عددهم یزید عن مأة ملیون مسلم یتعرضون لحملة شرسة من الهندوس المتعصبین تهدف الی طردهم الی باکستان اذا لم یغیر وا اسماء هم ولباسهم واذا لم یقبلوا بتزویج بناتهم بابناء غیر المسلمین. وقد قام الهندوس باستصدار امر من الحکومة المرکزیة باغلاق ومصادرة مسجد اثری کبیر یسمی الجامع البابری بدعوی انه بنی علی انقاض معبد هندوسی قدیم.

اخبار العالم الاسلامی، مکۃ المکرمہ، ۲۸ رجب ۱۴۰۹ھ/۶ مارچ ۱۹۸۹، صفحہ ۲

ہندستانی مسلمانوں کی یہ تصویر سراسر غلط ہے۔ اس قسم کی خلاف واقعہ باتیں مستقل طور پر عرب پرچوں میں چھپتی رہتی ہیں۔ اس نے عالم عرب کے لوگوں کا ذہن ہندستان کے بارہ میں بالکل خراب کر دیا ہے۔ (یہی رپورٹ الدعوۃ (ریاض) ۲۰ اپریل ۱۹۸۹ میں بھی شائع ہوئی ہے)

۱۵ مارچ ۱۹۸۹

مولانا قاضی ثناء اللہ (حنفی) ۱۱۴۳ھ میں پانی پت (ہندستان) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی

تعلیم کے بعد وہ دہلی آگئے اور شاہ ولی اللہ صاحب سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ وہ مرزا جانجاناں مظہر سے بیعت تھے۔ آخر عمر میں وہ اپنے وطن پانی پت میں مقیم ہو گئے۔ یہیں ۱۲۲۵ میں وفات پائی۔

قاضی ثناء اللہ صاحب نے اپنی ساری عمر دینی مطالعہ میں گزار دی۔ انھوں نے تفسیر اور فقہ وغیرہ موضوعات پر ۳۰ سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ انھوں نے قرآن کی مکمل تفسیر عربی زبان میں لکھی اور اس کا نام اپنے شیخ کے نام پر التفسیر المظہری رکھا۔ یہ کتاب ۱۰ جلدوں میں ندوۃ المصنفین (دہلی) سے شائع ہوئی ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۳۹۴ میں چھپی تھی اور دسویں جلد ۱۳۹۷ھ میں چھپی۔

اس تفسیر کا مکمل سیٹ میرے پاس موجود ہے۔ میں اس سے برابر استفادہ کرتا رہتا ہوں۔ مجھے یہ تفسیر بہت پسند ہے۔ میرا بار بار کا تجربہ ہے کہ جو بات دوسری تفسیروں میں نہیں ملتی وہ اکثر اس کی تفسیر میں مل جاتی ہے۔

ندوۃ المصنفین نے اس کو ہاتھ کی کتابت سے چھپوایا ہے۔ اس بنا پر وہ طباعتی حسن سے خالی ہے۔ میری تمنا ہے کہ کوئی لائق آدمی محنت کر کے اس کو ایڈٹ کرے اور دوبارہ ٹائپ میں اس کو جدید معیار پر چھپوایا جائے۔

۱۶ مارچ ۱۹۸۹

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس دنیا کا نظام "باوجود" کے اصول پر قائم ہے۔ یہاں برے اخلاق کا جواب اچھے اخلاق سے دینے کا نام اخلاق ہے۔ یہاں اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونے کا نام صبر ہے۔

اس دنیا میں آدمی کو رکاوٹوں کے باوجود کامیابی کا راستہ نکالنا پڑتا ہے۔ یہاں اتحاد اس وقت قائم ہوتا ہے جب کہ لوگ اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا راز جان گئے ہوں۔

۱۷ مارچ ۱۹۸۹

مولانا عبد اللہ طارق (نظام الدین) ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے ایک شعر سنایا جو مجھ کو بہت پسند آیا۔ وہ شعر یہ تھا:

تفاوت است میان شنیدن من و تو　　تو غلق باب و منم فتح باب می شنوم

یعنی میرے اور تمہارے درمیان جو فرق ہے وہ سننے کا فرق ہے۔ دروازہ کے پاس سے جو آواز آئی ہے، اس کو تم دروازہ بند کرنے کی آواز سمجھ رہے ہو، اور میں اس کو دروازہ کھولنے کی آواز سمجھتا ہوں۔

زندگی کے معاملات میں اصل اہمیت اسی زاویۂ نگاہ کی ہے۔ ایک شخص حالات کو منفی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کو نظر آتا ہے کہ حالات نے ہمارے لئے سفر کے تمام راستے بند کر دئے ہیں۔ دوسرا شخص حالات کو مثبت نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کو نظر آتا ہے کہ حالات نے ہمارے لئے سفر کے نئے وسیع تر مواقع کھول دئے ہیں۔ ایک ہی آواز ہے۔ مگر ایک شخص اس کو دروازہ کھلنے کی آواز سمجھتا ہے۔ اور دوسرا شخص یہ سمجھتا ہے کہ دروازہ بند ہو گیا۔

۱۸ مارچ ۱۹۸۹

میری زندگی کے تجربوں میں سے ایک اندوہناک تجربہ یہ ہے کہ آدمی اسی وقت تک اچھا رہتا ہے جب تک وہ اچھا رہنے کے لئے مجبور ہو۔ جیسے ہی وہ وقت آتا ہے جب کہ وہ اپنے اختیار سے اچھا بنے تو فوراً وہ دوسرا آدمی بن جاتا ہے۔ مجبورانہ طور پر نیک بننے والے بے شمار ہیں، مگر اختیارانہ طور پر نیک بننے والا کوئی نہیں۔

۱۹ مارچ ۱۹۸۹

جناب علی صاحب (پیدائش ۱۹۵۴) ملاقات کے لئے آئے۔ وہ نیندرو (ضلع بجنور) کے رہنے والے ہیں۔ تبلیغی جماعت کے تحت وہ پنجاب گئے تھے۔ وہاں کے بہت سے واقعات انھوں نے بتائے۔

جناب علی صاحب یکم مارچ ۱۹۸۹ کو پانی پت میں تھے۔ وہاں وہ گڑ منڈی کی مسجد میں اپنی جماعت کے ساتھ ٹھہرے۔ یہ مسجد آج ایک آباد اور پر رونق مسجد ہے۔ اس میں پانی، بجلی، پنکھا وغیرہ ہر چیز کا انتظام ہے۔ پنج وقتہ نماز ہوتی ہے۔ مگر دو سال پہلے وہ مکمل طور پر ایک ہندو کے قبضہ میں تھی جو اس کو اپنا رہائشی مکان بنائے ہوئے تھا۔

یہاں ایک ہندو لالہ ہیں جن کی گڑ منڈی میں تھوک کی بڑی دکان ہے۔ وہ گڑ، چینی، دال وغیرہ سپلائی کرتے ہیں۔ ان کے یہاں تقریباً دس مسلمان پلہ دار (قلی) کام کرتے ہیں۔ یہ مسلمان

بعد کو یہاں آکر آباد ہوئے ہیں۔ کیوں کہ ۱۹۴۷ میں یہاں کے تمام مسلمان یا تو پاکستان بھاگ گئے۔ یا قتل کر دئے گئے تھے۔

مسلمان پلہ دار جو یوپی وغیرہ سے آکر یہاں کام کرتے ہیں انھوں نے ہندو لالہ سے کہا کہ ہم کو نماز کی بہت پریشانی ہوتی ہے۔ آپ کے گدام میں ہم مشکل سے نماز پڑھتے ہیں۔ یہاں ایک بنی بنائی مسجد موجود ہے جس پر ایک ہندو کا قبضہ ہے۔ اگر آپ اس کو خالی کرادیں تو ہمارا کام بن جائے۔ ہندو لالہ نے اس ہندو کو بلایا جو ۱۹۴۷ سے اس مسجد میں رہ رہا تھا۔ لالہ جی نے کہا کہ مسلمان لوگ چاہتے ہیں کہ تم مسجد کو خالی کر دو تاکہ وہ لوگ وہاں نماز پڑھ سکیں۔

مذکورہ ہندو اس شرط پر خالی کرنے کے لئے راضی ہوا کہ اسے اتنی رقم دی جائے کہ وہ اپنے رہنے کے لئے دوسرا انتظام کر سکے۔ اس مقصد کے لئے پانچ ہزار روپیہ کا مطالبہ کیا۔ لالہ جی کے کہنے سننے سے آخر کار وہ چار ہزار روپیہ پر راضی ہو گیا۔ ہندو لالہ نے اپنے پاس سے چار ہزار روپیہ دے کر مسجد کو خالی کرایا اور اس کو مسلمانوں کے حوالہ کر دیا۔ اب یہ مسجد مکمل طور پر مسلمانوں کے قبضہ میں ہے۔ وہاں باقاعدہ پنج وقتہ نماز ہوتی ہے۔ ایک امام بھی ہیں جو اپنے حجرہ میں رہتے ہیں۔

مسجد کا تصور یہ ہے کہ وہ خدا کی عبادت کی جگہ ہے۔ اس بنا پر ہر آدمی نیک کام سمجھ کر اس میں مدد دینے کے لئے راضی ہو جاتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اس کے لئے جھگڑا نہ کیا جائے بلکہ ٹھنڈے طریقہ سے لوگوں سے مدد کرنے کے لئے کہا جائے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو لوگ مسجد کا مسئلہ لے کر اٹھے ہیں انھوں نے اپنی ماضی کی روش سے اپنی اچھی تصویر بنائی ہو۔ اگر انھوں نے اپنی تصویر بگاڑ رکھی ہو تب بھی ان کی اپیل غیر مؤثر ہو جائے گی۔

۲۰ مارچ ۱۹۸۹

ایک صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک گورنمنٹ کالج میں استاذ ہوں۔ پھر کہا کہ ریٹائرمنٹ کی عمر ۵۸ سال ہے۔ اس کے مطابق میری ملازمت کی مدت پوری ہو چکی ہے۔ تاہم کالج والوں نے ایک سال کی توسیع دے دی ہے۔ اب میں اکسٹنشن پر چل رہا ہوں۔

میں نے کہا کہ ایک اعتبار سے میرا حال بھی یہی ہے۔ میری عمر اب ۶۴ سال ہو چکی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ۶۳ سال میں ہوئی تھی۔ اس اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی اصل طبعی عمر ۶۳ سال ہے۔ اگر وہ مزید زندہ رہتا ہے تو وہ گویا خدا کی طرف سے اس کی توسیع ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب میری مدت عمر پوری ہو چکی ہے۔ اس کے بعد اگر میں زندہ ہوں تو گویا کہ میں توسیع پر چل رہا ہوں۔

انسان کو چاہئے کہ وہ ہر عمر میں موت کو یاد رکھے۔ مگر جس آدمی کی عمر ۶۳ سال سے اوپر ہو جائے اس کو تو صبح و شام موت کا منتظر رہنا چاہئے۔ کیوں کہ "۶۳" سال کے بعد وہ توسیع پر ہو جاتا ہے۔ کچھ نہیں معلوم کہ کس لمحہ اس کی توسیع کی مدت ختم ہو جائے اور موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے کے لئے آپہنچے۔

۲۱ مارچ ۱۹۸۹

ایک سوڈانی مسلمان طلال عثمان ہاشم (عمر ۴۰ سال) ملاقات کے لئے آئے۔ وہ ام درمان (ٹیلیفون 4 8 7 5 4 6) میں رہتے ہیں۔ اور تبلیغی جماعت کے تحت دہلی آئے ہیں۔ ان کے ساتھ تبلیغی جماعت کے کچھ اور لوگ بھی تھے۔

طلال عثمان ہاشم نے بتایا کہ تبلیغ کے کچھ لوگ اردن گئے۔ وہاں انھوں نے کچھ فلسطینی نوجوانوں میں تبلیغ کی بات کی۔ نوجوانوں نے کہا کہ تبلیغ کا حکم تو مکہ میں تھا۔ ہجرت کے بعد جب مدنی دور آیا تو قرآن میں جہاد کی آیتیں اتریں اور صبر اور تبلیغ کی آیتیں منسوخ ہو گئیں۔ اس لئے اب تو ہمیں صرف جہاد کرنا ہے۔

تبلیغ کے صاحب نے کہا کہ جہاد سے پہلے دعوت اسی طرح ضروری ہے جس طرح نماز سے پہلے وضو ضروری ہے (الجهاد بغير الدعوة مثل الصلاة بغير الوضوء) فلسطینی نوجوانوں نے کہا کہ اگر آپ کی بات صحیح ہے تو جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کے یہاں جا کر تبلیغ کرتے تھے، ہم کو اور آپ کو یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس جانا چاہئے اور ان کے اوپر تبلیغ کرنا چاہئے (فعلينا ان نذهب وندعوا اليهود الى الاسلام)

تبلیغ کے صاحب نے جواب دیا کہ موجودہ حالت میں اگر آپ یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس

تبلیغ اسلام کے لئے جائیں تو وہ کہیں گے کہ تم ہم کو کس اسلام کی طرف بلاتے ہو۔ وہ اسلام جو کتابوں میں ہے یا وہ اسلام جو مسلمانوں کی زندگیوں میں ہے۔ کیوں کہ کتابی اسلام اور عملی اسلام میں بہت زیادہ فرق ہو چکا ہے۔ تبلیغ کے صاحب نے کہا کہ اس لئے ہمارا اور آپ کا فرض ہے کہ پہلے مسلمانوں کی اصلاح کریں اور جب یہ کام ہو جائے، اس کے بعد غیر مسلموں میں تبلیغ کے لئے جائیں۔

تبلیغ والے عام طور پر غیر مسلموں میں تبلیغ نہ کرنے کا یہی جواب دیتے ہیں۔ مگر بہت سے وجوہ کی بنا پر یہ جواب بالکل غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم کو اصلاح مسلمین اور دعوت عام دونوں کام بیک وقت کرنا ہے۔ ان میں سے کوئی کام بھی کسی حال میں ساقط ہونے والا نہیں۔ تبلیغ والوں کے لئے زیادہ صحیح بات یہ ہوگی کہ وہ یہ کہیں کہ ہم مسلمانوں میں اصلاح کا کام کرتے ہیں، دوسرے لوگ اٹھیں اور وہ غیر مسلموں میں تبلیغ کا کام کریں۔ یہی ان کی طرف سے زیادہ صحیح اور محفوظ جواب ہے۔ آدمی اگر ایک کام نہ کر رہا ہو تو اس کو کم سے کم یہ کرنا چاہئے کہ وہ نہ کرنے کا اعتراف کرے۔

۲۲ مارچ ۱۹۸۹

رحمٰن نیر صاحب (۵۰ سال) نے بتایا کہ وہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر گئے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ لوگ قبر پر سر رکھ کر اس کو سجدہ کر رہے ہیں۔ رحمان نیر صاحب نے کہا کہ یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ اسلام میں غیر اللہ کو سجدہ کرنا حرام ہے۔ ایک صاحب نے جواب دیا: ہم سجدہ نہیں کرتے، ہم تو ہونٹوں سے اور آنکھوں سے چومتے ہیں۔

میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ قبر کو سجدہ کرنے کی اتنی خوبصورت تاویل لوگوں کے پاس موجود ہوگی۔

۲۳ مارچ ۱۹۸۹

ہربرٹ ہوور (Herbert Hoover) نے سیاسی لیڈروں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ انسانی تباہی کی قیمت پر اپنا سیاست کا کھیل کر رہے ہیں:

They are playing politics at the expense of human misery.

یہ تبصرہ سب سے زیادہ مسلم لیڈروں پر صادق آتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے تمام مسلم لیڈر ایسی

سیاست چلا رہے ہیں جس میں ان کی قائدانہ شخصیت تو بن جائے مگر ملت تباہ و برباد ہو کر رہ جائے۔

۲۴ مارچ ۱۹۸۹

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ: واما السائل فلا تنہر (اور سائل کو نہ جھڑکو) اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جو اپنے ظاہر کے اعتبار سے اس قابل ہو کہ اسے جھڑک دیا جائے جو اپنی ذاتی قیمت کے اعتبار سے کچھ پانے کا مستحق نہ ہو، وہ بھی اگر سائل بن کر تمہارے سامنے آجائے تو اس کو نہ جھڑکو اور نہ اسے ڈانٹ کر بھگاؤ۔

جو خدا بندوں کو یہ حکم دے، وہ خود یقیناً اس معاملہ میں اعلیٰ ترین مرتبہ پر ہوگا۔ بندہ کو چاہئے کہ اگر وہ اپنے رب کے سامنے عمل پیش نہ کر سکے تو کم از کم وہ اس کے سامنے سوال پیش کرے۔ اللہ کے سامنے جس طرح ایک عمل کی قیمت ہے، اسی طرح اس کے یہاں ایک سوال کی بھی قیمت ہے۔ جس شخص کے پاس حقیقی عمل ہو اور نہ حقیقی سوال، وہی وہ شخص ہے جو آخرت کے دن بربادی سے دوچار ہوگا۔

۲۵ مارچ ۱۹۸۹

موجودہ دنیا میں لذت کا حصول ممکن نہیں۔ انسان ایک چیز کو ذریعہ لذت سمجھ لیتا ہے اور اس کی طرف دوڑتا ہے۔ مگر جب وہ چیز مل جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر حقیقی معنوں میں کوئی لذت نہ تھی۔ اس دنیا میں ہر لذت فریب لذت ہے۔ اس حقیقت کو جو شخص تجربہ سے پہلے جان لے وہ عارف ہے، اور جو شخص تجربہ کے بعد جانے وہ جاہل۔

۲۶ مارچ ۱۹۸۹

رسول سے محبت اسلام میں مطلوب ہے۔ مگر محبت رسول کا رخ اطاعت رسول کی طرف ہونا چاہئے نہ کہ عشق رسول کی طرف۔ رسول اور پیروان رسول کے درمیان معشوق اور عاشق کا تعلق نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ رسول، اللہ کی طرف سے معیار ہے۔ ہماری ساری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اپنے آپ کو اس معیار کے مطابق بنائیں۔ محبت دراصل اتباع و اطاعت ہی کا اگلا درجہ ہے، وہ عشق و عاشقی کا کوئی معاملہ نہیں۔

دین میں اس انحراف نے بڑی احمقانہ قسم کی خرابیاں پیدا کی ہیں۔ مثلاً پاکستان سے ۱۲۴۸ صفحات کی ایک کتاب "شہاب نامہ" چھپی ہے۔ اس کے مصنف قدرت اللہ شہاب صاحب ہیں۔ ۱۹۸۷ سے ۱۹۸۸ کے درمیان صرف ایک سال میں اس کے چھ اڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس کا ایک حصہ مصنف کے سفر حج سے متعلق ہے۔ مصنف نے اپنے سفر مدینہ کے جو عاشقانہ تجربات لکھے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

"جی چاہتا تھا کہ گنبد خضرا پر نگاہ ڈالنے سے پہلے ان گنہگار آنکھوں کو کسی قدر صاف کرلوں۔ اس مقصد کے لئے شاہراہ مدینہ کی خاک سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی تھی؟ میں نے اضطراراً چلتی ہوئی سڑک سے خاک کی ایک چٹکی اٹھائی اور اسے اپنی آنکھوں کا سرمہ بنالیا۔

مسجد نبوی تک پہنچتے پہنچتے میری آنکھیں سرخ ہو کر سوج گئیں۔ اور راستہ نظر آنا مشکل ہوگیا۔ قدم قدم پر راگیروں سے ٹکر لگتی تھی۔ مجھے اندھا سمجھ کر ایک بھلے آدمی نے میری رہنمائی کی اور مجھے باب جبریل تک پہنچا دیا۔

باب جبریل پر عاشقان رسول کا ہجوم تھا۔ اندر جانے والوں اور باہر آنے والوں کا غیر منقطع تانتا بندھا ہوا تھا۔ ایک نورانی صورت بزرگ چٹائی پر بیٹھے لوگوں کے جوتے سنبھالنے میں مصروف تھے۔ میری آنکھوں میں اب تک دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ اور بھیڑ کے ریلے میں پھنس کر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ میں آگے بڑھ رہا ہوں یا پیچھے جا رہا ہوں۔ ایک مقام پر میں لوگوں سے ٹکرا کر بری طرح لڑکھڑایا اور جوتوں کے ڈھیر پر اوندھے منھ گر پڑا۔ جوتوں کی رکھوالی کرنے والے صاحب نے سہارا دے کر مجھے اٹھایا اور اپنے پاس چٹائی پر بٹھالیا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بولتے تھے۔ میری آنکھیں سوجی ہوئی اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ اپنی صراحی سے پانی کا گلاس پلا کر انھوں نے ازراہ ہمدردی دریافت کیا کہ میری آنکھوں کو کیا مرض لاحق ہے۔ میں نے شاہراہ مدینہ کی خاک کی چٹکی والا واقعہ بے کم و کاست بیان کر دیا۔ اسے سن کر وہ بے اختیار رو پڑے۔ (صفحہ ۶۱۶)

۲۷ مارچ ۱۹۸۹

زندگی کی محرومیاں غیر مومن کے لئے صرف اس کی مایوسی میں اضافہ کرتی ہیں۔ لیکن اگر آدمی کے اندر مومنانہ شعور زندہ ہو تو اس کی محرومیاں اس کو اپنی عاجزانہ حیثیت کی یاد دلاتے

والی بن جاتی ہیں۔ وہ اس کی عبدیت کے احساس کو تازہ کرکے اس کو مزید شدت کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ کر دیتی ہیں۔ اسی کے ساتھ محرومیوں کے ذریعہ آدمی کے دل میں درد و سوز کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ الحاح و اخبات کے ساتھ اپنے رب سے دعا کر سکے۔

محرومیاں آدمی کے اندر بے حسی کے برف کو توڑتی ہیں۔ وہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہاتی ہیں جو خدا کی رحمت کو سب سے زیادہ کھینچنے والا ہے۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو دنیا کی محرومی آخرت کی یافت ہے۔ کیوں کہ وہ آدمی کو جنت کی طرف لے جانے والی ہے۔ یہ بلاشبہ جنت کی بہت ارزاں قیمت ہے کہ آدمی دنیا کی کچھ معمولی چیزوں کو کھو کر آخرت کی اعلیٰ چیزوں کو پالے۔

۲۸ مارچ ۱۹۸۹

مارچ کے دوسرے ہفتہ میں کچھ لوگوں نے دہلی سے میرٹھ تک "پد یاترا" کیا۔ اس کے لیڈر سوامی اگنی ویش تھے۔ شبانہ اعظمی بھی اس میں شریک ہوئیں۔ میرے پاس بار بار سوامی اگنی ویش کا ٹیلیفون آیا کہ اس میں شرکت کریں۔ میں نے معذرت کر دی۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۸ مارچ ۱۹۸۹) میں مسٹر راہل شریمالی (اجین) کا خط چھپا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس معاملہ کی تلخ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اس قسم کے مارچ سے مارچ کرنے والوں کو زبردست پبلسٹی حاصل ہوتی ہے، لیکن اس سے کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا:

The bitter truth is that while these marches attract great publicity, they do not help in providing a solution to any problem.

یہ بات مسلم لیڈروں کی سرگرمیوں پر مزید اضافہ کے ساتھ صادق آتی ہے۔ مسلم لیڈروں کا حال یہ ہے کہ وہ بار بار ایسے اشوئے کراٹھتے ہیں جن کے نام پر مسلمانوں کی بھیڑ جمع ہوتی ہو۔ ان وقتی بھیڑوں سے لیڈر کی اپنی شخصیت تو بن جاتی ہے۔ مگر مسلمانوں کے مسائل میں سے ایک مسئلہ بھی حل نہیں ہوتا۔

۲۹ مارچ ۱۹۸۹

وہ ملک جس کو اب بنگلہ دیش کہا جاتا ہے۔ وہ ۱۹۷۱ سے پہلے پاکستان کا حصہ تھا اور

"مشرقی پاکستان" کہا جاتا تھا۔ اس وقت شیخ مجیب الرحمٰن مقبول ترین بنگالی لیڈر بن کر ابھرے۔ وہ اپنی پرجوش تقریروں میں بنگلہ کو سونار بنگلہ (سونے کا بنگلہ) کہا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارا ملک سونے کا ملک ہے۔ مگر پاکستانی حکمراں ہماری دولت پاکستان اٹھالے جاتے ہیں۔ ہم کنگال ہو رہے ہیں جب کہ ہماری دولت سے کراچی میں سونے کی سڑکیں بن رہی ہیں۔ ان تقریروں نے پورے مشرقی بنگال میں آگ لگا دی۔ یہاں تک کہ پاکستان سے خوں ریز جنگ لڑ کر وہ الگ ہوگیا اور "بنگلہ دیش" کی صورت میں ایک آزاد ملک قائم ہوگیا۔

مگر آج بنگلہ دیش ہمیشہ سے زیادہ غریب ملک ہے۔ ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بنگلہ دیش کے تقریباً ۵ لاکھ شہری اپنا ملک چھوڑ کر امریکہ جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ فروری ۱۹۸۹ میں امریکی حکومت نے اعلان کیا تھا کہ ۹۱-۱۹۹۰ کے دوران ۱۶۸ ملکوں سے نقل وطن کرنے والے ۲۰ ہزار افراد کو امریکہ میں جگہ دی جائے گی۔ اس کے بعد ڈھاکہ میں امریکی ویزا کے لئے درخواستوں کا ایک سیلاب امڈ پڑا ہے۔ پوسٹل ڈپارٹمنٹ کے افسروں کا کہنا ہے کہ روزانہ تقریباً ۴ ہزار بنگالی واشنگٹن کے ایک ادارہ کے پتہ پر ویزا کی درخواستیں بھیج رہے ہیں۔ ان میں عوام بھی ہیں اور خواص بھی۔ سلہٹ کے ۵۶ سالہ کسان رحیم علی نے کہا کہ اگر مجھے امریکہ جانے کا موقع مل گیا تو میں پیٹ بھر کھانا کھا سکوں گا۔ ایک ڈاکٹر جو سالانہ ۱۴۰ ڈالر فی کس آمدنی رکھنے والے ملک میں ایک ہزار ڈالر ماہانہ کماتا ہے وہ بھی نقل وطن کا خواہش مند ہے۔ اس نے کہا کہ سیاسی عدم استحکام اور تعلیمی اداروں میں انتشار کی وجہ سے وہ بنگلہ دیش چھوڑنا چاہتے ہیں۔ موجودہ حالات میں اس کے دو بیٹوں کا سخت تعلیمی نقصان ہو رہا ہے۔ ایک انجینئر نے کہا کہ بنگلہ دیش کے مقابلہ میں امریکہ ایک جنت ہے

(قومی آواز ۲۹ مارچ ۱۹۸۹)

کتنا فرق ہے سیاسی بیان بازی میں اور حقیقی زندگی کی تعبیر میں۔ سیاسی تقریروں میں بنگلہ دیش سونار بنگلہ تھا، مگر حقیقت میں وہ صرف فقیر بنگلہ بن کر رہ گیا ہے۔

۳۰ مارچ ۱۹۸۹

آرلینڈ اے باتستا (Orlando A. Battista) کا قول ہے کہ کوئی غلطی صرف

اس وقت غلطی ہے جب کہ تم اس کی اصلاح کرنے سے انکار کر دو :

An error doesn't become a mistake until you refuse to correct it.

غلطی ہر آدمی سے ہوتی ہے۔ اگر آدمی غلطی کو ماننے اور اس کی اصلاح پر آمادہ ہو تو غلطی کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ مگر جو شخص غلطی کو نہ ماننے اور اس کی اصلاح کرنے پر راضی نہ ہو، وہی وہ شخص ہے جس نے اپنی غلطی کو تباہی کے درجہ تک پہنچا دیا۔

۳۱ مارچ ۱۹۸۹

کچھ تعلیم یافتہ مسلمانوں سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اسلام کے بارہ میں اچھی اچھی باتیں کیں، مگر ان کے اندر مجھے اسلام کا درد محسوس نہیں ہوا۔ میں نے سوچا کہ قبول اسلام کے دو درجے ہیں۔ ایک وہ اسلام جو ذہنی پسندیدگی کی سطح پر ہو۔ دوسرا وہ اسلام جو روح کی گہرائیوں میں اترا ہوا ہو۔

موجودہ زمانہ میں لوگ یا تو اسلام سے دور ہیں یا ذہنی پسندیدگی کی سطح پر انھوں نے اسلام کو اختیار کر رکھا ہے۔ روح میں سرایت کیا ہوا اسلام کہیں نظر نہیں آتا۔ اس دوسرے اسلام کو قرآن میں " داخل القلب ایمان " کہا گیا ہے اور یہی وہ اسلام ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔

یکم اپریل ۱۹۸۹

کانسٹی ٹیوشن کلب میں صوفیاء کے سماجی رول کے موضوع پر ایک سیمینار تھا۔ منتظمین کی دعوت پر میں بھی شریک ہوا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسلام کی تاریخ میں ایک رول ماڈل حسن بن علی کا ہے جو رضا کارانہ طور پر حق خلافت سے دستبردار ہوگئے۔ دوسرا رول ماڈل حسین بن علی کا ہے جو خلافت کے لئے لڑے۔

میں نے کہا کہ اسلام کی بعد کی ہزار سالہ تاریخ میں امت کے نمائندہ افراد حسن کے رول ماڈل پر چلے۔ انھوں نے حکمرانوں سے ٹکراؤ کے بجائے حکومت و سیاست سے الگ رہ کر اپنے لئے تعمیری میدان میں کام تلاش کر لیا۔ صوفیاء بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھے۔ صوفیاء

نے حکمرانوں سے ٹکراؤ کو اوائڈ کرتے ہوئے اصلاح کا کام کیا۔

میری تقریر میں چوں کہ حسین کے رول ماڈل کو غیر مرجح قرار دیا گیا تھا، ایک شیعہ ڈاکٹر اس پر بگڑ گئے۔ میں نے غور کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ حسن اور حسین دونوں ہی نواسۂ رسول ہیں۔ مگر شیعہ حضرات حسن کو بالکل نظرانداز کرتے ہیں، اور حسین کے کردار کو مبالغہ آمیز حد تک نمایاں کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیعیت کا اصل عقیدہ یہ ہے کہ رسول کے بعد خلافت کا حق اہل بیت کو ہے۔ اسی پر شیعی مذہب کھڑا ہوا ہے۔ حسین کے رول ماڈل کو عظمت دینے سے ان کے مذہب کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ حسن کو نمایاں کریں تو ان کا مذہب بالکل منہدم ہو جائے گا۔ کیوں کہ حسینیت اگر دعوائے خلافت کا نام ہے تو حسنیت خلافت کے دعوا سے دستبرداری کا۔

۱۲ اپریل ۱۹۸۹

مسٹر ایس ایم جوشی (۸۹ ۱۹-۱۹۰۴) کے انتقال پر ٹائمس آف انڈیا (۲ اپریل ۱۹۸۹) میں ان کے بارہ میں جو رپورٹ چھپی ہے اس کا عنوان ہے:

A crusader against inequality

(نابرابری کے خلاف لڑنے والا مجاہد) بتایا گیا ہے کہ وہ زندگی بھر سماجی عدم مساوات (Social inequality) کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ وہ ڈاکٹر امبیڈکر کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ہریجنوں کو ہندستانی سماج میں برابر کا درجہ دینے کے لئے ستیاگرہ اور ایجی ٹیشن کرتے رہے۔ بار بار جیل گئے، وغیرہ۔

موجودہ زمانہ میں جو بھی اصلاح کے لئے اٹھتا ہے، وہ ستیاگرہ اور ایجی ٹیشن کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ یہی طریقہ مسلم رہنماؤں نے بھی اختیار کر رکھا ہے۔ خاموشی کے ساتھ ذہن بنانا اصل کام ہے، مگر اس کے لئے کوئی بھی کام نہیں کرتا، نہ مسلمانوں میں اور نہ غیر مسلموں میں۔

۱۳ اپریل ۱۹۸۹

مانٹگومری واٹ (W. Montgomery Watt) کی ۲۰۷ صفحات کی ایک کتاب ہے جس کا نام یہ ہے:

یہ کتاب اگرچہ اسلام کی تعریف پر ہے۔ مگر اس کا نام سخت مغالطہ آمیز ہے۔ اس نام کو دیکھ کر شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ اسلام اپنی ساری عظمتوں کے باوجود، ماضی کی چیز تھا، وہ مستقبل کی چیز نہیں۔

مصنف نے کتاب کے پانچویں باب میں فلکیات کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ فلکیات عربوں کے لئے ایک عملی سائنس تھی۔ کیوں کہ ان کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ ہر اسلامی شہر سے مکہ کے رخ کو جانیں تاکہ نمازوں کے وقت اپنے چہرہ کا رخ اس کی طرف کر سکیں:

Astronomy was a practical science for the Arabs ...because they had to know the direction of Mecca from every Islamic city, in order to face in this direction in their prayers. (p. 228)

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کے عبادتی اعمال ناقابل فہم رسوم نہیں ہیں بلکہ ان کا رشتہ پختہ انسانی علوم سے جڑا ہوا ہے۔ نماز کا تعلق سمتوں کے علم سے ہے۔ اسی طرح روزوں کا تعلق کلنڈر سے، زکوٰۃ کا تعلق علم الحساب سے، حج کا تعلق علم جغرافیہ سے۔ وغیرہ

۱۴ اپریل ۱۹۸۹

آجکل میرے اوپر موت کا خیال اتنا زیادہ چھایا ہوا رہتا ہے کہ میں اوپر جانے کے لئے سیڑھی پر چڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں خدا کی طرف چڑھ رہا ہوں۔ اور جب سیڑھی سے نیچے اترتا ہوں تب بھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں خدا کی طرف اتر رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ اب زندگی کی کشتی ساحل کے قریب پہنچ گئی۔ اب جلد ہی غالباً میرے اوپر وہ وقت آجائے گا جو دوسرے تمام لوگوں پر گزر چکا ہے۔

۱۵ اپریل ۱۹۸۹

ایک نومسلم نوجوان ملاقات کے لئے آئے۔ ان کا سابقہ نام شیام پرتاپ سنگھ گوتم تھا۔ موجودہ نام محمد عمر ہے۔ وہ ۱۹۶۴ میں فتح پور (الہ آباد) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۸۳ میں اسلام قبول کیا۔ پہلے انھوں نے بی ایس سی کیا تھا۔ اب وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اسلامک اسٹڈیز میں ایم اے

کر رہے ہیں۔ وہ ہندوؤں میں تبلیغ بھی کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھ پر تقریباً دس ہندو اسلام قبول کرچکے ہیں۔

وہ ہندی اور سنسکرت دونوں زبانیں جانتے ہیں۔ انھوں نے گیتا، رام چرت مانس، اور ویدوں کو پڑھا تھا۔ انھیں ہندوازم پر اطمینان نہ ہوسکا۔ چنانچہ انھوں نے تقابلی مطالعہ شروع کیا۔ آخر اسلام پر مطمئن ہوکر اسلام قبول کرلیا۔

انھوں نے بتایا کہ اللہ نے اپنے آپ ان کا دل بدل دیا۔ وہ موت کے بارہ میں بہت زیادہ سوچتے تھے۔ مرنے کے بعد آدمی کی روح کہاں جاتی ہے۔ عمل کیا ہے۔ انسان کا آخری انجام کیا ہونے والا ہے۔ ان کے اندر تلاش حق کا جذبہ ابھرا۔ چنانچہ راتوں کو اکثر وہ رویا کرتے تھے۔ رات رات بھر نیند نہ آتی۔ ان کے دوست ان کو پاگل کہنے لگے۔ انھوں نے قرآن کا ہندی ترجمہ پڑھا۔ اس سے ان کے دل کو اطمینان ہوا۔ آخر کار انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔

کچھ ہندوؤں نے انھیں مسلمانوں کے غلط کردار کو بتا کر انھیں اسلام سے پھیرنا چاہا۔ انھوں نے کہا: میں اللہ کا مسلمان ہوں، میں مسلمانوں کا مسلمان نہیں ہوں۔

۱۶ اپریل ۱۹۹۸

پیارے لال بھون (نئی دہلی) کے ایک اجتماع میں شریک ہوا اور منتظمین کی دعوت پر مختصر تقریر کی۔ یہ اجتماع ایک انگریزی کتاب کے اجراء (Release) کی تقریب پر کیا گیا تھا۔ یہ کتاب ڈاکٹر ماجد علی خاں نے The Satanic Verses کے جواب میں لکھی ہے۔ اور اس کا نام The Holy Verses ہے۔

میرا تاثر یہ تھا کہ کوئی شخص بھی سنجیدہ نہیں۔ نہ سننے والے اور نہ سنانے والے۔ جو صاحب اس اجتماع کے چیف گیسٹ تھے، انھوں نے اپنی تقریر میں "سلمان رشدی" کا نام نہیں لیا۔ انھوں نے کہا کہ میں اس ملعون کا نام لے کر اپنی زبان کو گندا کرنا نہیں چاہتا۔ ان کے اس جملہ پر زوردار تالیاں بجائی گئیں۔ مگر جب وہ اپنی تقریر کو مکمل کرکے واپس آئے تو میں نے سنا کہ سب سے پہلے انھوں نے سلمان رشدی کا نام لیا۔ میرے اور مذکورہ چیف گیسٹ کے درمیان صدر صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے صدر صاحب سے کہا: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شخص نے اپنا نام رشدی کیوں رکھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص اپنا ذہنی رشتہ ابن رشد سے جوڑتا ہے، کیوں کہ وہ بھی ایک گمراہ آدمی تھا۔

۷ اپریل ۱۹۸۹

جان رے (John Ray) کا قول ہے کہ ــــ مشورہ اس وقت سب سے کم سنا جاتا ہے جب کہ اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے:

Advice when most needed is least heeded.

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی خواہش کے زیر اثر ایک بات سوچتا ہے، اور اس کے مطابق کام کرنا چاہتا ہے۔ دوسرا شخص جو اس خواہش سے مغلوب نہیں ہے، وہ اس کے خلاف مشورہ دیتا ہے۔ مگر مذکورہ آدمی اس کے مشورہ کو قبول نہیں کرتا۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتا تھا اس کو کر ڈالتا ہے۔ بعد کو نتیجہ سامنے آنے کے بعد اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا اقدام غلط تھا۔ اب وہ مشورہ کی اہمیت کو محسوس کرتا ہے، مگر وقت گزرنے کے بعد۔

سب سے زیادہ عقلمند وہ ہے جو ایک صحیح مشورہ کی اہمیت کو آغاز میں سمجھ لے۔ اور سب سے زیادہ نادان وہ ہے جو صحیح مشورہ کی اہمیت کو آخر میں سمجھے۔

۸ اپریل ۱۹۸۹

ام درداء سے روایت ہے کہ ابو الدرداء گھر میں آئے۔ وہ غصہ میں بھرے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا کیا حال ہے۔ انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم میں آج کل کے مسلمانوں میں محمد کے دین کی کوئی چیز اس کے سوا نہیں دیکھتا کہ وہ ایک ساتھ نماز پڑھتے ہیں (عن ام الدرداء قالت دخل علیّ ابو الدرداء مغضباً فقلت له مالك. فقال: والله ما اعرف فيهم شيأً من أمر محمد الا انهم يصلون جميعاً، رواه البخاری)

دور اول میں جب کہ ابھی اصحاب رسول زندہ تھے، اس وقت لوگوں کا یہ حال ہو چکا تھا تو آج ۱۴۰۰ سال بعد ان کا حال کیسا ہوگا، مذکورہ حدیث سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دینداری اس کا نام نہیں کہ نماز، روزہ کا ڈھانچہ مسلمانوں میں موجود ہو یا اسلام کے نام پر جلسہ، جلوس یا تقریروں اور تحریروں کے ہنگامے جاری ہوں۔ دیندار

انسان دراصل وہ ہے جس کے اندر اللہ کا ڈر ایک نفسیاتی زلزلہ پیدا کر دے اور آخرت کی فکر اس کی پوری زندگی کو دنیا رخی کے بجائے آخرت رخی بنا دے۔ یہی وہ دین ہے جو حضرت ابو الدرداء کو بعد کے زمانہ میں بہت کم دکھائی دیتا تھا، اور موجودہ زمانہ میں تو وہ صفر کے درجہ میں غیر موجود ہو چکا ہے۔

۱۹ اپریل ۱۹۸۹

ڈینیل ویبسٹر (Daniel Webster) کا قول ہے کہ ــــــ جبر و تشدد انقلاب کا بیج ہے:

Repression is the seed of revolution.

"انقلاب" کو عام طور پر تبدیلی احوال کے معنی میں لیا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کو تبدیلی حکومت کے معنی میں لیا جائے تو یہ قول بالکل درست ہے۔ موجودہ زمانہ کے تمام نام نہاد انقلاب اور نام نہاد لیڈر جبر و تشدد کی زمین پر ابھرے ہیں۔ ایک حکومت اقتدار کے گھمنڈ میں ظلم کرتی ہے۔ اس ظلم کو کچھ لوگ مبالغہ آمیز انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اور پھر ان کے گرد عوام کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ حکمراں گروہ کے خلاف ایک سیاسی ہنگامہ کھڑا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ پرانے حکمراں ہٹ جاتے ہیں اور نئے افراد ان کی جگہ پر سیاسی کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔

اسی سیاسی واقعہ کا جھوٹا نام انقلاب ہے۔ مگر باعتبار حقیقت یہ افراد کی تبدیلی ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں نظام کی تبدیلی۔ نظام کی تبدیلی پورے سماج میں ذہنی اور شعوری تبدیلی سے آتی ہے نہ کہ محض چند افراد کی سیاسی اور حکومتی تبدیلی سے۔

۱۰ اپریل ۱۹۸۹

ٹائم (۲۰ مارچ ۱۹۸۹) کی کور اسٹوری ڈی این اے (DNA) کے بارہ میں تھی جس کا عنوان تھا ــــــ وراثتی رازوں کو حل کرنے کی کوشش:

Solving the mysteries of heredity

مضمون سے ظاہر ہوتا تھا کہ ڈی این اے کے بارہ میں جو تحقیقات ہوئی ہیں، وہ ارتقائے حیات کے قدیم تصور سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

اس مضمون کے بارے میں کچھ خطوط ٹائم (۱۰ اپریل ۱۹۸۹) میں شائع ہوئے۔ ٹائم کے ایک ریڈر مسٹر بیورلی کورو (Beverely Chorro) نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ جو شخص ان مضامین کو پڑھے اور اب بھی اس کی یہ خواہش ہو کہ وہ تخلیق کا کریڈٹ خدا کے بجائے ارتقاء کو دینا چاہے تو وہ یا تو بے عقل ہے یا اتنا زیادہ مغرور ہے کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنا نہیں جانتا:

Whoever reads these articles and still has the gall to credit evolution, rather than God, for our remarkable DNA is an idiot or too proud to admit he is wrong.

۱۱ اپریل ۱۹۸۹

سوڈان کے شمالی حصہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ خرطوم اسی میں شامل ہے۔ جنوبی سوڈان کے نسبتاً چھوٹے علاقہ میں عیسائیوں کی اکثریت ہے۔ اس علاقہ کی عیسائی آبادی اس کی خود مختاری کی جدوجہد کر رہی ہے۔ ۱۹۸۹ کے آغاز میں انھوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے مسلح بغاوت کر دی۔

ٹھیک یہی کام دنیا کے مختلف ملکوں (مثلاً لنکا، فلپائن، اریٹیریا، برما، وغیرہ) میں مسلمان کر رہے ہیں۔ انھیں جہاں کہیں علاقائی اکثریت حاصل ہے، وہ وہاں مسلح یا غیر مسلح تحریک چلا رہے ہیں کہ اس حصہ کو الگ کر کے وہاں انھیں آزاد مسلم حکومت بنانے کا موقع دیا جائے۔

نام نہاد مسلم پریس ان دونوں قسم کے واقعات کو بیان کرتا ہے، تو اس کے لئے اس کے پاس دو زبان ہوتی ہے۔ عیسائی علیحدگی کی تحریک کو وہ بغاوت قرار دیتا ہے، اور مسلم علیحدگی کی تحریک کو جہاد آزادی۔ میرے نزدیک یہ اسلام نہیں۔ یہ قومی سرکشی ہے۔ جو لوگ ایسی سرکشی کریں، وہ خود اپنے عمل سے اپنے آپ کو بے قیمت کر رہے ہیں۔

۱۲ اپریل ۱۹۸۹

۸ اپریل ۱۹۸۹ کو رمضان ۱۴۰۹ھ کی پہلی تاریخ تھی۔ کویت کے ماہنامہ الوعی الاسلامی رمضان ۱۴۰۹ھ (اپریل ۱۹۸۹ء) میں روزہ سے متعلق حدیثیں پڑھتے ہوئے یہ حدیث سامنے آئی: رب صائم حظه من صيامه الجوع والعطش (رواه ابن ماجه، والنسائی، والحاکم)

یعنی بہت سے روزہ دار ہیں جن کو اپنے روزہ سے بھوک اور پیاس حاصل ہوتی ہے۔

میں سوچنے لگا کہ ایسا کیوں ہے کہ ایک آدمی روزہ کے نام پر سارے دن بھوکا پیاسا رہے، اس کے باوجود اس کے حصہ میں روزہ نہ آئے بلکہ صرف بھوک پیاس آئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کھانا پینا بند کرنا یہ روزہ کی شکل ہے۔ یہی روزہ کی اصل حقیقت نہیں ہے۔ روزہ کی اصل حقیقت نفسیاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر تقویٰ اور شکر کی کیفیت ابھرے۔ بھوک پیاس سے اگر یہ ربانی کیفیت ابھرے تو آدمی کا روزہ صحیح معنوں میں روزہ بن گیا۔ اور جس کے اندر یہ ربانی کیفیت نہ ابھرے تو یہی وہ شخص ہے جس کو کھانا اور پینا چھوڑنے سے بھوک پیاس کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔

۱۳ اپریل ۱۹۸۹

مجھے اپنی زندگی میں بعض ہندوؤں کی طرف سے تلخ تجربات پیش آئے ہیں۔ اس وقت فوری طور سے سخت ردعمل ہوتا ہے۔ مگر جلد ہی سوچنے لگتا ہوں کہ اس قسم کا، بلکہ بعض اوقات اس سے شدید تجربہ مجھے مسلمانوں کی طرف سے بھی ہو رہا ہے۔ یہ دوسرا احساس پہلے احساس کی تلخی کو گھٹا دیتا ہے۔ جس تلخ تجربہ کو فوری ردعمل کے تحت میں ہندو کے ساتھ جوڑ رہا تھا، زیادہ غور و فکر کے بعد وہ تجربہ زندگی کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے جن مسلمانوں نے تقسیم ہند کی تحریک چلائی، ان کا معاملہ یہی تھا کہ انھوں نے پہلی حقیقت کو جانا مگر وہ دوسری حقیقت کو نہ جان سکے۔ اگر وہ وسیع دائرہ میں سوچتے تو وہ جان لیتے کہ جن مسائل کی بنا پر وہ "ہندو انڈیا" سے بھاگنا چاہتے ہیں، وہ مسائل "مسلم انڈیا" (پاکستان) میں بھی باقی رہیں گے۔ جیسا کہ وہ فی الواقع وہاں باقی رہے۔

بیشتر انسان معاملات کو صرف سطحی طور پر دیکھ پاتے ہیں۔ وہ اپنی کم فہمی کی بنا پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کے لئے انتخاب برائی (EVIL) اور بے برائی (No Evil) کے درمیان ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں انتخاب ہمیشہ چھوٹی برائی (Lesser evil) اور بڑی برائی (Greater evil) کے درمیان رہتا ہے۔ اس دنیا میں کامیابی صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو اس راز کو پالیں۔ جو لوگ اس راز کو نہ پائیں، وہ امتحان کی اس دنیا میں

ہمیشہ ناکام اور برباد رہیں گے۔ وہ کبھی کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔

۱۴ اپریل ۱۹۸۹

سہ روزہ دعوت (یکم اپریل ۱۹۸۹) میں افغانی مجاہدین کے لیڈر صبغۃ اللہ مجددی (۶۲ سال) کا مفصل انٹرویو شائع ہوا ہے۔ وہ جامعہ ازہر قاہرہ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ اور مجاہدین کی آئندہ بننے والی حکومت میں ان کو سربراہ مملکت کی حیثیت سے منتخب کیا گیا ہے۔

انٹرویو میں انھوں نے کہا کہ "امریکہ نے بھی جہاد میں ہماری امداد کی اور بیشتر اسلحہ ہمارے پاس امریکہ ہی سے آئے تھے"۔ دوسری طرف اسی انٹرویو میں انھوں نے کہا کہ "بالفعل عرب بھائیوں کی کوئی امداد گزشتہ دس سالوں میں ہم تک نہیں پہنچی" صفحہ ۲۔

مسلمانوں کے اخبارات (بشمول دعوت) یہ تاثر دیتے رہے ہیں کہ افغانی مجاہدین کی جنگ اس دور کا سب سے بڑا اسلامی جہاد ہے۔ دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ امریکہ اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اب یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جو قوم اسلام کی سب سے بڑی دشمن ہے، وہی سب سے بڑے اسلامی جہاد کی سب سے بڑی مددگار بھی ہے ـــــ خوش فہمی کیسے کیسے تضادات کو بیک وقت اپنے ذہن میں جمع کر لیتی ہے۔

۱۵ اپریل ۱۹۸۹

آجکل ہندستان میں عربی پرچوں کی بہتات ہے۔ اکثر مسلم اداروں نے ایک نہ ایک عربی پرچہ نکال رکھا ہے۔ یہ تمام کے تمام عربی پرچے غیر معیاری ہیں۔ وہ زبان اور بیان دونوں اعتبار سے ناقص ہیں۔ کچھ پرچوں کے نام یہ ہیں:

۱	البعث الاسلامی	لکھنؤ
۲	الرائد	لکھنؤ
۳	الکفاح	دہلی
۴	الداعی	دیوبند
۵	الدعوۃ	دہلی
۶	صوت الامۃ	بنارس

۷	نشرۃ	بنارس
۸	صوت الحق	ترکیسر
۹	الصحوۃ الاسلامیۃ	حیدرآباد
۱۰	مجلۃ الرشاد	اعظم گڑھ
۱۱	صوت الاسلام	غازی پور

ان غیر معیاری عربی جرائد کی کثرت کا راز میری سمجھ میں اس وقت آیا جب مذکورہ جریدہ نمبر ۹ پر تبصرہ میں نے البعث الاسلامی (مئی ۱۹۸۹، شوال ۱۴۰۹ھ) میں دیکھا۔ تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ ہندستان میں بہت سے مجلات اور صحف عربی زبان میں نکل رہے ہیں۔ اس قسم کے اسلامی پرچوں کا خاص مقصد یہ ہے کہ ہندستانی مسلمانوں اور عالم عربی کے مسلمانوں کے درمیان وہ ربط وتعلق کا ذریعہ بنیں (ان الهدف الرئيسي من مثل هٰذه المجلات الاسلامية التي تصدر باللغة العربية ان تكون همزة وصل بين الهند الاسلامية والعالم الاسلامي

العربي، صفحہ ۹۹)

مسلمانوں اور ہندوؤں میں دعوتی ربط قائم کرنے کے لئے ہندی پرچہ یا مسلمانوں اور عیسائیوں میں دعوتی ربط قائم کرنے کے لئے انگریزی پرچہ کسی ادارہ نے نہیں نکالا۔ البتہ مسلمانوں اور عربوں کے درمیان ربط قائم کرنے کے لئے ہر ادارہ نے تیسرے درجہ کا ایک عربی پرچہ ضرور نکال رکھا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ اتنی واضح ہے کہ اس کو لفظوں میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

۱۶ اپریل ۱۹۸۹

پاکستان کی جماعت اسلامی کے موجودہ امیر قاضی حسین احمد صاحب کا ایک مضمون پڑھا۔ اس کا عنوان ہے "عالم اسلام کے مسائل اور ان کا حل"۔ اس مضمون میں افغانستان کے بارہ میں گفتگو کرتے ہوئے یہ سطریں درج ہیں:

"افغانستان کی سرزمین پر مجاہدین کی آخری مکمل فتح کا آغاز ہو چکا ہے۔ روسی فوج کی افغانستان سے واپسی ایک نئے دور کی ابتدا ہے جو اسلام کی نشأۃ ثانیہ پر منتج ہو سکتا

ہے۔ اہم ترین چیز یہ ہے کہ افغان جہاد محض جنگ آزادی نہیں۔ یہ اسلام کو عملاً اللہ کی سرزمین پر نافذ کرنے کی جدوجہد ہے، اور یہی اس جدوجہد کا طرۂ امتیاز ہے۔ افغان جہاد کی کامیابی محض مسلمانوں کی قوت و شوکت نہیں، دور جدید میں ایک خالص اسلامی حکومت کی بنیاد رکھنے کا تاریخ ساز واقعہ ہے۔" روزنامہ وفاق، لاہور، ۱۹ اپریل ۱۹۸۹

یہ بیان احمقانہ حد تک بے معنی ہے۔ افغانستان کی جنگ بلا شبہ ایک قومی جنگ ہے۔ اس کا آخری انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ایک جنگ ختم ہو کر دوسری جنگ شروع ہو جائے۔ جو لوگ اس جنگ کے نتیجہ میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ، اور خالص اسلامی حکومت کا خواب دیکھ رہے ہیں، وہ صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ سوچنے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہیں۔

تاہم ایک اور کام کے لئے یہ لوگ بے حد ہوشیار ہیں۔ آئندہ جب افغانستان میں "خالص اسلامی حکومت" قائم نہ ہو سکے گی تو فوراً ان کا زرخیز دماغ کچھ ایسی بیرونی سازشیں دریافت کر لے گا جس نے سارا نقشہ بگاڑ دیا اور اسلامی حکومت بنتے بنتے رہ گئی۔ گویا حق کے عوامل کمزور ہیں اور باطل کے عوامل اس سے زیادہ طاقتور۔

۱۷ اپریل ۱۹۸۹

حضرت عمر بھی صحابی تھے اور حضرت بلال بھی صحابی تھے۔ مگر دونوں کے یہاں بعض بڑے عجیب فرق پائے جاتے ہیں۔ حضرت بلال مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو ان کی شدید تکلیف کو دیکھ کر ان کے اہل خانہ کی زبان سے نکلا: واکرباہ (ہائے تکلیف) حضرت بلال نے اس کو سنا تو انھوں نے کہا کہ نہیں، بلکہ ہائے خوشی۔ کل کے دن میں اپنے دوستوں سے ملوں گا، محمد سے اور ان کے ساتھیوں سے (واطرباہ، غداً القی الأحبہ محمداً وصحبہ)

العبقریات الاسلامیہ، صفحہ ۱۸۲

حضرت عمر کا واقعہ اس سے بالکل مختلف تصویر پیش کرتا ہے۔ حضرت عمر پر ابولولو فیروز ایرانی نے عین اس وقت حملہ کیا جب کہ آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ اس نے کئی خنجر مار کر آپ کو زخمی کر دیا۔ زخم اتنا شدید تھا کہ موت یقینی ہو گئی۔ اس وقت آپ کی زبان سے جو کلمات نکلے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ اگر میرا معاملہ برابر ہو جائے، نہ مجھے کوئی سزا ملے اور نہ کوئی جزا، تو یقیناً

میں ایک خوش قسمت انسان ہوں گا (و ان نجوت کفافاً لا وزر ولا اجر إني لسعید) صفحہ ۵۳۷

دو صحابی کے آخری کلمات میں یہ فرق دراصل معرفت کا فرق ہے۔ حضرت عمر کا فقرہ ان کی معرفت کی گہرائی کا ترجمان ہے۔ اس کے مقابلہ میں حضرت بلال کا فقرہ معرفت کی سادگی کا ترجمان۔

۱۸ اپریل ۱۹۸۹

"عالمی زبان" اسپرانتو (Esperanto) میں ہالینڈ سے ایک رسالہ شائع ہوتا ہے۔ اس کا نام ہے اونو کالے نی۔ یعنی یو این او اور ہم۔ یہ رسالہ یو این او کے ذیلی ادارہ یونیسکو کے تعاون سے شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ کے شمارہ نمبر ۲ (1981) میں زبان کے بارہ میں ایک معلوماتی مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۸۷ میں کون سی زبان ساری دنیا کی زبانوں کی فہرست میں کس درجہ پر تھی۔ مضمون میں جن زبانوں کے بارہ میں معلومات دی گئی ہیں ان میں سے تین زبانوں کی فہرست یہ ہے:

درجہ	زبان	بولنے والوں کی تعداد
۱	چینی	۸۶۳ ملین
۲	انگریزی	۳۵۰ ملین
۳	ہندستانی	۲۳۰ ملین

اس فہرست میں بظاہر چینی زبان نمبر ایک پر ہے اور ہندستانی زبان، جو دراصل ہندی اور اردو کا مشترک نام ہے، انگریزی کے بعد صرف تیسرے نمبر پر۔ لیکن یہ تقسیم خالص علمی اعتبار سے صحیح نہیں۔

چینی زبان زیادہ تر صرف ایک ملک میں بولی جاتی ہے۔ ہندستانی زبان اگرچہ کئی ملکوں میں رائج ہے مگر یہ سب پسماندہ ممالک ہیں۔ بولنے والوں کی گنتی کے اعتبار سے چینی اور ہندستانی زبان کو ضرور پہلا اور تیسرا درجہ مل رہا ہے۔ لیکن اگر زیادہ گہرائی سے دیکھا جائے تو انگریزی زبان نہ صرف چینی اور ہندستانی بلکہ تمام دوسری زبانوں سے بالاتر نظر آئے گی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی زبان پوری دنیا میں بیشتر پڑھے لکھے لوگوں کی قابل فہم زبان ہے۔ وہ واحد زبان ہے جس کو انٹرنیشنل زبان کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ نیز انگریزی زبان میں ہر قسم کا وسیع لٹریچر موجود ہے۔ گنتی کے اعتبار سے دوسری زبانوں کو اوپر کا درجہ مل سکتا ہے مگر اہمیت کے اعتبار سے انگریزی نمبر ایک حیثیت رکھتی ہے۔

۱۹ اپریل ۱۹۸۹

دور جدید میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لئے اٹھنے والا پہلا ممتاز نام غالباً سید جمال الدین افغانی کا ہے۔ ان کی مزید خوش قسمتی یہ تھی کہ ان کو دو ایسی قابل شخصیتیں ملیں جنھوں نے ان کی تحریک کو ان کے بعد پوری طاقت کے ساتھ جاری رکھا۔ اس طرح جمال الدین افغانی سمیت تین اعلیٰ افراد کے ذریعہ، یہ مشن پوری ایک صدی تک مسلسل جاری رہا۔

جمال الدین افغانی	۱۸۹۷	۱۸۳۸
مفتی محمد عبدہ	۱۹۰۵	۱۸۴۹
محمد رشید رضا	۱۹۳۵	۱۸۵۶

ملت کے انتہائی قیمتی افراد کے ذریعہ جاری رہنے والی اس سو سالہ جدوجہد کا کوئی حقیقی نتیجہ آج دیکھنا چاہیں تو وہ کہیں نظر نہیں آئے گا۔ ان کی تمام کوششیں ان کی زندگی میں پرشور الفاظ کی صورت میں گونجتی رہیں اور بالآخر ختم ہو کر رہ گئیں۔

ان مصلحین کے ذریعہ جو کام تقریباً سو سال تک جاری رہا، اس کو مختصر طور پر ان تین شقوں میں بیان کیا جاتا ہے:

۱ مسلمانوں کے ذہن وفکر کی اصلاح

۲ مسلم ملکوں کے حکام کی اصلاح

۳ سامراجی طاقتوں کی سازشوں کی نشاندہی اور ان کے خلاف دنیا کے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنا۔

جمال الدین افغانی اور ان کے ساتھی اگر اپنی ساری توجہ صرف پہلے کام پر لگاتے اور دوسرے اور تیسرے کام میں اپنے کو نہ الجھاتے تو یقیناً ان کی کوششیں نتیجہ خیز ہو سکتی تھیں۔ کیوں کہ پہلا کام

ہی اصل کام ہے۔ پہلے کام کے ساتھ دوسرے کاموں کو چھیڑنا صرف اس قیمت پر ہوگا کہ دونوں میں سے کوئی ایک بھی انجام نہ پائے۔

۲۰ اپریل ۱۹۸۹

اسلامی فقہ کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ مصالح کے حصول پر مفاسد اور خرابیوں کو دور کرنا مقدم ہے (درء المفاسد مقدم علی جلب المصالح)

یہ ایک نہایت اہم اصول ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں ہمیشگی طور پر خیر کی طرف رجحان موجود ہے۔ اگر ماحول سے غلط محرکات کا خاتمہ کر دیا جائے تو انسان خود اپنی اندرونی فطرت کے زور پر خیر کو اختیار کرنے لگے گا۔ پانی کہیں رکا ہوا ہو تو رکاوٹ کو دور کرنا کافی ہے، اس کے بعد پانی اپنے آپ بہنے لگتا ہے۔

۲۱ اپریل ۱۹۸۹

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب (لاہور) کا ایک رسالہ حکمت قرآن ہے۔ اس کا شمارہ مارچ اپریل ۱۹۸۹ میں انھوں نے ۲۶ صفحات کا ایک مضمون شائع کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے: واما بنعمة ربك فحدث۔ اس مضمون کے آغاز میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ راقم اللہ کا جتنا بھی شکر کرے کم ہے کہ اس نے قرآن کے ضمن میں اس کی مساعی کو اس درجہ بارآور کیا کہ اس کے نام کو دنیا بھر میں کم از کم اردو بولنے والوں کی حد تک دعوت رجوع الی القرآن کے جلی عنوان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس کے بعد انھوں نے ربع صدی کے دوران اپنی کوششوں کا تفصیلی تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ بحمد اللہ دل کو یہ گہرا اطمینان حاصل ہے کہ: "جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے!" کے مصداق عمر کے بہتر اور بیشتر حصے کے دوران جسم وجان کی بہتر اور بیشتر توانائیاں نوید نبویؐ: "خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ" کے مطابق بہترین کام میں صرف ہوئی ہیں۔ گویا شکر صد شکر کہ جتا زہ بمنزل رسید!" اس کے ساتھ ہی دل میں اس امید کا چراغ بھی روشن ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس کی توفیق عطا فرمائی تو لغزشوں، خطاؤں اور کوتاہیوں سے درگزر فرماتے ہوئے شرف قبول بھی ضرور عطا فرمائے گا۔ حکمت قرآن اپریل ۱۹۸۹، صفحہ ۱۲-۱۱

عجیب بات ہے کہ اس معاملے میں میرے احساسات ڈاکٹر صاحب سے بالکل مختلف ہیں۔ اگرچہ بظاہر میرے کام کی نوعیت بھی وہی ہے جو ڈاکٹر صاحب کے کام کی ہے۔ مگر میں ایک تنکے کے بقدر بھی اپنے کاموں کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا۔ میری دعا ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ میرا عمل، خواہ وہ برا ہو یا بظاہر اچھا، ان سب کو خدا میرے نامۂ اعمال سے حذف کر دے، اور مجھے صرف اپنے رحم وکرم سے بخش دے۔" شکر کہ جنازہ بمنزل رسید" کے بجائے میری زبان پر اکثر یہ شعر رہتا ہے۔

صبح گزری شام ہونے آئی میر　　　تو نہ چیتا اور بہت دن کم رہا

۲۲ اپریل ۱۹۸۹

نئی دہلی کے جس مکان میں میں رہتا ہوں، وہ دو منزلہ ہے۔ نیچے سے اوپر تک اس کی ۳۶ سیڑھیاں ہیں۔ آج رمضان ۱۴۰۹ھ کی ۱۵ تاریخ تھی۔ رات کو سحری کے لئے اوپر جانے لگا۔ تقریباً ۳۰ سیڑھیاں طے کی تھیں کہ اچانک موت کا خیال آگیا۔ میری عمر اب ۶۵ سال ہو چکی ہے۔ اب میں زندگی کے مقابلہ میں موت سے زیادہ قریب ہوں۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا گویا کہ میں دنیا سے آخرت کی طرف جا رہا ہوں۔ یہ سوچ کر دل بھر آیا۔ زبان پر یہ الفاظ آگئے:

" زندگی کی بیشتر سیڑھیاں چڑھ چکا، اب آخری چند سیڑھیاں باقی ہیں۔"

۲۳ اپریل ۱۹۸۹

اپریل کا پورا مہینہ کشمیر کے لئے تشدد کا مہینہ تھا ــــ توڑ پھوڑ، گولی اور بم۔ یہ سب وہاں کے مسلم نوجوان کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں ایک کشمیری حسنین اختر (فتح کدل، سرینگر) کا مراسلہ قومی آواز، ۲۴ اپریل ۱۹۸۹ میں شائع ہوا ہے۔

" اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کشمیر کے نوجوانوں کو کس چیز نے شر پسندی پر اکسایا؟ اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ دہشت گرد اور تخریب کار حکومت سے مندرجہ ذیل مطالبے کر رہے ہیں:

۱. غیر کشمیریوں کو باہر نکال دیا جائے۔
۲. جمعہ کے دن عام تعطیل کی جائے۔

۳۔ ریستوران و بار رمضان کے مہینہ میں بند رکھی جائیں۔

۴۔ عورتیں پردے میں رہ کر باہر نکلیں۔

ہر سال موسم سرما میں لاکھوں کشمیری تجارت اور روزگار کے لئے پورے بھارت میں جاتے ہیں۔ اگر "ہندستانیوں" کے لئے کشمیر کا دروازہ بند کر دیا جائے تو کشمیریوں کے لئے ہندستان کا دروازہ کس منطق سے کھلا رہے گا۔

کشمیر میں مسلمانوں کے لئے یہ خصوصی سہولت ہے کہ وہاں جمعہ کے دن نماز کے لئے دو گھنٹہ کی چھٹی دی جاتی ہے۔ اتوار کی چھٹی اس کے علاوہ ہے۔ ایسی حالت میں اگر اتوار کی چھٹی ختم کرکے جمعہ کے روز چھٹی دی جانے لگے تو اس سے کشمیریوں کو کیا فائدہ ہوگا۔

کشمیر میں ۸۰ فیصد سے زیادہ ہوٹل مسلمانوں کے ہیں۔ اور وہاں کی بیشتر آبادی بھی مسلمان ہے۔ ایسی حالت میں مسلمان اگر روزہ کی پابندی کریں تو ان کے ہوٹل اپنے آپ بند ہو جائیں گے۔ یہ مطالبہ مسلمانوں سے کیا جانا چاہئے نہ کہ موجودہ سیکولر حکومت سے۔

کشمیر کی ۹۰ فیصد آبادی مسلمان ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں کی آبادی میں ۹۰ فیصد مسلمان عورتیں ہیں۔ اگر مسلمانوں کے درمیان پردے کا رواج ہو تو چوتھا مطالبہ اپنے آپ حاصل ہو جائے گا۔ یہ کام بھی خود مسلمانوں کو کرنا ہے۔ اس کا ہندستان کی سیکولر حکومت سے کیا تعلق۔

۲۴ اپریل ۱۹۸۹

آسکر وائلڈ (Oscar Wilde) نے کہا کہ عدم قناعت ترقی کا پہلا زینہ ہے، ایک فرد کے لئے بھی اور ایک قوم کے لئے بھی:

Discontent is the first step in the progress of a man or nation.

آدمی کے اندر ہر قسم کی صلاحیتیں پیدائشی طور پر موجود ہیں۔ مگر عام حالت میں وہ سوئی ہوئی رہتی ہیں۔ جب کوئی ٹھیس لگتی ہے یا کوئی محرومی پیش آتی ہے تو اس کے نتیجے میں آدمی کے اندر عدم قناعت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی سوئی ہوئی طاقتیں جاگ پڑتی ہیں۔ اس وقت وہ ایسے کام کر گزرتا ہے جو وہ عام حالت میں نہیں کر سکتا تھا۔

آدمی اپنی موجودہ حالت پر مطمئن ہو جائے تو وہ جہاں ہے وہیں پڑا رہے گا۔ اور جب وہ اپنی حالت پر مطمئن نہ ہو تو مزید آگے بڑھنا چاہے گا۔ اس طرح عدم قناعت آدمی کے لئے محرک عمل کا کام کرتی ہے۔

۲۵ اپریل ۱۹۸۹

عربی میں جس چیز کے لئے "لا لحب علی بل لبغض معاویۃ" کی مثل ہے، اسی کو اردو میں کہا جاتا ہے ——— دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔

مجھے اپنی زندگی میں اس کی ایک مثال مولانا ابوالحسن علی ندوی اور ان کے حلقہ کی صورت میں نظر آئی۔ مولانا موصوف میری بعض تنقیدوں کی وجہ سے مجھ سے خفا ہیں۔ چنانچہ آجکل وہ میرے "دشمن" محمد ہاشم قاسمی کے دوست بن گئے ہیں جنھوں نے ہمارے مرکز کی بلڈنگ (حیدرآباد) پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے اور مرکز کے اکاؤنٹ میں خیانت کر کے اس کو اپنی ملکیت بنالیا ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی اور ان کا حلقہ آجکل محمد ہاشم قاسمی کی زبردست پذیرائی کر رہا ہے۔ محمد ہاشم قاسمی صاحب نے عرب کا ایک سفر کیا۔ اس کے سفرنامہ میں وہ لکھتے ہیں کہ سعودی عرب کا یہ سفر مولانا ابوالحسن علی ندوی کے مخلصانہ تعاون سے کامیابی سے ہم کنار ہو سکا (الفیصل اگست ۱۹۸۸)

مولانا ابوالحسن علی ندوی حیدرآباد کے سفر پر تھے۔ اس سلسلہ میں وہ محمد ہاشم قاسمی کی دعوت پر یکم جنوری ۱۹۸۹ کو ہمارے مرکز کی مغصوبہ بلڈنگ میں بھی گئے۔ اس طرح گویا انھوں نے محمد ہاشم قاسمی کے غصب اور خیانت کی تصدیق فرمائی (تعمیر حیات ۱۰ مارچ ۱۹۸۹، صفحہ ۴)

مولانا ابوالحسن علی ندوی کے حلقہ کے ایک خاص بزرگ مولانا عبداللہ عباس ندوی ہیں۔ محمد ہاشم قاسمی نے مولانا عبداللہ عباس ندوی کا مغصوبہ مرکز میں "استقبالیہ" دیا۔ عبداللہ عباس صاحب اپنے پرچہ "ذکر و فکر" میں سفرنامہ کے ذیل میں لکھتے ہیں "مولانا ہاشم القاسمی کے ادارہ میں استقبالیہ تھا۔ عصرانہ پر تکلف تھا۔ خلوص اور ذوق کے ساتھ کس طرح کام کیا جائے، یہ ادارہ اس کا اچھا نمونہ ہے (ذکر و فکر، مئی ۱۹۸۹، صفحہ ۹ - ۱۰) یہ مضمون دوبارہ تعمیر حیات ۱۰ مئی ۱۹۸۹ میں نقل کیا گیا ہے۔

یہ واقعات بتاتے ہیں کہ ان لوگوں میں اللہ کی ناراضگی کا اتنا بھی خوف نہیں ہے جتنا کہ کسی عرب شیخ کی ناراضگی کا۔ مولانا علی میاں ایسا نہیں کرسکتے کہ وہ سعودی عرب کے دشمن کو اپنا دوست بنائیں، مگر وہ وحید الدین خاں کے دشمن کو اپنا دوست بنا رہے ہیں۔ یہ فرق واضح طور پر اس کا ثبوت ہے کہ مولانا موصوف کو سعودی عرب کا خوف ہے مگر انھیں اللہ کا خوف نہیں۔

۲۶ اپریل ۱۹۸۹

میری زندگی کا تلخ ترین تجربہ یہ ہے کہ آدمی کے اوپر جب تک تجربات کا رولر نہ چلے، وہ کسی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا۔ انسان کو عقل دی گئی ہے۔ اس اعتبار سے انسان کو چاہئے تھا کہ وہ نظری دلیل کو مان کر حقیقت کا اعتراف کرلے۔ مگر کم از کم میرے تجربہ میں اب تک کوئی ایسا انسان نہیں آیا۔ میں نے جن انسانوں کو سنایا جانا، وہ سب وہی تھے جن کو حالات کا دباؤ تو منوا سکتا تھا مگر نظری دلیل کی طاقت ان کے لئے بالکل غیر مؤثر تھی۔

مجھے نہیں معلوم کہ باعتبار حقیقت ایسے انسانوں کا درجہ کیا ہے۔ مگر میرے خیال کے مطابق تو یہ زندگی کی حیوانی سطح ہے نہ کہ زندگی کی انسانی سطح۔

۲۷ اپریل ۱۹۸۹

آج صبح فجر کی نماز کے لئے کالی مسجد (نظام الدین) جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک جگہ سڑک پر نیم کی پتیاں پڑی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے سوچا کہ نیم کی یہ پتیاں کس قدر خوش قسمت ہیں۔ کچھ دن وہ درخت پر سرسبز حالت میں رہیں۔ اس کے بعد وہ اپنی شاخوں سے ٹوٹ کر سڑک پر پڑی ہوئی ہیں۔ یہاں وہ مسافروں کے قدموں کے نیچے پامال ہوتی رہیں گی۔ یہاں تک کہ مٹ کر ختم ہو جائیں گی۔

ان کے مقابلہ میں انسان کا معاملہ کتنا سخت ہے۔ انسان بھی زندگی کی شاخ پر کچھ دن ہرا بھرا رہتا ہے۔ اس کے بعد موت آتی ہے اور اس کو شاخ سے جدا کر دیتی ہے۔ مگر یہ جدا ہونا اس کے لئے مٹنے کے ہم معنی نہیں ہوتا۔ بلکہ عالم الغیب کے سامنے حساب کے لئے حاضری کے ہم معنی ہوتا ہے ـــــ پتی کا معاملہ کتنا زیادہ آسان ہے، اور انسان کا معاملہ کتنا زیادہ مشکل۔

۲۸ اپریل ۱۹۸۹

آج ۲۱ واں روزہ ہے۔ رمضان سے پہلے میں کسی قدر تردد میں تھا۔ مگر رمضان آیا تو ۲۱ روزے اتنی تیزی سے گزر گئے کہ کچھ احساس ہی نہیں ہوا۔ البتہ کمزوری بڑھ گئی ہے۔ آجکل روزانہ ایک دو بار چکر آجاتا ہے۔

آج دوپہر کے وقت آخرت کی باتیں سوچتے ہوئے خیال آیا کہ ساری زندگی میں نے سب سے زیادہ جنت کی تمنا کی۔ لیکن اگر اعمال کو دیکھوں تو اپنے اعمال کی بنا پر میں کسی بھی درجہ میں اپنے آپ کو جنت کا مستحق نہیں سمجھتا۔ جنت میری سب سے زیادہ مطلوب چیز ہے، مگر جنت ہی وہ چیز ہے جو میرے لئے سب سے زیادہ مشتبہ ہے۔ کاش اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے وہ چیز دے دیں جس کا میں اپنے اعمال کے اعتبار سے مستحق نہ تھا۔

۲۹ اپریل ۱۹۸۹

او ایس مارڈن (O.S. Marden) کا قول ہے کہ ـــــ پر امید شخص وہاں کامیابی کو دیکھ لیتا ہے جہاں دوسرے لوگ ناکامی دیکھ رہے ہوتے ہیں، وہ وہاں روشنی دیکھتا ہے جہاں دوسرے لوگوں کو صرف تاریکی اور طوفان نظر آتا ہے:

The hopeful man sees success where others see failure, sunshine where others see shadows and storm.

۳۰ اپریل ۱۹۸۹

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام پڑھتے ہوئے مسلمان جو الفاظ آپ کے لئے بولتے ہیں، ان میں سے ایک شفیع المذنبین (گنہگاروں کی شفاعت کرنے والے) بھی ہے۔ یہ لفظ آپ کے لئے قرآن وحدیث میں کہیں نہیں آیا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے لئے قرآن میں غافر الذنب (المومن ۳) کا لفظ آیا ہے، یعنی گناہ بخشنے والا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال بھی عجیب ہے۔ وہ شفیع المذنبین سے واقف ہیں، جس کا ذکر قرآن وحدیث میں کہیں موجود نہیں۔ مگر وہ غافر المذنبین سے واقف نہیں، جس کا ذکر قرآن میں صراحۃً موجود ہے۔ کیسا عجیب ہے ان کا جاننا، اور کیسا عجیب ہے ان کا نہ جاننا۔

یکم مئی ۱۹۸۹

اخباری خبروں کے مطابق، آجکل بنگلہ دیش کے ہندوؤں میں ایک نئی تحریک ابھری ہے۔ اس کا نام "بنگو بھومی" بتایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بنگلہ دیش کے بعض علاقے جہاں ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے۔ وہاں یہ مطالبہ کیا جارہا ہے کہ اس کو بقیہ ملک سے الگ کرکے اس کو ہندوؤں کا ہوم لینڈ بنادیا جائے تاکہ ہندوؤں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے۔

مسلمانوں کے اخبارات اس تحریک کو "سازش" قرار دے کر اس کے خلاف لفظی بیانات دینے میں مصروف ہیں۔ اس سلسلہ میں قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ٹھیک اسی قسم کی علیحدگی پسندی کی سیاست خود مسلمان بہت سے ملکوں میں چلا رہے ہیں۔ جس ملک میں بھی اس کے کسی حصہ میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے، وہاں علیحدہ مسلم ریاست قائم کرنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔ مثلاً اریٹیریا، لبنان، برما، فلپائن، موزمبیق، وغیرہ۔

مسلم اخبارات ان ملکوں میں مسلمانوں کی علیحدگی پسندی کی تحریک کو آزادی کی تحریک قرار دے کر ان کی حمایت کرنے میں مصروف ہیں۔ اور بنگلہ دیش میں اسی قسم کی تحریک کو تقسیم ملک کی گھناؤنی سازش قرار دے کر اس کی مذمت کر رہے ہیں ——— موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کا یہی تضاد ہے جس نے ان کی تمام کوششوں کو بے ثمر بنا رکھا ہے۔

۲ مئی ۱۹۸۹

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ گفت گو کے دوران انھوں نے کہا کہ فلاں شخص کا انتقال ہوگیا۔ یہ سن کر میں چپ ہوگیا اور دیر تک چپ رہا۔ انھوں نے چپ ہونے کا سبب پوچھا۔ میں نے کہا کہ یہ خبر ہر ایک کو معلوم ہے کہ "فلاں شخص کا انتقال ہوگیا" مگر یہ خبر کسی کو معلوم نہیں کہ "میرا انتقال ہونے والا ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ جاننے والے بھی نہیں جانتے۔ سننے والوں نے بھی ابھی تک نہیں سنا۔

۳ مئی ۱۹۸۹

مولانا امیر اللہ خاں صاحب (محبوب نگر) رمضان کے دنوں میں کراچی گئے تھے۔ وہ وہاں ایک مہینہ گزار کر واپس آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اخلاقی اعتبار سے پاکستان کی حالت اتنی زیادہ

گر چکی ہے کہ اس کے مقابلہ میں ہندستان جنت معلوم ہوتا ہے۔

انھوں نے بہت سی مثالیں دیں۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ یہاں سے جاتے ہوئے انھوں نے دہلی ریلوے اسٹیشن سے دہلی سے اٹاری کے لئے ٹکٹ لیا جس کی قیمت فی ٹکٹ ۵۹ روپیہ تھی۔ چار ٹکٹ لے کر وہ آگے بڑھے تو ایک آدمی دوڑ کر آیا کہ ٹکٹ بابو آپ کو بلا رہے ہیں۔ وہ واپس ہو کر دوبارہ کھڑکی پر گئے تو انھوں نے چار روپیہ لوٹایا کہ آپ اس کو لینا بھول گئے۔ دوسری طرف لاہور اسٹیشن پر وہ لاہور سے ملتان کا ٹکٹ لینے کے لئے ایک کھڑکی پر گئے اور کلرک کو ۴۵ روپیہ دیا۔ اس نے پہلے روپیہ لے لیا۔ اس کے بعد یہ کہہ کر اس کو لوٹا دیا کہ یہ فرسٹ کلاس کے ٹکٹ کی کھڑکی ہے۔ سکنڈ کلاس کا ٹکٹ بازو کی کھڑکی سے ملے گا۔ انھوں نے اپنے روپیہ کو گنا تو اس میں دس روپیہ کم تھے۔ کلرک نے ۴۵ روپیہ لے کر صرف ۳۵ روپیہ لوٹائے تھے۔

مولانا امیر اللہ خاں صاحب نے بتایا کہ پاکستان کے ہر نوٹ پر لکھا ہوتا ہے: "حصول رزق حلال عین عبادت ہے۔" یہی جملہ سرکاری دفتر کی دیواروں پر بھی لکھا ہوا ہے۔ مگر عین اسی نوٹ سے اور عین اسی دفتر میں رشوت کا کاروبار اتنے بڑے پیمانے پر جاری ہے کہ اس کے مقابلہ میں ہندستان کے کرپشن کی کوئی حقیقت نہیں۔ پاکستان میں ہر کام کے لئے رشوت اس طرح مطالبہ کر کے لی جاتی ہے جس طرح کوئی دکاندار چیزوں کی قیمت گاہک سے مانگ کر وصول کرتا ہے۔

پاکستان کا نعرہ، پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ، اسلام پسند رہنماؤں کی نصف صدی کی جدوجہد، جنرل ضیاء الحق کا ساڑھے گیارہ سال کا اسلامائزیشن، سب نے صرف الٹا نتیجہ بر آمد کیا۔

۴ مئی ۱۹۸۹

جنوری ۱۹۷۷ میں مسلم یونیورسٹی میں ایک سمینار تھا۔ اس سلسلہ میں علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہاں یونیورسٹی کے مہمان خانہ میں میری ملاقات جماعت اسلامی کے ایک رکن ڈاکٹر عبد الحق صاحب سے ہوئی۔ ان کو جماعت اسلامی سے میری علٰحدگی پر اختلاف تھا۔ انھوں نے کہا کہ میرے یا آپ کے اندر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی والی صلاحیت تو ہے نہیں

میں یا آپ خود کوئی مشن کھڑا نہیں کر سکتے۔ اس بنا پر ہمارے لئے صحیح یہ ہے کہ ہم جماعت اسلامی کی تحریک سے وابستہ رہیں۔

جماعت اسلامی سے وابستگی کے بارہ میں میں ان کی رائے سے متفق نہ تھا۔ مگر یہ میرا بھی احساس تھا کہ میں خود کوئی مشن برپا نہیں کر سکتا۔ جس وقت علی گڑھ میں یہ بات ہو رہی تھی اس وقت اگرچہ الرسالہ کا اجراء عمل میں آچکا تھا۔ مگر میری ذات سمیت، کوئی بھی شخص یقین نہیں رکھتا تھا کہ وہ چند مہینے سے زیادہ مدت تک باقی رہ سکے گا۔

مگر الرسالہ نکلتا رہا۔ آج الرسالہ ساری دنیا میں پڑھا جا رہا ہے۔ وہ دوسری مطبوعات کے ساتھ مکمل معنوں میں ایک مشن بن چکا ہے۔ ۱۹۷۶ سے اب تک، اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی بہت سی غیر معمولی نصرتیں مجھے حاصل ہوئی ہیں جن کی وجہ سے الرسالہ ایک مشن بن سکا۔ ان میں بھی ایک سب بے حد خاص نصرت میری وہ لڑکی ہے جس کا نام فریدہ خانم ہے۔ فریدہ خانم نہ صرف میرے اردو کے کاموں میں مسلسل معاون رہی ہے، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ تنہا اسی کی کوششوں سے یہ ممکن ہوا کہ فروری ۱۹۸۴ میں الرسالہ کا انگلش اڈیشن جاری ہوا۔ یہ تمام تر اسی کا کارنامہ ہے جو اب تک انگریزی الرسالہ کو جاری رکھے ہوئے ہے۔

اس درمیان میں میری جن کتابوں کے انگریزی ترجمے شائع ہوئے ہیں، وہ تمام تر اسی کی تنہا کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ میرا احساس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر فریدہ خانم کے ذریعہ میری نصرت نہ فرمائی ہوتی تو ناممکن تھا کہ میں اس مشن میں انگریزی شعبہ کھولوں اور اس کو کامیابی کے ساتھ چلا سکوں۔

۵ مئی ۱۹۸۹

افغان باغیوں نے عبوری حکومت کے قیام کا اعلان کیا ہے۔ مگر ابھی ان کے پاس افغانستان میں کوئی جگہ نہیں جہاں وہ اپنی حکومت کا مرکز بنا سکیں۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے جلال آباد کو چنا۔ پندرہ ہزار مجاہدین نے جلال آباد پر حملہ کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ۱۹ مارچ تک وہ جلال آباد پر قبضہ کر لیں گے۔ مگر مارچ اور اپریل، دو مہینے کی کوشش کے باوجود وہ اب تک اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

یہ ایک سوال ہے کہ وہ مجاہدین جنھوں نے روسی فوجوں کو پسپائی پر مجبور کر دیا، وہ روسی فوجوں کی واپسی کے بعد جلال آباد پر قبضہ کیوں نہ کر سکے۔ قومی آواز (۴ مئی ۱۹۸۹) کی ایک رپورٹ کے مطابق، فوجی ماہرین کا کہنا ہے کہ جلال آباد میں افغان باغیوں کو اس وجہ سے شکست ملی ہے کہ پہلی بار انھوں نے گوریلا جنگ ترک کرکے براہ راست حملہ کیا جس کی ان میں نہ صلاحیت تھی اور نہ سکت۔

ایک اعتبار سے اگر آدمی کی مہارت ثابت ہو جائے تو ضروری نہیں کہ دوسرے اعتبار سے بھی وہ ضرور مہارت رکھنے والا ہوگا۔

۶ مئی ۱۹۸۹

اجودھیا کی بابری مسجد کے نام پر اٹھائی جانے والی تحریک آندھی کی طرح اٹھی اور غبارہ کی طرح پھٹ کر ختم ہوگئی۔ بابری مسجد تحریک کے نام نہاد لیڈر اب خود نجی مجلسوں میں اعتراف کرتے ہیں کہ بابری مسجد دوبارہ مسلمانوں کو ملنے والی نہیں۔

تاہم یہ تحریک اسلامی مرکز کے لئے ایک نعمت ثابت ہوئی ہے۔ راقم الحروف ۱۹۶۷ سے الجمعیۃ ویکلی کے ذریعہ ہندستانی مسلمانوں کو یہ سبق دیتا رہا ہے کہ ہندو مسلم معاملات میں وہ ٹکراؤ اور ایجی ٹیشن کا طریقہ اختیار نہ کریں بلکہ صبر و اعراض اور حکیمانہ تدبیر کے طریقہ پر مسائل کو حل کریں۔ ۲۰ سالہ کوشش کے باوجود بہت کم مسلمانوں کو یہ پیغام متاثر کر سکا تھا۔ مگر بابری مسجد کے ناکام تجربہ نے مسلمانوں کے ذہن کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ جو بات وہ دلیل سے سمجھ نہیں پا رہے تھے، اس کو انھوں نے حالات کے دباؤ کے تحت قبول کر لیا ہے۔

اس سلسلہ میں بار بار مثالیں سامنے آرہی ہیں۔ تازہ مثال سہسوان کی ہے۔ قومی آواز (۶ مئی ۱۹۸۹) میں سہسوان کے بارہ میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ "پشت والی دیوار کی اوٹ سے ایک سور کے بچے کو عین اس وقت مسجد کے اندر پھینکا گیا جبکہ مسجد کے اندر کچھ نمازی عبادت میں مشغول تھے .... سہسوان کی سب سے اہم مسجد میں ایک سور کے چھوٹے بچہ کو پیچھے سے پھینکا گیا، اس پر کچھ مسلمان چراغ پا بھی ہوئے۔ مگر سنجیدہ لوگوں نے بیچ میں پڑکر حالات پر قابو پالیا۔ واقعہ کی اطلاع مقامی کوتوالی میں

کی گئی اور پولیس حرکت میں آگئی ... معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

۷ مئی ۱۹۸۹

دنیا کی لذتیں انتہائی ناقص اور انتہائی محدود ہیں۔ اس لئے وہ انسان کا مقصود نہیں بن سکتیں۔ انسان فطری طور پر کامل اور لامحدود لذت چاہتا ہے۔ پھر ناقص اور محدود لذت کیوں کر اسے تسکین دے سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی لذتیں انسان کی طلب کا جواب نہیں ہیں اور نہ ہو سکتی ہیں۔

البتہ دنیا کی لذتوں کا ایک بہت بڑا فائدہ ہے۔ وہ آخرت کی عظیم لذتوں کا ابتدائی تعارف ہیں۔ محدود لذت کا موجود ہونا اس بات کا قرینہ ہے کہ لامحدود لذت کی موجودگی بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ اس طرح دنیا کی "جنت" آخرت کی "جنت" کے امکان کو ثابت کرتی ہے۔ کیوں کہ علمی اور عقلی اعتبار سے، کسی چیز کا ممکن ثابت ہونا ہی اس کی موجودگی کا ثابت ہو جانا ہے۔

۸ مئی ۱۹۸۹

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے ایک مشہور عالم کا نام لے کر کہا کہ آپ اکثر ان کے اوپر تنقید کرتے ہیں۔ کیا ان کی سب کتابیں غلط ہیں۔ کیا انھوں نے سب غلط باتیں ہی کہی ہیں۔ میں نے کہا کہ ایسا کوئی غلط کار دنیا میں پایا نہیں جاتا جس کی سب باتیں غلط ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ غلط وہ ہے جو صحیح میں غلط کو ملائے نہ کہ وہ جو صد فی صد غلط بات کہے۔ کیوں کہ ایسے غلط کار کا تو کوئی وجود ہی نہیں۔

انھوں نے میری بات سے اتفاق کیا۔ انھوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ میں نے قادیانی کی ایک کتاب پڑھی۔ اس میں مجھے بہت سی اچھی اچھی باتیں لکھی ہوئی نظر آئیں۔ حالانکہ قادیانی کو تمام علما نے کافر قرار دیا ہے۔

۹ مئی ۱۹۸۹

مولانا عبدالمتین بنارسی سے گفتگو کرتے ہوئے صحیح مسلم کی اس روایت کا ذکر آیا جو تأبیر نخل کے بارہ میں ہے اور جس میں ہے کہ آپ نے فرمایا: انتم اعلم باموردنیاکم

میں نے کہا کہ یہ حدیث مذہب کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب کو بتا رہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسانی معاملات دو قسم کے ہیں۔ ایک معاملات کا اخلاقی پہلو۔ دوسرا وہ جس کو معاملات کا ٹکنکل پہلو کہہ سکتے ہیں۔ مذکورہ حدیث نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ اخلاقی پہلو کو خدائی ہدایت کا پابند بناتے ہوئے ٹکنکل پہلو کے بارہ میں کہہ دیا کہ اس کو تحقیق اور تجربہ کی بنیاد پر قائم کرو۔ گویا دینی مطالعہ کو سائنسی ریسرچ سے جدا کر دیا گیا۔

دوسرے مذاہب اپنی موجودہ شکل میں ان دونوں پہلوؤں کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ انھوں نے ٹکنکل پہلو کو بھی مذہبی عقائد کے تابع کر رکھا ہے۔ مثلاً ہندو مذہب میں گائے کے گوشت کو طبی تحقیق کے بجائے مذہبی عقیدہ کے ماتحت کر دیا گیا ہے۔ عیسائی مذہب میں سورج اور زمین کی گردش کے معاملہ کو مذہبی عقیدہ کی حیثیت دے دی گئی۔ وغیرہ

ٹکنکل پہلو کو اس طرح مذہبی عقیدہ کے ماتحت کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ درخت کے پھل کی پیداوار کم ملے گی۔ انسان قیمتی گوشت کے فائدے سے محروم رہے گا۔ کائنات کے حقائق انسان کے اوپر ظاہر نہیں ہوں گے۔ وغیرہ۔ مذکورہ طریقہ کی بنا پر دوسرے مروجہ مذاہب سائنسی تحقیق اور ترقی کا دروازہ بند کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام نے سائنسی تحقیق اور ترقی کا دروازہ آخری حد تک کھول دیا ہے۔

۱۰ مئی ۱۹۸۹

احمد دیدات (جنوبی افریقہ) کا ایک مختصر انٹرویو اخبار العالم الاسلامی (مکہ) کے شمارہ ۱۸ رمضان ۱۴۰۹ ھ (۲۴ اپریل ۱۹۸۹) کے صفحہ اول پر چھپا ہے۔ بظاہر اس پر الدعوۃ الاسلامیۃ کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ مگر حقیقۃً وہ مناظرہ کے بارہ میں ہے۔

احمد دیدات کہتے ہیں کہ جو مناظرے میں نے کئے۔ ان کے سلسلہ میں میرا تجربہ مجھے یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ فتح ہمیشہ مجھ کو حاصل ہوگی۔ کیونکہ مسیحیت کے بارہ میں میری معلومات خود مسیحیوں کی اپنی معلومات سے زیادہ ہوتی ہیں (ان تجربتي في مناظراتي التي اجريتها تدفعني للتفاؤل بالانتصار دائما حيث ان معلوماتي عن

النصرانیۃ تفوق معلومات النصاری انفسہم عن دینہم)

احمد دیدات صاحب میرے نزدیک ایک مناظر ہیں نہ کہ داعی۔ ان کا انداز کلام مناظرانہ ہوتا ہے نہ کہ داعیانہ۔ مناظرہ ایک قسم کی لفظی جنگ ہے۔ اس کا مقصد فریق ثانی کے اوپر فتح حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دعوت خیر خواہی کا ایک عمل ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اسلام کی سچائی کو اتارا جائے اور اس کو خدا کے دین رحمت کے سایہ میں لایا جائے۔ مناظر دنیوی فتح و شکست کی اصطلاحوں میں سوچتا ہے، داعی اخروی جنت اور جہنم کی اصطلاحوں میں۔

۱۱ مئی ۱۹۸۹

مسٹر پرمود کمار بترا ایک بڑے ہندو افسر ہیں۔ انھوں نے امریکہ سے بزنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری لی ہے۔ آج ایک ملاقات میں انھوں نے کہا کہ پچھلے چند سالوں سے ٹیلی ویژن پر رامائن پر جو سیریل دکھائے جارہے ہیں، وہ بہت زیادہ انقلابی اثرات کے حامل ہیں۔ انھوں نے ہندوؤں کے اندر ایک نئی جاگ پیدا کی ہے۔ ہندو اپنی ویلوز سے ازسرنو واقف ہوئے ہیں۔ یہ بالکل ایک نیا ریولیوشن ہے۔

یہ محض خوش فہمی کی باتیں ہیں۔ کیوں کہ سماجی حالات کو دیکھا جائے تو ہندو سوسائٹی مسلسل بگاڑ کی طرف جارہی ہے۔ کرپشن میں دن بدن اضافہ ہورہا ہے۔ ہوم افیرس کے اسٹیٹ منسٹر مسٹر پی چدمبرم نے ۸ مئی ۱۹۸۹ کو لوک سبھا میں بتایا کہ دہلی میں جہیز کی موتوں (Dowry deaths) میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۸۷ میں ۵۹ نوجوان عورتوں کو ان کے سسرال میں جلا کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۸۸ میں اس طرح جلائی جانے والی نوجوان عورتوں کی تعداد ۷۱ تک پہنچ گئی (ٹائمس آف انڈیا ۹ مئی ۱۹۸۹) یہ تمام کی تمام عورتیں ہندو تھیں۔ اور صرف دہلی کی بات ہے۔

مسلمان بھی اسی قسم کی خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ ہندو اور مسلمانوں میں آجکل اس قسم کے پروگرام بہت سے چلائے جارہے ہیں۔ ان پروگراموں سے جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ صرف قومی فخر ہے، اور اسی قومی فخر کو دونوں فرقے غلطی سے قومی ترقی کے ہم معنی

سمجھ رہے ہیں۔

۱۲ مئی ۱۹۸۹

آج پاکستانی سفارت خانہ (نئی دہلی) کی ایک تقریب میں شرکت کی۔ میری کتاب پیغمبر انقلاب (انگریزی) پر حکومت پاکستان نے پہلا انٹرنیشنل انعام دیا ہے۔ اس کے سلسلہ میں سفارت خانہ کی طرف سے یہ تقریب ہوئی۔ دہلی کا پاکستانی سفارت خانہ ۱۵ ایکڑ رقبہ میں قائم ہے۔ اس میں تقریباً ۲۰۰ آدمی کا اسٹاف ہے۔

تقریب سے واپس آنے کے بعد میں نے سوچا کہ اگر میں یہ کہوں "جس طرح دنیا میں حکومت پاکستان نے میری کتاب کو قابل انعام قرار دیا ہے، اسی طرح انشاء اللہ آخرت میں وہ خدا کے یہاں بھی قابل انعام قرار پائے گی" تو یہ جملہ بظاہر گرامر کے لحاظ سے صحیح ہوگا، مگر حقیقت کے اعتبار سے بلاشبہ وہ سراسر غلط ہے۔ دنیا میں انسان کا معاملہ انسان سے ہے۔ آخرت میں انسان کا معاملہ خدا سے ہوگا۔ بندوں کی نسبت سے ایک کتاب کی کوئی قیمت ہوسکتی ہے، مگر خدا کی نسبت سے کسی کتاب کی کوئی قیمت نہیں۔

۱۳ مئی ۱۹۸۹

پاکستان کے ایک تعلیم یافتہ بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا اس لئے یہاں اسلام کا نظام قائم ہونا چاہئے۔ مگر بدقسمتی سے آدھی صدی کے قریب کا عرصہ گزر گیا اور اب تک یہ کام نہ ہوسکا۔ میں نے کہا کہ اپنے بیان میں اگر آپ صرف ایک لفظ کی تبدیلی کر دیں تو آپ کو موجودہ صورت حال پر افسوس کی ضرورت نہ ہوگی۔ معمولی لفظی تبدیلی کے ساتھ آپ اس طرح کہیں کہ: پاکستان اسلام کے نعرہ پر بنا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں آدھی صدی سے نعروں کی سیاست جاری ہے۔ میں نے کہا کہ پاکستان اگر واقعۃً اسلام کے نام پر بنتا تو ۱۹۴۷ میں پاکستان بننے کے بعد ہی وہاں اسلام آجاتا۔ مگر حقیقت یہ ہے پاکستان اسلام کے نعرہ پر بنا۔ اس لئے بالکل فطری ہے کہ پاکستان بننے کے بعد وہاں نعروں کی سیاست کا زور ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی پیش آیا۔ پاکستان آج دنیا کا سب سے زیادہ نعرہ باز ملک ہے۔ اس میں نہ کوئی تعجب کی بات ہے اور نہ افسوس کی۔

۱۴ مئی ۱۹۸۹

دھولیہ (مہاراشٹر) میں مارچ ۱۹۸۹ میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ اس کے بارہ میں ایک مختصر مضمون الرسالہ (ستمبر ۱۹۸۹) میں ان شاء اللہ شائع ہوگا۔ دھولیہ کے دو آدمیوں نے بتایا کہ ہولی کے موقع پر ہندوؤں نے مسجد کی دیوار پر پانی پھینکا تھا۔ مگر جب دونوں فرقوں میں جھگڑا ہوگیا تو مسلمانوں نے معاملہ کو بھیانک بنانے کے لئے خود رات کے وقت مسجد کی دیواروں پر رنگ ڈال کر اس کو رنگین کر دیا تاکہ دیکھنے والے سمجھیں کہ ہندوؤں نے مسجد کی دیوار پر ہولی کا رنگ ڈالا تھا۔

میں نے کہا کہ میں اپنی رپورٹ میں یہ بات لکھ دیتا ہوں۔ مگر دھولیہ والوں نے سخت اختلاف کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہماری تمام رپورٹیں، تمام کاغذات اور مقدمہ کے بیانات، سب میں یہی بتایا گیا ہے کہ ہندوؤں نے رنگ پھینکا۔ اب اگر آپ لکھ دیں کہ ہندوؤں نے پانی پھینکا تھا اور مسلمانوں نے اپنی طرف سے رنگ ڈال دیا تو ہمارا کیس بگڑ جائے گا۔

میں نے کہا کہ ہندستانی مسلمانوں کا یہی مزاج ہے جس نے انھیں خدا کی مدد سے محروم کر رکھا ہے اور وہ مسلسل بربادی کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ خدا کی مدد ہمیشہ سچ پر آتی ہے۔ جھوٹ پر کبھی خدا کی مدد نہیں آتی۔ آپ لوگ جھوٹ پر خدا کی مدد اتارنا چاہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ آج تک آپ کے اوپر نہیں اتری۔

۱۵ مئی ۱۹۸۹

پاکستان کے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے انجمن خدام القرآن قائم کی ہے۔ اس کے آرگن کے طور پر ماہنامہ میثاق نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ مئی ۱۹۸۹ میں صفحہ ۷۳ پر ایک مضمون کا عنوان ہے:

بھارت میں دعوت رجوع الی القرآن کا ایک نیا مرکز۔ یہ کلیان (بمبئی) کے معین الدین ڈون کا خط ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ آپ کے تین رسالے (میثاق، حکمت قرآن، ندا) باقاعدگی سے مل رہے ہیں۔ نوجوانان ہند، جن کی جذباتی وابستگی پاکستانی مسلمانوں سے آج بھی جوں کی توں برقرار ہے، کے لئے یہ ایک انمول تحفہ ہے۔ ہم نے ہر سال اپنی جانب سے کم از کم پانچ سو روپئے انجمن خدام القرآن لاہور تک پہنچانے کی ذمہ داری لی ہے، وغیرہ۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور ان کا ادارہ مسلح تصادم (Armed conflict) کے ذریعہ ساری دنیا میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے علمبردار ہیں۔ ایسی حالت میں ہندستانی مسلمان کا انھیں مذکورہ انداز کا خط لکھنا اور اس کا پاکستانی ماہنامہ میں نمایاں طور پر چھاپنا اشتعال انگیز حد تک غلط ہے۔ اس کی غلطی اس طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ پاکستان کا ایک ہندو اگر ہندستان کی تنظیم آر ایس ایس کو خط لکھے جو اکھنڈ بھارت کی علم بردار ہے۔ اس خط میں پاکستانی ہندو لکھے کہ پاکستان کے ہندو نوجوان بھارت کے ساتھ زبردست جذباتی وابستگی رکھتے ہیں اور ہم یہاں سے آر ایس ایس کو مستقل سالانہ مدد پہنچائیں گے تو ڈاکٹر اسرار سمیت تمام پاکستان کے مسلمان غصہ سے بھر جائیں گے اور پاکستانی ہندوؤں کو غدار سے کم کوئی لقب نہیں دیں گے۔ میرے نزدیک یہ کمینہ پن ہے کہ آدمی اپنے لئے کچھ پسند کرے اور دوسرے کے لئے کچھ۔

۱۶ مئی ۱۹۸۹

آج ایک تجربہ گزرا۔ اس کے بعد میری زبان پر یہ الفاظ آئے: قیامت میں جب دوسرے لوگ ناز بے گناہی کے ساتھ پہنچیں گے، یہ عاجز اور حقیر بندہ احساس گنہ گاری کے ساتھ آہستہ قدموں کے ساتھ چلتا ہوا آئے گا۔

۱۷ مئی ۱۹۸۹

میرے خلاف آجکل تنقیدوں کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔ بولنے والے بول رہے ہیں۔ مگر سب کا خلاصہ صرف ایک ہے۔ یہ تمام لوگ میری تنقیدوں سے برہم ہیں۔ عثمان غنی عادل صاحب نے اخبار انقلاب (بمبئی) میں کئی قسطوں میں ایک مضمون شائع کیا ہے، اس میں لکھتے ہیں:

"صاحب الرسالہ کے عتاب کا نشانہ زمانہ بعید اور زمانہ قریب کی بے شمار شخصیتیں بنتی رہی ہیں۔ صاحب الرسالہ کی اعلیٰ اور روشن تحریروں کا یہی ایک کمزور پہلو ہے جو ان کے مثبت پہلوؤں کی قدر بھی گھٹا دیتا ہے۔"

میرے ناقدین کا حال یہ ہے کہ ان میں سے کسی نے اب تک میرے نقطۂ نظر کو دلیل سے رد نہیں کیا۔ ان کی تمام تحریریں الزام بازی، استہزاء اور اظہار غضب کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ جب کہ میری

تنقید بس دلیل پر مبنی ہوتی ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ لوگوں نے خود اپنے لئے تو تنقیص تک کو جائز ٹھہرا رکھا ہے، مگر مجھے علمی تنقید کی بھی اجازت نہیں۔

۱۸ مئی ۱۹۸۹

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے بارہ میں میرا احساس یہ ہے کہ ان کا سب سے بڑا مذہب شخصیت پرستی ہے نہ کہ خدا پرستی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ خدا کے خلاف روزانہ بے شمار لٹریچر چھپ رہے ہیں، مگر اس کو دیکھ کر مسلمانوں میں کوئی جذبہ نہیں بھڑکتا۔ وہ ٹھنڈے ذہن کے تحت ان کو برداشت کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے انسانی اکابر پر تنقید کر دیجئے تو وہ آخری حد تک بھڑک اٹھیں گے۔

مسلمانوں کے ہر گروہ نے کسی نہ کسی کو اپنا بڑا بنا رکھا ہے۔ وہ سب کچھ سن سکتا ہے مگر اپنے بڑے کے خلاف کچھ بھی سننے کے لئے تیار نہیں۔ اسی کا نام شخصیت پرستی ہے، اور شخصیت پرستی ایک قسم کا شرک ہے۔

۱۹ مئی ۱۹۸۹

مسٹر ایس ایس بھٹناگر (غازی آباد) کائستھ ہیں۔ وہ اچھی اردو جانتے ہیں اور الرسالہ کے قاری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہندوؤں میں کثرت سے ایسے لوگ ہیں جو اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے غازی آباد کے کئی ہندوؤں کے نام اور پتے بتائے جو بھٹناگر صاحب کے ذریعہ اردو زبان پڑھ رہے ہیں۔

اردو کی اصل کمی یہ نہیں ہے کہ اس ملک میں اردو کے خلاف تعصب پایا جاتا ہے۔ اردو کی اصل کمی یہ ہے کہ اس میں تخلیقی اور صحت بخش لٹریچر نہیں۔ اگر مسلم علما اور دانشور محنت کرکے ایسی کتابیں لکھیں جو اسلام کے آفاقی اور انسانی پہلوؤں کو اعلیٰ اسلوب میں پیش کرتی ہوں تو نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی اس کو ضرور پڑھیں گے۔

ہندوؤں کی اصل مشکل رسم الخط کا مسئلہ ہے۔ ہندو عام طور پر اردو زبان سمجھتے ہیں۔ البتہ وہ اس کو پڑھ نہیں پاتے۔ اس کا ایک حل یہ ہے کہ عام دل چسپی کے مضامین پر معیاری قسم کے کیسٹ تیار کئے جائیں اور ان کو ہندوؤں میں بڑے پیمانہ پر پھیلا جائے۔ یہ اردو کو زندہ

رکھنے کی سب سے طاقت ور ضمانت ہے۔

۲۰ مئی ۱۹۸۹

آج صبح کو فجر سے پہلے نیند کھلی۔ بستر پر لیٹا ہوا اپنا احتساب کر رہا تھا۔ اپنے اعمال نامہ میں مجھے صرف غلطیاں نظر آئیں۔ کوئی ثواب کا کام دکھائی نہیں دیا۔ میری زبان سے نکلا: لوگ اپنے آپ سے خوش اور ساری دنیا سے خفا ہوتے ہیں۔ میرا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ میں ساری دنیا سے خوش اور صرف اپنے آپ سے خفا ہوں۔

۲۱ مئی ۱۹۸۹

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ رجال کو حق سے پہچانا جاتا ہے، حق کو رجال سے نہیں پہچانا جاتا (انما یعرف الرجال بالحق ولا یعرف الحق بالرجال)

موجودہ زمانہ کے مسلمان اس قول کے بالکل برعکس ہیں۔ موجودہ مسلمانوں کے نزدیک حق کی پہچان یہ ہے کہ ان کے مفروضہ اکابر اس کی تصدیق کرتے ہوں۔ ان کے اکابران کے لئے حق کا معیار بن گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اکابر پر تنقید کو بالکل برداشت نہیں کرتے۔ حق کا مجروح ہونا انھیں گوارا ہے، مگر انھیں یہ گوارا نہیں کہ ان کے اکابر کی شخصیتیں مجروح ہوں۔

۲۲ مئی ۱۹۸۹

ولیم چاننگ (Wiliam E. Channing) کا قول ہے کہ غلطی ایک طریقہ ہے جس ذریعہ ہم ترقی کرتے ہیں:

Error is the discipline through which we advance.

اس میں شک نہیں کہ غلطی آدمی کو نئے نئے راستے دکھاتی ہے، وہ آدمی کو ترقی کی طرف لے جاتی ہے۔ مگر غلطی کا یہ فائدہ اس وقت ہے جب کہ غلطی کا اعتراف کیا جائے۔ اعتراف نہ کرنے کی صورت میں غلطی صرف نقصان ہے۔ مگر اعتراف کرنے کی صورت غلطی ترقی کا زینہ بن جاتی ہے۔

۲۳ مئی ۱۹۸۹

رابرٹ ہیرک (Robert Herrick) کا قول ہے کہ یہ دراصل انجام ہے جو ہمیں سرفراز کرتا ہے نہ کہ صرف لڑنا:

It is the end that crowns us, not the fight.

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا معاملہ اس مقولہ کے بالکل برعکس ہے۔ وہ مسلسل بے نتیجہ لڑائی لڑ رہے ہیں اور یک طرفہ طور پر بربادی اور ہلاکت سے دوچار ہوتے ہیں۔ مگر ان میں کوئی نہیں جو ان لڑائیوں کو انجام کے اعتبار سے جانچے۔ وہ صرف ایک بات جانتے ہیں —— اپنی جھوٹی لڑائیوں کو قربانی کے خانہ میں ڈال کر فخر کرتے رہنا۔

۲۴ مئی ۱۹۸۹

ایک صاحب کو ہم مرکز میں بطور کارکن بلانا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان سے خط و کتابت ہوئی۔ ہم نے یہ کہا کہ فی الحال ہم آپ کو ایک ہزار روپیہ مہینہ دے سکتے ہیں۔ ان کا اصرار یہ تھا کہ ان کا مشاہرہ دو ہزار روپیہ مہینہ ہونا چاہئے۔ زیادہ تنخواہ پر وہ اتنا زیادہ مُصر رہے کہ انھوں نے ہماری پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آج ان سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے اپنی بعض تقریروں کا خلاصہ بتایا۔ اپنی ایک تقریر کی روداد بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں نے لوگوں کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ آدمی کو اصول کے معاملہ میں حساس ہونا چاہئے اور مادی چیزوں کے بارے میں غیر حساس۔

اس سلسلہ میں انھوں نے اپنی تقریر میں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کی لڑکیوں نے اپنے باپ سے شکایت کی کہ آجکل انھیں صرف پیاز اور مسور کی دال کھانے کو مل رہی ہے۔ عمر بن عبد العزیز نے جواب دیا کہ تم لوگ اس کو پسند کرتی ہو کہ پیاز اور مسور کی دال کھاؤ اور مرنے بعد جنت میں جاؤ یا یہ کہ عمدہ قسم کے کھانے کھاؤ اور مرنے کے بعد تمہیں جہنم میں داخل کیا جائے۔ (اوکما قال)

انھوں نے کہا کہ میری تقریر لوگوں نے بہت پسند کی۔ میں نے کہا کہ مگر مجھے آپ کی تقریر پسند نہیں۔ آپ اپنے لئے کچھ پسند کرتے ہیں اور دوسروں کے لئے کچھ۔ آپ دوسروں سے یہ کہہ رہے ہیں کہ "پیاز اور مسور کی دال" پر قناعت کرو اور خود اپنے لئے اس کے برعکس دسترخوان کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلم مقررین کا عام طور پر یہی حال ہے، ان کا عمل کچھ ہے اور

ان کی تقریر کچھ۔ یہی وجہ ہے کہ جلسوں اور تقریروں کی دھوم کے باوجود اس کا کوئی اصلاحی فائدہ نہیں ہوتا۔

۲۵ مئی ۱۹۸۹

۲۰ مئی کی شام کو میں میوات گیا تھا۔ چند دن ٹھہر کر آج واپس آیا۔ میوات میں موٹی روٹی پکائی جاتی ہے جو اکثر کچی ہوتی ہے۔ میں یہ روٹی کھاتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرا پیٹ بالکل خراب ہوگیا۔ پیٹ کا یہ حال ہوگیا کہ جیسے اس نے ہضم کرنے کی صلاحیت مکمل طور پر کھو دی ہو۔ سخت کمزوری آگئی۔

آج دہلی واپس آکر دوا کھائی۔ تشخیص بالکل صحیح تھی چنانچہ چند گھنٹہ کے اندر اس سے کنٹرول ہوگیا۔ اور پیٹ کی حالت درست ہوگئی۔

حدیث میں آیا ہے کہ ہر بیماری کے لئے دوا ہے (لکل داء دواء) اس دنیا میں ایک طرف مرض ہونا اور دوسری طرف اس کی دوا ہونا، ایک طرف مضر چیزوں کا ہونا اور دوسری طرف ایسی چیزوں کا ہونا جو ضرر کا ازالہ کرنے والی ہوں، یہ بتاتا ہے کہ اس دنیا کا خالق ایک صاحب شعور خالق ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں صرف ایک چیز پائی جاتی۔ اس کی مناسبت سے دوسری چیز کا وجود نہ ہوتا۔

۲۶ مئی ۱۹۸۹

اسلامی شاعر حسان بن ثابت الانصاری کا ایک شعر ہے۔ اس کے آخری مصرعہ میں وہ کہتے ہیں کہ میں اس چیز کا بہت زیادہ چھوڑنے والا ہوں جس کا میں عادی نہ بنا ہوں:

وَإِنِّي لَتَرَّاكٌ لِمَا لَمْ أُعَوَّدِ

اس شعر میں اعوّد کا لفظ غالباً ضرورت شعری کی بنا پر ہے۔ دوسرا کوئی لفظ یہاں زیادہ پُرمعنی ہوسکتا تھا۔ تاہم اس سے قطع نظر، شاعر اس میں جو بات کہنا چاہتا ہے وہ بہت اہم ہے۔ یعنی آدمی اپنے آپ کو اسی کام میں ڈالے جس کی واقعی استعداد اس کے اندر موجود ہو۔ جس کام کی استعداد آدمی اپنے اندر نہ پائے وہ اس کے اندر داخل ہونے سے آخری حد تک پرہیز کرے۔

۲۷ مئی ۱۹۸۹

فتنۂ ابن الزبیر (۷۳ھ) کے زمانہ میں حضرت عبداللہ بن عمر خانہ نشین ہوگئے۔ کچھ لوگوں نے

ان سے کہا کہ آپ اس جہاد میں حصہ کیوں نہیں لیتے۔ جب کہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ ان سے لڑو، یہاں تک فتنہ باقی نہ رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا کہ اس آیت کا تعلق اسلام اور شرک کی لڑائی سے ہے نہ کہ مسلمانوں کی آپس کی لڑائی سے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ وہ آیتوں اور حدیثوں کو جانتا ہو۔ اسی کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ وہ آیت اور حدیث کے موقع و محل سے واقف ہو۔ بصورت دیگر وہ آیت اور حدیث کا حوالہ دے گا، مگر وہ اس سے ایسا مطلب نکال رہا ہوگا جس کا قرآن و حدیث سے کوئی تعلق نہیں۔

۲۸ مئی ۱۹۸۹

امریکہ میں ہائی وے پر گاڑی چلانے کی آخری حد رفتار ۵۵ میل فی گھنٹہ ہے۔ اس حد بندی کے دو مقاصد ہیں۔ انتہائی تیز رفتاری کے باعث پٹرول کے ضیاع کو روکنا۔ اور حادثہ کے امکان کو کم کرنا۔ یہاں سڑک کنارے ہر ایک سو گز کے فاصلہ پر رفتار چیک کرنے والے خاص راڈار (RADAR) نصب کئے گئے ہیں۔ اس کے نیچے جلی حرفوں میں یہ عبارت درج رہتی ہے :

آپ کی رفتار راڈار کے ذریعہ چیک کی جارہی ہے۔ محتاط رہئے۔

اگر آدمی کے اندر خدائی احساس زندہ ہو تو وہ سڑک کی اس وارننگ میں زندگی کی وارننگ پڑھ لے گا۔ وہ دنیا کے واقعہ میں آخرت کی حقیقت کو پا جائے گا۔

۲۹ مئی ۱۹۸۹

ٹائم میگزین (۲۹ مئی ۱۹۸۹) کے صفحہ ۳ پر نہایت نمایاں انداز میں آسکر وائلڈ (Oscard Wilde) کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ یہ دراصل شخصیتیں ہیں نہ کہ اصول جو زمانہ کو حرکت دیتے ہیں:

It is personalities, not principles that move the age.

میں سمجھتا ہوں کہ یہ نصف صداقت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ طاقت ور شخصیتیں ہی کوئی بڑا انقلاب لاتی ہیں۔ مگر خود طاقت ور شخصیتوں کی طاقت بھی اصول اور نظریہ ہی ہوتا ہے۔ جس آدمی

کے پاس کوئی طاقت ور نظریہ نہ ہو، وہ کوئی طاقت ور واقعہ بھی ظہور میں نہیں لاسکتا۔

۳۰ مئی ۱۹۸۹

مسٹر ایم جے اکبر کی کتاب جواہر لال نہرو کے بارہ میں چھپی ہے۔ اس کے ۶۰۹ صفحات ہیں، اور اس کا نام ہے:

Nehru: The Making of India

اس کتاب میں ہندستان کی تقسیم کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ مجھے یہ جاننے کی خواہش تھی کہ ہندستان کا اتحاد کیوں اسلام کے نام پر برباد کیا گیا تھا:

I needed to know why the unity of India had been destroyed in the name of Islam.

یہ صحیح ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ نصف صدی گزرنے کے باوجود پاکستان میں اسلام نہ آسکا۔ ایم جے اکبر کو اس پر تعجب ہوتا ہے۔ مگر مجھے اس سے بھی زیادہ تعجب ان مسلمانوں کی عقل پر ہے جنھوں نے یہ سمجھا کہ نعرہ بازی کی سیاست کے ذریعہ وہ ایک "اسلامستان" قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

۳۱ مئی ۱۹۸۹

سہ روزہ دعوت (یکم جون ۱۹۸۹) کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے "۲۷ مئی ۱۹۸۹ کو لندن کے ہائیڈ پارک میں مسلمانوں نے رشدی کی کتاب شیطانی آیات کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا جو پوری دنیا میں ہونے والا اب تک کا سب سے بڑا مظاہرہ تھا"

اس رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ "اطلاعات کے مطابق، ہفتوں کی تیاریوں کے باوجود مظاہرہ میں خاطر خواہ نظم وضبط نہیں تھا۔ اور جلسہ وجلوس ایک حد تک بدنظمی کا شکار رہا۔ ایک اطلاع کے مطابق ایک مرحلہ میں ایرانی اور عراقی مظاہرین کے درمیان تصادم بھی ہو گیا۔

قومی آواز (۲۹ مئی ۱۹۸۹) کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ تقریباً ۲۰ ہزار مسلمانوں نے لندن میں مظاہرہ کیا۔ مظاہرین ابتداءً ہائیڈ پارک میں جمع ہوئے جہاں مقررین نے پرجوش تقریریں کیں۔ اس کے بعد وہ جلوس کی شکل میں وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر کی رہائش گاہ کی طرف

چلے۔ رہائش گاہ کے قریب پہنچ کر مظاہرین تشدد پر اتر آئے۔ انھوں نے پولیس پر سنگ باری کی اور پولیس کی گاڑی کو الٹنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں پولیس نے جلوس کے اوپر لاٹھی چارج کیا۔

اس قسم کی خبروں پڑھ کر مجھے بے حد دکھ ہوتا ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں مسلمان انگلینڈ میں عزت کے ساتھ رہ رہے تھے۔ اب وہ اس ملک میں ذلیل بن کر رہنے پر مجبور ہوں گے۔ اسلامی دعوت کے مواقع کی بربادی اس کے علاوہ ہے۔ بظاہر یہ کام رسول اللہ کے نام پر کیا جارہا ہے۔ لیکن رسول اللہ آج اگر زندہ ہوں تو وہ ان مسلمانوں پر لعنت بھیجیں اور ان سے اپنی برأت کا اظہار کریں۔

یکم جون ۱۹۸۹

پرانا مقولہ ہے کہ : خطائے بزرگاں گرفتن خطا است۔ اس کا مطلب عام طور پر یہ لیا جاتا ہے کہ بزرگ لوگ اگر غلطی کریں تو اس پر تنقید کرنا غلطی ہے۔ یعنی اگر بزرگ غلطی کریں تب بھی ان پر تنقید نہ کرو۔

اس مقولہ کا یہ مطلب صحیح نہیں۔ اس کا صحیح مطلب غالباً یہ ہے کہ بزرگ اگر کوئی غلطی کردے تو اس کی تقلید نہ کرو۔ بزرگ کی غلطی بھی غلطی ہے۔ اس مقولہ کا ترجمہ غالباً یہ ہوگا کہ : بزرگوں کی غلطی کو لینا غلطی ہے۔

۲ جون ۱۹۸۹

سید امین الحسن رضوی (سابق ایڈیٹر ریڈئنس) نے مولانا مودودی کا ایک خط مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۶۴ ہفت روزہ اخبار نو (۲ جون ۱۹۸۹) میں شائع کیا ہے۔ ۱۹۶۵ میں پاکستان میں صدر کے عہدہ کے لئے الکشن ہوا۔ اس میں ایک طرف محمد ایوب خاں تھے اور دوسری طرف مس فاطمہ جناح۔ مولانا مودودی اور ان کی جماعت اسلامی نے فاطمہ جناح کی مکمل حمایت کی۔ اس پر سید امین الحسن رضوی کو اسلامی نقطۂ نظر سے تعجب ہوا۔ کیوں کہ اسلام میں عورت کی حکمرانی کو غلط بتایا گیا ہے۔ انھوں نے مولانا مودودی کو بطور استفسار ایک خط لکھا۔ مولانا مودودی نے ان لفظوں میں جواب دیا :

"میں ان نقصانات سے واقف ہوں جو صدر ایوب صاحب کی آمریت سے پاکستان کے لوگوں کو دینی، اخلاقی اور مادی حیثیت سے پہنچتے ہیں۔ اور مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ اگر یہ آمریت آئندہ کے لئے مستحکم ہوگئی تو مزید کیا نقصانات پہنچیں گے۔ ایسی حالت میں میرے لئے خدا کے حضور یہ ذمہ داری اپنے سر لینا ممکن نہیں کہ میرے کسی فعل کی وجہ سے یہ آمریت ملک پر از سر نو مسلط ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس انتخاب میں فاطمہ جناح کی تائید نہ کی گئی تو یہ آمریت پھر مسلط ہو جائے گی۔ اس کا مسلط ہونا میرے نزدیک ایک عورت کو سربراہ بنانے کی بہ نسبت کم از کم دس گنا زیادہ بڑا گناہ ہے۔"

۱۔ حدیث میں ہے کہ جو قوم عورت کو حکمراں بنائے وہ ہرگز فلاح نہیں پائے گی۔ مگر مولانا مودودی کے نزدیک پاکستان کی فلاح کی صورت یہ تھی کہ ایک عورت کو اس کا حکمراں بنایا جائے۔ ایسی حالت میں مولانا مودودی کے "احساس ذمہ داری" کا ماخذ اور جو کچھ بھی ہو، مگر اس کا ماخذ اسلام نہیں ہو سکتا۔

۲۔ واقعات بتاتے ہیں کہ مولانا مودودی کا اندازہ سیاسی اعتبار سے آخری حد تک غلط تھا۔ ۱۹۶۵ کے الکشن میں ساری مخالفانہ کوشش کے باوجود ایوب خاں دوبارہ برسراقتدار آگئے۔ ان کے بعد بھی مسلسل کوئی نہ کوئی آمر پاکستان پر مسلط ہوتا رہا ——— ایوب خاں، یحییٰ خاں، بھٹو، جنرل ضیاء الحق۔

مولانا مودودی کا مذکورہ خط اسلامی نقطۂ سے بھی غلط تھا اور سیاسی اندازہ کے لحاظ سے بھی غلط۔ یہ خط ان کے عالم ہونے کی حیثیت کو بھی مجروح کر رہا ہے اور ان کے مفکر ہونے کی حیثیت کو بھی۔

۳ جون ۱۹۸۹

حدیث کی کتابوں میں دوا علاج کے بارہ میں بہت سی روایتیں آئی ہیں۔ یہ روایتیں عام طور پر باعتبار سند زیادہ قوی نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ عرب کے اقوال ان میں شامل ہوگئے ہوں۔ تاہم ان میں بڑی حکمت کی باتیں ہیں۔

مثلاً ایک روایت میں ہے کہ: المعدۃ بیت الداء (معدہ بیماریوں کا گھر ہے)

یہ ایک حقیقت ہے کہ بیشتر بیماریوں کا سرچشمہ معدہ ہوتا ہے۔ اگر خوراک کے بارہ میں کامل احتیاط برتی جائے اور پُرخوری سے پرہیز کیا جائے تو آدمی بیشتر بیماریوں سے محفوظ رہے گا۔

۴ جون ۱۹۸۹

مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی میں برسراقتدار آنے کے بعد ترکی کو مغربی تہذیب میں ڈھالنا شروع کیا۔ اس سلسلہ میں اس نے نہایت احمقانہ اقدامات کئے۔ مثلاً ۱۹۲۴ میں مصطفیٰ کمال پاشا نے ایک حکم جاری کیا جس کی رو سے ترک لڑکیوں کے لئے سر پر اوڑھنی رکھنا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

۵۵ سال بعد ۱۹۸۰ میں ترکی کے اعلیٰ تعلیمی بورڈ نے خاموشی کے ساتھ ایک نیا اعلان جاری کیا۔ اس کے مطابق ترک لڑکیوں کے لئے سر کھولنا لازم نہ رہا۔ اب لڑکیوں کو یہ اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنے سر پر اوڑھنی رکھ سکتی ہیں ـــــ جدید مسلم قیادت پچھلے سو برس سے اسی قسم کے احمقانہ اقدامات میں مصروف ہے۔ کمال اتاترک نے اس حماقت کو بھونڈے انداز سے کیا۔ اور دوسرے لوگ اسی قسم کی حماقت کو زیادہ سلیقہ کے ساتھ کر رہے ہیں۔

۵ جون ۱۹۸۹

نیویارک کے ٹائم میگزین (۵ جون ۱۹۸۹) میں جاپان کے بارہ میں ایک مضمون ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ پر جاپان کا اقتصادی حملہ اتنا شدید ہے کہ امریکہ میں تحفظاتی احساس (Protectionist sentiment) پیدا ہو گیا ہے۔ وہ امریکہ جو ۱۹۴۵ میں جاپان کے مقابلہ میں فاتحانہ حیثیت رکھتا تھا، وہ آج جاپان کے مقابلہ میں دفاعی پوزیشن میں چلا گیا ہے۔ کس قدر عبرتناک ہے یہ واقعہ۔

آج تو جاپان کی صنعتی اور اقتصادی ترقی کا ہر ایک چرچا کر رہا ہے۔ مگر غالباً میں ہندستان میں پہلا شخص ہوں جس نے ۱۹۶۵ میں جاپان کی ترقی کے بارہ میں لکھنا شروع کیا۔ پچھلے تقریباً ۲۵ سال میں میں نے جاپانی ظاہرہ پر اتنے زیادہ مضامین لکھے ہیں کہ ان کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ اگر توفیق ملی تو ان شاء اللہ "جاپانیات" کے نام سے ایک کتاب شائع کی جائے گی۔ جاپان مجھے حکمت حدیبیہ کا ایک نیا مظہر نظر آتا ہے۔

۶ جون ۱۹۸۹

نیویارک سے جناب کلیم الدین صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ وہ حیدر آباد کے رہنے والے ہیں اور معاش کے سلسلے میں امریکہ گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ میں میں مسلمانوں کے مختلف حلقوں میں گیا اور ان کے بہت سے اجتماعات میں شرکت کی۔ ہر جگہ قومی اسلام کا تذکرہ تھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ لوگ اس دعوتی اسلام سے واقف ہی نہیں جس کا آپ الرسالہ میں مسلسل تذکرہ کر رہے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں یہی تمام مسلمانوں کا حال ہے۔ وہ قومی مسائل میں مشغول ہیں اور اس کو دعوت کا نام دئے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی سرگرمیاں مسلمانوں کی سرکشی کے خانہ میں تو لکھی جاسکتی ہیں مگر وہ تعمیل اسلام کے خانہ میں لکھی نہیں جاسکتیں۔

۷ جون ۱۹۸۹

الشیخ الغزالی نے بعض روایات کو صحت سند کے باوجود قبول نہیں کیا۔ کیوں کہ وہ بداہۃً عقل کے خلاف ہیں۔ اس پر بعض سعودی پرچوں میں سخت تنقید کی جارہی ہے۔ الدعوۃ ۲۷ شوال ۱۴۰۹ھ (یکم جون ۱۹۸۹) میں ایک عرب مضمون نگار لکھتے ہیں کہ شیخ غزالی اپنے عقلی منہج کی وجہ سے ضعیف حدیثوں کو قبول کر لیتے ہیں۔ اور صحیح حدیثوں کو رد کر دیتے ہیں۔ جن صحیح حدیثوں کو انھوں نے رد کیا ہے، ان میں سے ایک بخاری کی یہ روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے موت کے فرشتہ کی آنکھ پر طمانچہ مارا (فیقبل احادیث ضعیفة ویرد احادیث صحیحة۔ فمن الاحادیث التی ردها وهی صحیحة الحدیث الذی فیه أن موسیٰ علیه السلام لطم عین ملك الموت، صفحہ ۲۴)

آگے مضمون نگار لکھتے ہیں کہ شیخ غزالی نے جو منہج اختیار کیا ہے یہ وہی منہج ہے جس کو قدیم متکلمین نے اختیار کیا تھا۔ ان کا قول تھا کہ جب نقل عقل کے خلاف ہو تو عقل کو لیا جائے گا۔ ان کا کہنا تھا کہ نقل کی وکالت ظنی ہے اور عقل کی وکالت قطعی (وهذا المنهج الذی اتبعه الشیخ هو منهج المتکلمین فیما سبق حیث قالوا اذا خالف النقل العقل وجب تقدیم العقل وقالوا ان دلالة النقل ظنیة ودلالة العقل قطعیة، صفحہ ۲۵)

اصل یہ ہے کہ عقل کی دو قسمیں ہیں۔ عقل شرعی، اور عقل علمانی۔ دینی امور میں عقل علمانی

کا استعمال بلاشبہ درست نہیں۔ مگر دینی امور میں عقل شرعی کا استعمال عین درست ہے۔ مذکورہ بالا حدیث میں عقل شرعی کا استعمال یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ دین میں پیغمبر اور فرشتہ کا جو تصور دیا گیا ہے۔ اس سے مذکورہ واقعہ مطابقت نہیں رکھتا۔ اس قسم کے نقطۂ نظر کو عقل پرستی کہنا ہرگز درست نہیں۔

۸ جون ۱۹۸۹

حدیث کی کتابوں میں ایسی بہت سی روایتیں آئی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں یہ بات پسندیدہ ہے کہ کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کا ارادہ کرے تو نکاح سے پہلے اسے دیکھ لے۔ ایک روایت کے مطابق، حضرت مغیرہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک عورت کے لئے نکاح کا پیغام بھیجا۔ آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے اسے دیکھا ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو دیکھ لو۔ اس طرح زیادہ امید ہے کہ دونوں کا تعلق دائمی طور پر برقرار رہے۔

عن المغيرة بن شعبة قال خطبتُ امرأةً على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال النبى صلى الله عليه وسلم انظرتَ اليها. قلتُ لا. قال فانظر اليها. فانه اجدر ان يودم بينكما (نسائی، ابن ماجہ، الترمذی)

۹ جون ۱۹۸۹

اسلام میں اتفاق و اتحاد پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ اس وقت تک خیر پر رہیں گے جب تک وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے (الناس بخير ما تعاونوا)

دو یا زیادہ آدمیوں کے درمیان باہمی تعاون کا ظہور میں آنا کوئی سادہ سی بات نہیں، یہ بہت بڑا واقعہ ہے۔ باہمی تعاون اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی اپنی ذات کو پیچھے کرنے اور اصول کو آگے کرنے کے لئے تیار ہو۔ جب وہ مقصد کے مقابلہ میں ہر دوسری چیز کو ثانوی حیثیت دینے پر راضی ہو۔ جب وہ اس اعلیٰ حوصلگی کا ثبوت دے کہ وہ تعاون کے خلاف حالات ہونے کے باوجود تعاون کرے گا۔ اس کے مفادات اور اس کی ذاتی مصلحتیں مجروح ہو رہی ہوں تب

بھی وہ مفاد اور مصلحت سے اوپر اٹھ کر حق کی خاطر دوسرے کا ساتھ دیتا رہے گا۔

تعاون علی الخیر کی اسی انوکھی صفت کی بنا پر خدا کے یہاں اس کا بڑا درجہ ہے۔ ایک حدیث قدسی کے مطابق، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائیں گے کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنھوں نے میرے جلال کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کی۔ آج میں ان کو اپنے سایہ کے نیچے جگہ دوں گا جب کہ میرے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہیں (این المتحابون بجلالی۔ الیوم اُظِلّهم بظلی یوم لا ظلّ الّا ظلّی۔)

۱۰ جون ۱۹۸۹

چودھری رحمت علی (۱۹۵۱ - ۱۸۹۲) نظریہ پاکستان کے پہلے خالق تھے۔ وہ مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے اور لندن میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۰ میں انھوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا جس کا نام تھا:

The Millat of Islam and the menace of Indianism.

اس میں انھوں نے پہلی بار پاکستان کا نظریہ پیش کیا۔ ان کا خیالی پاکستان حسب ذیل علاقوں پر مشتمل تھا اور انھیں کے چند حروف کو لے کر اس کا نام بنایا گیا تھا:

پنجاب افغانستان کشمیر سندھ بلوچستان پاکستان۔ یہی نظریہ اقبال نے ۱۹۳۰ میں پیش کیا۔ دونوں کا بنیادی نظریہ ایک تھا۔ صرف جغرافی حدول کا فرق تھا۔ سید شریف الدین پیرزادہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ڈاکٹر اقبال نے چودھری رحمت علی کو ایک مکتوب روانہ کیا تھا جس میں انھوں نے پاکستان نیشنل موومنٹ میں اپنی بھی شمولیت کی خواہش ظاہر کی تھی۔ چودھری رحمت علی نے ڈاکٹر صاحب کے عزائم کا خیر مقدم کرتے ہوئے جواباً لکھا کہ وہ انھیں پاکستان نیشنل موومنٹ کے صدر کی حیثیت سے بسروچشم قبول کرتے ہیں، بشرطیکہ ڈاکٹر اقبال اپنا سر کا خطاب واپس کر دیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ ڈاکٹر اقبال اس تحریک کی صدارت قبول کریں، ان کا انتقال ہو گیا۔ (صفحہ ۱۸۴)

ہفت روزہ انقلاب (راولپنڈی، پاکستان) نے اپنے شمارہ ۱۲ مئی ۱۹۸۹ میں لکھا

ہے کہ "مسلمانانِ برصغیر نے اپنے عظیم رہنماؤں کی رہبری میں جدوجہد کرکے ایک آزاد اور خودمختار وطن حاصل کرلیا جو پاکستان کہلایا۔ اب چودھری رحمت علی نے اپنی منزل کو پالیا تھا۔ ان کی تجویز نے بھی عملی صورت اختیار کرلی تھی۔ ۱۹۴۸ میں وہ اس نوزائیدہ مملکت، اپنی آرزوں اور امیدوں کے مرکز پاکستان میں تشریف لائے۔ قومی رہنماؤں سے ملے اور ایک دو جلسوں کو خطاب کیا۔ مگر جلد ہی دل برداشتہ ہوکر لندن واپس چلے گئے۔

کاغذی پاکستان بنانا کتنا آسان ہے، اور حقیقی پاکستان بنانا کتنا مشکل۔

۱۱ جون ۱۹۸۹

ابن الجوزی (۵۰۸ - ۵۹۷ ھ) مشہور علماءِ اسلام میں سے ہیں۔ ان کی ایک کتاب صید الخاطر کے نام سے ۱۲۸۰ میں چھپی ہے۔ اس کو ناجی طنطاوی نے ایڈٹ کیا ہے۔ اس کتاب میں بہت سی اصلاحی باتیں درج ہیں۔

کہتے ہیں کہ میں نے ممنوع چیزوں کے بارہ میں لوگوں کے حرص پر غور کیا تو میں نے دیکھا کہ جتنا زیادہ منع کیا جائے، اتنا ہی لوگوں کی رغبت اس کی طرف بڑھتی ہے۔ مثل ہے کہ آدمی اس چیز کا حریص ہے جس سے اس کو منع کیا جائے (المرء حریص علی ما منع)

ایک عرب شاعر نے کہا ہے کہ مجھے ایک چیز سے روکا گیا تو اس کی طرف میری خواہش بڑھ گئی۔ انسان کے لئے سب سے زیادہ محبوب چیز وہ ہے جس سے اسے روکا جائے:

منعت شیأً فاکثرت الولوع بہ   احب شئ الی الانسان ما منعا

۱۲ جون ۱۹۸۹

موجودہ زمانہ کے مسلمان سب سے زیادہ اتحاد کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان سب سے زیادہ اختلاف کی حالت میں مبتلا ہیں۔ اس کے سبب پر غور کرتے ہوئے میری زبان سے نکلا: مسلمان اتحادیوں کے ساتھ متحد ہوکر رہنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اختلافیوں کے ساتھ متحد ہوکر رہنے کا نام اتحاد ہے۔ اتحاد کی یہی وہ اہم ترین حقیقت ہے جس سے ہمارے اصاغر بھی ناآشنا ہیں اور ہمارے اکابر بھی ناآشنا۔

اتحاد کا راز ہے، اختلاف کو برداشت کرنا۔

۱۳جون ۱۹۸۹

صوفیاء کے یہاں چلہ کشی کا بہت رواج ہے۔ یعنی ۴۰ دن تک عبادت و ریاضت کرنا۔ اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی پیش کی جاتی ہے جو الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ کتابوں میں آئی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

من اخلص للہ اربعین یوما ظہرت ینابیع الحکمۃ علی لسانہ

جس شخص نے اللہ کے لئے چالیس دن تک اخلاص اختیار کیا، اس کی زبان پر حکمت کی باتیں جاری ہو جاتی ہیں۔

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جس شخص نے چالیس دن تک دنیا سے بے رغبتی اختیار کی اور اس میں مخلصانہ عبادت کی تو اللہ اس کی زبان پر حکمت کے چشمے اس کے دل سے جاری کر دیتا ہے (من زھد فی الدنیا اربعین یوما و اخلص فیہا العبادۃ اجری اللہ علی لسانہ ینابیع الحکمۃ من قلبہ)

جلال الدین سیوطی اور اس طرح کے کچھ لوگوں نے اس روایت کو قبول کیا ہے۔ مگر بہت سے علماء نے اس کو ضعیف اور موضوع قرار دیا ہے۔ مثلاً سخاوی، ذہبی، ابن جوزی وغیرہ۔ موجودہ زمانہ میں ناصر الدین البانی بھی اس کو موضوع کہتے ہیں۔

تاہم مفہوم کے اعتبار سے اس روایت میں کوئی حقیقی نقص نہیں۔ اس میں ۴۰ دن کا لفظ اعتباری ہے۔ یعنی ۴۰ دن سے مراد لمبی مدت ہے نہ کہ حسابی معنوں میں ۴۰ دن۔ بجائے خود یہ بات صحیح ہے کہ کوئی شخص لمبی مدت تک کسی خاص عمل میں گزارے تو اس عمل کے رموز اس پر کھل جاتے ہیں۔ اس کو اس عمل کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔

۱۴جون ۱۹۸۹

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اقبال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق تھا۔ وہ عاشق رسول تھے۔ میں نے کہا کہ رسول اللہؐ کے لئے عشق کا لفظ بولنا ایک بدعت ہے کیونکہ شریعت میں اس کے لئے محبت کا لفظ آیا ہے نہ کہ عشق کا۔

دوسری بات یہ ہے کہ رسول سے محبت کا یا عشق کا مطلب وہ نہیں ہے جو ایک عورت

اور ایک مرد کو آپس میں ہوتا ہے۔ اس سے مراد والہانہ اتباع ہے نہ کہ عام معنوں میں ذاتی نوعیت کا عشق۔ اقبال اگر رسول اللہؐ کے عاشق تھے تو انھیں آپ کا اتباع کرنا چاہئے تھا۔ رسول اللہ کا یہ حال تھا کہ انھوں نے دور شاعری میں بھی شاعری نہیں کی، بلکہ نثر میں کلام کیا۔ اس کے برعکس اقبال دور سائنس میں شاعری کرتے رہے۔ کیا اسی کو عشق رسول کہا جائے گا۔

۱۵ جون ۱۹۸۹

اسلام آباد (پاکستان) سے انگریزی ویکلی مسلم ورلڈ (The Muslim World) نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ ۳ جون ۱۹۸۹ میں نوبیل انعام یافتہ ڈاکٹر عبد السلام کے انٹرویو کے کچھ اقتباسات شائع ہوئے ہیں۔ یہ انٹرویو انھوں نے اخبار نیشن (The Nation) کو دیا تھا۔

ڈاکٹر عبد السلام نے کہا کہ ہم سائنسی ذہن رکھنے والی قوم نہیں۔ انھوں نے پاکستان واپسی کے لئے اپنی گہری دل چسپی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس کی خاطر وہ کسی بھی چیز کو چھوڑ سکتے ہیں حتی کہ ٹری ایسٹ میں اپنے ممتاز عہدہ کو بھی، اگر پاکستانی حکومت ایک سائنسی ادارہ قائم کرے اور اس کے لئے ان کی خدمات حاصل کرے:

> We are not a science-minded people. Although we might have done very well in the higher reaches, we are neither here nor there. Dr. Salam expressed his keenness to return to Pakistan. He said that he would give up anyting—even his prestigious position at Trieste—if the Pakistan government sets up a Science Institute and asked for his services.

مگر عملاً کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ کیوں کہ پاکستان کی جو حکومت بھی ڈاکٹر عبد السلام کو اس طرح بلائے گی، اس کو موقع پرست لیڈر شوشہ بنالیں گے اور حکومت پر قادیان نوازی کا الزام عائد کردیں گے۔ اس طرح وہ عوام کو بھڑکا کر اس حکومت کے لئے اگلے الکشن میں جیتنے کا امکان ختم کردیں گے —— یہی جھوٹی اسلامی سیاست ہے جس نے نصف صدی کے باوجود پاکستان کو بربادی کے سوا کسی اور منزل تک نہیں پہنچایا۔

۱۶ جون ۱۹۸۹

مکہ سے ایک عربی ماہنامہ نکلتا ہے جس کا نام الرابطہ ہے۔ اس کے شمارہ ذو القعدہ ۱۴۰۹ھ

میں مدینہ کی مسجد نبوی کے امام الشیخ علی عبد الرحمن الحذیفی کا ایک خطبہ نقل کیا گیا ہے جو انھوں نے وہاں کی مسجد نبوی میں دیا تھا۔ انھوں نے کہا :

یا امۃ الاسلام، لماذا الاختلاف والدین واحد۔ الیٰ متی الشقاق والامۃ واحدۃ۔ الیٰ متی التفرقۃ وانتم تدرکون ما فیہا من الضرر (صفحہ ۶)

اے امت اسلام باہمی اختلاف کیوں جب کہ دین ایک ہے۔ باہمی جھگڑے کب تک جب کہ امت ایک ہے۔ باہمی تفریق کب تک حالاں کہ تم جانتے ہو کہ اس میں کتنا زیادہ نقصان اور بگاڑ ہے۔

مسلمانوں کے اندر اتحاد و اتفاق کے لئے اس قسم کی جذباتی اپیلیں سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے کی جا رہی ہیں۔ مگر عملی صورت حال آج اس سے بھی زیادہ خراب ہے جتنا کہ سو سال یا پچاس سال پہلے تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر آدمی یہ فرض کر کے بول رہا ہے کہ "امت اسلام" واقعہ میں موجود ہے۔ جب کہ خود امت اسلام سرے سے موجود نہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ بھیڑ کو امت اسلام سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی قدیم شہر کے کھنڈروں کو دیکھ کر سمجھنا کہ خود وہ شہر زندہ حالت میں موجود ہے۔ آج سب سے پہلا کام یہ ہے کہ دوبارہ "امت اسلام" وجود میں لائی جائے۔ اس کے بعد ہی اگلے مرحلہ کا کوئی کام کیا جا سکتا ہے۔

۱۷ جون ۱۹۸۹

ہمارے یہاں پاکستان کے تین اخبارات آتے ہیں۔ دو اردو اخبار (وفاق اور نوائے وقت) اور ایک انگریزی اخبار (فرنٹیئر پوسٹ)۔ نوائے وقت کے ہر شمارہ میں مسٹر جناح اور ڈاکٹر اقبال کا کوئی قول نقل کیا جاتا ہے۔ اس کے شمارہ ۱۲ جون ۱۹۸۹ میں مسٹر محمد علی جناح کا ایک قول نقل کیا گیا ہے جو انھوں نے ۱۰ مارچ ۱۹۴۱ کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا :

"مسلم اقلیت کے صوبوں میں رہنے والے مسلمان خود دار اور بلند حوصلہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں رہنے والے بھائیوں کی نجات اور آزادی کی خاطر وہ ہر قسم کے ایثار اور قربانی کے لئے تیار ہیں"

۱۹۴۷ میں ملک کی تقسیم کے بعد "بھارت" کے مسلمان جن حالات سے دوچار ہوئے، وہ

مسٹر جناح کے مذکورہ قول کے عین مطابق تھے۔ مگر جب یہ متوقع حالات عملاً پیش آئے تو ہمارے مسلمان ان کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ وہ صبر کے بجائے فریاد اور احتجاج کرنے لگے۔ ایثار و قربانی کی بات کرنا کتنا زیادہ آسان ہے، اور ایثار و قربانی کا عملی ثبوت دینا کتنا زیادہ مشکل۔

۱۸ جون ۱۹۸۹

انگریزی جرنلسٹ مسٹر ارن شرما سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے جیسے لوگ لامذہب صرف اس لئے ہیں کہ ہم مذہب کو نہیں سمجھتے:

We are non-believer because we don't understand religion.

یہی اکثر ان لوگوں کا حال ہے جو بے دین یا لامذہب کہے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی مذہب سے دوری حقیقۃً انکار کی بنا پر نہیں بلکہ بے خبری کی بنا پر ہے۔ ان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کے طرز فکر اور ان کے ذہنی معیار پر انھیں مذہب نہ دیا جا سکا۔ اس لئے مذہب ان کے دماغ میں جگہ نہیں بنا سکا۔ اگر مذہب کو ان کے فکری معیار پر مدلل کرکے پیش کیا جائے تو ان میں سے بہت سے لوگ انکار مذہب کو چھوڑ کر اقرار مذہب کو اپنا طریقہ بنالیں گے۔

۱۹ جون ۱۹۸۹

ٹائمس آف انڈیا (۱۹ جون ۱۹۸۹) کے صفحہ آخر پر سلمان رشدی کا ایک انٹرویو چھپا ہے جو ۲۵ سالہ ایمنہ میرنے اس سے لندن کے کسی مکان میں لیا تھا۔ ہندستان پہلا ملک ہے جس نے رشدی کی کتاب (سیٹنک ورسز) پر پابندی لگائی تھی۔ اس کا مذاق اڑاتے ہوئے سلمان رشدی نے کہا کہ امریکی فلم لاسٹ ٹمپٹیشن آف کرائسٹ پر کسی بھی عیسائی ملک میں پابندی نہیں لگائی گئی۔ مگر ہندستان میں اس پر پابندی لگا دی گئی۔ یہ کیا مذاق ہے:

Look at the "Last Temptation of Christ" (an American film), not banned in any Christian country but banned in India. That's laughable.

میں مذکورہ کتاب اور فلم دونوں کو سخت بیہودہ اور لغو سمجھتا ہوں۔ مگر پابندی کا مطالبہ کرنا

اور پابندی لگانا موجودہ زمانہ میں سراسر بے فائدہ ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد اس کی اشاعت اور بڑھ جاتی ہے۔ رشدی کی کتاب ابتدائی چند مہینوں میں صرف چند ہزار فروخت ہوئی مگر فروری ۱۹۸۹ میں خمینی کے فرمان قتل کے بعد اس کے خلاف جو شور وغل ہوا اس کے بعد اس کی مانگ بے حد بڑھ گئی چنانچہ فروری سے مئی ۱۹۸۹ تک اس کے ایک ملین نسخے فروخت ہو چکے تھے اور نصف درجن زبانوں میں اس کے ترجمے زیر اشاعت تھے۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے پاکستان میں ہندستانی فلموں کی نمائش کو ممنوع قرار دیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ ہندستانی فلموں کے ویڈیو کیسٹ باہر ملکوں میں جا کر پاکستان پہنچنے لگے اور گھر گھر میں وی سی آر پر ہندستانی فلمیں دیکھی جانے لگیں۔

۲۰ جون ۱۹۸۹

مغل شہنشاہ اکبر نے دین الٰہی ایجاد کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے راجہ مان سنگھ کو اس دین میں شرکت کی دعوت دی۔ ملا بدایونی کی روایت کے مطابق، راجہ مان سنگھ نے کہا کہ میں ایک ہندو ہوں، اگر آپ کہیں تو میں مسلمان ہو جاؤں۔ مگر یہ دوسرا (دین الٰہی) کا راستہ مجھے خود نہیں معلوم کہ کیا ہے (سخن در دہن دارید، ہندو خود ہستم۔ واگر بفرمائید مسلمان می شوم۔ و راہ دیگر خود نمی دانم کہ کدام است)

اسلام تاریخی اعتبار سے ایک ثابت شدہ اور قائم شدہ مذہب ہے۔ مگر 'دین الٰہی' کی حیثیت اس وقت محض ایک ذہنی اپج کی تھی۔ اس بنا پر راجہ مان سنگھ کی سمجھ میں اسلام آیا، مگر دین الٰہی اس کی سمجھ میں نہ آسکا۔

یہ اسلام کے حق میں ایک عظیم الشان تائید ہے۔ اگر ہم لوگوں کو اسلام کی طرف بلائیں تو لوگوں کو محسوس ہوگا کہ انھیں ایک معلوم اور مسلّم چیز کی طرف بلایا جا رہا ہے، جب کہ دوسرے مذاہب کا حال یہ ہے کہ وہ یا تو "دین الٰہی" کی طرح غیر معروف ہیں یا ہندوازم اور بدھزم اور مسیحیت کی طرح غیر تاریخی۔

۲۱ جون ۱۹۸۹

پاکستان کی خاتون وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے حال میں امریکہ کا دورہ کیا ہے۔ واپسی کے بعد

انھوں نے ۲۰ جون کو اسلام آباد میں سعودی گزٹ (ریاض) کے نمائندہ سے ملاقات کی۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۱ جون ۱۹۸۹) کے مطابق ، انھوں نے گفت گو کے دوران کہا کہ میرے پاس اور میرے قبضہ میں ایسی معلومات ہیں جو بتاتی ہیں کہ وہ (ضیاء الحق) کتنے اسلام کے مخالف تھے :

I have information in my records, in my possession, which shows how anti-Islam he was.

جنرل محمد ضیاء الحق سے پوچھا جائے تو وہ بے نظیر کو سب سے بڑا اسلام دشمن بتائیں گے۔ اس کے برعکس بے نظیر بھٹو کے نزدیک ضیاء الحق سب سے بڑے اسلام دشمن تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر قیامت نہ آئے تو کسی بھی چیز کی حقیقت کھلنے والی نہیں۔ حتی کہ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ کون اسلام دوست تھا اور کون اسلام دشمن۔

۲۲ جون ۱۹۸۹

عربی مدارس کے بارہ میں میرا تاثر یہ ہے کہ وہاں کوئی بھی "علم" نہیں پڑھایا جاتا ، حتی کہ اسلام کا علم بھی نہیں۔ میری تعلیم عربی کے ایک مدرسہ میں ہوئی۔ یہاں جغرافیہ کے بارہ میں کوئی بھی کتاب شامل نصاب نہ تھی۔ نہ وہاں کی مجلسوں میں جغرافیہ کے بارہ میں کچھ بتایا جاتا تھا۔ اس کے باوجود یہ اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہ میں نے دوران تعلیم ہی میں جغرافیہ کے بارہ میں بہت کچھ جان لیا۔

اس واقفیت کا ذریعہ ٹکٹ (پوسٹیج اسٹمپ) تھا۔ مجھے بچپن ہی سے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق ہو گیا۔ یہ شوق مجھے مسٹر عتیق احمد انصاری کے ذریعہ ملا۔ جو اس زمانہ میں لکھنؤ میں لا ٹینیر کالج میں پڑھتے تھے۔ وہ میرے عزیز بھی تھے اور دوست بھی۔ وہ خود ٹکٹ کے شوقین تھے۔ ہر بار جب وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں اعظم گڑھ آتے تو مجھے کچھ نہ کچھ ٹکٹ دیتے۔ عتیق احمد انصاری کے والد مشتاق احمد انصاری لکھنؤ میں جیل انڈسٹریز کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔

ہمارے مدرسہ کے دفتر میں لکڑی کا ایک بڑا بکس تھا۔ اس میں ایک بہت موٹا سا البم رکھا ہوا تھا۔ یہ کسی بہت با ذوق آدمی نے بنایا تھا۔ اور پھر مدرسہ کو دے دیا۔ اس میں دنیا کے تمام ملکوں کے ٹکٹ تھے۔ ہماری بستی کے منشی محمود علی صاحب مدرسہ میں محرر (کلرک)

تھے۔ انھوں نے میرے شوق کو جان کر ٹکٹوں کا یہ البم مجھے دکھایا۔ اور اس البم کے بہت سے ٹکٹ مجھے دئے۔ چند سال میں میرے پاس اکثر ملکوں کا ٹکٹ ہوگیا۔

میرا ٹکٹوں کا البم میرے لئے جغرافیہ کی کتاب بن گیا۔ عتیق احمد انصاری سے اور دوسرے لوگوں سے میں ان ملکوں کے حالات معلوم کرتا جس کے ٹکٹ میرے پاس موجود تھے۔ نیز کتابوں کے ذریعہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ اس طرح ٹکٹوں کے شوق نے مجھے دوران تعلیم ہی میں ضروری جغرافی معلومات دے دی۔

۲۳ جون ۱۹۹۳

برما کے دو مسلمان ملاقات کے لئے۔ ایک کا تعلق مانڈے سے تھا، دوسرے کا تعلق رنگون سے۔ وہ جلال آباد کے مدرسہ میں تعلیم کے لئے آئے تھے۔ اب فارغ ہوکر واپس اپنے وطن جارہے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ اراکان (Arakan) کے علاقہ کے مسلمانوں نے ۲۰ سال پہلے ایک فوجی پارٹی بنائی۔ اس کا نام بسم اللہ ٹا پیوے (بسم اللہ فوجی پارٹی) تھا۔ اس کا مقصد اراکان کو آزاد کرکے علیحدہ مسلم ریاست بنانا تھا۔ مگر حکومت نے ظالمانہ طور پر اس تحریک کو کچل دیا۔ تقریباً دو لاکھ مسلمان الاکان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ابھی تک اراکان کے مسلمانوں کے ساتھ تعصب برتا جارہا ہے۔ حالاں کہ اب تحریک اندرونی طور پر ختم ہو چکی ہے۔

میں نے کہا کہ بنگلہ دیش کے ہندو علیحدگی کی تحریک چلائیں تو اس کو تمام مسلمان سازش اور غداری کہتے ہیں۔ اور برما کے مسلمان اس قسم کی علیحدگی کی تحریک چلائیں تو وہ مسلمانوں کے نزدیک آزادی کی تحریک بن جاتی ہے۔ مسلمانوں کو ایک معیار اختیار کرنا چاہئے۔ یا تو وہ دونوں جگہ اس کو آزادی کی تحریک کہیں یا دونوں جگہ غداری کی تحریک۔ موجودہ صورت انھیں بربادی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچائے گی۔

یہی صورت آج تمام دنیا میں ہے۔ مسلم ملکوں کی غیر مسلم آبادی اگر علیحدگی کا مطالبہ کرے تو وہ مسلمانوں کے نزدیک بغاوت ہے۔ اور غیر مسلم ملکوں کے مسلمان اگر علیحدگی کا مطالبہ کریں تو وہ مسلمانوں کے نزدیک آزادی کی جدوجہد ہے۔ یہ دوہرا معیار نہ خدا کے نزدیک

مقبول ہے اور نہ انسانوں کے نزدیک مقبول۔

۲۴ جون ۱۹۸۹

ایک صاحب نے کہا کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔ ان کے یہاں ایک بچی بھی پیدا ہو چکی ہے۔ مگر بیوی پستہ قد اور بھدی شکل کی ہے۔ اس لئے ان کو ازدواجی مسرت حاصل نہیں۔

میں نے انھیں سختی سے منع کیا۔ میں نے کہا کہ نکاح سے پہلے آدمی کو ہزار بار سوچنا چاہئے۔ مگر نکاح کے بعد اس کو چاہئے کہ نباہ کے سوا ہر سوچ کا دروازہ بند کر دے۔ اسلام میں غیر عورت کو قصداً دیکھنا جائز نہیں۔ مگر مخطوبہ کو دیکھنا نہ صرف جائز بلکہ مطلوب قرار دیا گیا ہے۔ دوسری طرف طلاق کے بارہ میں حدیث میں آیا ہے کہ وہ ابغض المباحات ہے — گویا نکاح سے پہلے ممنوعہ حد تک تحقیق کی اجازت دی گئی ہے۔ مگر نکاح کے بعد مباح حد میں داخلہ کو بھی پسند نہیں کیا گیا۔

۲۵ جون ۱۹۸۹

ایک تعلیم یافتہ مسلمان ہیں۔ وہ نہایت ذہین اور سوجھ بوجھ والے آدمی ہیں۔ مگر آدمی خواہ کتنا ہی سمجھدار ہو، اس کی سمجھ محدود ہوتی ہے۔ انھوں نے دبئی (عرب امارات) میں ہوٹل کھولا۔ مگر ہوٹل ناکام ہو گیا۔ پندرہ لاکھ روپیہ کا گھاٹا دے کر انھیں ہوٹل کو بند کر دینا پڑا۔

انھوں نے اپنے ہوٹل میں مغل کھانوں کا اعلیٰ انتظام کیا تھا۔ ان کا آئیڈیا تھا کہ ہندستان اور پاکستان کے لاکھوں لوگ جو عرب امارات میں رہتے ہیں، وہ اپنی پوری فیملی کے ساتھ کھانا پسند کریں گے۔ چنانچہ انھوں نے ہوٹل کا نظام اس طرح بنایا کہ ایک شخص اپنی پوری فیملی کے ساتھ آئے اور ایک میز پر اپنی پسند کا کھانا کھا سکے۔

مگر ساری ذہانت کے باوجود ان سے ایک چوک ہو گئی۔ وہ یہ کہ لوگ فیملی کے ساتھ صرف چھٹی کے دن آکر کھانا کھا سکتے ہیں۔ وہ اس طرح روزانہ نہیں آسکتے۔ چنانچہ ہفتہ کی چھٹی کے دن تو ان کے یہاں زبردست بھیڑ لگ جاتی۔ مگر بقیہ دنوں میں بالکل سناٹا رہتا۔ چنانچہ مجبور

ہو کر انھوں نے ہوٹل بند کر دیا۔

مذکورہ مسلمان نے ہوٹل کا یہ قصہ سنایا تو میں نے ان کو یہ آیت سنائی: قل لو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء۔ میں نے کہا کہ دنیا کے فائدہ کا بہت گہرا تعلق "آئندہ" کو جاننے سے ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کو اپنا عجز تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

۲۶ جون ۱۹۸۹

مارکسی اشتراکیت کے بارہ میں میری کتاب پہلی بار اپریل ۱۹۵۹ میں چھپی۔ اس کو مکتبہ جماعت اسلامی رامپور نے چھاپا تھا۔ کتاب کا نام یہ تھا:

مارکسزم جس کو تاریخ رد کر چکی ہے۔

۳۰ سال پہلے کتاب کا یہ نام لوگوں کو بہت عجیب معلوم ہوا تھا۔ لوگوں نے کہا کہ مارکسزم تو پوری طاقت کے ساتھ زندہ ہے، پھر آپ کیسے کہتے ہیں کہ تاریخ نے اس کو رد کر دیا۔

مگر اب ۳۰ سال بعد یہ حقیقت ہر ایک کی سمجھ میں آرہی ہے۔ امریکہ کے ٹائم میگزین نے اپنے شمارہ ۵ جون میں ایک تفصیلی رپورٹ دی تھی جس میں ایسے حقائق پیش کئے گئے تھے جس سے یہ ثابت ہو رہا تھا کہ روس اور چین میں کمیونزم زوال کی طرف جارہا ہے۔ ٹائم (۲۶ جون) میں اس رپورٹ پر قارئین کے خطوط چھپے ہیں۔ ہانگ کانگ کا ایک قاری لکھتا ہے:

> The world is witnessing the last convulsions of a dying beast called Communism, which will not last to the year 2000.
> (Francesco M. Bongiovanni)

دنیا اس مرتے ہوئے حیوان کی آخری تشنجی حالت کا مشاہدہ کر رہی ہے جس کو کمیونزم کہا جاتا ہے۔ اور جو ۲۰۰۰ تک باقی رہنے والا نہیں۔

۲۷ جون ۱۹۸۹

سر جان ہکس (Sir John Hicks) موجودہ زمانہ کا مشہور ماہر اقتصادیات ہے۔ ۲۰ مئی ۱۹۸۹ کو اس کا انتقال ہو گیا۔ بوقت انتقال اس کی عمر ۸۵ سال تھی۔ علم اقتصادیات میں وہ مجتہدانہ رائے رکھتا تھا۔ مثلاً اس نے لارڈ کینز کی جنرل تھیوری (General Theory) سے سخت

اختلاف کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اقتصادیات ایک ڈسپلن ہے نہ کہ سائنس:

Economics is not a science but a discipline.

سرجان ہکس کو نوبیل انعام ملا تو اس نے اس کا بڑا حصہ لندن اسکول لائبریری کو دیدیا وہ دولت برائے دولت کا قائل نہ تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں اسی کے مطابق عمل کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں اس قسم کے اہل علم وہ بہترین افراد تھے جن کو اسلام کا پیغام پہنچایا جاتا۔ مگر مصلحین نے یا تو صرف مسلمانوں کے اندر اصلاحی کام کیا۔ اور اگر غیر مسلموں میں کچھ کام کیا تو ان کے پست طبقات میں۔ غیر مسلموں کے اعلیٰ ذہن اور تعلیم یافتہ طبقہ کو وہ خدا کے دین کا مخاطب نہ بنا سکے۔

۲۸ جون ۱۹۸۹

انگریز جب ہندستان میں آئے تو انھوں نے یہاں سب سے بڑا اتحاد پیدا کیا۔ انھوں نے ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک پورے برصغیر کو ایک متحدہ ملک کی حیثیت دے دی۔ مگر ۱۹۴۷ میں جب وہ اس ملک کو چھوڑ کر گئے تو انھوں نے اس کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ تاکہ وہ ابدی طور پر آپس میں لڑتے رہیں اور کبھی دوبارہ متحد نہ ہو سکیں ——— انھیں اپنے لئے کچھ پسند تھا اور دوسروں کے لئے کچھ۔

۲۹ جون ۱۹۸۹

موجودہ زمانہ کے جو مسلم رہنما ہیں، خواہ وہ بے ریش ہوں یا باریش۔ ان کے بارہ میں میری رائے بے حد سخت ہے۔ ان کے بیانات کو سن کر اور ان کے حالات کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کے سب محض اکسپلائٹر ہیں۔ حتیٰ کہ اکثر ایک آہ کے ساتھ یہ جملہ میری زبان سے نکل جاتا ہے کہ اگر یہی وہ لوگ ہیں جو جنتوں میں داخل کئے جانے والے ہیں تو جہنم کو خالی رہنا چاہئے، کیوں کہ دوسرے لوگ بہرحال ان سے کم برے ہیں۔

۳۰ جون ۱۹۸۹

ہندستان میں مسلمان بھی ہیں اور عیسائی بھی۔ دونوں اقلیتی فرقے ہیں۔ مگر دونوں کے مزاج میں بعد المشرقین کا فرق پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر عیسائیوں نے تعلیم کے میدان میں

قدم رکھا تو انھوں نے ابتدائی تعلیم کے ادارے قائم کئے۔ ملک میں عیسائیوں کے اسکول تو بہت ہیں مگر عیسائیوں کی یونیورسٹی کوئی ایک بھی نہیں۔

مسلمانوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ انھوں نے اسکول کی سطح پر تعلیم کے انتظام کی طرف بہت کم توجہ دی، البتہ انھوں نے کئی یونیورسٹیاں قائم کر دیں ـــــ مسلم یونیورسٹی عثمانیہ یونیورسٹی، جامعہ ملیہ، ہمدرد یونیورسٹی، وغیرہ۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ عیسائیوں کے پیش نظر ذہن بنانا تھا، اور مسلمانوں کے پیش نظر منارۂ فخر کھڑا کرنا۔

یکم جولائی ۱۹۸۹

دکتور عبداللہ النفیسی کویت کی یونیورسٹی میں استاد تھے۔ انھوں نے ایک کتاب لکھ کر شائع کی۔ اس کا نام تھا: عندما یحکم الاسلام (جب اسلام حکومت کرے گا) اس کتاب میں کچھ ایسی باتیں تھیں جن سے کویت کے سیاسی نظام پر بالواسطہ تنقید ہوتی تھی۔ چنانچہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد دکتور عبداللہ النفیسی کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ وہ اگرچہ کویت کے شہری تھے۔ مگر کویت میں انھیں کوئی اچھی جگہ نہ مل سکی۔ آجکل وہ عرب امارات میں ہیں اور وہاں کی یونیورسٹی میں کام کر رہے ہیں۔ عرب امارات میں وہ اس قیمت پر ہیں کہ انھوں نے دوبارہ سسٹم پر تنقید کرنے کی غلطی نہیں کی جو انھوں نے اس سے پہلے کویت میں کی تھی۔

۲ جولائی ۱۹۸۹

امام مالک کہتے ہیں کہ جب میں چھوٹا تھا تو گویّوں کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ ان سے گانا سیکھتا تھا۔ ایک دن میری ماں نے مجھ سے کہا کہ بیٹا، گویّا اگر بدشکل ہو تو وہ گویا کی حیثیت سے مقبول نہیں ہو سکتا۔ اس لئے تم گانا چھوڑ دو۔ اور فقہ و حدیث کی تعلیم حاصل کرو۔ کیوں کہ فقہ و حدیث کے ساتھ بدشکلی کچھ نقصان نہیں پہنچاتی۔ چنانچہ میں نے گویوں کی صحبت چھوڑ دی اور فقہاء و علماء کے پاس رہنے لگا۔ اس کے بعد خدا نے مجھے اس مرتبہ پر پہنچایا جس پر تم اس وقت مجھے دیکھتے ہو۔

مذہب میں ہر چیز چھپ جاتی ہے اور اس کی وجہ مذہب میں تقدس کا پہلو ہے۔ مذہبی لوگوں کے لئے تقدس ایک پراسرار پردہ کا کام کرتا ہے۔ یہ خصوصیت مذہب کے سوا کسی اور چیز کو حاصل نہیں۔

۳ جولائی ۱۹۸۹

چند دن کشمیر میں رہ کر آج دہلی واپس آیا۔ وہاں شہر سے دور پہاڑوں کے درمیان ایک صاحب نے گھر بنایا ہے۔ اس سے ملحق بہت بڑی زمین ہے۔ مجموعی طور پر مکان اور زمین کی قیمت تقریباً ایک کروڑ روپیہ ہے۔

یہاں بہت سے کشمیری جمع ہوئے۔ کئی نشستوں میں میں نے اسلام کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی۔ یہ لوگ بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ میری تحریک پر انھوں نے ایک مسجد کی تعمیر شروع کی اور مجھ سے اس کا سنگ بنیاد رکھوایا۔ اس پورے علاقہ کا قدیم نام بدل کر "وحید آباد" رکھ دیا۔ وغیرہ۔

کشمیری لوگ بہت جذباتی ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب محض وقتی جذباتیت کا نتیجہ ہو۔ لیکن اگر انھوں نے گہرے طور پر ہماری دعوت کو سمجھا ہو تو یہ مقام انشاء اللہ آئندہ الرسالہ مشن کا ایک طاقت ور مرکز بن جائے گا۔

۴ جولائی ۱۹۸۹

سری لنکا میں اس وقت تقریباً ۵۰ ہزار ہندستانی فوجی ہیں۔ حکومت ہند ان کے اوپر روزانہ ۲ کرور روپیہ خرچ کرتی ہے۔ اس طرح اب تک ۱۲ ہزار کرور روپیہ سے زیادہ رقم خرچ کی جا چکی ہے۔ سری لنکا کے صدر رانا سنگھے پریم داسا بار بار کہہ رہے ہیں کہ ہندستانی فوج فوراً لنکا سے واپس جائے۔ مگر راجیو گاندھی فوج کو بلانے کے لئے تیار نہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اندرا گاندھی نے جو کچھ بنگلہ دیش میں ہوشیاری کے ساتھ کیا تھا، اس کو راجیو گاندھی لنکا میں بے وقوفی کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔

اگرچہ بنگلہ دیش کے معاملہ میں بھی ہندستان کی شرکت ایک غلطی تھی۔ ۱۹۷۱ میں ہندستان نے جو کچھ بنگلہ دیش میں کیا وہی ۱۹۸۹ میں پاکستان نے کشمیر میں ہمارے خلاف شروع کر دیا۔

۵ جولائی ۱۹۸۹

بمبئی سے برہمن ازم کے خلاف ایک کتاب چھپی ہے جس کی قیمت ۹۵ روپیہ ہے۔ کتاب کا نام اور مصنف کا نام یہ ہے:

Non-Brahman Movement in Maharashtra By M.S. Gore Segment)

کتاب میں پسماندہ طبقہ کے مشہور مصلح جیوتی راؤ پھولے (۱۸۹۰-۱۸۲۷) کے متعلق بتایا گیا ہے کہ انھوں نے برطانی اقتدار کا استقبال کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر شودروں کو ترقی کرنی ہے تو انھیں برطانی اقتدار کو بطور ناگزیر برائی کے اختیار کرنا ہوگا:

He welcomed the British rule as "an evil necessity" if the Sudras were to make nay progress (p. 20)

ہندستان کا سب سے بڑا سماجی مسئلہ طبقاتی عدم مساوات ہے۔ یہ مسئلہ نہ برطانی اقتدار کے زمانہ میں ختم ہوا۔ نہ آزادی کے انقلاب نے اس کو ختم کیا اور نہ مہاتما گاندھی کی ہریجن تحریک اس کا خاتمہ کرسکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عدم مساوات کی جڑیں خود ہندو مذہب میں گہرائی کے ساتھ موجود ہیں۔ اس کا خاتمہ صرف دو صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ یا تو ہندو مذہب مٹ جائے یا ہریجن ہندو مذہب کو چھوڑ کر نیا مذہب اختیار کرلیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کا واحد حل اسلام ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کے احمقانہ لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے ابھی تک ملک کے اندر وہ معتدل فضا نہیں بنی جب کہ سنجیدہ طور پر اس حل کے بارے میں غور کیا جاسکے۔

۶ جولائی ۱۹۸۹

صبح کو سورج نکلنے سے پہلے قریب کے پارک میں ٹہل رہا تھا۔ اس دوران قرآن کی یہ آیت یاد آئی: وفی اموالہم حق للسائل والمحروم (اور ان کے مالوں میں حق ہے سائل اور محروم کے لئے)

میں نے سوچا کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ حقداروں کے علاوہ سائل اور محروم کو بھی اپنے مال میں سے دیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنی جنت کے لئے ضرور یہ اصول رکھا ہوگا۔ یہ سوچتے ہوئے بے اختیار دل سے یہ دعا نکلی کہ خدایا، میں حق داری کی بنیاد پر آپ کی جنت میں حصہ پانے کا مستحق نہیں، آپ سائل اور محروم ہونے کی بنیاد پر مجھے اپنی

جنت میں حصہ دار بنا دیجئے۔

۷ جولائی ۱۹۸۹

لارڈ ہیلی فیکس (Lord Halifax) نے کہا ہے کہ جب لوگ اپنی آزادی کے لئے لڑیں، تو کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنی فتح کے ذریعہ نئے آقاؤں کے سوا کچھ اور پا سکیں:

When the people contend for their liberty they seldom get anything by their victory but new masters.

عقل اور تجربہ دونوں کے مطابق یہ بات نہایت صحیح ہے۔ ہندستان میں مسلم علماء نے انگریزی اقتدار کے خلاف آزادی کی تحریک چلائی۔ مگر ۱۸۵۷ سے لے کر ۱۹۴۷ تک لمبی جدوجہد کے بعد جب آزادی ملی تو معلوم ہوا کہ وہ ملک کے اکثریتی فرقہ کے محکوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ پاکستان کے اسلام پسندوں نے جنرل ایوب خاں کی "غلامی" کے خلاف تحریک چلائی مگر اس کے بعد معلوم ہوا کہ وہ جنرل ایوب کی غلامی سے نکل کر ذوالفقار علی بھٹو کی غلامی میں پہنچ گئے ہیں۔ مصر کے اسلامی رہنماؤں نے شاہ فاروق کے اقتدار سے آزاد ہونے کی تحریک چلائی۔ مگر یہ آزادی صرف اس قیمت پر ملی کہ اس کے بعد وہ فوجی افسر کی شدید تر غلامی میں داخل ہو چکے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی تحریکیں جان و مال کے ضیاع کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو نہایت تاکید کے ساتھ یہ ہدایت فرمائی کہ حکمراں، خواہ وہ تمہاری نظر میں کتنا ہی برا ہو، اس کے خلاف سیاسی تحریک سے اعراض کرو۔ حکمرانوں کے خلاف سیاسی ٹکراؤ سے بچ کر دوسرے میدانوں میں اصلاح و تعمیر کے کام میں لگ جاؤ۔

۸ جولائی ۱۹۸۹

قومی آواز (۷ جولائی ۱۹۸۹) میں جناب محمد یونس سلیم صاحب کا ایک مفصل مضمون چھپا ہے جس کا عنوان ہے: مسلم کنونشن اور ان کا پس منظر۔

مضمون میں بتایا گیا ہے کہ ہندستان کی آزادی حاصل کرنے کے بعد نومبر ۱۹۴۷ میں مسلمانوں کا پہلا تاریخی اجتماع دہلی میں منعقد ہوا۔ یہ اجتماع مولانا ابوالکلام آزاد کی ایما پر

جمعیۃ علماء ہند نے طلب کیا تھا۔ اسی موقع پر مولانا آزاد نے اپنا وہ مشہور جملہ کہا تھا کہ ستارے ڈوب گئے تو ڈوب جائیں۔ لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو اور ان کو ان اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

اس کے بعد جمعیۃ علماء ہی کی جانب سے بمبئی میں ۱۹۵۴ میں ایک دینی تعلیمی کانفرنس منعقد کی گئی۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اس کانفرنس کے روح رواں تھے۔ اس کانفرنس میں پرجوش تقریروں کے بعد یہ طے کیا گیا کہ ملک بھر میں دینی مدارس قائم کئے جائیں اور موجودہ مدارس کو تقویت پہنچائی جائے۔

دسمبر ۱۹۵۶ میں مدراس میں ساؤتھ انڈیا مسلم کنونشن ہوا۔ اس کی صدارت ڈاکٹر سید محمود نے کی جو اس وقت حکومت ہند میں امور خارجہ کے منسٹر تھے۔ کنونشن کے شرکا نے اپنی تقریروں میں' اپنے آپ کو قوال' تو ضرور ثابت کیا مگر اس کے بعد وہ "فعال" نہ رہ سکے۔

جون ۱۹۶۱ میں دہلی (سپرو ہاؤس) میں ایک کامیاب کنونشن ہوا۔ مولانا حفظ الرحمان اس کے سرگرم داعی تھے۔ ڈاکٹر سید محمود نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا کہ ہندستان میں مسلمانوں کو دوسرے درجہ کا شہری بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ بعد کو پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر سید محمود کے درمیان" درجہ دوم کے شہری" پر بڑی تیز جھڑپ ہوئی۔

ستمبر ۱۹۶۴ میں دہلی میں جمہوری کنونشن ہوا۔ اس کا اہتمام مولانا اسعد مدنی نے کیا تھا۔ اس کنونشن کو مرارجی ڈیسائی نے بھی مخاطب کیا تھا۔ ان کے چند جملے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کو سخت ناگوار گزرے تھے۔ انھوں نے کھڑے ہو کر مرارجی ڈیسائی کو ٹوکا۔ تھوڑی دیر کے لئے کنونشن کی فضا مکدر ہو گئی۔

اگست ۱۹۶۴ میں ایک مسلم اجتماع ندوۃ (لکھنؤ) میں ہوا۔ ڈاکٹر سید محمود اس کے صدر تھے۔ اسی موقع پر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کی بنیاد ڈالنے کی تجویز بھی منظور کی گئی۔

نومبر ۱۹۶۴ میں ڈاکٹر سید محمود نے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے لئے گیارہ رکنی مجلس کی تشکیل کا اعلان کیا۔ اس طرح باضابطہ طور پر مجلس مشاورت عمل میں آئی اور اس نے ملک میں دورہ کر کے تقریریں شروع کیں۔ پنڈت سندر لال بھی اس میں شریک تھے۔

۱۹۷۲ میں پرسنل لا کے تحفظ کے عنوان سے مسلمانوں کا اجتماع ہوا اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ اسی کے تحت شاہ بانو بیگم کی تحریک چلائی گئی۔

اب جولائی ۱۹۸۹ میں سید شہاب الدین صاحب کا مسلم سیاسی کنونشن ہو رہا ہے۔ پچھلے پچاس برس میں ہندستان کے مسلم رہنماؤں نے اس طرح کے سیکڑوں چھوٹے بڑے اجتماع کئے ہیں۔ مگر جہاں تک مسلم مسائل کا معاملہ ہے وہ ابھی تک روز اول کے مرحلہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ یہ تمام کنونشن اور اجتماعات محض وقتی مظاہرے تھے۔ اور وقتی مظاہروں کے ذریعہ کوئی مسئلہ حل ہونے والا نہیں۔

۹ جولائی ۱۹۸۹

محمد شمیم صاحب (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ ایک ہندو افسر نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ لوگ جانور کو حلال کرتے ہیں اور مچھلی کو حلال کئے بغیر کھاتے ہیں۔ یہ فرق کیوں۔

محمد شمیم صاحب نے جواب دیا کہ اصل یہ ہے کہ خون تمام بیماریوں کا سبب (Carrier of all diseases) سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے جانور (بکری وغیرہ) کو اس طرح ذبح کیا جاتا ہے کہ اس کے جسم کا پورا خون باہر نکل جائے۔ اس طرح ذبح کیا ہوا جانور ہر قسم کے جراثیم سے بالکل پاک ہو جاتا ہے۔ مگر مچھلی میں گردش خون (Circulation of blood) کا نظام نہیں ہوتا۔ چنانچہ مچھلی کے لئے یہ مسئلہ نہیں۔ اس لئے مچھلی کو ذبح کئے بغیر سادہ طور پر مار کر کھایا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے نہایت صحیح جواب دیا۔

۱۰ جولائی ۱۹۸۹

ریوارول (Antoine Rivarol) ایک فرانسیسی جرنلسٹ تھا۔ وہ ۱۷۵۳ میں پیدا ہوا، اور ۱۸۰۱ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا قول ہے کہ پرنٹنگ پریس خیال کا توپ خانہ ہے:

The printing press is the artillery of thought.

یہ قول پریس کی اہمیت کو بتاتا ہے۔ اسلام میں جس چیز کو دعوت کہا جاتا ہے وہ یہی چیز ہے جو ہمیشہ اسلام کی سب سے بڑی طاقت ثابت ہوئی ہے۔ موجودہ زمانہ میں

پرنٹنگ پریس کی ایجاد نے اس طاقت کی اثرانگیزی کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ماضی میں مسلمانوں نے اسلام کی دعوتی طاقت کو کامیابی کے ساتھ استعمال کیا مگر موجودہ زمانہ میں جب کہ وہ اس کو مزید زیادہ کامیابی کے ساتھ استعمال کرسکتے تھے، اس کی اہمیت سے اس قدر غافل ہوئے کہ انھوں نے سرے سے اس کو استعمال ہی نہیں کیا۔

۱۱ جولائی ۱۹۸۹

تفسیر قرطبی فقہی انداز کی تفسیر ہے۔ قرطبی امام مالک کے مسلک کے تھے۔ تاہم انھوں نے بعض مقامات پر امام مالک سے اختلاف کیا ہے۔ مثلاً حج کے موقع پر جو رمی جمار کیا جاتا ہے، اس کے متعلق حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹی کنکریاں (چنے کی دال کے برابر) ماری جاسکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں امام مالک نے کہا ہے کہ اس سے بڑی کنکری مجھ کو زیادہ محبوب ہے (واکبر من ذالك احبُّ اليَّ) قرطبی نے اس پر تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ مالک کے اس قول کے کوئی معنی نہیں (ولا معنى لقول مالك) اس تنقید میں استخفاف کا عنصر شامل ہے۔ مگر کسی نے اس کو برا نہیں مانا۔ موجودہ زمانہ میں تو لوگ تنقید کے بارہ میں اتنے حساس ہو گئے ہیں کہ خالص علمی اور تجزیاتی تنقید بھی انھیں گوارا نہیں۔

۱۲ جولائی ۱۹۸۹

نعت گوئی اپنی موجودہ مدحیہ شکل میں ایک بدعت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حسان بن ثابت انصاری وغیرہ کے کچھ اشعار ہیں جن کو نعت میں شمار کیا جاتا ہے۔ مگر آجکل کے مفہوم کے اعتبار سے وہ نعت نہیں۔ یہ دراصل جوابی اشعار ہیں جو مشرکین کی منظوم ہجو کے رد میں لکھے گئے۔ مشرکین چونکہ اشعار کی صورت میں ہجو کرتے تھے، اس لئے اشعار کی صورت میں ان کا جواب دیا گیا۔ صحابہ کے بعد جب اسلام کا اقتدار قائم ہو گیا اور بیشتر لوگ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہجو کا سلسلہ ختم ہو گیا، اس کے بعد نعت گوئی بھی اپنے آپ ختم ہو گئی۔

صحابہ کے بعد تقریباً چھ سو سال تک نعت یا نعت گو شعرا کا وجود نہیں ملتا۔ بوصیری (۶۹۶ - ۶۰۸) غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے پہلی بار موجودہ طرز کی نعت لکھی جو قصیدہ بردہ کے

نام سے مشہور ہے۔ بوصیری کے تفصیلی حالات کشف الظنون میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

اس مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر کا کوئی مثبت رول اسلامی معاشرہ میں نہیں ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ دفاع کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے، وہ بھی اس وقت جب فریق ثانی نے اشعار کے ذریعہ اسلام یا پیغمبر اسلام پر حملہ کیا ہو۔ یہ حملہ اگر نثر کی صورت میں کیا گیا ہو تو نثر کی صورت میں اس کا جواب دیا جائے گا، البتہ اگر یہ حملہ اشعار کے ذریعہ کیا جائے تو اشعار کے ذریعہ اس کا جواب دینا جائز ہوگا۔

۱۳ جولائی ۱۹۸۹

سیرت کی کتابوں میں ابوطالب کے کچھ قصیدے نقل کئے گئے ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر معمولی تعریف کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک طویل قصیدہ کا ایک شعر ہے جس میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کہتے ہیں کہ وہ ایسے روشن چہرہ والا ہے کہ اس کے وسیلے سے بارش طلب کی جاتی ہے، یتیموں کی سرپرستی کرنے والا اور بیواؤں کی پناہ:

وَأبْيَضَ يُسْتَسقَىٰ الغَمامُ بِوَجْهِهِ ثِمالَ اليَتامىٰ عِصْمَةٌ لِلأرامِلِ

ابوطالب آخر وقت تک ایمان نہیں لائے۔ اس لئے ان کے اس قسم کے اشعار جذبۂ ایمانی کے تحت نکلے ہوئے نہیں کہے جاسکتے۔ علماء نے لکھا ہے کہ ابوطالب نے یہ قصیدہ خاندانی فخر کے لئے کہا تھا۔ کیوں کہ بھتیجے کا فخر چچا کو پہنچتا ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جن کو اسلام یا سنت نبوی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مگر اشعار کی صورت میں وہ شاندار نعت کہتے ہیں۔ اس قسم کی نعتیں بھی حقیقۃً ایمان و اسلام کے لئے نہیں ہوتیں، بلکہ وہ قومی افتخار کے لئے ہوتی ہیں۔ کیوں کہ قوم کا فخر قوم کے فرد کو پہنچتا ہے۔

۱۴ جولائی ۱۹۸۹

ایک اسپینی مثل ہے کہ ذاتی معرفت سے ذاتی ترقی کا آغاز ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:

Self-knowledge is the beginning of self-improvement.

یہ نہایت صحیح بات ہے۔ آدمی کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو جانے۔ جب آدمی حقیقی طور پر اپنے آپ کو جان لے، اس کے بعد ہی وہ وقت آتا ہے جب کہ اس کی ذات یا اس کی شخصیت کے ارتقاء کا آغاز ہو۔ اپنے آپ کو جاننا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی اپنے آپ کو کامل طور پر غیر جانب دارانہ نظر سے دیکھ سکے۔

۱۵ جولائی ۱۹۸۹

کویت کے ماہنامہ العربی (جولائی ۱۹۸۹) کے صفحہ ۴۰ پر عربی ادیب توفیق الحکیم کا ایک قول نقل کیا گیا ہے: لا یطفئ مصباح العقل غیر عواصف النفس. عقل کے چراغ کو نفس کی آندھی کے سوا کوئی اور چیز نہیں بجھاتی۔

یہ صدفی صد حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عقل کی صورت میں انسان کو ایسی غیر معمولی صلاحیت دی ہے جو ہر چیز کو سمجھ سکتی ہے۔ عقل کی روشنی میں آدمی ہر معاملہ میں صحیح رائے قائم کر سکتا ہے۔ مگر خواہش عقل کی قاتل ہے۔ جب آدمی کی عقل صحیح فیصلہ کرنے سے قاصر رہتی ہے تو اس کا واحد سبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی عقل اس کی خواہش سے آزاد ہو کر نہ سوچ سکی۔

۱۶ جولائی ۱۹۸۹

کہا جاتا ہے کہ امام احمد بن حنبل کو ۷۰۰ ہزار سے زیادہ حدیثیں یاد تھیں۔ امام مسلم نے کہا ہے کہ میں نے اپنی کتاب صحیح مسلم ۳۰۰ ہزار حدیثوں سے لے کر تیار کی ہے (جمعت کتابی من ثلاث مأة الف حدیث) وغیرہ

اس طرح کی باتوں سے بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ حدیثیں لاکھوں کی تعداد میں تھیں یا ہیں۔ مگر ایسا نہیں۔ یہ شبہ محدثین کی اصطلاح کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ حدیثوں کی تعداد کو طرق کی تعداد سے شمار کرتے ہیں۔ مثلاً حدیث انما الاعمال بالنیات ۷۰۰ طریقوں سے مروی ہے۔ ایک محدث ان کے مجموعہ کو ۷۰۰ حدیث کہے گا۔ حالاں کہ وہ صرف ایک حدیث ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صحیح اور معتبر احادیث کی اصل تعداد اس سے بہت کم ہے۔ حاکم نے صراحت کی ہے کہ درجہ اول کی حدیثیں ۱۰ ہزار سے زیادہ نہیں (وقد صرح الحاکم

ابو عبد اللہ ان الاحادیث التی فی الدرجۃ الاولی لا تبلغ عشرۃ آلاف)

۱۷ جولائی ۱۹۸۹

لاہور کے ماہنامہ میثاق (جولائی ۱۹۸۹) میں "افغان جہاد سے سبق" کے زیر عنوان ایک نوٹ ہے، یہ نوٹ حسب ذیل ہے:

افغان جہاد عظیم کامیابی حاصل کرنے کے بعد اگر آج تعطل کا شکار ہو گیا ہے تو اس کی دوسری وجوہات بھی ہوں گی۔ اصل وجہ یہ ہے کہ مجاہدین سے ایک بڑی خطا ہوئی ہے۔ انھوں نے پروفیسر عبد الرب رسول سیاف کو جہاد کا امیر بنا کر ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ لیکن پھر توڑ دی۔ سات سات آٹھ آٹھ گروپ بن گئے اور اکثر میں تقسیم در تقسیم بھی پیدا ہو گئی۔ امدادی رقوم اور اسلحہ سب لوگ الگ الگ لینا چاہتے تھے۔ آج اس کا نتیجہ سامنے ہے۔ گوریلا طرز جنگ کے عادی مجاہدین نے ثمر خیل چھاؤنی کو جس طرح روند کر دکھا دیا اس کے بعد جلال آباد کی حیثیت کیا رہ گئی تھی۔ انھوں نے یہ کارنامہ باقاعدہ جنگ کے ذریعہ ہی انجام دیا تھا۔ لیکن پھر بدنظمی نے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ ہر دھڑا جلال آباد کی تسخیر کا سہرا اپنی پیشانی پر باندھنے کا آرزو مند تھا۔ چنانچہ منصوبہ بندی کے بغیر اور اپنی قوت کو جمع کئے بغیر ہر کمانڈر از خود چڑھ دوڑا۔ عظیم جانی نقصان اٹھانے کے باوجود جلال آباد مجاہدین کے راستہ کی دیوار بنا ہوا ہے۔ (صفحہ ۱۷)

جو مجاہدین فتح اسلام سے پہلے اپنے نفس کو قابو میں نہ رکھ سکے وہ فتح و غلبہ کے بعد کیوں کر اپنے نفس کو قابو میں رکھنے میں کامیاب ہوں گے۔ جب کہ بعد کو یہ کام پہلے سے ہزار گنا زیادہ دشوار ہو چکا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے شورش پسند گروہ سے یہ امید رکھنا کہ وہ اقتدار پر قبضہ کر کے قرآن و سنت کی حکومت قائم کریں گے ایک ایسی خوش فہمی ہے جو کسی ایسے ہی دماغ میں جگہ پا سکتی ہے جو عقل و فہم سے بالکل خالی ہو۔

۱۸ جولائی ۱۹۸۹

اطہر صدیقی ایم اے نے یہ واقعہ بتایا۔ وہ محمد ہدایت اللہ صاحب وائس پریسیڈنٹ انڈیا (۱۹۰۵ - ۱۹۹۲) کے پی اے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک بار سکھ پیشواؤں کا ایک وفد ہدایت اللہ صاحب سے ملنے کے لئے آیا۔ وہ لوگ سب کے سب کرپان لگائے ہوئے تھے۔

سیکورٹی کے لوگوں نے کہا کہ آپ لوگ کرپانیں باہر رکھ دیں، اس کے بعد وائس پریسیڈنٹ سے ملنے کے لئے اندر جائیں۔ وہ لوگ کرپانیں باہر رکھنے پر تیار نہیں ہوئے۔ سیکورٹی افسر نے ٹیلیفون پر سکریٹری کو بتایا۔ سکریٹری نے کہہ دیا کہ کرپانوں کے ساتھ اندر مت جانے دو۔ اور اگر وہ اصرار کریں تو ان کو گرفتار کر لو۔

اطہر صدیقی صاحب نے موقع کی نزاکت کو محسوس کیا۔ وہ فوراً اندر جا کر ہدایت اللہ صاحب سے ملے اور ان سے کہا کہ سیکورٹی افسر اور سکریٹری کا اصرار حکمت کے خلاف ہے۔ آپ ملٹری افسر سے براہ راست کہہ دیں کہ وہ ان لوگوں کو کرپانوں کے ساتھ اندر آنے دیں۔ چنانچہ ہدایت اللہ صاحب نے ٹیلیفون پر سیکورٹی افسر کو ہدایت دے دی۔

اس کے بعد سکھ وفد کرپانوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ہدایت اللہ صاحب کے سامنے پہنچتے ہی انھوں نے اپنی کرپانوں کو اتار کر ہدایت اللہ صاحب کے قدموں میں رکھ دیا اور کہا کہ کیا ہم کمینہ پن کریں گے کہ یہاں آ کر آپ کے اوپر ان کرپانوں سے حملہ کریں۔ آپ ہمارے باپ ہیں۔ ہم تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔

یہ صرف آپ کی نادانی ہے جو فریق ثانی کو ہتھیار استعمال کرنے تک لے جاتی ہے۔ اگر آپ حکمت کا طریقہ اختیار کریں تو فریق ثانی اپنے ہتھیاروں سمیت آپ کے قدموں میں گر پڑے گا۔

۱۹ جولائی ۱۹۸۹

ایک صاحب ملنے کے لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ کا الرسالہ پڑھتا ہوں۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ "صلح حدیبیہ" کی بات کو اتنا کیوں دہراتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں آپ کو صلح حدیبیہ کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔

میں نے کہا کہ قرآن میں صلح حدیبیہ کو فتح مبین کہا گیا ہے۔ کئی صحابہ سے مروی ہے کہ وہ صلح حدیبیہ کو فتح عظیم سمجھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صلح حدیبیہ وہ طریق کار ہے جس سے کھلی فتح اور سب سے بڑی فتح کا دروازہ کھلا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ماسٹر اسٹریٹجی ہے۔ ایسی حالت میں اگر الرسالہ میں اس کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے تو اس میں اعتراض کی کیا بات

ہے۔ جب 'حدیبیہ' اسلام کی ماسٹر اسٹریٹجی ہے تو ہر مقام پر سب سے پہلے اس کو زیر عمل لانے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اس کو صرف وہاں چھوڑا جا سکتا ہے جہاں وہ سرے سے قابل انطباق ہی نہ ہو۔

۲۰ جولائی ۱۹۸۹

گورکھپور میں ایک قدیم ہندو ادارہ ہے جس کے تحت گیتا پریس، کینسر ہاسپٹل وغیرہ چل رہے ہیں۔ یہ ادارہ گئوکشی کے مسئلہ پر ایک ویڈیو فلم بنا رہا ہے۔ اس کے نمائندہ بھیم سین چوپڑہ میرے پاس آئے اور مجھے اس میں شرکت کے لئے اصرار کیا۔ چنانچہ آج ویڈیو پارٹی آئی اور ریکارڈ کیا۔ میں نے حسب ذیل بیان دیا:

"گائے کو ذبح کرنا یا اس کا گوشت کھانا اسلام میں جائز ہے مگر وہ فرض نہیں ہے۔ یعنی وہ permitted ہے مگر وہ obligatory نہیں ہے۔

ہندستان میں انگریزوں سے پہلے مغل حکمرانوں کی پالیسی یہ تھی کہ گائے کے ذبیحہ کو روکا جائے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، اس وقت کے علماء اور صوفیاء نے اس پالیسی کی مخالفت نہیں کی۔ اس کی وجہ بظاہر یہی تھی کہ اس ملک میں مسلمانوں کے ساتھ بہت بڑی تعداد میں ہندو بستے ہیں۔ وہ لوگ عام طور پر گائے کو مقدس مانتے ہیں۔ چنانچہ ہندو بھائیوں کے جذبات کا احترام کرنے کے لئے ایسا کیا گیا۔

آج بھی میں سمجھتا ہوں کہ ہندوؤں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے مسلمانوں کو گائے کا ذبیحہ بند کر دینا چاہئے، عقیدہ کے طور پر نہیں بلکہ وقتی پریکٹس کے طور پر۔ چنانچہ عملاً ایسا ہی ہے۔ کہ مسلمان اس کو چھوڑے ہوئے ہیں، اور کسی ہندستانی عالم نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ مسلمانوں کو ضرور گائے کا ذبیحہ کرنا چاہئے۔ اب ممکن ہے کہ گورنمنٹ کو گائے کے ذبیحہ سے دلچسپی ہو کیونکہ اس سے فارن ایکسچینج مل سکتا ہے، ورنہ مسلمانوں کو اب اس مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑی چیز جس کی آج کے ہندستان میں ضرورت ہے، وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھائی چارہ ہے۔ دونوں محبت کے ساتھ مل جل کر رہیں۔ اسی میں دونوں کی ترقی اور بھلائی ہے۔ مسلمان اگر گائے کو دے کر ہندوؤں کے دل کو پالیں تو میں

سمجھتا ہوں کہ انھوں نے بہت چھوٹی چیز دے کر بہت بڑی چیز پائی۔"

۲۱ جولائی ۱۹۸۹

ایک صاحب نے کہا کہ آپ آیات اللہ خمینی (ایران) اور جنرل ضیاء الحق (پاکستان) پر تنقید کرتے ہیں۔ مگر آپ شاہ ایران اور بھٹو پر تنقید نہیں کرتے۔ حالاں کہ اگر آیات اللہ خمینی سے اور ضیاء الحق سے غلطیاں ہوئی ہیں تو شاہ ایران اور بھٹو نے بھی بہت سی برائیاں کی ہیں۔

میں نے کہا کہ شاہ ایران اور بھٹو نے جو کچھ کیا، سیکولرزم کے نام پر کیا۔ اس لئے ان کے عمل سے یا تو سیکولرزم بدنام ہوگا یا وہ خود ذاتی طور پر بدنام ہوں گے۔ مگر خمینی اور ضیاء الحق نے جو کچھ کیا، اسلام کے نام پر کیا۔ اس لئے ان کے عمل سے اسلام بدنام ہوتا ہے۔ میں اسلام کو بدنامی سے بچانے کے لئے ان حضرات کے اعمال کا تجزیہ کرتا ہوں اور یہ بتاتا ہوں کہ ان لوگوں نے جو کچھ کیا اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ ان کی ذاتی سیاست تھی نہ کہ فی الواقع اسلام۔

۲۲ جولائی ۱۹۸۹

آج میرے لڑکے ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں کا دہلی میں ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ ٹالسٹائے مارگ پر گاڑی سے دب جانے کی وجہ سے ان کے دائیں پاؤں کی ہڈی (گھٹنے اور کولھے کے درمیان) ٹوٹ گئی۔ بڑی مشکل سے کسی نے ولنگڈن اسپتال پہنچایا کیوں کہ کوئی لے جانے کے لئے تیار نہ تھا۔ خبر ملتے ہی میں اور ثانی اثنین اسپتال پہنچے۔ وہاں یہ منظر تھا کہ ظفر الاسلام زخمی حالت میں اسٹریچر پر لیٹے ہیں اور کوئی پرسان حال نہیں۔ دو گھنٹے اس حالت میں گزر گئے کہ وہ کراہ رہے ہیں اور کوئی طبی کارروائی نہیں ہوئی۔ عجیب بے بسی کا عالم تھا جو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

چنانچہ اطہر صدیقی صاحب کو ٹیلیفون کیا گیا جو ہیلتھ منسٹر کے پی اے ہیں۔ انھوں نے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کو ٹیلیفون کرایا۔ اس کے بعد میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر بھاری کی ذاتی ہدایت پر کارروائی شروع ہوئی۔ اگلے دن ہیلتھ منسٹر رفیق عالم دیکھنے کے لئے آئے اور ذمہ داروں کو ہدایات دیں۔ اس کے بعد فضا بالکل بدل گئی۔ اب وی آئی پی والے انداز پر علاج شروع ہوگیا۔

ظفر الاسلام نے بتایا کہ اس سے پہلے جب وہ لندن میں تھے، وہاں بھی ایک بار ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ دائیں ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ان کی بیوی ساتھ تھیں، انھوں نے فوراً پولیس کو

ٹیلی فون کیا۔ اس کے بعد منٹوں کے اندر ایمبولنس آگئی۔ اس نے ان کو اسپتال پہنچایا۔ کسی سفارش کے بغیر فوراً باقاعدہ علاج شروع ہوگیا۔

ہندستان اور مغرب کے اسی فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے تمام بہترین دماغ ہندستان سے بھاگ کر مغرب کے شہروں میں آباد ہو رہے ہیں۔ آزادی نے اس کے سوا کوئی فرق نہیں کیا کہ ہماری سیاسی محکومی دوبارہ اقتصادی محکومی میں تبدیل ہو گئی۔

۲۳ جولائی ۱۹۸۹

انگریزی ہفت روزہ سنڈے (۲۳ جولائی ۱۹۸۹) میں خوشونت سنگھ نے ڈاکٹر پی سی رے (۱۹۴۴-۱۸۶۱) کی یاد میں ایک صفحہ لکھا ہے۔ ڈاکٹر پی سی رے بہت قابل آدمی تھے اور کئی زبانیں جانتے تھے۔ انھوں نے اسلام کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔

ڈاکٹر رے ۱۹۲۳ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بلائے گئے۔ وہاں انھوں نے کانووکیشن ایڈریس دیا۔ اس ایڈریس میں انھوں نے اسلام کی سادگی اور اس کی مساوات کا بلند الفاظ میں اعتراف کیا۔ انھوں نے کہا کہ اونچے مینار سے مؤذن کی پکار مسلمانوں کو نماز کے لئے بلاتی ہے۔ امیر کو بھی اور فقیر کو بھی، بادشاہ کو بھی اور بھشتی کو بھی۔ لوگ مسجد میں جمع ہوتے ہیں اور کندھے سے کندھا ملا کر خدا کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسلام میں انسان اور انسان کے درمیان کوئی امتیاز نہیں:

> **The call of the muezzin sounds from the top of the minaret summoning the faithful to prayer, the ameer and the fakeer, the badshah and the bhishti, flock together and squat shoulder to shoulder in the adoration of the Almighty. Islam knows no soul-killing distinctions between man and man.**

ڈاکٹر رے نے کہا کہ مغرب میں بظاہر ڈیموکریسی کا نعرہ ہے مگر نسل اور رنگ اور دولت کی بنیاد پر امتیاز نے مغرب کی ڈیماکریسی کو بے معنی بنا دیا ہے۔ ہندوؤں میں کاسٹ سسٹم ایسی برائی ہے جس کے بعد حقیقی معنوں میں برابری کا سماج قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام میں ریل ڈیموکریسی ہے اور اسی کے ساتھ مساوات بھی۔

نماز میں بے پناہ کشش ہے۔ اگر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت کی فضا

نہ ہو تو یہ نماز بذات خود تبلیغ کا ذریعہ بن جائے۔

۲۴ جولائی ۱۹۸۹

اس دنیا میں کامیاب وہ ہے جس کی ناکامی کو خدا کامیابی میں تبدیل کر دے۔ جس کی سیئہ کو خدا اپنی نصرت خاص سے حسنہ کی صورت عطا فرمائے۔ جس آدمی کو اللہ تعالیٰ کی یہ نصرت نہ ملے اس کی کامیابی بھی ناکامی ہے اور اس کا حسنہ بھی سیئہ ہے۔ کم از کم آج کی تاریخ تک، یہ آخری بات ہے جس کو میں نے اپنے علم اور تجربہ سے جانا۔

۲۵ جولائی ۱۹۸۹

عابد سعید خاں صاحب ایم اے ایک بزرگ کو لے کر آئے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ ہمارے خالو ہیں جو ۱۹۴۷ کے بعد پاکستان چلے گئے۔ گفت گو کے دوران میں نے خالو صاحب سے کہا کہ عابد سعید خاں صاحب اگر پاکستان چلے گئے ہوتے تو وہاں بہت ترقی کر سکتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں مادی اعتبار سے ضرور ترقی کرتے مگر اس کے بعد دو آدمی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر آتے اور گولی مار کر ان کا خاتمہ کر دیتے اور جو کچھ انھوں نے کمایا تھا سب اٹھا کر لے جاتے۔

پاکستان شاید امریکہ کے بعد دوسرا ملک ہے جہاں خطرناک ہتھیار کھلے عام بازار سے خریدے جا سکتے ہیں۔ اور کسی لائسنس کے بغیر اپنے پاس رکھے جا سکتے ہیں۔ انگریزی ہفتہ وار انڈیا ٹوڈے (۳۱ جولائی ۱۹۸۹) نے ۶ صفحہ کی ایک رپورٹ چھاپی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ آدم خیل میں ہتھیاروں کے بڑے بڑے بازار ہیں جہاں جوتے اور کپڑے کی طرح ہر قسم کے خطرناک ہتھیار بکتے ہیں۔ صفحہ ۶۰ - ۶۱ پر ایک بہت بڑی تصویر ہے۔ اس میں ایک دکان کو دکھایا گیا ہے جو رائفل، پستول، ہوائی جہاز کو مارنے والے گن وغیرہ سے بھری ہوئی ہے۔ اس کے آگے ایک آدمی مصلا بچھا کر نماز پڑھ رہا ہے۔ تصویر میں وہ حالت سجدہ میں نظر آتا ہے۔

اس کے نتیجہ میں نہ صرف پاکستان میں ہر آدمی کے پاس کھلے ہتھیار ہیں بلکہ اطراف کے ملکوں میں تشدد کی تحریکوں کو یہاں سے بہت بڑے پیمانہ پر اس قسم کے خطرناک ہتھیار مل رہے ہیں ـــــ پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا، مگر وہ روس اور چین کے ہتھیاروں کی مارکٹ ہو کر رہ گیا۔

۲۶ جولائی ۱۹۸۹

فیروز آباد کے ایک مسلمان آئے۔ انھوں نے شکایت کی کہ ہندستان کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ مسلمانوں کو پیچھے رکھا جائے۔ ایسی حالت میں وہ کیسے ترقی کرسکتے ہیں۔

گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ فیروز آباد میں چوڑیوں کی تجارت پہلے مکمل طور پر مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ اب وہ مکمل طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں جاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ مسلمان POT FURNACES کے اصول پر اپنے کارخانے بنائے ہوئے تھے۔ ہندو تعلیم یافتہ تھے، انھوں نے جدید ٹکنیک استعمال کی۔ اور انھوں نے TANK FURNACES کے اصول پر کارخانے قائم کئے۔ ہمارے مقابلہ میں ان کا مال اچھا بھی معلوم ہوتا ہے اور سستا بھی۔ چنانچہ ان کا مقابلہ ہمارے لئے ناممکن ہوگیا ہے۔ تمام مسلمان چوڑی والے آجکل سخت گھاٹے میں جا رہے ہیں۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ہماری بھٹی تقریباً ۱۰ لاکھ روپیہ میں تیار ہو جاتی ہے۔ مگر ان کی جدید طرز کی بھٹی کو بنانے میں تقریباً ایک کروڑ روپیہ خرچ آتا ہے۔ مسلمان اس کو افورڈ نہیں کرسکتا۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ کوآپریٹو بنا لیجے۔ انھوں نے کہا کہ کچھ مسلمانوں نے کوآپریٹو بنایا۔ مگر وہ آپس میں کھاپی کر ختم ہوگیا۔

میں نے کہا کہ آپ کا ذاتی تجربہ یہ بتا رہا ہے کہ ہندو اپنی تعلیم اور اپنی منصوبہ بندی کی وجہ سے آپ سے آگے بڑھ گیا ہے اور اپنی تقریر میں آپ یہ فرما رہے ہیں کہ حکومت ہند کی مخالفانہ پالیسی نے مسلمانوں کو پیچھے دھکیل رکھا ہے۔

۲۷ جولائی ۱۹۸۹

ٹائمس آف انڈیا (۲۷ جولائی ۱۹۸۹) صفحہ ۶ پر ایک نوٹ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ برطانیہ کے شمال اور شمال مشرقی حصہ میں تقریباً دس سیٹیں ایسی ہیں جہاں مسلم آبادی کافی ہے اور ان کا ووٹ انتخابی نتیجہ کو متاثر کرسکتا ہے۔ اس علاقہ سے جو لوگ برطانی پارلیمنٹ کے لئے منتخب ہوتے ہیں، وہ اس بات کی وکالت کر رہے ہیں کہ برطانی مسلمانوں کے جذبات (Muslim sentiments) کا لحاظ کرتے ہوئے سلمان رشدی کی کتاب سیٹنک ورسز پر پابندی لگادی جائے۔

مگر ممبروں کی اکثریت اس کے خلاف ہے۔ لیبر پارٹی کے لیڈر مسٹر نیل کنوک (Neil Kinnock) نے کہا کہ وہ صرف ایک مذہب میں عقیدہ رکھتے ہیں، اور وہ آزادی ہے۔ وہ اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ایک مصنف کی ادبی آزادی کو مذہبی جذبات کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا جائے:

The only religion he believes in is "liberty". Thus, he is unwilling to sacrifice the literary licence of an author at the alter of religious sentiments.

مسٹر کنوک نے اپنے اعتبار سے صحیح بات کہی ہے۔ میرے نزدیک اس معاملہ میں مسلمانوں کی جذباتیت انھیں فائدہ تو کچھ نہیں دے گی۔ البتہ انھیں نقصان پہنچانے کا سبب ضرور بنے گی۔

۲۸ جولائی ۱۹۸۹

آج کل شدت سے مجھ پر یہ احساس طاری رہتا ہے کہ میری موت شاید قریب آگئی۔ اسی کے ساتھ برابر یہ خیال آتا ہے کہ میرے بعد الرسالہ جاری رہنے کی کیا صورت ہوگی۔ اور یہ مشن آئندہ کس طرح قائم رہے گا، جب کہ ذہن سازی کی موجودہ مہم کا ابھی بہت دن تک جاری رہنا انتہائی ضروری ہے۔

جہاں تک الرسالہ جیسے اوریجنل مضامین کا تعلق ہے، اس کو لکھنے والا فی الحال مجھے کوئی نظر نہیں آتا۔ نہ حلقۂ الرسالہ کے اندر اور نہ اس حلقہ کے باہر۔ اس قسم کے مضامین لکھنے کے لئے آدمی کو موت اور زندگی کے درمیان کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ مگر اس وقت مجھے سارے عالم اسلام میں کوئی بھی شخص ایسا نظر نہیں آتا جس نے اپنے آپ کو حقیقی معنوں میں موت اور زندگی کے درمیان کھڑا کر رکھا ہو۔

تاہم ایک اور کام ہے جس کو کوئی اچھا پڑھا لکھا آدمی اگر محنت کرے تو اس کو انجام دے سکتا ہے۔ حلقۂ الرسالہ میں ایسے افراد موجود ہیں۔ وہ کام ہے میری چھوٹی ہوئی تحریروں کی بنیاد پر اس مشن کو آئندہ جاری رکھنا۔ میں اس کو ضروری سمجھتا ہوں کہ آئندہ بہت دنوں تک الرسالہ کو صرف میری تحریروں کے ذریعہ نکالا جائے۔

اس وقت میرے پاس کثیر تعداد میں ایسے مضامین موجود ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔ اسی کے ساتھ ڈائری اور خطوط کے جوابات وغیرہ بھی بڑی مقدار میں موجود ہیں۔ ان کو ایڈٹ کرکے ان شاء اللہ تقریباً دس سال تک الرسالہ اسی طرح میری تحریروں کے ذریعہ جاری رکھا جاسکتا ہے۔

دوسرا کام میرے مضامین اور کتابوں کا ترجمہ ہے، جو خود بہت بڑا کام ہے، عربی اور انگریزی اور دوسری زبانوں میں تمام کتابوں اور تحریروں کا ترجمہ انتہائی ضروری ہے۔ اگر ترجمہ کا یہ کام باقاعدہ صورت میں شروع ہو جائے تو یہ مشن از سر نو نئی طاقت کے ساتھ عالمی سطح پر جاری ہو جائے گا۔

دوسروں کی تحریریں اس مشن میں اس وقت تک شامل نہ کی جائیں جب تک یہ مشن پوری طرح قائم (establish) نہ ہو جائے۔

۲۹ جولائی ۱۹۸۹

ایک مسلمان (محفوظ الرحمٰن صاحب) سے ملاقات ہوئی۔ وہ پرس اور بیگ بنانے کا کام کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ دو سال پہلے ان کا کام بہت خراب ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ انھوں نے ارادہ کیا کہ اس کام کو چھوڑ کر دوسرا کام شروع کر دیں۔

اسی زمانہ میں انھوں نے الرسالہ کا ایک مضمون پڑھا۔ اس مضمون میں انھیں یہ انسپریشن ملا کہ کام بدلنے کے بجائے اسی کام میں نیا پن پیدا کرنا چاہئے۔ اب انھوں نے "دماغی محنت" شروع کی۔ ان کی سمجھ میں کچھ ڈیزائنیں آئیں۔ اس کے مطابق وہ کچھ نئے قسم کے پرس اور نئے قسم کے بیگ بنا کر بازار میں لے آئے۔ ان کا کام مزید کامیابی کے ساتھ دوبارہ چل پڑا۔

انھوں نے بتایا کہ جس زمانہ میں کام چھوڑنے کا ارادہ تھا، میں نے سوچا کہ میں ایک اردو ہفت روزہ نکالوں۔ ہندی میں ایک ہفت روزہ "جرائم کی کہانیاں" کے نام سے نکلتا ہے جو بے حد کامیاب ہے۔ میں نے سوچا کہ اردو میں اس قسم کا کوئی پرچہ نہیں ہے اس لئے اگر اسی ڈھنگ پر اردو میں ایک پرچہ نکالا جائے تو وہ کافی کامیاب ہو سکتا ہے۔ مگر بعض اسباب کی بنا پر وہ اس کو شروع نہ کر سکے۔ انھوں نے بتایا کہ میرے ایک ساتھی نے مجھ سے یہ آئیڈیا

لیا اور خاموشی سے "جرائم" کے نام سے ایک پرچہ نکال دیا۔ اس نے اس پرچہ کے ذریعہ سے اتنی زبردست کامیابی حاصل کی کہ آج اس نے نئی دہلی میں ایک کوٹھی خرید لی ہے۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں صحافت اور قیادت کا میدان کتنی بری شکل اختیار کر چکا ہے۔ وہی محفوظ صاحب پلاسٹک کاروبار کے میدان میں ترقی کے لئے یہ سوچتے ہیں کہ نئے قسم کا بیگ بنائیں۔ مگر وہی محفوظ صاحب صحافت کے میدان میں آنا چاہتے ہیں تو ان کا ذہن انھیں یہ سکھاتا ہے کہ جرائم کی کہانیاں چھاپو، کیوں کہ اس طرح تمہارا پرچہ زیادہ بکے گا۔ یہی وہ صورت حال ہے جس نے موجودہ زمانہ میں صحافت اور قیادت کو مجرد استحصال (Sheer exploitation) بنا کر رکھ دیا ہے۔

۳۰ جولائی ۱۹۸۹

ہمارے یہاں پاکستان کے دو اردو روزنامے آتے ہیں ——— وفاق (لاہور) اور نوائے وقت (لاہور) یہ اخبارات ہندستان کے بارہ میں نفرت سے بھرے ہوتے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ گویا نفرت کا کارخانہ ہیں۔ حتی کہ سادہ قسم کے واقعات کو بھی اس طرح چھاپا جاتا ہے کہ اس سے ہندستان کے بارہ میں حقارت اور نفرت کا جذبہ پیدا ہو۔

بارش اور سیلاب خدا کی طرف سے آتے ہیں، اور ہر ملک میں آتے ہیں۔ امسال کراچی میں بارش ہوئی تو نوائے وقت ۲۶ جولائی ۱۹۸۹ میں اس کی خبر اس سرخی کے ساتھ چھپی:

طوفانی بارش نے کراچی میں تباہی مچادی

اسی قسم کی بارش کا واقعہ ہندستان میں ہوا تو اس کی رپورٹنگ کے الفاظ بدل گئے۔ مثلاً وفاق (۲۰ جولائی ۱۹۸۹) کے صفحہ اول پر ہندستان میں ہونے والی بارش کی جو خبر چھپی ہے، اس کی سرخی یہ ہے:

بھارت میں سیلاب نے تباہی مچادی

بارش کا واقعہ مقامی واقعہ تھا۔ پاکستان میں اس کے مطابق وہ مقامی واقعہ کے طور پر چھپا۔ مگر ہندستان میں اسی قسم کا مقامی واقعہ ملک گیر واقعہ بن گیا۔ جب کہ ہندستان کا رقبہ پاکستان کے مقابلہ میں ۸ گنا زیادہ ہے۔ اور فطری نظام کے تحت یہ ناممکن ہے کہ سارا

ہندستان بیک وقت سیلاب سے تباہ ہو جائے۔

۳۱ جولائی ۱۹۸۹

موجودہ زمانہ کی ایک صحافتی اصطلاح ہے جس کو Media projection کہا جاتا ہے۔ یعنی اخبارات کے صفحات میں اپنے آپ کو نمایاں کرنا۔ اس مقصد کے لئے منسٹر اور بڑے سیاسی لیڈر رقمیں دے کر جرنلسٹوں کو خریدتے ہیں۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ روزانہ اخبارات کا مطالعہ کرکے اپنے مؤکلوں کو بتائیں کہ آج وہ کونسا بیان یا پریس اسٹیٹمنٹ جاری کریں جو کل کے اخبار میں نمایاں طور پر چھپے، اور اس طرح وہ برابر نیوز میں رہیں۔

اس طرح ایک لیڈر اخبار کے صفحات میں ہیرو بن کر نمایاں ہوتا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں وہ زیرو ہوتا ہے۔ یہی آج تمام لیڈروں کا حال ہے، خواہ وہ مسلم لیڈر ہوں یا غیر مسلم لیڈر، خواہ وہ داڑھی والے ہوں یا بے داڑھی والے۔ اس معاملہ میں ایک اور دوسرے کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

یکم اگست ۱۹۸۹

۳۱ جولائی کو میں ماؤنٹ آبو (راجستھان) میں تھا۔ وہاں برہما کماری مشن کا سنٹر ہے۔ بہت وسیع رقبہ میں اس کی عمارتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ روزانہ تقریباً ایک ہزار آدمی وہاں دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ ہم نے ایک جدید ترین طرز کا ہال دیکھا۔ اس میں لکچر ہو رہا تھا جس کو دو ہزار سے زیادہ طلبہ سن رہے تھے۔ ہر چیز نہایت شاندار اور اعلیٰ معیار کی تھی۔

میرے ساتھ چار اور مسلمان تھے۔ مشن کا ایک آدمی ہم کو اس کی تمام چیزیں دکھا رہا تھا۔ اس دوران ہمارے ساتھیوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ "یہاں پہاڑ کے اوپر آپ نے اتنا بڑا کام پھیلا رکھا ہے، اس کے لئے آپ کو پیسہ کہاں سے ملتا ہے" یہ سن کر مجھ کو اتنی شرم آئی کہ میں نے سر جھکا لیا۔ دیر تک میرے منھ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ میرے نزدیک یہ نہایت سطحی اور غیر شریفانہ سوال تھا۔ میری روح آخری حد تک تڑپ اٹھی۔ میں نے سوچا کہ میں نے بہت بڑی غلطی کی کہ ایسے سطحی آدمی کو اپنے وفد میں شامل کرکے یہاں لے آیا۔

میں نے کہا ــــــ مسلمان بولنا تو کیا جانیں گے، وہ چپ رہنا بھی نہیں جانتے۔

۲ اگست ۱۹۸۹

قدسی کا ایک قطعہ ہے، اس کا آخری شعر یہ ہے۔

روز قیامت ہر کسے آید بدستش نامۂ　　من نیز حاضر می شوم تصویر جاناں دربغل

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں شاہ عبد العزیز دہلوی (۱۸۲۳-۱۷۶۲) نے ایک لفظی تبدیلی کی تھی۔ اور وہ اُس کو اِس طرح پڑھا کرتے تھے:

من نیز حاضر می شوم تفسیر قرآں دربغل

موجودہ زمانہ کے اکثر مصنفین نے اس قسم کی باتیں کہی ہیں کہ قیامت کے دن وہ اپنی فلاں کتاب لے کر خدا کے یہاں پہنچیں گے۔ میرے نزدیک اس قسم کی باتیں بالکل طفلانہ ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو خدا کی عظمت کا حقیقی ادراک نہ ہو سکا، ورنہ وہ ہرگز ایسی بات نہ کہتے۔

۳ اگست ۱۹۸۹

مسٹر ارن شرما (انگلش جرنلسٹ) نے بتایا کہ ۱۹۶۹ میں جب کہ وہ دہلی کے ایک اسکول میں پڑھتے تھے۔ مہارشی یوگی آئے اور رنجیت ہوٹل (نئی دہلی) میں ٹھہرے۔ انھوں نے اخباروں میں اعلان کیا کہ لوگ میرے پاس آئیں۔ میں ان کو ایسا منتر بتاؤں گا جس سے ان کے اندر تخلیقی ذہانت (Creative intelligence) پیدا ہوگی۔

اسکول کی دو لڑکیاں ان کے یہاں گئیں۔ انھوں نے ہر ایک سے کہا کہ میں اپنا منتر تمہارے کان میں بتاؤں گا۔ تم خود اس کا جاپ کرنا۔ مگر کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ ایک لڑکی اپنا کان ان کے پاس لے گئی۔ اس کو انھوں نے چپکے سے منتر بتا دیا۔ پھر دوسری لڑکی اپنا کان لے گئی۔ اس کو بھی انھوں نے چپکے سے منتر بتا دیا۔ اس کے بعد دونوں نے یہ کیا کہ انھوں نے کسی کو وہ منتر نہیں بتایا۔ بس خود اس کا جاپ کرتی رہیں۔

کچھ دن بعد ارن شرما نے ایک لڑکی کو کہہ سن کر راضی کیا کہ وہ انھیں مذکورہ منتر بتائے۔ اس نے بتایا کہ "اوم آئنگ"۔ پھر انھوں نے دوسری لڑکی سے ملاقات کی۔ اس سے کہا کہ میں نے تمہاری دوسری ساتھی سے منتر معلوم کر لیا ہے، اور وہ اوم آئنگ ہے۔ لڑکی نے حیرت کے ساتھ بتایا کہ ٹھیک یہی منتر انھوں نے مجھ کو بھی سکھایا تھا۔ ارن شرما صاحب نے مزید بتایا کہ

اوم کا مطلب شانتی (Peace) ہے، مگر آٹنگ کا کوئی مطلب نہیں۔

۴ اگست ۱۹۸۹

محمد ابراہیم صاحب رائچوری (۲۱ سال) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ایک واقعہ بتایا جو ان کے ساتھ ۱۹ جولائی ۱۹۸۹ کو پیش آیا تھا۔ وہ تبلیغی جماعت کے ساتھ بسوا کلیان (ضلع بیدر) گئے۔ وہاں وہ بازار میں گشت کے لئے نکلے۔ وہ مسلمانوں کی دکانوں پر جاکر انھیں مسجد میں آنے کے لئے کہہ رہے تھے۔

وہاں جامع مسجد کے پاس ایک ہندو کی دکان ہے جس کا نام کشن ہے۔ وہ سبزی وغیرہ بیچتا ہے۔ یہ لوگ اس کے سامنے سے کچھ بات کئے بغیر گزر گئے۔ اس کے بعد وہ ہندو دکاندار اٹھ کر ان کے پیچھے آیا۔ اس نے پوچھا کہ آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں۔ آپ کا مقصد کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ایمان ویقین کی باتیں کرتے ہیں۔ ہندو دکاندار نے کہا: تم لوگ جو مسلمانوں کو جوڑتے ہیں۔ اور ایمان کی بات کرتے ہیں، اگر آپس ہی میں بانٹ کر کھاتے ہیں تو وہ ہم تک کیسے پہنچے گا؟

۵ اگست ۱۹۸۹

موجودہ زمانہ کے مسلمان جو ہنگامہ آرائیاں کر رہے ہیں، اگر یہی خدا کا مطلوب ومحبوب عمل ہو تو خدا کو نعوذ باللہ سطحی ماننا پڑے گا۔ اور ایسا ماننا کسی طرح ممکن نہیں۔ خدا کا اعلیٰ ترین نفیس ذوق جو اس کی تخلیقات فطرت میں ظاہر ہوا ہے، وہ اس قسم کے کسی بھی خیال کو بالکل مردود قرار دیتا ہے ——— موجودہ زمانہ کے مسلمان دین کے نام پر جو بے معنی سرگرمیاں جاری کئے ہوئے ہیں، ان کو سوچ کر میرے دل میں یہ خیال آیا اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

۶ اگست ۱۹۸۹

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ میں آپ اپنے جو سفرنامے چھاپتے ہیں، ان میں خودستائی ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ جو لوگ اس قسم کا تبصرہ کرتے ہیں، وہ دو چیزوں کا فرق نہیں سمجھتے۔ ایک ہے خودستائی، دوسرا ہے بیانِ واقعہ۔ الرسالہ کے سفرنامہ میں جو چیز ہوتی ہے وہ بیان واقعہ ہے نہ کہ خودستائی۔

میں نے کہا کہ آپ مختلف لوگوں کے سفرناموں کو دیکھئے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی

ایک سفرنامہ ہے جس میں آپ نے معراج کے سفر کو بیان فرمایا ہے۔ اس میں ہے کہ بیت المقدس میں تمام انبیاء جمع ہوئے اور میں نے ان کی امامت کی۔ میں اوپر گیا تو آسمان کا دروازہ میرے لئے کھولا گیا۔ ایک شخص کہے گا کہ یہ خودستائی ہے۔ مگر نہیں، یہ بیان واقعہ ہے۔

اسی طرح امام شافعی کا سفرنامہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں فلاں شیخ کی مجلس میں گیا۔ میں لوگوں کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اس کے بعد میں نے شیخ کے ایک سوال کا جواب دیا۔ شیخ کو میرا جواب پسند آگیا۔ اس نے مجھ کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ فلاں ملک کا حاکم مجھ سے خوش ہو گیا اور میرے لئے ایک بڑے عہدے کی پیشکش کی۔ مولانا علی میاں اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ فلاں عرب ملک میں میں نے تقریر کی۔ اس کے بعد ایک شیخ نے کہا کہ آپ نے عربوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ وغیرہ۔

ان تمام چیزوں کو آپ خودستائی کہیں گے۔ مگر دراصل وہ بیان واقعہ ہیں۔ اور کوئی بھی سفرنامہ اس قسم کے واقعات کے تذکرہ سے خالی نہیں ہو سکتا۔ آپ کسی بھی مسلم یا غیر مسلم کا سفرنامہ نہیں بتا سکتے جس میں اس قسم کی باتیں درج نہ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سفرنامہ کے لازمی اجزاء ہیں۔ ان کے بغیر کوئی سفرنامہ نہیں لکھا جا سکتا۔

۷ اگست ۱۹۸۹

سید اقبال الظفر ایڈوکیٹ (بہار شریف) سے ملاقات ہوئی۔ ان کی عمر ۷۴ سال ہے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ ۱۹۴۶ کے الکشن میں مسلمانوں نے جو نعرے لگائے تھے، ان میں سے ایک نعرہ اب تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ اس کے الفاظ یہ تھے:

لال بکس کو توڑ دو ہرے بکس میں ووٹ دو

اس زمانہ میں کانگرس کا بیلٹ بکس لال رنگ کا ہوتا تھا، اور مسلم لیگ کا بیلٹ بکس ہرے رنگ کا۔ اسی کے لحاظ سے یہ نعرے بنائے گئے تھے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے جھوٹے لیڈروں نے مسلمانوں کو کیسی احمقانہ جذباتیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ احمقانہ جذباتیت بدقسمتی سے آج بھی مسلمانوں میں جاری ہے۔

۸ اگست ۱۹۸۹

آج کے ٹائمس آف انڈیا میں چرٹن کالنس (Churton Collins) کا ایک قول نقل کیا ہے۔ اس نے کہا کہ زندگی میں کامیابی کا راز صرف وہ لوگ جانتے ہیں جو اپنی زندگی میں کامیاب نہ ہو سکے:

The secret of success in life is known only
to those who have not succeeded.

یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی "لفظ" سے نہیں سیکھتا، وہ صرف "تجربہ" سے سیکھتا ہے۔ تمام حکمت کی باتیں کہنے والے کہہ چکے ہیں۔ مگر آدمی صرف ان کو پڑھ کر یا سن کر انھیں نہیں پکڑتا۔ وہ صرف اس وقت ہوش میں آتا ہے جب کہ تجربات کی آہنی منطق اس کو ماننے پر مجبور کر دے۔

۹ اگست ۱۹۸۹

میری کتاب الاسلام کا عربی ترجمہ ایک مصری اردو داں دکتور سمیر عبدالحمید ابراہیم نے کیا ہے جو ۱۹۸۴ میں قاہرہ سے چھپی ہے۔ یہ عربی ترجمہ میرے سامنے اس وقت آیا جبکہ وہ چھپ چکا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس میں ترجمہ کی کافی غلطیاں ہیں۔

کتاب میں عبادت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے جو باتیں کہی گئی ہیں، ان میں سے ایک بات وہ ہے جو ان الفاظ میں آئی ہے کہ اس میں آدمی جس سے چھننے کا خطرہ محسوس کرتا ہے اسی سے پانے کی امید بھی رکھتا ہے (صفحہ ۷)۔ اس فقرہ کا ترجمہ دکتور سمیر نے ان الفاظ میں کیا ہے:

فهو يشعر بخطر هناك في مصفاة الماء الا انه يضع امله في الحصول على الماء في هذه المصفاة (صفحہ ۱۴)

یہ عربی ترجمہ بالکل عجیب ہے۔ نحوی غلطی نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا مطلب سمجھنا مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصری مترجم نے "پانے" کو "پانی" سمجھ لیا اور اس کے مطابق ترجمہ کر ڈالا۔ ترجمہ کے لئے یہی کافی نہیں ہے کہ آدمی ایک زبان اور دوسری زبان کے ہم معنی الفاظ کو جانتا ہو۔ اسی طرح مترجم کو کتاب کے موضوع سے واقف اور آشنا

بھی ہونا چاہئے۔ ورنہ وہ یہی کرے گا کہ وہ 'پانے' کا ترجمہ 'پانی' کر دے (Acquaint)
گا اور سارا مضمون خبط ہو کر رہ جائے گا۔

۱۰ اگست ۱۹۸۹

۸ اگست کو راجیہ سبھا (نئی دہلی) کا اجلاس ہو رہا تھا۔ وزیر اعظم راجیو گاندھی مشتعل ہو گئے۔ انھوں نے ہندستانی پارلیمنٹ کے ممبروں کو (LIMPETS) کہہ دیا۔ لمپ گھونگھے کی قسم کا ایک کیڑا ہے جو چٹانوں سے لپٹا رہتا ہے۔ یہ لفظ جب انسان کے لئے بولا جائے تو اس سے مراد ایسا شخص ہوتا ہے جو عہدہ اور منصب کو کسی طرح نہ چھوڑے (ٹائمس آف انڈیا ۹ اگست ۱۹۸۹)

راجیو گاندھی نے وزیر اعظم کے عہدے پر پہنچنے کے بعد جو انداز اختیار کیا۔ اس کے بعد یہ لفظ سب سے زیادہ خود ان کے اوپر چسپاں ہوتا ہے۔ توپوں کے سودے میں ۶۰ کرور روپیہ سے زیادہ کا کمیشن لینا۔ کمپٹرولر اینڈ آڈیٹر جنرل (CAG) کی رپورٹ سے اس کی تصدیق، جولائی میں بیشتر اپوزیشن ممبروں کا استعفا، وغیرہ۔ ایسے واقعات ہیں جو کسی بھی جمہوری ملک میں وزیر اعظم کے استعفا کے لئے کافی ہیں۔ مگر راجیو گاندھی صاحب خود جو فعل زیادہ بڑے پیمانے پر کر رہے ہیں، اسی کا الزام وہ دوسروں کو دے رہے ہیں۔

ٹھیک یہی حال موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں کا ہے۔ یہ مسلمان لیڈر روزانہ دوسروں کے خلاف بیان دیتے رہتے ہیں۔ حالاں کہ ان معاملات میں یہ مسلمان لیڈر خود سب سے بڑے مجرم ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں کے سامنے ابو بکر و عمر کا نمونہ نہیں ہے۔ ان کے سامنے غیر مسلم سیاسی لیڈروں کا نمونہ ہے جو ذاتی مفاد کے سوا کچھ اور جانتے ہی نہیں۔

۱۱ اگست ۱۹۸۹

مہاتما گاندھی کا کہنا تھا کہ Truth is God یعنی سچائی خدا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا نظریہ یہ ہے کہ خدا سچائی ہے:

God is truth

دونوں فقروں میں بظاہر صرف لفظی ترتیب کا فرق ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی ضد

ہیں۔ "سچائی خدا ہے" کے نظریہ میں خدا بذات خود کوئی مستقل شئی نہیں۔ وہ محض ایک علامت ہے اس کے برعکس "خدا سچائی ہے" کے نظریہ کے مطابق، خدا ایک مستقل شئی اور ایک علیحدہ وجود ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے انسان ایک مستقل اور علیحدہ وجود ہے۔ اس فرق پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ، ایک اگر کفر ہے تو دوسرا اسلام ہے۔

۱۲ اگست ۱۹۸۹

ٹائمس آف انڈیا (۱۲ اگست ۱۹۸۹) میں "Letters" کے کالم میں مسز ورگھیز کا خط چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے "بیمار اخلاقیات" (Sick Ethic)

مکتوب نگار نے اپنا ذاتی تجربہ لکھا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں چھبا ہاسپٹل میں ایک ڈاکٹر برخوردار تھے۔ ان کا حال یہ تھا کہ وہ غریبوں اور کوڑھیوں پر سب سے زیادہ توجہ دیتے تھے۔ ایسا کوئی مریض جب ان کے یہاں آتا تو اس کو فوراً دیکھتے اور پورے دھیان کے ساتھ اس کا علاج کرتے۔ اس کے بعد دوسرے دولت مندوں پر توجہ دیتے تھے۔

ڈاکٹر برخوردار سے پوچھا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ وہ دولت مندوں کے مقابلہ میں غریبوں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میرا خدا غریبوں اور بیکسوں کے درمیان رہتا ہے نہ کہ دولت مندوں اور خوش حال لوگوں کے درمیان۔ میں اپنے خدا کی خدمت کرنے کے کسی موقع کو کھونا نہیں چاہتا:

> My Lord walks among the poor and the powerless, not among the rich and the privileged. I do not wish to lose any opportunity of serving my God.

اس کے بعد مکتوب نگار نے لکھا ہے کہ آج ہمارے ڈاکٹروں اور اسپتالوں کا حال یہ ہے کہ پورا اسپتال صرف دولت مند اور صاحب اثر لوگوں کے گرد گھومتا ہے:

> Today the entire hospital rotates around the prosperous and the influential.

کیسی عجیب تھی وہ آزادی جس نے قوم کی اخلاقیات کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔

۱۳ اگست ۱۹۸۹

لاجپت نگر (نئی دہلی) میں ایک ہندو فیملی رہتی ہے۔ اس خاندان کی ایک لڑکی کافی آزاد خیال تھی اور گھر سے باہر رہ کر اپنا ذاتی بزنس کر رہی تھی۔ اس نے اپنی ذاتی پسند سے ایک مسلمان سے شادی کر ناطے کیا ہے۔ لڑکی کا نام ونی ہے اور لڑکے کا نام شکور حسین خاں۔

اس سلسلہ میں ایک بے حد سبق آموز بات معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ مس ونی کے خاندان کے افراد نے اس انتخاب پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کی ماں اور بہنوں نے مشترک طور پر یہ کہا کہ مسلمانوں کا کچھ دین دھرم اور ضمیر ہوتا ہے، مگر ہندوؤں کے یہاں تو کچھ بھی نہیں۔ ہندوؤں میں اب نہ دھرم رہ گیا ہے اور نہ ضمیر۔

ہمارے گھر میں ایک ہریجن عورت صفائی کا کام کرتی ہے۔ اس نے ہمارے گھر میں اپنے ذاتی تجربات بتاتے ہوئے کہا کہ کوٹھیوں میں جو ہندو رہتے ہیں ان میں سو میں سے ایک ہی دو اچھے ہوتے ہیں باقی سب خراب ہیں۔

اس طرح کے واقعات برابر سامنے آرہے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو سماج مسلسل بگاڑ کی طرف جا رہا ہے۔ دوسری طرف مسلمان کچھ اپنے دینی عقائد کی وجہ سے اور کچھ حالات کے دباؤ کی وجہ سے مسلسل سدھرتے جا رہے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد وہ وقت قریب آجائے گا جب ہندوؤں کی اخلاقی گراوٹ انھیں آخری زوال پر پہنچا دے گی۔ اور مسلمانوں کے حالات انھیں اخلاقی طور پر زیادہ بہتر بنا دیں گے۔ یہ گویا ایک نیا غلبہ ہے جو مسلمانوں کی موجودہ مغلوبیت کے کھنڈر سے ابھر رہا ہے۔

۱۴ اگست ۱۹۸۹

کسی بات کو سمجھنے کے لئے سنجیدہ (Sincere) ہونا انتہائی ضروری ہے۔ غیر سنجیدہ آدمی کسی بھی بات کو سمجھ نہیں سکتا، خواہ بظاہر وہ کتنی ہی واضح کیوں نہ ہو۔

اس کی ایک مثال آرگنائزر کو پڑھتے ہوئے سامنے آئی۔ یہ پرچہ فرقہ پرست عناصر کی طرف سے نکالا جاتا ہے۔ اس کا خاص دعویٰ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں ہندو مظلوم ہیں۔ کیوں کہ کانگرس ہندوؤں کی قیمت پر مسلمانوں کو خوش کرنے کی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہے۔ مذکورہ

شمارہ (صفحہ ۴۳) میں مسلمانوں کے ذکر کے تحت ایک مضمون میں کہا گیا ہے کہ ہندستان کی اقلیتیں یہاں کی ہندو اکثریت سے زیادہ سہولتیں اور زیادہ بہتر سلوک حاصل کئے ہوئے ہیں:

The minorities in India do get more facilities and better treatment than the majority Hindus. (p. 43)

کیسی عجیب بات ہے کہ جو شکایت مسلمانوں کو ہے، وہی شکایت موجودہ نظام کے خلاف خود ہندوؤں میں پائی جاتی ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۸۹

آرسی زینر (R.C. Zaehner) ایک آکسفورڈ اسکالر ہیں۔ انھوں نے مختلف مذاہب کے بارہ میں ایک کتاب لکھی ہے جو ۱۹۷۰ میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا نام ہے ــــ ہم آہنگ ناموافقت:

Concordant Discord

اس کتاب کے مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ہم مختلف مذاہب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں بہت سے اختلافات نظر آتے ہیں۔ لیکن زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر بے آہنگی (Disharmony) میں آہنگ (Harmony) موجود ہے۔

بہت سے علما (مثلاً ڈاکٹر بھگوان داس) نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ ثابت کریں کہ تمام مذاہب ظاہری اختلافات کے باوجود ایک ہیں۔ وہ اس طرح اہل مذاہب کے درمیان ٹکراؤ کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میں اس کو بے فائدہ سمجھتا ہوں۔ اہل مذاہب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ تمام مذاہب کو ایک ثابت کیا جائے۔ اس کی واحد کارگر تدبیر یہ ہے کہ اہل مذاہب کے اندر رواداری (Tolerance) کا مزاج پیدا کیا جائے۔ یعنی اختلاف کو برداشت کرتے ہوئے ایک دوسرے کا احترام کرنا اور اختلاف کا اظہار سنجیدہ علمی دائرہ میں کرنا نہ کہ مناظرہ اور تصادم کے دائرہ میں۔ اس دنیا میں امن قائم کرنے کا راز اختلاف کو برداشت کرنا ہے نہ کہ اختلاف کو ختم کرنا۔

اس معاملہ میں دوسری کوئی صورت سرے سے ممکن ہی نہیں۔

۱۶ اگست ۱۹۸۹

آج سیلم پور (دہلی) کے دو نوجوان آئے۔ انھوں نے اپنا نام اختر حسین اور نفیس احمد بتایا۔ دونوں نے کہا کہ ہم اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔ مسلم لیڈروں کی باتیں سن کر اور مسلم اخبارات کو پڑھ کر اور مسلم معاشرہ کے ماحول سے متاثر ہو کر ہم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس ملک میں ہمارے لئے کام کرنے اور ترقی کرنے کے مواقع نہیں ہیں۔

اس کے بعد ان میں سے ایک شخص کو "راہیں بند نہیں" نامی پمفلٹ ملا۔ اس کو پڑھ کر اس کا ذہن بدل گیا۔ اس نے یہی پمفلٹ اپنے ساتھی کو پڑھنے کے لئے دیا۔ اس کا ذہن بھی اس کو پڑھنے کے بعد بالکل بدل گیا۔ اب یہ دونوں الرسالہ کے مستقل قاری بن چکے ہیں اور نئے حوصلہ کے ساتھ زندگی کے میدان میں جدوجہد کر رہے ہیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ اس طرح ہزاروں نوجوان ہیں جن کو الرسالہ کی تحریک نے نئی زندگی دی ہے۔

۱۷ اگست ۱۹۸۹

دو صاحبان ملاقات کے لئے۔ دونوں دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ ان سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ قرآن ہمارے اندر یہ ذہن بنانا چاہتا ہے کہ ہم عُسر میں یُسر کو دیکھیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں ہمارے علماء اس کا ثبوت نہ دے سکے۔

میں نے کہا کہ ہمارے علماء فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ انگریزوں نے پروفیسر آرنلڈ کے ذریعہ کتاب پریچنگ آف اسلام (۱۸۹۶) لکھوائی تاکہ مسلمانوں کے عمل کا رخ سیاسی جہاد سے ہٹا کر دعوت و تبلیغ کی طرف موڑ دیں۔ مگر علماء وقت اس سے متاثر نہیں ہوئے۔ اسی طرح ۱۹۳۰ میں انگریزوں نے علماء کو یہ پیش کش کی کہ دہلی میں صفدر جنگ مقبرہ کا پورا علاقہ، جو کئی کیلومیٹر میں پھیلا ہوا ہے، آپ لوگوں کو دے دیا جائے گا۔ یہاں آپ لوگ تعلیم و تبلیغ کا ادارہ قائم کریں اور سیاست سے الگ ہو جائیں۔ مگر علماء نے اس پیش کش کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور بدستور انگریز کے خلاف سیاسی لڑائی میں مشغول رہے۔

میں نے کہا کہ اگر ان علماء نے قرآن و سنت کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا تو وہ اس کو عین اسلام کے حق

میں سمجھتے اور اس کو قبول کر لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عین وہی صورتحال تھی جو واقعہ حدیبیہ کے وقت پیش آئی۔ قریش نے مسلمانوں سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر کے سمجھا کہ ہم نے مسلمانوں سے ان کی تلوار چھین لی۔ حالاں کہ اصل صورت حال یہ تھی کہ انھوں نے مسلمانوں سے "تلوار" چھین کر زیادہ بڑی طاقت انھیں دے دی، اور وہ دعوت کے کھلے مواقع تھے۔ چنانچہ دعوت کی تسخیری طاقت ظاہر ہوئی اور صرف دو سال کے اندر مکہ فتح ہو گیا۔

اسی طرح انگریز اگرچہ علماء سے "تلوار" چھین رہے تھے، مگر اس کے بدلے وہ انھیں ایٹم بم دے رہے تھے۔ وہ انھیں دعوت و تبلیغ کے کھلے مواقع دے رہے تھے جو بلاشبہ ہر تلوار سے زیادہ تسخیری طاقت رکھنے والا ہے۔ علماء کے شمشیری جہاد نے تو اسلام اور مسلمانوں کو کچھ نہیں دیا۔ لیکن اگر وہ اس وقت دعوت کے میدان میں متحرک ہو جاتے تو آج اس ملک کی تاریخ بالکل دوسری ہوتی۔

۱۸ اگست ۱۹۸۹

الرسالہ اپریل ۱۹۸۹ میں میرا ایک مضمون "تعدد ازدواج" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون دوبارہ قومی آواز (۱۳ اگست ۱۹۸۹) میں نقل ہوا۔ اس کو پڑھ کر ڈاکٹر مسعود علی، کھالاپار، مظفر نگر کا ایک خط قومی آواز ۱۸ اگست ۱۹۸۹ میں چھپا ہے۔ اس خط میں موصوف لکھتے ہیں:

"اس سے قبل اسی موضوع پر سہارن پور کے ڈاکٹر جاوید جمیل کا مضمون قومی آواز ۲۴ دسمبر ۱۹۸۸ میں شائع ہوا تھا۔ مولانا وحید الدین خاں کا مضمون اسی مضمون پر مبنی نظر آتا ہے۔ کچھ مقامات پر تو تقریباً وہی الفاظ نقل کئے گئے ہیں جو ڈاکٹر جاوید جمیل کے مضمون میں تھے۔ مثال کے طور پر مولانا موصوف لکھتے ہیں: 'چنانچہ جنگ کے بعد مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان ملکوں میں جنسی بے راہ روی عام ہو گئی۔ یہاں تک کہ بہت سی بے شوہر یا غیر شادی شدہ عورتوں کے گھروں کے سامنے اس قسم کے بورڈ لکھے ہوئے نظر آنے لگے کہ رات گزارنے کے لئے ایک مہمان چاہئے'۔ اب دیکھئے ڈاکٹر جاوید جمیل کے مضمون کے الفاظ: 'دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمنی میں مردوں کی تعداد اس قدر کم ہو گئی تھی کہ بہت سی خواتین نے اپنی جسمانی ضرورتوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے دروازوں پر (صرف ایک شب کے لئے) کے بورڈ لگا لئے'۔"

اصل یہ ہے کہ یہ بات میں نے سب سے پہلے ستمبر ۱۹۵۸ میں اپنے ایک مضمون میں کہی تھی۔ یہ مضمون "حقیقت کی تلاش" کے عنوان سے اسی وقت چھپ گیا تھا اور بار بار چھپتا رہا ہے۔ کوئی بھی شخص اس کو "حقیقت کی تلاش" کے آخر میں دیکھ سکتا ہے۔ غالباً ڈاکٹر جاوید جمیل نے یہ بات میرے مضمون سے لی ہوگی۔ میں نے اس کو ڈاکٹر جمیل سے نہیں لیا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ میرا مضمون ان کے مضمون سے ۳۰ سال پہلے چھپ چکا ہے۔

۱۹ اگست ۱۹۸۹

ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی کیلی فورنیا کے ایک اسلامی سنٹر میں ڈائرکٹر ہیں۔ آج ہمارے مرکز میں ان کا لکچر تھا۔ لکچر کا عنوان تھا: اسلام امریکہ میں۔

اپنے لکچر میں انھوں نے بہت سی باتیں امریکہ کے بارے میں بتائیں۔ ایک بات یہ تھی کہ امریکہ کے جیل خانوں میں جو قیدی ہیں، اور جن میں زیادہ تعداد سیاہ فام لوگوں کی ہے، ان میں اسلام پھیل رہا ہے۔ کچھ مسلمان ان کو جیل میں پڑھنے کے لئے اسلامی کتابیں پہنچاتے ہیں اور ان کو پڑھ کر وہ مسلمان ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جیل کے حکام ان قیدیوں کے درمیان تبلیغ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو مجرم اسلام قبول کرتا ہے اس کی زندگی میں فوراً اصلاح آجاتی ہے۔ جیل کے ایک افسر نے کہا کہ اسلام زندگی کو بدلنے میں بہت زیادہ موثر ہوتا ہے:

Islam is the most rehabilitating factor.

اس نے کہا کہ جیل خانوں میں عیسائی مشنری کے لوگ بھی کام کرتے ہیں۔ مگر عیسائی ہونے کے بعد قیدی کے اندر کوئی خاص تبدیلی نہیں آتی۔ مگر جو قیدی اسلام قبول کر لیتا ہے اس کی عادتیں بالکل بدل جاتی ہیں۔ وہ نیا انسان بن جاتا ہے ——— یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے عقائد انسان کی شخصیت کو بدلنے کے لئے نہایت طاقت ور محرک ہیں۔ جب کہ دوسرے مذاہب (تحریف کی بنا پر) اپنی یہ طاقت کھو چکے ہیں۔

۲۰ اگست ۱۹۸۹

کلیم الرحمان صاحب ایم اے (پیدائش ۱۹۵۰) پٹنہ کے اورینٹل کالج میں استاد ہیں۔ انھوں

نے بتایا کہ لندن کی ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی نے جارج برنارڈ شا سے کہا کہ آپ سگرٹ (Abdulla) کے لئے اشتہار کا مضمون لکھ دیجئے۔ برنارڈ شا نے کہا کہ میں تو سگرٹ نوشی کا مخالف ہوں، میں کیسے سگرٹ کا اشتہار لکھوں۔ کمپنی نے ایک بڑی رقم کی پیش کش کی، مگر برنارڈ شا تیار نہیں ہوا۔ آخر کمپنی نے کہا کہ اچھا، آپ کا جو خیال ہو، وہی لکھ دیجئے۔ برنارڈ شا نے لکھ دیا — سگرٹ نہ پیو، حتی کہ عبد اللہ سگرٹ بھی نہیں:

Don't smoke, even Abdulla.

کمپنی نے جارج برنارڈ شا کے نام سے یہی الفاظ چھاپ دئے اور اس کو خوب پھیلایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کو عبد اللہ سگرٹ کے بارے میں تجسس ہوا۔ اس کے بعد عبد اللہ سگرٹ کی زبردست شہرت ہوئی اور وہ بہت زیادہ بکنے لگا۔

اس دنیا میں ناموافق کو بھی اپنے موافق بنایا جاسکتا ہے، شرط صرف یہ ہے کہ آدمی ہوشیار اور موقع شناس ہو۔ اس قسم کی ہوشیاری کی ایک مثال "رازحیات" صفحہ ۸۳ پر دیکھی جاسکتی ہے۔

۲۱ اگست ۱۹۸۹

سید لئیق احمد (پیدائش ۱۹۶۰) ملاقات کے لئے آئے۔ وہ نظام آباد (آندھرا پردیش) کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۸۶ میں شب برات کے روز ہنومان کا جلوس نکلا۔ جلوس چلتا ہوا نہرو پارک کے قریب پہنچا تو عشاء کا وقت ہو چکا تھا۔ اس دن رات کو عشاء کی نماز کے بعد مسجد کچیان میں شب برات کا جلسہ ہونے والا تھا۔ اس کا وقت ساڑھے نو بجے مقرر تھا۔

مختلف محلوں کے مسلمان اپنے گھروں سے نکل کر روانہ ہوئے کہ مسجد کچیان میں نماز پڑھیں اور اس کے بعد جلسہ میں شرکت کریں۔ ان کا راستہ نہرو پارک سے گزرتا تھا۔ پولیس نے انھیں روکا اور کہا کہ آپ لوگ تھوڑی دیر ٹھہر جائیں۔ جلوس گزر جائے تو اس کے بعد مسجد کے لئے روانہ ہوں۔ مگر مسلمانوں نے اسی وقت آگے جانے کے لئے اصرار کیا۔ پولیس والوں نے ڈرانے کے لئے لاٹھی گھمائی اور دیواروں پر لاٹھی ماری۔ اس پر مسلمان مشتعل ہو گئے اور پتھر اور چپل پولیس کی طرف پھینکے۔ اس کے بعد پولیس نے باقاعدہ لاٹھی چارج کیا۔ اور بہت سے لوگوں کو حوالات میں بند کر دیا۔ وہاں مسلمانوں کو کافی مارا گیا۔

میں نے کہا کہ یہ مسلمانوں کی سراسر نادانی تھی۔ اگر اس وقت وہ رک جاتے تو زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ لگتا۔ اتنی دیر میں جلوس گزر جاتا اور پھر وہ مسجد میں جا کر جلسہ میں شریک ہو جاتے۔ اسی قسم کی نادانیاں ہیں جس نے مسلمانوں کو غیر ضروری مسائل میں مبتلا کر رکھا ہے۔

۲۲ اگست ۱۹۸۹

قومی آواز (۱۴ اگست ۱۹۸۹) میں ایم شفیق انصاری ایڈوکیٹ (مرادآباد) کا مراسلہ چھپا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "یوپی میں نافذ خاتمہ زمینداری ایکٹ ۱۹۵۰ کے ذریعہ اترپردیش میں عورتوں کو چالیس سال سے زرعی زمین میں ان کے حقوق سے لگاتار محروم کیا جا رہا ہے۔ قانون کی مذکورہ دفعات ۱۷۱، اور ۱۷۲ کے مطابق اگر کوئی مرد یا خاتون کچھ زرعی جائداد چھوڑ کر فوت ہو جائے، اور اگر ان کے وارثین میں بیٹے بھی ہوں تو کل جائداد بطور ترکہ صرف بیٹوں اور یتیم پوتوں کو ملتی ہے۔ شادی شدہ یا غیر شادی شدہ بیٹیوں کو کچھ نہیں ملتا۔"

یہ قانون ہندو مسلمان دونوں پر نافذ ہے۔ یہ شریعت کے قانون وراثت میں کھلی ہوئی مداخلت ہے۔ مگر پچھلے ۴۰ سال کے اندر کسی بے ریش یا باریش لیڈر نے اس کے خلاف کوئی تحریک نہیں چلائی۔ شاہ بانو بیگم کے معاملہ میں سپریم کورٹ کا فیصلہ اس کے مقابلہ میں بہت معمولی تھا جب کہ مذکورہ قانون کا معاملہ اس سے بہت زیادہ سنگین ہے۔

اس معاملہ میں نام نہاد لیڈروں کی خاموشی کی وجہ صرف یہ ہے کہ شاہ بانو بیگم کے معاملہ میں مسلمانوں کی بھیڑ جمع کی جا سکتی تھی۔ مگر مذکورہ قانون کے معاملہ میں مسلمانوں کی بھیڑ جمع نہیں کی جا سکی۔ یہ حال ہے ان لیڈروں کا جو شاہ بانو بیگم کی تحریک کے وقت کہتے تھے کہ ہم شریعت کے معاملہ میں ادنیٰ مداخلت برداشت نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام لیڈر راور رہنا ملت کو بھٹکانے والے ہیں نہ کہ ملت کو راہ دکھانے والے۔

۲۳ اگست ۱۹۸۹

حیدرآباد سے محی الدین محمد اپنے خط میں لکھتے ہیں "ایک صاحب جو امریکہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہیں، چند دن کے لئے یہاں آئے تھے۔ ان سے ملاقات میں میں نے امریکی مسلمانوں کے بارہ میں دریافت کیا۔ انھوں نے بتایا کہ عرب ممالک سے جو لوگ امریکہ میں آکر آباد ہوئے ہیں

انھوں نے اپنا مذہبی تشخص برقرار نہیں رکھا۔ اس کے برعکس ہندستان وغیرہ (اقلیتی ملکوں) کے جو مسلمان وہاں جاکر آباد ہوئے ہیں ان کی قابل لحاظ تعداد نے اپنے مذہبی تشخص کو برقرار رکھا ہے"۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جن ملکوں میں مسلم حکومتیں ہیں، وہاں کے مذہبی امور حکومت انجام دیتی ہے، عام مسلمانوں کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اقلیتی ملکوں کے مسلمانوں کو اپنے ملکوں میں خود اپنی کوشش سے تمام ملی اور مذہبی کام کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ عرب ملکوں کے لوگ امریکہ گئے تو اپنے سابقہ ذہن کی بنا پر انھوں نے مذہبی اداروں کے قیام کی فکر نہیں کی۔ اس کے برعکس ہندستان وغیرہ کے مسلمان جس طرح اپنے ملک میں یہ کام کر رہے تھے، اسی طرح وہ امریکہ میں بھی یہی کام کرنے لگے۔ اس طرح ان کا مذہبی تشخص نسبتاً محفوظ رہا۔

کچھ معاملوں میں اگر اکثریتی ملکوں کے مسلمان بہتر پوزیشن میں ہیں، تو کچھ دوسرے معاملہ میں اقلیتی ملکوں کے مسلمان بہتر پوزیشن میں۔

۲۴ اگست ۱۹۸۹

ہندستان ٹائمس (۲۴ اگست ۱۹۸۹) میں ایک خبر ہے کہ ـــــ دنیا کے سب سے زیادہ دولت مند لوگ :

Richest men of the world.

نیویارک کی ڈیٹ لائن کے ساتھ چھپنے والی یہ خبر امریکہ کے میگزین (Fortune) کے سالانہ جائزہ پر مبنی ہے۔ اس کے مطابق دنیا کے چار امیر ترین آدمی یہ ہیں :

Sultan of Brunei	25	billion dollars
King Fahd	18	billion dollars
Mars family, USA	12.5	billion dollars
Queen Elizabeth II, UK	10.9	billion dollars

اس اندازہ کے مطابق، انفرادی دولت کے اعتبار سے اس وقت ساری دنیا میں مسلمان نمبر ایک پر ہیں۔ اسی طرح انھیں اور بھی کئی امتیازی خصوصیات حاصل ہیں۔ اقوام متحدہ کے ممبروں میں سب سے زیادہ تعداد مسلم ملکوں کی ہے۔ سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب قرآن ہے۔ سب سے زیادہ تیز رفتار مذہب اسلام ہے۔ دنیا کا سب سے زیادہ قیمتی خطہ مسلمانوں کو حاصل ہے۔

وغیرہ۔

ان تمام امتیازی خصوصیات کے باوجود مسلمان ہی آج سب سے زیادہ بے وقار قوم بنے ہوئے ہیں۔ کیسی عجیب ہے یہ صورتحال۔

۲۵ اگست ۱۹۸۹

ایک تاجر سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ آپ تجارت کر رہے ہیں۔ اس کے تحت آپ کو بہت سے کام کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً دکان بنانا، سفر کرنا، سامان حاصل کرنا، اشتہار دینا، تعلقات قائم کرنا، رجسٹر مرتب کرنا، عدالتی معاملات سے نمٹنا، وغیرہ وغیرہ۔ مگر ان تمام مختلف سرگرمیوں کا مقصد صرف ایک ہے۔ اور وہ پیسہ حاصل کرنا ہے۔ آپ کی یہ تمام سرگرمیاں اگر آپ کو پیسہ دے رہی ہوں تو وہ بامعنی ہیں۔ اور اگر ان کے نتیجہ میں آپ کو پیسہ نہ ملے تو تمام سرگرمیاں بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔

یہی معاملہ دین کا ہے۔ دین میں بھی بظاہر بہت سے اعمال ہیں۔ کلمہ، نماز، روزہ، حج اور دوسرے اعمال۔ یہ سرگرمیاں محض شکلاً مطلوب نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا کوئی اندرونی مقصد ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ آدمی کے اندر تقویٰ کی صفت پیدا کر رہی ہوں تو وہ بامعنی ہیں۔ ورنہ سب کی سب بے معنیٰ۔ ان سرگرمیوں کی تقویٰ کے بغیر کوئی قیمت نہیں۔

۲۶ اگست ۱۹۸۹

رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک ناول ہے جس کا اصل بنگالی نام جوگا جوگ ہے۔ یہ ناول ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی سے اردو میں چھاپا گیا ہے۔ یہ اردو ترجمہ ۳۷۵ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا نام سنجوگ ہے۔

کتاب کے آخر میں بتایا گیا ہے کہ ہیروئن کمودنی کا اپنے شوہر سے نباہ نہیں ہوا۔ وہ سسرال سے واپس ہو کر اپنے بھائی کے پاس آگئی۔ اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ بھائی تنہا اپنے گھر میں رہتا تھا۔ بہن نے اپنے بھائی سے کہا کہ میں یہاں تمہارے اوپر بار تو نہ ہو جاؤں گی۔ بھائی بپرداس نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ تم میری بہن ہو۔ تم یہاں وہ کام کرو گی جو کوئی پرائیویٹ سکریٹری بھی نہیں کر سکتا۔ اس دوران بھائی جو کچھ اپنی بہن سے کہتا ہے اس میں سے ایک جملہ یہ ہے:

پھر تو یہ جانتی ہے کہ مجھے تعلیم دینے کا شوق ہے۔ تجھ سے بہتر شاگرد مجھے کون ملے گا۔

اور ایک کام کیا جائے گا۔ بہت دنوں سے مجھے فارسی زبان سیکھنے کا شوق ہے۔ اکیلے پڑھتے اچھا نہیں لگتا۔ تجھے ساتھ لے کر پڑھوں گا۔ تو ضرور مجھ سے آگے بڑھ جائے گی۔ لیکن میں ذرا بھی رشک نہ کروں گا۔

رابندر ناتھ ٹیگور ۱۸۶۱ میں کلکتہ میں پیدا ہوئے اور وہیں ۱۹۴۱ میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کے ناول انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کے ہندستان کو بتاتے ہیں۔ مذکورہ اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زمانہ آج کے زمانہ سے کس قدر مختلف تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ مسلم رہنماؤں نے اس زمانہ کو بالکل استعمال نہیں کیا، وہ تقریباً بلا استعمال ختم ہوگیا۔

۲۷ اگست ۱۹۸۹

المتنبی مشہور عرب شاعر ہے۔ وہ ۹۱۵ء میں کوفہ میں پیدا ہوا، ۹۶۵ء میں دیر العقول میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ کسی نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا ہے کہ لا نبیَّ بعدی (میرے بعد کوئی نبی نہیں) اس نے کہا کہ تم لوگ اس حدیث کا مطلب غلط نکالتے ہو۔ یہ حدیث دراصل اس طرح ہے: لا نبیٌّ بعدی۔ یعنی 'لا' میرے بعد نبی ہے۔ میں ہی وہ نبی ہوں اور آسمان میں میرا نام لا ہے (وانا اسمی فی السماء لا)

یہ استدلال نہیں ہے، بلکہ لطیفہ ہے۔ اس سے تفریح کا فائدہ ہو سکتا ہے، مگر اس قسم کے شاعرانہ نکتوں سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔

۲۸ اگست ۱۹۸۹

پاکستان کے اخباروں میں 'وفاق' ایک اسلامی اخبار سمجھا جاتا ہے۔ اس کے شمارہ ۲۴ اگست ۱۹۸۹ کے اداریہ کا عنوان ہے: "بھارت میں مسلم اقلیت کی زبوں حالی" پورا مضمون سطحی معلومات کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔ مثلاً اس میں درج ہے کہ "بھارت کے رزرو بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق، مسلمانوں کو بمشکل چھ اعشاریہ اور دو فی صد قرضے فراہم کئے جاتے ہیں"۔

یہ ایک لغو بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمان عام طور پر بینک کا قرضہ لینے سے احتراز کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں انھیں سود دینا پڑتا ہے۔ ان کا یہ احتراز علماء اسلام کے فتوؤں کی وجہ سے ہے نہ کہ رزرو بینک کی پالیسی کی وجہ سے۔

مسلمانوں کے اخبارات ساری دنیا میں صرف ایک کام کر رہے۔ وہ سطحی اور بے بنیاد باتیں چھاپ کر مسلمانوں کے اندر دوسروں کے خلاف نفرت بھر رہے ہیں۔ ان اخبارات کا نہ نکلنا ان کے نکلنے سے اچھا تھا۔

۲۹ اگست ۱۹۸۹

بیسویں صدی کے نصف اول میں سوشلزم کی دھوم تھی۔ روس اور چین جیسے ملکوں میں مکمل مارکسی نظام نافذ کیا گیا۔ اور دوسرے ملکوں (مثلاً ہندستان) میں سوشلزم کے نام سے اس کے نظریات کو اختیار کرنے کی کوشش کی گئی۔

سوشلزم یا مارکسزم کے تحت سلب ونہب کا سلسلہ شروع ہوا۔ لوگوں پر زبردست مظالم کئے گئے۔ کہا گیا کہ عظیم تر بھلائی (Greater good) اور اجتماعی ضرورت (Social necessity) کی خاطر ایسا کیا جا رہا ہے۔ مگر بیسویں صدی کے آخر میں پہنچ کر یہ نظریہ لغو قرار دیدیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ٹائمس آف انڈیا (۲۹ اگست ۱۹۸۹) میں ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ سکشن ۲، صفحہ ۳

بعد کے مسلمانوں میں بہت کچھ بگاڑ آگیا، مگر اسلام کا نظریہ کبھی فیل نہیں ہوا۔ جب کہ مارکسزم اور سوشلزم کا معاملہ یہ ہے کہ خود ان کے نظریات فکری اعتبار سے غلط قرار پا گئے ہیں۔

۳۰ اگست ۱۹۸۹

ایک مصری عالم محمد عوضین الهامی (الجیزہ) ملاقات کے لئے۔ ان کے ساتھ قطر کے ایک عالم بھی تھے۔ مصری عالم سے میں نے جمال عبد الناصر کے بارہ میں سوالات کئے۔ میں نے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ جمال عبد الناصر یہ کہتے تھے کہ نحن ابناء الفراعنة سنرميكم في البحر۔ انھوں نے کہا کہ جمال عبد الناصر کی تقریریں میں نے سنی ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ نحن سنلقي اليهود في البحر۔ مگر میں نے خود کبھی ان کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ "نحن ابناء الفراعنة" اگرچہ انھیں فرعونی تہذیب سے دلچسپی تھی۔ مگر یہ جملہ میری معلومات کے مطابق انھوں نے نہیں کہا۔

گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ جمال عبد الناصر نماز روزہ کے پابند تھے۔ ان کے گھر کے سبھی لوگ نماز روزہ کے عامل تھے۔ ان کی بیوی پورے ستر میں رہتی تھیں۔ البتہ اخوانیوں پر انھوں نے شدید مظالم کئے۔ مگر اب مصر میں اخوانی بالکل آزاد ہیں۔ چوں کہ اب وہ حکومت

سے ٹکراؤ نہیں کرتے۔ اس لئے حکومت نے انھیں آزادی دے دی ہے۔ اخوان کے افراد اب مصر میں بڑے بڑے کاروبار کر رہے ہیں اور اچھی حالت میں ہیں۔

مصری عالم کی مذکورہ گفتگو میں نے ایک ہندستانی مسلمان سے بتائی جو جمال عبدالناصر کے مخالف ہیں۔ انھوں نے فوراً کہا کہ ان کا نماز روزہ حقیقۃً Cultural habit کے طور پر تھا۔ نہ کہ سچی دینداری کے طور پر۔

یہی وہ ذہنی انحراف ہے جو کسی آدمی کو سچائی تک پہنچنے نہیں دیتا۔ مصر کے مذکورہ واقعہ میں اصل سبق یہ ہے کہ حکمرانوں کا ظلم صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو ان کا اقتدار چھیننے کے لئے اٹھیں۔ اگر آپ حکمراں کے لئے اس قسم کا سیاسی مسئلہ نہ بنیں تو وہ آپ سے تعرض بھی نہیں کرے گا۔ مگر مذکورہ بزرگ نے یہ سبق نہیں لیا۔ انھوں نے اپنے ذہن کی گاڑی دوسری طرف موڑ دی اور یہ کہہ دیا کہ مصر کے حکمراں Cultural habit کی وجہ سے نماز روزہ ادا کرتے تھے۔

۳۱ اگست ۱۹۸۹

اخبار العالم الاسلامی (مکہ) کے شمارہ ۲۱ اگست ۱۹۸۹ میں صفحہ ۱۵ پر ایک خبر چھپی ہے جس کا عنوان یہ ہے ـــــ برطانیہ کی اقلیتیں برطانی اقدار کو اختیار کریں:

Minorities urged to embrace UK values.

اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک برطانی منسٹر جان پیٹن (John Patten) نے برطانیہ میں بسنے والے مسلمانوں سے یہ کہا کہ آپ لوگ برطانیہ میں اپنی شرائط پر نہیں رہ سکتے اور نہ دہرا وفاداری کے ساتھ یہاں رہ سکتے ہیں:

> One cannot be British on one's own exclusive terms or on a selective basis, nor is there room for dual loyalties where those loyalties openly contradict one another.

قومی آواز (۳۰ اگست ۱۹۸۹) میں صفحہ اول پر ایک خبر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ برطانیہ کی حکمراں پارٹی کے ایک ممبر پارلیمنٹ مسٹر ٹاونیٹ ڈ نے برطانی مسلمانوں کے خلاف بہت سخت بیان دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سلمان رشدی کی ناول (شیطانی آیات) پر جو مسلمان برھم ہیں، وہ جہاں

سے آئے ہیں وہیں انھیں لوٹ جانا چاہئے۔

برطانیہ میں آباد مسلمان نہایت عزت کے ساتھ وہاں رہ رہے تھے۔ مگر سلمان رشدی کی کتاب پر جھوٹا ہنگامہ کرکے انھوں نے اپنے آپ کو انگریزوں کی نظر میں بے عزت کرلیا۔ مجھے امید نہیں کہ اب دوبارہ وہ وہاں سابقہ عزت اور وقار حاصل کر سکیں گے۔

سلمان رشدی کی کتاب ستمبر ۱۹۸۸ میں لندن سے شائع ہوئی۔ فروری میں آیت اللہ خمینی نے اس کے قتل کا فتویٰ جاری کیا۔ ۱۵ فروری ۱۹۸۹ کو رشدی روپوش ہوگیا۔ اس وقت سے وہ حکومت برطانیہ کی حفاظت میں ہے اور حکومت اس کی خصوصی حفاظت پر روزانہ تقریباً ایک ہزار پونڈ خرچ کر رہی ہے۔ ۳ جون ۱۹۸۹ کو آیت اللہ خمینی کا انتقال ہوگیا۔

یکم ستمبر ۱۹۸۹

حیدر آباد کے حبیب محمد صاحب (حبیب بھائی) ملاقات کے لئے آئے۔ گفت گو کے دوران انھوں نے بتایا کہ ۱۹۷۹ میں وہ کپڑے کی ایک نمائش دیکھنے کے لئے ویسٹ جرمنی گئے تھے۔ وہاں وہ جرمنی کے شہر ہینوور (Hanover) میں تھے۔ کار کے ڈرائیور سے انھوں نے ایک بار کہا کہ دوسری عالمی جنگ میں جرمنی کو بہت نقصان ہوا۔ سارا برباد ہوگیا۔ ڈرائیور نے کہا کہ بربادی تو ضرور ہوئی۔ مگر اس میں بھی تعمیر کا ایک پہلو تھا۔ کیوں کہ اس کے بعد ہم کو موقع ملا کہ ہم جرمنی کو از سر نو زیادہ بہتر طور پر بنا سکیں۔ اگر بربادی نہ ہوتی تو نیا زیادہ بہتر جرمنی ہم نہ بنا پاتے۔

میں نے کہا کہ یہی معاملہ قوموں کا بھی ہے۔ قومیں جب بربادی سے دوچار ہوتی ہیں تو ان کے لئے تعمیر حیات کا نیا امکان پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً ہندستان کے مسلمان ۱۹۴۷ کے بعد بربادی سے دوچار ہوئے۔ اس میں ان کے لئے نئی تعمیر کا امکان نکل آیا۔ اس بربادی نے ان کی خوش فہمیوں کے خیالی محل کو توڑ دیا اور انھیں اس قابل بنایا کہ وہ حقیقت کی زمین پر کھڑے ہوسکیں۔

۲ ستمبر ۱۹۸۹

آج کے ٹائمس آف انڈیا میں جان رے (John Ray) کا قول نقل کیا گیا ہے کہ خوش حالی میں محتاط رہو اور بدحالی میں صبر کرو:

In prosperity, caution; in adversity, patience.

یہ بڑی حکمت کی بات ہے۔ اگر آدمی اس حکیمانہ نصیحت کو اختیار کرلے تو دولت مندی اور مفلسی دونوں حالت میں وہ مطمئن اور کامیاب رہے گا۔ جب کہ اس کے برعکس روش آدمی کو دونوں حالتوں میں ناکام و نامراد بنا دیتی ہے۔

۳ ستمبر ۱۹۸۹

مولانا باب الدین مظاہری (جامعہ عربیہ، ہتورا، ضلع باندہ) ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ کانپور میں کئی سال تک رہے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق، کانپور کے علاقہ طلاق محل میں ۷ - ۸ مندر ایسے ہیں جو مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں۔ اسی طرح ہندو علاقوں کی کچھ مسجدیں ہندوؤں کے قبضہ میں ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ منظر انھوں نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مقبوضہ مسجدوں کو واگزار کرانے کی سب سے زیادہ آسان تدبیر یہ ہے کہ مسلمان اپنے قبضہ کے مندروں کو ازخود ہندوؤں کے حوالے کر دیں۔ اسی طرح مغل دور میں جن مندروں کو مسجد میں تبدیل کیا گیا ہے، انھیں بھی ازخود ہندوؤں کے حوالے کر دیا جائے۔

مولانا عبد الحئی صاحب (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی کتاب "ہندستان اسلامی عہد میں" کے اندر ایسی ایک درجن مسجدوں کا ذکر ہے جو مندر کی جگہ پر بنائی گئی ہیں۔ اسی کتاب پر مولانا ابوالحسن علی ندوی کا "بسوط مقدمہ" ہے جس میں انھوں نے اس کتاب کے بیانات کو "صحیح تصویر اور مکمل دستاویز" قرار دیا ہے۔ (صفحہ ۱۷)

۴ ستمبر ۱۹۸۹

دہلی کے اردو اخبار قومی آواز (۴ ستمبر) میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کا ایک انٹرویو چھپا ہے۔ قومی آواز کے نمائندہ سے بات چیت کرتے ہوئے مولانا موصوف نے کہا کہ "وہ معاملات کو سیاست کے بجائے اخلاقیات کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ حالات میں جس ابتری کی عام طور پر شکایت کی جاتی ہے، اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انسانوں نے اپنی اخلاقی ذمہ داریاں فراموش کر دی ہیں اور عام انسانوں کی فلاح سے زیادہ شخصی اور جماعتی مفادات کی فکر کی جاتی ہے۔ لوگوں کو صحیح راستہ پر لانے کے لئے وہ پچھلے کئی برس سے پیام انسانیت کی تحریک چلا رہے

ہیں جس کا سیاست سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔ صفحہ ۲

مولانا ابوالحسن علی ندوی کا اپنے بارہ میں یہ بیان ادھورا ہے۔ انھیں کہنا چاہئے کہ جن لوگوں سے مجھے شکایت نہ پیدا ہوئی ہو، ان کے لئے میں اخلاقی ہوں۔ مگر جن سے میری شکایت پیدا ہو جائے ان کے لئے میں سیاسی لیڈروں کی طرح ہو جاتا ہوں۔

اس کی زندہ مثال میری ذات ہے۔ میں نے مولانا موصوف پر خالص علمی انداز کی تنقید کی۔ اس کے نتیجہ میں وہ مجھ سے برہم ہو گئے۔ میری باتوں کا انھوں نے علمی جواب تو نہیں دیا۔ البتہ انتہائی بے بنیاد طور پر میرے اوپر "کذب بیانی" کا الزام لگایا (ماہنامہ الفیصل، حیدر آباد، دسمبر ۱۹۸۶، صفحہ ۲۳)

محمد ہاشم قاسمی صاحب (حیدر آباد) نے ہمارے خلاف کھلے طور پر غصب اور خیانت کا معاملہ کیا ہے۔ اور اس کے بعد مسلسل میرے خلاف جھوٹی الزام تراشی کی مہم چلا رہے ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی اور ان کا حلقہ "بغض معاویہ" کی نفسیات کے تحت محمد ہاشم قاسمی صاحب کا سرپرست بن گیا۔ عام پذیرائی کے علاوہ خود مولانا ابوالحسن علی ندوی نے حیدر آباد کی اس عمارت کی "خیر مقدمی تقریب" میں شرکت کی جو یقینی طور پر مغصوبہ ہے (تعمیر حیات، لکھنو، ۱۰ مارچ ۱۹۸۹، صفحہ ۴) مولانا موصوف کے رفیق خاص ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی اس مغصوبہ عمارت کے ایک "استقبالیہ" میں شریک ہوئے۔ وہاں "پر تکلف عصرانہ" تناول کیا اور محمد ہاشم قاسمی کی تعریف کی۔ (تعمیر حیات، ۱۰ مئی ۱۹۸۹ صفحہ ۹) وغیرہ۔

۵ ستمبر ۱۹۸۹

پاکستان کے روزنامہ نوائے وقت (۲۸ اگست ۱۹۸۹) میں ایک عبرت ناک واقعہ شائع ہوا ہے۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ۱۹۴۹ میں قرارداد مقاصد پاس کی۔ اس کا اصل متن انگریزی میں تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس کا اردو ترجمہ دیکھا تو وہ "بے پناہ برہم" ہو گئے۔

"ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی قرارداد مقاصد پر جید علماء کے حساس رویہ کا اس انداز سے ذکر کرتے ہیں: واقعہ کچھ یوں ہے کہ ہمارے محکمۂ اطلاعات نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو درست نہ تھا۔ قانونی نکات اس ترجمہ میں مسخ ہو کر رہ گئے تھے۔ میں انٹلی جنس اسکول کے کوارٹر میں رہتا تھا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح نماز کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا احتشام الحق تھانوی اور غالباً مولانا ظفر احمد انصاری میرے پاس پہنچے۔ مولانا عثمانی کہنے لگے کہ اس قرارداد مقاصد میں ہمارے ساتھ بڑا دھوکا ہوا۔ آپ نے کیا کہا تھا اور کیا لکھا ہے۔ میں نے دیکھا تو ترجمہ غلط تھا۔ میں نے وہیں بیٹھ کر ترجمہ کیا تو مولانا عثمانی مطمئن ہو گئے"۔

یہی معاملہ ان دوسرے علما کا تھا جو انڈین نیشنل کانگرس میں شریک تھے۔ کانگرس کی تمام کارروائیاں انگریزی زبان میں ہوتی تھیں، اور یہ علما انگریزی جانتے نہ تھے۔ اس لئے عجیب عجیب لطیفے پیش آتے تھے۔

وہ علما جو انگریزی سے ناواقف تھے، وہ ایسی تحریکوں میں کیوں شریک ہوئے جن کا سارا کام انگریزی زبان میں ہوتا تھا۔ یہ بات مجھے اتنی احمقانہ معلوم ہوتی ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کی کیا توجیہ کروں۔ وہ اسلام بھی کیسا عجیب ہوگا جو انگریزی سیاسی تحریکوں میں شرکت کو ضروری ٹھہرائے مگر انگریزی سیکھنا اس کے نزدیک ضروری نہ ہو۔

۶ ستمبر ۱۹۸۹

تعمیر حیات، لکھنؤ (۱۰ اگست ۱۹۸۹) میں حافظ بشیر احمد مصری (۱۹۱۴) کا مضمون چھپا ہے۔ ۱۹۶۴ میں وہ انگلینڈ کی مسجد ووکنگ کے امام مقرر ہوئے تھے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں کہ "اس مسجد کو مستشرق ڈاکٹر لیٹنر (Dr Lietner) نے ۱۸۸۹ میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کے لئے ہندستان کے مسلمانوں نے رقم فراہم کی تھی"۔

اس مسجد کا ذکر انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (X/724) میں موجود ہے۔ اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جو بتاتے ہیں کہ نوآبادیاتی دور میں بھی انگریزوں میں بہت سے لوگ تھے جو اسلام کے حق میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ ان میں سے بہت سے انگریز مسلمان بھی ہوئے۔ یہ واقعہ انگریزوں میں (اور اسی طرح پورے یورپ میں) اسلام کے دعوتی امکان کو بتا رہا تھا۔ مگر مسلم رہنماؤں میں کوئی ایک شخص بھی نہ تھا جو اس امکان کو دیکھے اور اس کو استعمال کرنے کی کوشش کرے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام رہنما دعوہ بلائنڈ (Dawa-blind) ثابت ہوئے ہیں۔

۷ ستمبر ۱۹۸۹

سلمان رشدی کے خلاف جھوٹا طوفان اٹھانے والے مسلمان اب تقریباً خاموش ہو گئے ہیں۔ حالاں کہ اس طوفان میں یک طرفہ طور پر صرف مسلمانوں کا نقصان ہوا ہے۔ ان مظاہروں میں بہت سے مسلمان مارے گئے۔ بہت سی جائدادیں جلائی گئیں۔ مگر سلمان رشدی بدستور زندہ موجود ہے۔ اب تک اس کی کتاب کی گیارہ لاکھ کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ اٹلی کے کتب فروشوں کی انجمن نے رشدی کی کتاب کو اس سال (۸۹ - ۱۹۸۸) کی سب سے زیادہ بکنے والی کتاب قرار دیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا عجیب حال ہے۔ ان کا ہر اقدام یک طرفہ طور پر ان کی اپنی بربادی اور ہلاکت پر ختم ہو رہا ہے۔ خواہ وہ سید احمد شہید بریلوی کا اقدام ہو یا موجودہ زمانہ میں بابری مارچ اور سلمان رشدی کے خلاف احتجاج۔ ایسا تو نہیں کہ موجودہ مسلمان اللہ کی رحمت سے دور کر دئے گئے ہوں۔

۸ ستمبر ۱۹۸۹

اخبار قومی آواز (ضمیمہ) ۲ ستمبر ۱۹۸۹ میں ہندو افسانہ نگار درام لعل جی کی ایک تقریر چھپی ہے جو انھوں نے سویڈن کے ہندستانیوں کے سامنے کی تھی۔ انھوں نے اس تقریر میں کہا: "ہندستان ۱۹۴۷ میں ایک ہزار سال کی غلامی کے بعد آزاد ہوا ہے"۔ دوسری طرف مسلمان اپنی تقریروں میں کہتے ہیں: ہم نے اس ملک پر ایک ہزار سال تک حکومت کی ہے۔

یہی ذہن ہندستان کے تمام فرقہ وارانہ مسائل کی جڑ ہے۔ مسلمان ماضی کے حاکمانہ احساس کی بنا پر ہندوؤں کو حقیر سمجھتے ہیں اور غیر ضروری طور پر ان سے لڑنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندو ماضی کے احساس محکومی کی بنا پر مسلمانوں سے نفرت کرنے لگا ہے۔ معمولی اشتعال پر اس کا انتقامی جذبہ بھڑک اٹھتا ہے اور بے دردی کے ساتھ مسلمانوں کو مارنا پیٹنا شروع کر دیتا ہے۔

اس مسئلہ کو ختم کرنے کے لئے مسلمانوں کو پہل کرنا چاہئے۔ انھیں مذکورہ قسم کی بولی بولنا بالکل بند کر دینا چاہئے۔ ہندوؤں سے اپنے تعلقات کو محبت کے جذبہ کے تحت

استوار کرنا چاہئے نہ کہ فخر کے جذبہ کے تحت۔

۹ ستمبر ۱۹۸۹

میسور کے ٹیپو سلطان (۱۷۹۹-۱۷۴۹) کا مقابلہ انگریزوں کے ساتھ پیش آیا۔ انھوں نے فرانس سے انگریزوں کے خلاف معاہدہ کرنا چاہا مگر وہ فرانس کو اس پر راضی نہ کر سکے۔ اس کے بعد انھوں نے عرب، کابل، قسطنطنیہ، مارشس اپنے وفود بھیجے تاکہ ان سے فوجی تعاون حاصل کریں۔ مگر اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ اسی طرح ہندستان کی ریاستوں کو انھوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ میں ملانے کی کوشش کی۔ مگر کوئی ریاست تیار نہیں ہوئی۔ آخر کار وہ تنہا انگریزوں سے لڑ گئے۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ کو سرنگاپٹنم میں انگریزی گولی نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ ٹیپو کا یہ قول بہت مشہور ہے: شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے۔

اس جملہ میں بہادری ضرور ہے، مگر اس میں دانش مندی نہیں۔ اگر یہ کوئی مطلق اصول ہوتو رسول اور اصحاب رسول کو مکہ میں شیر کی طرح لڑ کر شہید ہو جانا چاہئے تھا نہ کہ وہ ایک ایسی روش اختیار کریں جس نے اغیار کو موقع دیا کہ وہ اس کو "فرار" سے تعبیر کریں۔

جنوبی ہند میں حیدر آباد کے نظام نے ٹیپو سلطان کے برعکس طریقہ اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وقتی مصالحت کی بنا پر انھیں یہ موقع ملا کہ وہ قیام ریاست ۱۷۶۸ سے لے کر ۱۹۵۶ تک ہندستان کے اندر اور ہندستان کے باہر مسلمانوں اور اسلامی اداروں کی غیر معمولی خدمت کر سکیں۔

ٹیپو سلطان کے مذکورہ قول کے مقابلہ میں مجھے زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ — ایک دن کے لئے "گیدڑ" بن جانا آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ سو سال تک "شیر" بن کر رہ سکے۔

۱۰ ستمبر ۱۹۸۹

امیر معاویہ نے عرب قبیلہ کے ایک سردار سے پوچھا کہ تم نے اپنی قوم کے اوپر سرداری کیسے حاصل کی۔ اس نے کہا: میں ان کے جاہلوں کی جہالت کو برداشت کرتا تھا۔ میں ان کے سائل کو دیتا تھا۔ میں ان کی ضرورتوں میں ان کی مدد کرتا تھا۔ پس جو شخص میری طرح کرے گا وہ میرے جیسا ہو جائے گا (قال معاوية لعرابة بم سدت قومك. قال: كنت احلم عن جاهلهم

واعطی سائلهم واسعیٰ فی حوائجهم۔ فمن فعل مثل فعلی فهو مثلی۔

کسی قوم میں سچی سرداری یا سچی قیادت حاصل کرنے کا بلاشبہ یہی صحیح ترین طریقہ ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں پریس اور کمیونی کیشن کی ایجادنے لوگوں کو موقع دے دیا ہے کہ وہ جھوٹے الفاظ بول کر لوگوں کے اوپر قائد بن جائیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں کوئی سچا لیڈر پیدا نہیں ہوا۔ البتہ ان کے درمیان جھوٹے لیڈروں کی اتنی کثرت ہے کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔

۱۱ستمبر ۱۹۸۹

۱۹۸۹ نہرو ایوارڈ

(Jawaharlal Nehru award for International understanding)

فلسطینی لیڈر یاسر عرفات کو دیا گیا ہے۔ اس پر ہندستان کے ایک یہودی —— جواہر حزقیل (Jawahar Ezekiel) کا مراسلہ ٹائمس آف انڈیا (۱۱ستمبر ۱۹۸۹) میں شائع ہوا ہے۔ مراسلہ نگار نے غصہ کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

To give this prestigious award to a man who has masterminded the birth of international terrorism and has dedicated his life to the destruction of the state of Israel is to devalue the award.

یہ اس قابل قدر انعام کو بے قدر کرنا ہے کہ اس کو ایک ایسے شخص کو دیا جائے جو بین اقوامی دہشت گردی کا موجد ہے اور جس نے اپنی زندگی کو ریاست اسرائیل کی تخریب کے لئے وقف کر رکھا ہے۔

یاسر عرفات کو نہرو انعام دینا مسلمانوں کے لئے خوشی کا باعث ہے اور یہود کے لئے غصہ کا باعث۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں فریق واقعات کو الگ الگ زاویہ سے دیکھتے ہیں۔ اس مثال سے "زاویۂ نظر" کے فرق کو سمجھا جاسکتا ہے۔

۱۲ستمبر ۱۹۸۹

ایک شخص نے یحییٰ بن اکثم صیفی سے کہا کہ اے قاضی مجھے بتائیے کہ میں کتنا کھاؤں۔ قاضی نے اس کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ بھوک سے زیادہ اور سیری سے کم (قال رجل لیحیی بن اکثم

الصیفی۔ ایھا القاضی، کم آکل۔ اجابہ القاضی: فوق الجوع دون الشبع)

اس سوال کا اس سے بہتر جواب نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہی کھانا بہتر کھانا ہے۔ جو شخص اس طرح کھائے وہ نہایت سکون میں رہے گا۔ مزید یہ کہ وہ بیماریوں سے محفوظ ہو جائے گا۔ اس کو ضرورت نہ ہوگی کہ وہ ڈاکٹروں اور حکیموں کے یہاں حاضری دے۔

۱۳ ستمبر ۱۹۸۹

ٹائمس آف انڈیا (۱۳ ستمبر ۱۹۸۹) میں ایک خبر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ افغانستان کے صدر ڈاکٹر نجیب اللہ نے کہا ہے کہ وہ سابق ظاہر شاہ کی افغانستان واپسی کا خیر مقدم کریں گے، اگر اس سے ملک میں امن قائم کرنے میں مدد ملے:

Dr Najibullah says he would welcome the return of former king Zahir Shah if it helped in the establishment of permanent peace and tranquility in his country. (p. 7)

محمد داؤد خاں، افغانستان کے وزیر اعظم تھے۔ ۱۷ جولائی ۱۹۷۳ کو "انقلاب" برپا کر کے انھوں نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ ظاہر شاہ معزول ہو کر روم چلے گئے۔ اس وقت سے وہ وہیں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ۲۷ اپریل ۱۹۷۸ کو دوسرا "انقلاب" ہوا۔ داؤد خاں اور ان کے بیشتر اہل خاندان قتل کر دئے گئے۔ اور حفیظ اللہ امین ملک کے حکمراں بن گئے۔ جو شخص روایت شکنی کرے، وہ خود بھی بالآخر روایت شکنی کا شکار ہوتا ہے۔

افغانستان میں دوبارہ ۱۹۷۹ میں روس کی مدد سے مقامی کیونسٹ پارٹی نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ایک لاکھ سے زیادہ روسی فوجی اس ملک میں داخل کر دئے گئے۔ ۱۹۸۸ میں اگرچہ روسی فوجیں واپس جا چکی ہیں۔ مگر سوویت یونین اب بھی کابل حکومت کو ۲۰ سے ۳۰ کروڑ ڈالر مالیت کے ہتھیار فراہم کر رہا ہے۔ دوسری طرف امریکہ ۸۹-۱۹۸۸ میں دو ارب ڈالر کی مالیت کے ہتھیار حکومت کے مخالف گروپ (مجاہدین) کو دے چکا ہے۔

ان حالات میں بہترین قابل عمل بات یہ ہے کہ دونوں فریق ظاہر شاہ کی واپسی پر راضی ہو جائیں۔ ظاہر شاہ کو علامتی صدر ریاست بنا کر منصفانہ الکشن کرایا جائے اور جو گروہ جیتے

اس کو چار یا پانچ سال کے لئے حکومت کرنے کا موقع دے دیا جائے۔

۱۴ ستمبر ۱۹۸۹

قومی آواز (۱۳ ستمبر ۱۹۸۹) کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ برطانوی مسلمانوں (زیادہ صحیح لفظوں میں برطانیہ میں مقیم ہندستانی اور پاکستانی مسلمانوں) نے فیصلہ کیا ہے کہ سلمان رشدی کے خلاف مہم کو جاری رکھا جائے۔" اخبار ٹائمز نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے رشدی کے ناول کے خلاف لندن اور بریڈ فورڈ میں حالیہ مظاہروں کے دوران تشدد دیکھا گیا تھا۔ اس پر برطانیہ و شمالی آئرلینڈ کی مسلم تنظیموں کی مرکزی انجمن کے جنرل سکریٹری سید عزیز پاشا نے یہ کہہ کر تنقید کی کہ 'جس نے بھی تشدد سے کام لیا وہ سچا مسلمان نہیں ہے، اور ہم اس سے بری الذمہ ہیں'۔

یہ جھوٹے الفاظ ہیں۔ جلوس کے منتظمین کو تشدد کی غلطی کو خود اپنے آپ پر لینا چاہئے۔ کیونکہ جو لوگ اتنے تربیت یافتہ نہ ہوں کہ وہ جلوس میں پرامن رہ سکیں، ان کا جلوس نکالنا جائز نہیں۔ اسی لندن میں پچاس سال پہلے فیبین سوسائٹی نے جلوس نکالا۔ بعض افراد نے اس میں تشدد کیا اور دولت مندوں کے مکانوں کے شیشے توڑ ڈالے۔ فیبین سوسائٹی کے لیڈروں نے اپنے آپ پر ذمہ داری لیتے ہوئے جلوس کے طریقے کو خیرباد کہنے کا اعلان کر دیا۔ اسی لندن میں مسلم رہنما تشدد کے لئے دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرا کر اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے رہے ہیں۔ یہ ہے وہ اسلامی کردار جس کو موجودہ زمانہ کے نام نہاد لیڈر پیش کر رہے ہیں۔

۱۵ ستمبر ۱۹۸۹

ٹائمس آف انڈیا ۱۳ ستمبر ۱۹۸۹، سکشن ۲، صفحہ ۳ پر مسٹر ارن سنہا کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ہندستان کی بیوروکریسی نے اپنے استحصالی مقصد کی خاطر ایک آئیڈیالوجی وضع کی ہے۔ یہ خطرہ میں گھرا ہوا ہندستان (Endangered India) کی آئیڈیالوجی ہے۔ یہ ہماری بیوروکریسی کے لئے بے حد مفید ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ اس ملک کے مسلم لیڈروں کا بھی ہے۔ وہ 'اسلام خطرہ میں' اور 'مسلمان خطرہ میں' کی گھنٹی بجا کر اپنی لیڈری قائم کئے ہوئے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ ان کے لیڈروں کا یہی استحصالی مزاج ہے۔

۱۶ستمبر۱۹۸۹

ڈاکٹر عبدالعلیم (۱۹۰۶) سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ایک اشتراکی ادیب تھے۔ تاہم وہ اس کے ناقد بھی تھے۔ اردو کے موجودہ ترقی پسند ادیبوں کو وہ 'رومانی انقلاب پسند' کہا کرتے تھے۔ انھوں نے لکھا تھا:

'ہمارے اکثر ادیب انقلاب کا خوش آئند خواب اسی طرح دیکھتے ہیں جس طرح کوئی عاشق اپنی محبوبہ کا تصور کرتا ہے۔ ان کے لئے مزدور، کسان، سرمایہ دار، طبقاتی کش مکش، اور انقلاب کی وہی حیثیت ہے جو غزل گو شعرا کے لئے گل وبلبل، ہجر ووصال، ساقی وبادہ، رقیب و محتسب وغیرہ کی۔' (اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر)

موجودہ زمانہ کے وہ مسلمان جو 'اسلامی انقلاب' کی باتیں کرتے ہیں، وہ بھی اسی نوعیت کی ایک قسم ہیں۔ شاعروں اور ادیبوں کے بعد یہ اسی قسم کا تیسرا گروہ ہے۔ تینوں یکساں طور پر رومانی تخیلات کی پیداوار ہیں۔ وہ اگرچہ الگ الگ الفاظ بولتے ہیں مگر بنیادی طور پر ان سب کی نوعیت ایک ہے۔

۱۷ستمبر۱۹۸۹

افغانستان سے روسی فوجیں واپس جا چکی ہیں۔ اس کے بعد 'افغانی مجاہدین' نے زبردست کوشش کی کہ وہ جلال آباد پر قبضہ کر لیں۔ مگر مسلسل حملوں کے باوجود وہ مکمل طور پر ناکام رہے جب کہ ان حملوں پر ایک سال کی مدت گزر چکی ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۷ستمبر) میں پاکستان کے آرمی چیف جنرل مرزا اسلم بیگ کی تقریر شائع ہوئی ہے۔ اس میں امریکہ پر تنقید کی گئی ہے کہ اس نے افغانی مجاہدین کو ہتھیاروں کی فراہمی روک دی۔ رپورٹ کے مطابق، انھوں نے کہا کہ افغان باغیوں کا جلال آباد پر قبضہ کرنے میں ناکام ہوتا اس سبب سے تھا کہ امریکہ نے جنوری ۱۹۸۹ سے مئی تک انھیں کوئی ہتھیار نہیں دیا:

He said the the rebels' failure to capture Jalalabad was due to American failure to supply them arms from January to May this year. (p. 8)

افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کو تمام مسلمان افغان مجاہدین کا کارنامہ بتاتے رہے۔ اور اب جب کہ روسیوں کی واپسی کے باوجود یہ افغانی مجاہدین ڈاکٹر نجیب اللہ کی کابل حکومت کے مقابلہ میں عاجز ثابت ہو رہے ہیں تو اس کا الزام فوراً انھوں نے امریکہ کے سر رکھ دیا۔ حالانکہ یہ الزام اگر صحیح ہو تو اس کے بعد یہ بھی ماننا ہوگا کہ اس سے پہلے افغان مجاہدین کی کامیابی تمام تر امریکی فوجی امداد کا کرشمہ تھی۔

۱۸ ستمبر ۱۹۸۹

سردار سرجیت سنگھ لانبا (۵۵ سال) سے ملاقات ہوئی۔ وہ علامہ اقبال کے عاشق ہیں۔ اقبال کے اکثر اشعار ان کو زبانی یاد ہیں۔ اقبال کے بارہ میں بہت زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ وہ ۱۹۴۷ میں پاکستانی پنجاب سے ہندستان آئے۔

مسٹر لانبا نے بتایا کہ لاہور کے راجپال نے "رنگیلا رسول" کتاب لکھی۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین تھی۔ اس پر مسلمان بگڑ گئے۔ علم الدین ایک بڑھئی کا لڑکا تھا۔ اس نے قسم کھائی کہ میں راجپال کا خون پیے بغیر نہیں رہوں گا۔ راجپال دکاندار تھا۔ وہ اس کی دکان پر گیا۔ اس نے وہاں پوچھا کہ تم راجپال ہو۔ دکاندار نے کہا کہ ہاں۔ کئی بار تصدیق کرنے کے بعد علم الدین نے چھرا نکالا اور یہ کہہ کر اسے مار ڈالا کہ میں رسول اللہ کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے نام پر لاہور میں ایک سڑک ہے جس کا نام "غازی علم الدین روڈ" ہے۔

علم الدین پر قتل کا مقدمہ چلا اور اس کو پھانسی ہو گئی۔ اقبال کو جب معلوم ہوا کہ علم الدین کو پھانسی ہو گئی ہے تو انھوں نے اپنی مادری زبان پنجابی میں کہا:

اَسیں گلاں کردے رہ گئے، ترکھاناں دا مُنڈا بازی لے گیا

یعنی ہم سب باتیں ہی کرتے رہے، بڑھئی کا لڑکا بازی لے گیا۔

مسٹر لانبا نے اقبال کی اس بات کو تعریف کے انداز میں کہا۔ مگر میں اس کو سخت قابل اعتراض سمجھتا ہوں۔ علم الدین نے جس طرح راجپال کو مارا وہ اسلامی شریعت میں قطعاً درست نہ تھا۔ اگر بالفرض اقبال کے نزدیک 'رنگیلا رسول' لکھنے کی سزا قتل ہو تب بھی کسی فرد کو یہ سزا نافذ کرنے کا اختیار نہیں۔ یہ اقدام بلاشبہ قابل مذمت تھا۔ مگر ہمارے رہنما پچھلے سو سال سے اس قسم کے

جذباتی اقدامات کی حوصلہ افزائی کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج پوری قوم احمقانہ حد تک جذباتی ہو کر رہ گئی ہے۔

۱۹ ستمبر ۱۹۸۹

سید ہاشم علی صاحب آج ملاقات کے لئے آئے۔ وہ ۴ اکتوبر ۱۹۸۹ کو وائس چانسلر (علی گڑھ) کے عہدے سے ریٹائر ہو رہے ہیں۔ سید ہاشم علی صاحب نہایت مخلص اور لائق آدمی ہیں۔ مگر ان کے خلاف علی گڑھ کے نام نہاد اسلام پسند طبقہ نے بہت طوفان اٹھایا۔ کہا گیا کہ وہ اسلام دشمن اور سیکولر نواز ہیں۔ وغیرہ۔

اس مخالفت کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہاشم علی صاحب کے اندر کچھ مزاح (Humour) کا عنصر پایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ انھوں نے علی گڑھ میں یہ کہہ دیا کہ آجکل متقی آدمی اس کو سمجھا جاتا ہے جس نے اپنے بڑے بھائی کا کرتا اور چھوٹے بھائی کا پائجامہ پہن رکھا ہو۔ وغیرہ۔

اس کے سلسلہ میں میرا خیال ہے کہ یا تو متکلم کے اندر اتنی حکمت ہو کہ وہ ایسے مواقع پر اس قسم کا مزاحیہ فقرہ نہ کہے، یا سامع کے اندر اتنی وسعت ظرف ہو کہ وہ اس کو نظرانداز کر دے۔ بدقسمتی سے موجودہ مسلمانوں کے اندر دونوں میں سے کوئی ایک بات بھی نہیں۔ اس لئے مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کسی طرح درست نہیں ہوتے۔

۲۰ ستمبر ۱۹۸۹

جھینگا مچھلی کو عربی میں اِبیسان یا دود کہتے ہیں۔ کسی نادان نے مفتی صاحبان سے فتویٰ پوچھا کہ جھینگا حرام ہے یا حلال۔ مفتی کو کہنا چاہئے تھا کہ اس قسم کے سوال نہ کرو۔ جب قرآن میں کہہ دیا گیا ہے کہ احل لکم صید البحر وطعامہ (المائدہ ۹۶) ایسی حالت میں اس قسم کا سوال غیر ضروری ہے۔ مگر مفتی صاحبان نے دوسری نادانی یہ کی کہ فوراً اس کے حلال و حرام کا فتویٰ دینے لگے۔

بعد کے علماء نے دیکھا کہ اس معاملہ میں اصحاب فقہ کے درمیان اختلاف ہے تو انھوں نے تیسری نادانی کی۔ انھوں نے کہا کہ چوں کہ جھینگا کچھ علماء کے نزدیک حرام ہے، اور کچھ دوسرے علماء اس کو حلال بتاتے ہیں، کیوں کہ اس کو مچھلی کہا جاتا ہے، اس لئے احتیاط یہ کہ اس کو نہ کھایا جائے (الدود الذی یقال لہ جھینگہ حرام عند بعض العلماء۔ وقال بعضہم

حلال لانہ یسمی باسم السمك ۔ فالاحتیاط ان لا یؤکل ، حاشیہ جلالین ، پارہ ۷)

فقہ اور فتاویٰ کی کتابوں میں اس قسم کے بے شمار مسائل ہیں۔ مگر وہ سب کے سب لغویت کی حد تک غلط ہیں۔ جن چیزوں کو خدا اور رسول نے حرام نہ کیا ہو، ان کو حرام کہنا ایسی جسارت ہے جس کے لئے دین میں کوئی گنجائش نہیں۔ صحابہ وتابعین کے زمانہ میں اس طرح حرام وحلال کی بحثیں نہیں کی جاتی تھیں۔ بعد کے علماء ہر معاملہ میں حرام وحلال کی بحثیں کرنے لگے۔ یہ عین وہی غلطی ہے جس میں یہود مبتلا ہوئے۔

۲۱ ستمبر ۱۹۸۹

چودھری دیوی لال ہریانہ کے چیف منسٹر ہیں۔ وہ ۲۵ ستمبر ۱۹۱۴ کو پیدا ہوئے۔ اس مناسبت سے ۲۵ ستمبر کو ان کے بارہ میں ایک کتاب چھاپی جا رہی ہے۔ ان کے ایک ساتھی مسٹر وسیم احمد (3011055) میرے پاس آئے اور بار بار ٹیلی فون پر تقاضا کیا کہ میں اس کتاب کے لئے ایک پیغام لکھ کر دے دوں۔ پہلے میں نے معذرت کی۔ آخر ان کے اصرار پر حسب ذیل تحریر لکھ کر دے دی۔

چودھری دیوی لال ۱۹۱۴ میں پیدا ہوئے۔ ان کی اصل زبان اردو ہے۔ وہ اردو ہی میں اپنا تمام لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں۔ اس طرح چودھری دیوی لال کا یوم پیدائش ہندستان کی تاریخ کے ایک اہم باب کو بتاتا ہے۔ وہ اس قیمتی زمانہ کی یاد دلاتا ہے جب کہ اس ملک کی عام زبان اردو تھی۔ سب لوگ اردو میں لکھتے اور بولتے تھے، خواہ وہ ایک فرقہ کے ہوں یا دوسرے فرقہ کے۔

دیوی لال جیسے لوگوں کی موجودگی بتاتی ہے کہ اس ماضی کا تسلسل ابھی ملک میں باقی ہے۔ میری تمنا ہے کہ یہ تسلسل مزید باقی رہے۔ یہاں تک کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے۔ ماضی اور حال کے سرے دوبارہ مل کر نیا مستقبل پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائیں۔

۲۲ ستمبر ۱۹۸۹

پاکستان کے مشہور اخبار نوائے وقت کے زیر اہتمام شعبۂ ایوان وقت (کراچی) میں ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی۔ اس کا موضوع تھا: نظریہ پاکستان اور آج کا پاکستان — ہم سے کیا غلطیاں سرزد ہوئیں۔ اس موقع پر جو تقریریں ہوئیں وہ نوائے وقت کی خصوصی اشاعت (۱۵ ستمبر ۱۹۸۹) میں شائع ہوئی ہیں۔ ایک تقریر کا جلی عنوان یہ ہے: نظریۂ پاکستان اب صرف نعرہ

بن کر رہ گیا ہے۔

اس عنوان میں میں صرف ایک معمولی لفظی ترمیم کروں گا ' نظریۂ پاکستان صرف ایک نعرہ تھا۔' مجھے تعجب ہے کہ پاکستان کے تمام اسلام پسند اور اسلامی مفکرین نصف صدی سے ایک جھوٹے لفظ میں جی رہے ہیں، اور وہ "نظریہ پاکستان" کا لفظ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نظریہ پاکستان کا کہیں کوئی وجود نہیں۔ جس چیز کا وجود تھا یا ہے وہ صرف "نعرہ پاکستان" ہے۔

سیاسی لیڈر ہمیشہ یہی کرتے ہیں کہ وہ نعرہ کو نظریہ کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ نام نہاد نظریہ پاکستان کی طرح ہر تحریک کا ایک نظریہ رہا ہے۔ مثلاً گاندھی کا ایک نظریہ ہند تھا، شیخ مجیب کا ایک نظریہ بنگلہ دیش تھا، وغیرہ۔ مگر اس طرح کے نظریات سے صرف سیاسی تبدیلیاں ہوا کرتی ہیں۔ ان کے ذریعہ کبھی کوئی سماجی نظام نہیں بنتا۔ یہی وجہ ہے کہ نظریۂ ہند اور نظریہ بنگلہ دیش کی طرح نظریۂ پاکستان بھی سراسر ناکام ثابت ہوا۔

۲۳ ستمبر ۱۹۸۹

کچھ اہل حدیث حضرات ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم الرسالہ کے قاری ہیں۔ مگر آپ اپنے رسالہ میں فقہی مسائل پر کچھ نہیں لکھتے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ رفع یدین اور آمین بالجہر، اور آمین بالسر جیسے مسائل پر الرسالہ میں کچھ نہیں ہوتا۔

میں نے کہا کہ زور اور تاکید کی چیزیں اساسات دین ہیں نہ کہ فروعات دین۔ حدیث میں آیا ہے کہ انما الاعمال بالنیات۔ ایسی کوئی حدیث نہیں جس کے الفاظ یہ ہوں کہ انما الاعمال بالمسائل۔ یہ (Shift of emphasis) ہے کہ لوگ اساسی باتوں پر زور دینے کے بجائے فروعی باتوں کی دھوم مچانے لگیں۔

۲۴ ستمبر ۱۹۸۹

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ دین کا خلاصہ دو چیزیں ہیں۔ ——— اللہ کا ڈر، اور بندوں کے ساتھ حسن عمل۔ ایک صاحب نے کہا کہ یہ مفہوم آپ نے کہاں سے نکالا۔ میں نے کہا کہ یہ مفہوم قرآن وحدیث میں مختلف شکلوں میں موجود ہے۔ مثلاً ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ وہ کیا چیز ہے جو لوگوں کو بہت زیادہ جنت میں لے جائے گی۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کا

تقویٰ اور حسن اخلاق (سئل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن اکثر ما یدخل الناس الجنۃ قال : تقوی اللّٰہ وحسن الخلق ، سنن الترمذی)

۲۵ ستمبر ۱۹۸۹

موجودہ عرب تہذیب کا ایک جزء تسبیح بھی ہے۔ اکثر عربوں کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی تسبیح ہوتی ہے جس کو وہ انگلیوں کے درمیان گھماتا رہتا ہے۔ گفتگو یا اور کوئی چیز اس کے لئے اس کام میں حارج نہیں ہوتی۔ ایک ہندستانی عالم نے بتایا کہ انھوں نے خلیج کے ایک سفر میں ایک عرب شیخ سے تسبیح کی اس گردش کے بارے میں پوچھا۔ عرب شیخ نے جواب دیا کہ یہ کوئی عمل نہیں۔ خدا کی قسم یہ تو صرف ایک کھلونا ہے (واللّٰہ ان ھٰذا للعبۃ)

ہندستانی عالم نے یہ قصہ بتاتے ہوئے کہا کہ اس کو الرسالہ میں نہ لکھئے گا۔ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان کے موجودہ علماء کی اخلاقی حالت کیا ہے۔ وہ ہندستان میں تنقید و احتساب کے شہنشاہ بنے ہوئے ہیں۔ مگر عرب حکام یا عرب شیوخ کے خلاف بولنا ہو تو ان کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ ہندستان میں وہ محتسب کائنات سے کم کسی چیز پر راضی نہیں۔ مگر عرب دنیا میں وہ محتسب فرد بننے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے۔

۲۶ ستمبر ۱۹۸۹

کچھ مسلمان ملاقات کے لئے آئے۔ ان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان لیڈر، خواہ وہ داڑھی والے ہوں یا بے داڑھی والے۔ سب کے سب اپوزیشن کی بولی بولتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں جو خدا اور رسول کی بولی بولنا جانتا ہو۔

۲۷ ستمبر ۱۹۸۹

ایک صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ ان کے چہرہ پر بہت چھوٹی داڑھی تھی۔ انھوں نے کہا کہ پہلے میں بڑی داڑھی رکھتا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ "اعفاء اللحیہ" کا حکم صرف حدیث میں ہے۔ قرآن میں نہیں ہے۔ اس لئے میں نے اپنی داڑھی چھوٹی کرالی۔

میں نے کہا کہ میں قرآن و حدیث کی اس تفریق کو صحیح نہیں سمجھتا۔ تاہم اس سے قطع نظر، خود قرآن میں بھی "اعفاء اللحیہ" کی آیت موجود ہے۔ حضرت موسیٰ کے قصہ میں بتایا گیا ہے کہ جب بچھڑے

کی پرستش پر حضرت موسیٰ نے باز پرس کی تو انھوں نے دوران کلام حضرت ہارون کی داڑھی پکڑلی۔ اس پر حضرت ہارون نے فرمایا: لا تاخذ بلحیتی ولا برأسی (طٰہٰ ۹۴)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارون کی داڑھی آپ کی طرح نہیں تھی، بلکہ بڑی تھی۔ کیوں کہ بڑی داڑھی ہی پکڑی جاسکتی ہے۔ چھوٹی داڑھی ہاتھ میں نہیں آئے گی، پھر اس کو پکڑا کیسے جاسکتا ہے۔ حضرت ہارون کے متعلق معلوم ہے کہ وہ پیغمبر تھے۔ قرآن کی تصدیق کے بعد ان کا اسوہ بھی ہمارے لئے قابل تقلید بن جاتا ہے۔

۲۸ ستمبر ۱۹۸۹

کافر کی یہ تعریف کہ آفاق میں گم ہے　　مومن کی یہ تعریف کہ گم اس میں ہے آفاق

اقبال نے جب اپنا یہ شعر مسلمانوں کے سامنے پیش کیا تو ہر طرف واہ واکی دھوم مچ گئی۔ فوراً ہی اقبال مسلمانوں کے مقبول ترین شاعر بن گئے۔ اس کے برعکس اگر آپ مسلمانوں کے سامنے یہ کہیں کہ "کافر اللہ سے نہیں ڈرتا، مومن وہ ہے جو اللہ سے ڈرے" تو کسی طرف سے بھی واہ وا کا شور بلند نہیں ہوگا اس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ شعر فخر پر مبنی ہے اور دوسرا جملہ تواضع پر۔ پر فخر کلمات پر واہ وا بلند کی جاسکتی ہے مگر تواضع کے الفاظ پر واہ وا کا شور بلند ہونے کے کوئی معنی نہیں۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعمیر ذہن کیا ہے، اور موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے جو کچھ کیا وہ کیوں تعمیر ذہن کی کوشش نہ تھی۔ یہ رہنما اپنے اشعار اور تقریروں اور انشا پردازانہ مضامین میں مذکورہ شعر جیسی باتیں کہتے رہے ہیں۔ یہ باتیں مسلمانوں کے اندر فخر کی نفسیات ابھارتی رہیں۔ مگر فخر کی نفسیات ابھارنے کا نام ذہنی تربیت نہیں۔ ذہنی تربیت یہ ہے کہ آدمی کے اندر تواضع سنجیدگی اور حقیقت پسندی کا مزاج پیدا کیا جائے، اور وہ موجودہ رہنماؤں نے کیا ہی نہیں۔

۲۹ ستمبر ۱۹۸۹

ہندستان میں فیملی پلاننگ پر اربوں روپے خرچ کئے جارہے ہیں۔ پہلے حکومت کا نعرہ تھا: دو یا تین بس۔ اس کے بعد نعرہ دیا گیا: ہم دو ہمارے دو۔ موجودہ نعرہ ہے: ایک میں ایک۔ آخری نعرہ غالباً یہ ہوگا کہ ایک یا کوئی نہیں:

One or None

اس طرح حکومت یہ تاثر دے رہی ہے کہ اس ملک کا اصل مسئلہ یہاں کی بڑھی ہوئی آبادی ہے۔ مگر یہ مغالطہ ہے۔ اس ملک کا اصل مسئلہ خود حکومت کا کرپشن ہے۔ حکومت میں نیچے سے اوپر تک کرپشن (بھرشٹاچار) اپنی آخری حد تک پھیل چکا ہے۔ اس ملک کے مسائل صرف اس وقت ختم ہوں گے جب کہ اس ملک سے کرپشن کا خاتمہ کیا جائے۔ ورنہ آبادی گھٹتے گھٹتے اگر اتنی کم ہو کہ یہاں صرف دو آدمی رہ جائیں تو وہ بھی اپنے بگڑے ہوئے مزاج کے تحت فساد کے سوا کوئی اور کارنامہ انجام نہیں دے سکیں گے۔

۳۰ ستمبر ۱۹۸۹

۳۰ ستمبر کو میں ٹرانزٹ پسنجر کے طور پر کراچی میں تھا۔ وہاں میری ملاقات ایک تاجر سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان کے مقابلہ میں پاکستان بہت چھوٹا ملک ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہمارے تجارتی مواقع بہت کم ہیں۔ کیوں کہ ہمیں اپنی پیداوار کو فروخت کرنے کے لئے مقابلتہً بہت چھوٹا مارکیٹ ملتا ہے۔ اس کے بجائے ہندستان میں تجارتی مواقع بہت زیادہ ہیں۔ کیوں کہ وہاں ایک صنعت کار کے لئے بہت بڑا مارکیٹ موجود ہے۔

مسلم رہنماؤں کے اندر اگر دعوتی ذہن ہوتا تو یہی بات وہ دعوتی اعتبار سے سوچتے۔ ہندستان کی تقسیم نے ملک کو تین حصوں میں بانٹ دیا۔ اور اگر پورے برٹش انڈیا کو لیا جائے تو تو تقریباً دس ملکوں میں (انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال، بھوٹان، تبت، سری لنکا، وغیرہ۔) اس کے نتیجہ میں دعوتی میدان محدود ہو گیا۔ اگر ملک تقسیم نہ کرایا جاتا، تو پورا برصغیر ہند ایک ملک ہوتا اور پھر ہم کو ایک وسیع برّ اعظم میں دعوتی کام کے مواقع بلا روک ٹوک حاصل رہتے۔ مگر مسلم لیڈروں میں دعوت کا اتنا بھی درد نہ تھا جتنا ایک تاجر کے اندر اپنی تجارت کے لئے ہوتا ہے۔ وہ کوئی نیا دعوتی میدان تو پیدا نہ کر سکے۔ البتہ جو دعوتی میدان ان کی کوششوں کے بغیر اپنے آپ موجود تھا، اس کو بھی انھوں نے برباد کر ڈالا۔

یکم اکتوبر ۱۹۸۹

سرسید احمد خاں نے اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق میں خلافت راشدہ کے متعلق ایک مضمون چھاپا۔ اس مضمون کے بین السطور سے کچھ اس طرح کا مطلب نکلتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علی کو خلافت ملنا چاہئے تھا۔ بنارس کے ایک شیعہ عالم اس مضمون کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے مذکورہ پرچہ لیا اور سفر کرکے علی گڑھ پہنچے۔ شیعہ عالم نے سرسید کے مضمون کی بہت تعریف کی اور پھر ایک نازک سوال کر دیا: "اگر آپ حضور اکرم کی وفات کے وقت موجود ہوتے تو آپ خلافت کے لئے ابوبکر کی تائید کرتے یا علی کی"۔

اس وقت مجلس میں مذکورہ شیعہ کے علاوہ بعض سنی بھی موجود تھے۔ سرسید اگر خلیفہ کے منصب کے لئے ابوبکر کا نام لیں تو شیعہ عالم سے ٹکراؤ ہوتا اور اگر علی کا نام لیں تو سنی عالم سے۔ سرسید نے ایک لمحہ سوچا اور پھر بولے: "اجی حضرت، میں اِن کی اُن کی تائید کیوں کرنے چلا۔ میں خود اپنی خلافت کا ڈول ڈالتا۔ کیا ایسا گولڈن چانس دوسروں کے لئے چھوڑ دیتا"۔

ایسے نازک موقع پر بہترین طریقہ یہی ہے کہ ایسا جواب دیا جائے کہ پوری بات تفریح میں ختم ہو جائے۔

۲ اکتوبر ۱۹۸۹

سید حامد (I.A.S.) نئی دہلی کی مرکزی حکومت میں اڈیشنل سکریٹری تھے۔ اس کے بعد وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ دہلی کی مرکزی حکومت میں کوئی ۶۴ سکریٹری ہیں۔ ان پر پورے ہندستان کی حکومت کا دار و مدار ہے۔ ان کی سرکاری مصروفیت کا یہ حال ہے کہ لوگوں کو ان سے ملاقات کرنے کے لئے بسا اوقات پندرہ پندرہ دن تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ مگر میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ ان کے تعلیمی شعور کا یہ حال ہے کہ شام کو آفس سے فرصت ملی اور میاں بیوی دونوں اپنے بچوں کی تعلیم اور ہوم ورک میں مدد دینے کے لئے بیٹھ گئے اور گھنٹہ دو گھنٹہ تک اپنے زیرِ تعلیم بچوں کی تیاری کراتے رہے۔

تعلیم کے بارہ میں ہندو قوم کی یہی باشعوری ہے جس نے اس کو مسلمانوں سے آگے کر رکھا ہے۔ نہ کہ مفروضہ تعصب اور سازش۔ مسلمانوں کی پس ماندگی کو اسی قسم کی تعلیمی محنت کے ذریعہ ختم کیا جا سکتا ہے نہ کہ فریاد اور مطالبات کے ذریعہ۔

۳ اکتوبر ۱۹۸۹

سعودی تعاون سے ایک عربی ہفت روزہ نکلتا ہے جس کا نام المجلہ ہے۔ اس کا ہیڈ آفس

لندن میں ہے۔ اس کے شمارہ ۳ اکتوبر ۱۹۸۹ (۴ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ) میں ایک اسرائیلی صحافی کی کتاب (عدوی نفسی) کا تعارف چھپا ہے:

Yor am Binur, My Enemy, My Self, London 1989

کتاب کا یہودی مصنف یورام بینور نہایت عمدہ عربی جانتا ہے اور بالکل عربوں کی طرح عربی زبان بولتا ہے۔ چنانچہ وہ فلسطینیوں کی بستی میں برسوں تک رہا۔ ان کے بارہ میں اندر سے واقفیت حاصل کی۔ اس کے بعد اس نے یہ کتاب لکھی۔

دوسری قوموں میں کثرت سے ایسی مثالیں موجود ہیں۔ مگر آج مسلمانوں میں ایسا کوئی شخص موجود نہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان ہر معاملہ میں دوسری قوموں سے پیچھے ہو گئے ہیں۔ جھوٹے فخر کے سوا اور کوئی سرمایہ ان کے پاس موجود نہیں۔

۴ اکتوبر ۱۹۸۹

کچھ سال پہلے لکھنؤ کی دیواروں پر اردو زبان کے خلاف اس مضمون کے ہندی پوسٹر لگائے گئے تھے: جس بھاشا نے دیش کو بانٹا، اس بھاشا کو دیش سے نکالو (ٹائمس آف انڈیا ۴ اکتوبر ۱۹۸۹) مگر آج اسی ریاست یوپی میں اردو کو سکنڈ لینگویج کا درجہ قانونی طور پر دیدیا گیا ہے۔

۳ اکتوبر کو اترپردیش لیجسلیٹو کونسل نے بی جے پی کی زبردست مخالفت کے باوجود اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے سے متعلق سرکاری زبان (ترمیمی بل ۱۹۸۹) کی منظوری دیدی۔ بی جے پی ممبروں نے اس کے قانونی جواز کو چیلنج کیا۔ اس کے بعد تین ممبر اردو کے خلاف نعرہ لگاتے ہوئے ایوان کے بیچ میں پہنچ گئے۔ اس پر چیرمین نے مارشلوں کو حکم دیا اور انھوں نے تینوں ممبروں کو اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ یہ ممبر "اردو بل مردہ باد" اور "ایک راجیہ بھاشا، نہیں چاہئے دوسری بھاشا" کا نعرہ لگاتے ہوئے باہر نکلے۔ (قومی آواز ۴ اکتوبر ۱۹۸۹)

اترپردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملنا صرف ایک "عطیہ" نہیں وہ ایک "ذمہ داری" ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ اردو میں اعلیٰ لٹریچر تیار کر کے اردو کی عمومی انسانی افادیت ثابت کریں۔ اگلے چند برسوں میں اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا تو صرف مذکورہ قسم کا

قانون اردو کے لئے زندگی کی ضمانت نہیں بن سکتا۔

۵ اکتوبر ۱۹۸۹

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ دوسروں کا ظلم و تعصب نہیں ہے۔ ان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں انھوں نے فیض رسانی کی صلاحیت کھودی ہے۔ وہ ہر جگہ Receiving end پر ہیں۔

حال میں میں نے لیبین ایئر لائنز سے سفر کیا تو معلوم ہوا کہ لیبین ایئر لائنز انتہائی خستہ حالت میں ہے۔ اس کے پاس نہ جہاز ہیں اور نہ فاضل پرزے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ امریکہ نے لیبیا کو جہاز کی سپلائی بند کر دی ہے۔ دوسری طرف سعودی ایئر لائنز نہایت نئے انداز کا ہے کیوں کہ اس پر امریکہ کی عنایتیں ہیں۔ افغانستان میں امریکہ نے ہتھیار دیا تو افغانی مجاہدین نے روسیوں کو مار بھگایا۔ فلسطین میں امریکہ ہتھیار نہیں دیتا تو وہاں سارا عالم اسلام عاجز ثابت ہو رہا ہے۔ پاکستان کو امریکہ نے اپنی سرپرستی میں لے رکھا ہے تو وہاں خوش حالی ہے۔ بنگلہ دیش کو امریکہ نے نظر انداز کر دیا ہے تو وہ بدترین بدحالی کا شکار ہو رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

۶ اکتوبر ۱۹۸۹

مولانا عبد الخالق صاحب رائے بریلی کے ایک حنفی عالم تھے۔ انھوں نے فتح المودعہ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ یہ کتاب ستمبر ۱۹۰۲ میں انوری پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں "میلاد النبی" کے رواج کو سراسر بدعت (محدث فی الدین) کہا گیا ہے۔ اور اس موضوع پر تاریخی حوالوں کے ذریعہ مدلل گفتگو کی گئی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں میلاد النبی کی مجالس کا مطلق رواج نہ تھا۔ یہ چھ سو سال بعد شروع ہوا۔ موصل کے ایک مجہول الاحوال شخص عمر بن محمد نے ۶۰۴ھ میں پہلی بار مولد رسول کے نام سے اس قسم کی مجلس منعقد کی۔ اس کے بعد سلطان المظفر ابوسعید کوکری نے اس کی تقلید کی۔ وہ اربل کا حاکم تھا جو موصل کے قریب ایک تاریخی شہر ہے۔ اس طرح یہ بدعت عراق سے شروع ہوئی اور پھر ہر جگہ پھیل گئی۔

میلاد کے جشن اور جلسہ جلوس اور تقریبات کا بدعت ہونا ایک ثابت شدہ امر ہے۔ یہ بھی

حدیث سے ثابت ہے کہ ہر بدعت ضلالت ہے۔ اس طرح کی سیکڑوں بدعتیں آج مسلمانوں میں رائج ہیں۔ کوئی بھی رہنما ان کو ختم کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ ایسی حالت میں کیوں کر ممکن ہے کہ موجودہ مسلمان اللہ کی رحمت و نصرت کے مستحق قرار پائیں۔

۷ اکتوبر ۱۹۸۹

مشہور فلم ایکٹر دلیپ کمار (محمد یوسف) نے اپنی پوری زندگی فلمی دنیا میں گزاری۔ مگر اپنی ذاتی زندگی میں وہ ایک پاکباز آدمی ہیں۔ حاسدین کے پروپگنڈے کی تردید کرتے ہوئے دلیپ کمار نے کہا کہ " میں ایک سنی عقیدہ مسلمان ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی شراب نہیں پی۔ نماز پابندی سے ادا کرتا ہوں۔ خیرات زکوٰۃ برابر ادا کرتا ہوں۔ اسلام کی راہ میں اپنا جان و مال ہر وقت قربان کرنے کو تیار رہتا ہوں (وفاق یکم اکتوبر ۱۹۸۹)

واقف کاروں کے بیان کے مطابق، دلیپ کمار (محمد یوسف) کے الفاظ بالکل درست ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ بالعموم " سیکولر " لوگ نام نہاد دینی لوگوں کے مقابلہ میں سیرت و کردار کے اعتبار سے زیادہ بہتر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سیکولر لوگوں کا ضمیر انھیں ملامت کرتا رہتا ہے کہ تم غلطی پر ہو۔ یہ احساس ان کے لئے ایک قسم کا دینی اور اخلاقی محرک بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس معروف دینی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تو دیندار ہیں۔ ان کا یہ احساس ان کے اندر قساوت پیدا کر دیتا ہے اور وہ گناہ کے ارتکاب میں زیادہ جری ہو جاتے ہیں۔

مشہور صوفی اور عالم جامی (۱۴۹۲ - ۱۴۱۴ء) کا ایک شعر ہے جو غالباً اسی صورتحال سے تعلق رکھتا ہے:

بہ قمار خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم چو بہ صومعہ رسیدم ہمہ یافتم دغائی

۸ اکتوبر ۱۹۸۹

پاکستان بننے کے بعد مسٹر محمد علی جناح نے ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ کو اسلامیہ کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے کہا: ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا۔ بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں (نوائے وقت، لاہور، ۳ ستمبر ۱۹۸۹)

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے دوبارہ ۱۴ جنوری ۱۹۴۸ کو اسلامیہ کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے اس بات کو دہرایا اور کہا: ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک قطعہ زمین حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا۔ بلکہ ہم لوگ ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں اسلام کے اصول کو آزما سکیں (نوائے وقت، لاہور، یکم اکتوبر)

یہی بات مسٹر جناح سے لے کر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تک تمام پاکستانی مسلمان کہتے رہے ہیں۔ مگر یہ عین وہی چیز ہے جس کو انگریزی مثل میں گاڑی کو گھوڑے کے آگے باندھنا کہا گیا ہے:

putting the cart before the horse

اسلامی اصولوں کے نفاذ کی صحیح ترتیب یہ ہے کہ پہلے افراد کے اندر ذہنی تبدیلی اور قلبی آمادگی پیدا کی جائے۔ اس کے بعد ہی کسی ملک میں اسلامی اصول کا عملی نفاذ کیا جا سکتا ہے۔ پہلے قطعہ زمین حاصل کرو، اس کے بعد اسلامی نظام نافذ کرو، یہ جملہ گرامر کے لحاظ سے صحیح مگر حقیقت کے اعتبار سے سراسر غلط ہے۔ وہ احمقانہ حد تک بے معنی ہے۔ یہ الٹی ترتیب ہے جو موجودہ دنیا میں کبھی بھی واقعہ نہیں بن سکتی۔

۹ اکتوبر ۱۹۸۹

ہجرت دعوت کا مرحلہ نہیں، ہجرت نبوت کا مرحلہ ہے۔ یہ اس سنت کا ایک حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے لئے مقرر کیا ہے۔

نبی جب کسی قوم میں دعوت دیتا ہے، اور اپنی دعوت کو اتمام حجت کے مرحلہ تک پہنچا دیتا ہے تو اس کے بعد وہ قوم عذاب کی مستحق ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد براہ راست خدا کے حکم کے تحت نبی اپنی قوم کو چھوڑ کر باہر چلا جاتا ہے۔ تاکہ خدا کا عذاب آئے اور منکر قوم ہلاک کر دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ نبیوں نے ہمیشہ ہجرت کی ہے مگر عام داعیوں نے کبھی اس طرح ہجرت نہیں کی۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۸۹

حسان بن ثابت الانصاری کی بابت کچھ عرب ناقدوں نے کہا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد حسان کی شاعری کمزور پڑ گئی۔ حالاں کہ اسلام میں داخل ہونے سے پہلے ان کے اشعار نہایت طاقت ور ہوا کرتے تھے (ان شعر حسان قد ضعف فی الاسلام وقد کان نحلاً فی الجاهلية)

میں نے حسان بن ثابت کے دونوں زمانوں کے اشعار کا تقابلی مطالعہ نہیں کیا ہے۔ تاہم اگر یہ صحیح ہو تو اس سے اسلام پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اسلام ایک سائنٹفک مذہب ہے۔ وہ آدمی کے اندر سنجیدگی اور حقیقت پسندی کا مزاج پیدا کرتا ہے، اس لئے اگر اسلام میں داخل ہونے کے بعد کسی شاعر کی شاعری کمزور پڑ جائے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

۱۱ اکتوبر ۱۹۸۹

بابری مسجد کو مسلمان (صحیح تر لفظ میں مسلم لیڈر) مقامی حیثیت سے لیتے اور اس کے لئے خاموش جدوجہد کرتے تو اس سے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ مگر مسلمانوں نے اس کو پورے ملک میں شور وغل کا مسئلہ بنایا۔ اس کے ردعمل میں ہندو فرقہ واریت بہت بڑے پیمانے پر جاگ اٹھی۔

ہریانہ کے ایک بھٹہ چلانے والے ہندو نے پچاس لاکھ اینٹیں بنوائیں۔ ہر اینٹ پر "شری رام" لکھا ہوا تھا۔ ان اینٹوں کو اس ہندو نے رام جنم بھومی کی تعمیر کے لئے مفت دے دیا۔ اب وشو ہندو پریشد وغیرہ جماعتوں نے یہ کیا کہ ان اینٹوں کو گاڑیوں میں رکھ کر سارے ہندستان میں گھمانا شروع کیا۔ اس کا نام "رام شیلا" یعنی رام کی اینٹیں رکھ دیا گیا۔ ہندوؤں نے ان اینٹوں کے نام پر کروڑوں روپئے نذر کئے۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۰ اکتوبر ۱۹۸۹) کے صفحہ اول پر ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ رام شیلا پوجن بنیادی طور پر ایک وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ہندوؤں میں ہندو ہونے کا سویا ہوا فخر جگایا جا رہا ہے:

The Ram Shila pujan samaroh is basically a channel through which the "slumbering pride" in being a Hindu is attempted to be aroused.

ہندوؤں کے سوئے ہوئے فخر کو جگانے کی اصل ذمہ داری نام نہاد مسلم لیڈروں پر ہے جنھوں نے بابری مسجد کے نام پر سارے ملک میں ہنگامہ کھڑا کیا۔ یہ ایک ردعمل ہے مسلمانوں کے عمل کا۔ بابری مسجد تو مسلمانوں کو ملی نہیں، البتہ ایک نیا شدید تر مسئلہ ان کے خلاف کھڑا ہو گیا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان جھوٹے لیڈروں سے قوم کو کب نجات ملے گی۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۸۹

ندوہ (لکھنؤ) کے تین طالب علم ملاقات کے لئے آئے۔ ان میں سے ایک محمد یٰسین مالیگانوی تھے جو شبلی ہاسٹل میں رہتے ہیں۔ یہ ہاسٹل لکھنؤ یونیورسٹی کے ہاسٹل سے ملا ہوا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ رات کو جب لائٹ چلی جاتی ہے تو یونیورسٹی کے لڑکے اپنی چھتوں پر چڑھ جاتے ہیں اور ندوہ والوں کو برا بھلا کہتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیا الفاظ کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ بالکل فحش گالی ہوتی ہے جس کو ہم اپنی زبان سے ادا نہیں کر سکتے۔ شبلی ہاسٹل کی دیوار اور یونیورسٹی ہاسٹل کی دیوار میں تقریباً ۲۰ فٹ کا فاصلہ ہے۔

ذی قعدہ ۱۴۰۹ھ میں ایک روز ایسا ہی ہوا۔ ندوہ کے کچھ لڑکے اپنی چھت پر چڑھ کر ان کا جواب دینے لگے۔ اس سے شدت پیدا ہوئی اور یونیورسٹی کے لڑکوں نے باقاعدہ پتھر پھینکنے شروع کئے۔ کچھ پتھر ایک استاد مولانا محمد خالد کے گھر میں گرے جو پاس ہی رہتے ہیں۔ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد مولانا محمد رابع حسنی اور ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی وغیرہ آئے۔ مولانا رابع صاحب نے تقریباً پندرہ منٹ تک ندوہ کے لڑکوں کو سمجھایا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ لوگ ہرگز جوابی اشتعال نہ دکھائیں۔ اپنے اپنے کمروں میں رہیں وہ چلاتے چلاتے اپنے آپ خاموش ہو جائیں گے۔ آپ لوگ ہر حال میں سکون سے رہئے اور ردعمل مت ظاہر کیجئے۔

کیسے عجیب ہیں ندوہ کے لوگ۔ وہ الرسالہ کے بارہ میں کہتے ہیں کہ الرسالہ مسلمانوں کو بزدلی سکھاتا ہے۔ اور خود اپنے ذاتی معاملہ میں عین الرسالہ کے مسلک پر عمل کر رہے ہیں۔ عوامی جلسہ میں وہ جہاد پر تقریر کرتے ہیں اور جہاں اپنی ذات زد میں ہو وہاں صبر و تحمل کی تلقین کر رہے ہیں (ملاحظہ ہو، تعمیر حیات ۱۰ اگست ۱۹۸۸، صفحہ ۲)

۱۳ اکتوبر ۱۹۸۹

گورکھپور کے ایک صاحب تشریف لائے۔ وہ تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اور دوسروں کے کئی تبلیغی تجربات بتائے۔ مثلاً ایک انجینئر صاحب کا قصہ بتایا جو انھوں نے خود بیان کیا تھا۔ انجینئر صاحب نے ان سے بتایا کہ میں ایک بار ایک جماعت لے کر فلاں مقام پر گیا۔ وہاں ہم لوگ ایک مسجد میں ٹھہرے۔ یہ مسجد بدعتیوں کے محلہ میں تھی۔ وہ لوگ جماعت کو دیکھ کر بگڑ گئے۔

ہمارے سامان اور اسٹووغیرہ کو باہر پھینک دیا اور ہم کو مسجد سے باہر نکال دیا۔ مگر ہم لوگ ان سے ٹکرائے نہیں۔ ہم ان کے لئے دعائیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ شام کو ایک شخص کو رحم آیا۔ وہ ہم کو دوبارہ مسجد میں لے گیا۔ ہم لوگ چند دن وہاں رہے اور خاموشی اور حکمت کے ساتھ ان کی تعلیم کرتے رہے۔

انجنیئر صاحب نے انھیں بتایا کہ اس واقعہ کے پانچ سال بعد ایک سفر کے دوران میری ملاقات ایک شخص سے ہوئی تعارف کے بعد میں نے وہاں کا حال پوچھا۔ اس نے کہا کہ صاحب آپ کا ہمارے یہاں آنا ہمارے لئے بہت بابرکت ثابت ہوا۔ وقتی طور پر کچھ لوگ مخالف ہو گئے تھے۔ مگر آپ نے جو بیج ڈالا تھا وہ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ آج وہ شاداب درخت بن چکا ہے۔ بہت سے لوگ بدعت سے توبہ کرکے تبلیغ کے ساتھ جڑ گئے ہیں، وغیرہ

مذکورہ تبلیغی بزرگ نے اس کے بعد الرسالہ کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے سفرنامہ میں خودستائی ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ سفرنامہ میں جو چیز ہوتی ہے وہ خودستائی نہیں، بیان واقعہ ہے۔ وہ ایسا ہی ہے جیسے آپ نے مذکورہ انجنیئر صاحب کی بات نقل کی۔ سفرنامہ میں الرسالہ یا مطبوعات الرسالہ کے بارہ میں کسی کا تاثر نقل کیا جاتا ہے۔ اس کو آپ خودستائی کہتے ہیں۔ مگر اسی قسم کا تاثر انجنیئر صاحب نے نقل کیا تو آپ کو وہ خودستائی محسوس نہیں ہوا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انجنیئر صاحب نے جو بات کہی اس کو آپ نے تبلیغی مشن کے خانہ میں ڈال دیا۔ اور میں نے الرسالہ میں اسی قسم کی جو بات درج کی اس کو آپ میری ذات کے خانہ میں ڈال رہے ہیں۔ حالاں کہ جس طرح تبلیغ ایک مشن ہے اسی طرح الرسالہ بھی ایک مشن ہے۔ اگر آپ سفرنامہ میں درج شدہ واقعہ کو الرسالہ مشن کے خانہ میں ڈال دیں تو وہ آپ کو خودستائی نہ دکھائی دے۔ بلکہ وہ آپ کو الرسالہ مشن کی رفتار کار دکھائی دینے لگے، جس طرح انجنیئر صاحب کی بات آپ کو خودستائی کے بجائے تبلیغی مشن کی رفتار کار نظر آرہی ہے۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۸۹

محمد ہاشم قاسمی صاحب (حیدرآباد) جنھوں نے ہمارے ساتھ غصب اور خیانت کا معاملہ کیا ہے۔ وہ اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے راقم الحروف کو بدنام کرنے کی مہم چلا رہے ہیں۔ حال میں

انھوں نے ایک ہینڈ بل چھاپ کر تقسیم کیا ہے۔ اس میں میرے متعلق بہت سی جھوٹی اور بے بنیاد باتیں کہی گئی ہیں۔

ایک صاحب اس ہینڈ بل کو پڑھنے کے بعد مجھ سے ملے۔ انھوں نے پرجوش طور پر کہا کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ بابری مسجد ہندوؤں کے حوالے کر دینا چاہئے۔ میں نے پوچھا کہ یہ آپ نے کیسے جانا۔ انھوں نے کہا کہ دیکھئے، اس ہینڈ بل میں یہی لکھا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ ہینڈ بل میں یہ بات کسی حوالہ کے بغیر کہی گئی ہے۔ موجودہ صورت میں وہ زیادہ سے زیادہ ایک خبر ہے۔ اور خبر کے متعلق ہمارے فقہاء کا کہنا ہے کہ خبر میں سچ اور جھوٹ دونوں کا امکان ہوتا ہے (الخبر یحتمل الصدق والکذب) پھر کیا آپ نے اس خبر کی تحقیق کی۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ اس قسم کی کسی "خبر" کو تحقیق کے بغیر ماننا اسلام میں جائز نہیں۔ آپ کو چاہئے تھا کہ سب سے پہلے ہینڈ بل والے صاحب سے اس کا حوالہ مانگیں اور میری اصل عبارت کا تقاضا کریں۔ اور جب تک وہ حوالہ اور اصل عبارت پیش نہ کریں اس وقت تک اس معاملہ میں ہرگز کوئی رائے قائم نہ کریں۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۸۹

ایک صحابی نے بعد کے زمانہ میں ایک تابعی سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب ہم قرآن کی دس آیتیں لیتے تو ہم اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے جب تک ہم اس کو پوری طرح سیکھ نہ لیں اور اس میں جو کچھ ہے، اس کو پوری سچائی کے ساتھ اخذ نہ کر لیں (کنا اذا اخذنا عشر آیات لانتجاوزها الا اذا تعلمنا ما بها بصدق)

اصحاب رسول کی نظر قرآن کے معانی پر ہوتی تھی، موجودہ مسلمانوں کی نظر قرآن کے الفاظ پر ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک تدبر قرآن کی اہمیت تھی، اب لوگوں کے نزدیک تلاوت قرآن کی اہمیت ہے۔ کتنا زیادہ فرق ہے دور اوّل کے مسلمانوں میں اور آج کے مسلمانوں میں۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۸۹

میں مکان کی چھت پر تھا۔ اوپر نگاہ اٹھی تو دیکھا کہ بہت سی چیلیں بلندی پر اڑ رہی ہیں۔ اچانک خیال آیا کہ یہ سب خدا کی نشانیاں ہیں۔ چڑیوں کو خدا نے اوپر ہوا میں اڑایا تاکہ انسان ہوائی جہاز بنانے کی بات سوچے۔ اس نے مچھلیوں کو سمندر میں تیرایا تاکہ پانی کے جہاز بنانے کا

تصور ان کے دماغ میں آئے۔ اس نے زمین پر گھوڑے کی سواری چلائی تاکہ انسان یہ سوچ سکے کہ اس کو پہیہ دار گاڑی بنانا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی خام اشیاء دنیا میں پھیلا دی ہیں تاکہ انسان اپنی عقل کو استعمال کرکے ان کے ذریعہ اپنے لئے ترقی یافتہ دنیا بنائے۔ وہ فضا میں حیاتیاتی پرواز کو مشینی پرواز میں تبدیل کرے۔ وہ سمندر میں حیوانی تیراکی کو مشینی تیراکی کی صورت دے۔ وہ زمین میں جانوروں کے ذریعہ سفر کو ریلوں اور کاروں کا سفر بنا دے۔

انسان سے خدا کو یہی تخلیقی عمل مطلوب ہے نہ کہ محض تقلیدی عمل جس کی تربیت آج ہمارے اداروں میں دی جا رہی ہے۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۸۹

پرانی دہلی کے دو مسلمان بزرگ ملاقات کے لئے آئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ آج کل ملک میں فرقہ واریت کی آگ بھڑک رہی ہے۔ جگہ جگہ ہندو مسلم فساد ہو رہے ہیں۔ مثلاً بدایوں کوٹہ، اندور وغیرہ۔

میں نے کہا کہ فساد کا حل نہایت آسان ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان یہ عزم کرلیں کہ وہ "دوسری غلطی" نہیں کریں گے۔ یعنی ہندوؤں کی طرف سے اشتعال انگیزی کے باوجود وہ مشتعل نہیں ہوں گے۔ میں نے کہا کہ خود دہلی کی دو مثالیں اس کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔ دہلی میں ۱۹۸۷ میں فساد ہوا۔ مسلمانوں کو جان و مال کا نقصان اٹھانا پڑا۔ مگر اسی قسم کے حالات کے باوجود ۱۹۸۹ میں فساد نہیں ہوا۔ ۱۹۸۷ میں فساد اس طرح ہوا تھا کہ ہندوؤں نے پرانی دہلی کے علاقہ میں جلوس نکالا۔ انھوں نے مسلم مخالف نعرے لگائے۔ اس پر مسلمان مشتعل ہو کر لڑ پڑے۔ اس کے بعد فساد ہوا اور یک طرفہ طور پر مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔

۱۹۸۹ (ستمبر) میں ٹھیک اسی طرح ہندوؤں کا جلوس نکلا۔ اس نے مسلم مخالف نعرے لگائے (آنے والے بزرگ نے تصدیق کی کہ وہ خود ان اشتعال انگیز نعروں کو سننے والوں میں تھے) مگر اس بار دہلی میں کوئی فساد نہیں ہوا۔ ان دونوں واقعات کو ملا کر دیکھئے تو ان کے درمیان فرق کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۸۷ میں مسلمان ردعمل کا شکار ہو گئے تھے اس لئے فساد ہوا۔ ۱۹۸۹ میں وہ

ردعمل کا شکار نہیں ہوئے اس لئے فساد کے اسباب کے باوجود فساد نہیں ہوا۔

مذکورہ مسلمان نے کہا کہ الکشن بھی تو قریب ہے (یعنی ۲۲، ۲۴ نومبر ۱۹۸۹ کو لوک سبھا کا الکشن ہونے والا ہے، اس لئے گورنمنٹ نے فساد نہیں ہونے دیا)۔ میں نے کہا کہ کیا حکمراں پارٹی (کانگرس) کو صرف دہلی میں ووٹ لینا ہے۔ دوسرے مقامات پر اس کو ووٹ نہیں لینا ہے۔ جہاں آج بھی فسادات ہو رہے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ فساد ہمیشہ اسی مقام پر ہوتا ہے جہاں مسلمان ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جہاں مسلمان خاموش رہ جائیں وہاں فساد نہیں ہوتا۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۸۹

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) عمر خیام (۱۱۲۲ - ۱۰۴۸) پر ۵۳ سطریں لکھی ہیں۔ (VII/530) اور خلیفہ ثانی عمر بن خطاب (۶۴۴ - ۵۸۶) پر صرف ۵ سطریں (X/248) جبکہ کوئی مسلمان انسائیکلو پیڈیا تیار کرے تو وہ نہ صرف اس کے برعکس عمل کرے گا بلکہ اگر وہ عمر خیام پر پانچ سطریں لکھے گا تو عمر فاروق پر ۵۰۰ سطریں درج کرے گا۔

یہ صرف کافر عالم اور مسلمان عالم کے درمیان فرق کی بات نہیں۔ یہی فرق خود مسلمانوں کے اپنے درمیان بھی پایا جاتا ہے۔ ایک مسلمان عالم اگر اشخاص کا تذکرہ لکھے گا تو اپنے حلقہ کے اکابر کے بارہ میں صفحات کے صفحات درج کر دے گا۔ اس کے برعکس دوسرے حلقہ کے اکابر کے بارہ میں یا تو سرے سے کوئی اندراج نہ ہوگا، اور اگر اندراج ہوگا تو صرف چند سطروں کی حد تک۔ اسی کو شاعر نے کہا ہے کہ:

این گناہے است کہ در شہر شما نیز کنند

۱۹ اکتوبر ۱۹۸۹

دیوبند کے ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے فتنے وہ نہیں ہیں جو الملل والنحل اور اس طرح کی دوسری کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں۔

۱۔ موجودہ زمانہ کا اعتقادی فتنہ یہ ہے کہ آج کا انسان خدا کو حذف کر کے واقعات کی توجیہ بیان کرتا ہے۔ کوئی شخص خدا کا منکر نہ ہو تب بھی اس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ تمام واقعات کو خدا کو مانے بغیر سمجھ سکے۔

۲۔ دوسری بات عمل سے متعلق ہے۔ موجودہ زمانہ میں مارکس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان نظام سے بنتا ہے نہ کہ نظام انسان سے۔ اگرچہ مارکسزم آج زندہ نہیں ہے مگر اس کا یہ فکر اتنا پھیلا کہ مارکس کے مخالفین بھی اب تک اسی انداز سے سوچتے ہیں۔ عالم اسلام کے بیشتر تعلیم یافتہ لوگوں کی سوچ یہی ہے۔

حدیث میں کہا گیا ہے کہ قلب (یا ذہن) کی اصلاح پر انسانی معاملات کی اصلاح کا انحصار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی تفکیر مبنی بر فرد (Individual-based) ہے۔ اس کے مقابلہ میں مارکسیت کے زیر اثر، موجودہ زمانہ کی عام تفکیر مبنی بر نظام (System-based) ہوگئی ہے۔ موجودہ زمانہ کے تمام مصلحین ومفکرین (مثلاً سید قطب، ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ) اسی دوسرے طرز فکر کی پیداوار ہیں۔ حالاں کہ یہ طرز فکر اسلام کے عین برعکس ہے۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۸۹

ایک صاحب کے بعض سوالات کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں جنرل محمد ضیاء الحق نے شخصی طور پر اور جماعت اسلامی اور اخوان المسلمین نے جماعتی طور پر یہ کوشش کی کہ وہ پہلے حکومت پر قبضہ کرلیں اور اس کے بعد افراد کی اصلاح کریں۔ یہ طریقہ سراسر سنت نبوی کے خلاف ہے، اس لئے، دھوم اور ہنگاموں کی لمبی سیاست کے باوجود اس کا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوسکا۔

میں نے کہا کہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پیش کش کی گئی کہ اگر آپ اپنی اس تحریک سے اقتدار چاہتے ہیں تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنانے کے لئے تیار ہیں (ان کنت تريد به مُلكاً مَلَّكْنَاكَ علينا) آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ میں تمہارے اوپر اقتدار نہیں چاہتا۔ میں تو صرف بشیر و نذیر ہوں (ولا الملك عليكم. ولكن الله بعثني اليكم رسولا وانزل علىّ كتاباً وامرني ان اكون بشيرا ونذيرا) سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول صفحہ ۱۵-۳۱۶)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ نظریہ سراسر غیر اسلامی ہے کہ پہلے حکومت پر قبضہ کرلو، اور اس کے بعد افراد کی اصلاح کرو۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے افراد کے اندر ایمانی انقلاب لے آئی،

اس کے بعد حسب حالات حکومت تک پہنچو۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۸۹

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ "عشق رسول" ایک بدعانہ لفظ ہے۔ قرآن و حدیث میں کہیں بھی یہ لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ رسول اللہ کے معاملہ میں اتباع مطلوب ہے نہ کہ عشق۔

انھوں نے کہا کہ مگر محبت کا لفظ تو رسول اللہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ محبت سے مراد عشق نہیں ہے۔ محبتِ رسول دراصل اتباع رسول ہی کا اگلا درجہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول کی اتباع مشینی انداز کی نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ والہانہ اتباع کے انداز میں ہونا چاہئے۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۸۹

مغل حکمراں اورنگ زیب نے کہا تھا کہ دنیا میں صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے کہ بہت زیادہ ہے، پھر بھی کوئی نہیں :

نیست جز آدم دریں عالم کہ بسیار است و نیست

دنیا ایسے انسانوں سے بھری ہوئی ہے جو انٹرسٹ کے لئے متحرک ہوتے ہیں۔ مگر ساری دنیا میں ایک انسان بھی شاید ایسا موجود نہیں جو پرنسپل کے لئے متحرک ہوتا ہو۔ ذاتی مفاد کے لئے ہر آدمی دوڑ رہا ہے، مگر اصول حق کے لئے دوڑنے والا کوئی شخص نظر نہیں آتا۔

دنیا میں سب سے زیادہ بھیڑ سطحی انسانوں کی ہے۔ دنیا میں بیشتر انسان وہ ہیں جو صحیح معنوں میں اپنی ذات کے لئے بھی کرنا نہیں جانتے۔ کچھ انسان ایسے ہیں جو اپنی ذات کے لئے کرنا جانتے ہیں، اور ایسا انسان تو شاید آج کی دنیا میں نایاب کے درجہ میں ہے جو صحیح معنی میں حق کے لئے کرنا جانتا ہو۔ دنیا میں سب کچھ ہے مگر ایک سچا انسان نہیں۔ دنیا میں ہر چیز ہے مگر وہی ایک چیز نہیں جس کے لئے یہ دنیا تخلیق کی گئی تھی۔

۲۳ اکتوبر ۱۹۸۹

عبدالواجد سردار (۲۶ سال) ڈھاکہ (دھان منڈی) کے رہنے والے ہیں۔ وہ دہلی کے

ایک مدرسے میں زیر تعلیم ہیں۔ ان کے گھر کے سب لوگ انگریزی تعلیم یافتہ اور خوش حال ہیں۔ ان کی والدہ نے کہا کہ میں اپنے ایک بچہ کو عربی پڑھاؤں گی۔ اس طرح وہ دہلی پہنچے۔

ملاقات کے دوران انھوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں ۱۲۰ بیگھہ زمین ہے۔ گھر کا کوئی آدمی زمین کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا، اس لئے پوری زمین بٹائی پر دی ہوئی ہے۔ جن لوگوں کو بٹائی پر دیا گیا ہے وہ سب ہندو ہیں۔ انھوں نے کہا ——— ہندوؤں کا اخلاق بہت اچھے ہوتے ہیں، وہ دھوکا نہیں دیتے۔ مثلاً کسی کھیت میں ۲۰ کوئنٹل دھان ہو تو مسلمان اس کو ۱۵ کوئنٹل بتائے گا اور ہم کو ساڑھے سات کوئنٹل دے گا۔ مگر ہندو پورا ۲۰ کوئنٹل بتائے گا اور ہم کو اس کا نصف (۱۰ کوئنٹل) دے گا۔

عبد الواجد صاحب نے مزید بتایا کہ بنگلہ دیش ۱۹۷۱ میں بنا۔ اس وقت تو میں بچہ تھا۔ مگر ہمارے بڑے بتاتے ہیں کہ پاکستانی دور میں ہم زیادہ اچھے تھے۔ میں نے کہا کہ ایسے لوگ کتنے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ستر فیصد۔

برصغیر کی تقسیم نے مسلمانوں کو حقیقی معنوں میں کچھ نہیں دیا۔ وہ بنگلہ دیش میں بھی برباد ہیں، ہندستان میں اور پاکستان میں بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہر جگہ بربادی کی نوعیت الگ الگ ہے۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۸۹

ایک صاحب سے گفت گو کرتے ہوئے میں نے کہا: آپ کا مخالف جب آپ سے کچھ چھینتا ہے تو عین اسی وقت وہ بہت بڑی چیز آپ کو دے دیتا ہے ——— زندگی کا نیا حوصلہ، نئے عزم کے ساتھ اپنے لئے مستقبل کی تعمیر۔ محرومی کا واقعہ پیش آنے کے بعد اگر آپ مایوس نہ ہوں، بلکہ از سر نو اپنی زندگی کی تعمیر کا نقشہ بنائیں تو محرومی کا واقعہ آپ کے لئے نئے شاندار تر مستقبل کی طرف سفر کا زینہ بن جائے گا۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۸۹

آج کے ٹائمس آف انڈیا (نئی دہلی) میں ہیلے (Hailey) کا ایک قول نقل کیا گیا ہے کہ ہر مومن خدا کا ایک معجزہ ہے:

Every believer is God's miracle.

اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا اس کائنات کی سب سے واضح حقیقت ہے۔ وہ سورج اور چاند سے بھی زیادہ روشن ہے۔ مگر خدا پر یقین لانا صرف ان لوگوں کے لئے ممکن ہے جو نہ دکھائی دینے والی چیزوں کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جو لوگ صرف دکھائی دینے والی چیزوں کو دیکھیں، ان کے لئے خدا کا کوئی وجود نہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یقیناً یہ ایک خدائی معجزہ ہے کہ ایک شخص کا دماغ خدا کے وجود پر کامل یقین کرے اور اس کا دل خدا کے احساس سے لرز اٹھے۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۸۹

مولانا انیس نعمان الندوی (مالیگاؤں) مرکز میں آگئے ہیں۔ انھوں نے تذکیر القرآن کے عربی ترجمہ کا کام شروع کر دیا ہے۔ آج غالباً وہ دیباچہ کا ترجمہ مکمل کر لیں گے۔ ترجمہ کا یہ کام لیبیا اور تیونس اور الجزائر کے عرب نوجوانوں کے اصرار پر شروع کیا گیا ہے۔ ان لوگوں نے کہا ہے کہ ترجمہ کی تکمیل کے فوراً بعد وہ لوگ اس کی اشاعت کا انتظام کریں گے۔

تذکیر القرآن کا عربی ترجمہ شائع ہونا گویا اس مشن کا اگلے مرحلہ میں داخل ہونا ہے۔ اس نئے مرحلہ کے اسباب خدا کے فضل سے پیدا ہو گئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں اس نئے مرحلہ کو دیکھنے کے لئے زندہ رہوں گا یا نہیں۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ یہ مرحلہ ضرور آئے گا، خواہ وہ میری موت سے پہلے آئے یا میری موت کے بعد۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۸۹

ایک صاحب نے ہندستانی حکومت کے تعصب کی شکایت کی۔ میں نے کہا کہ دہلی میں چار یونیورسٹیاں ہیں۔ اور چاروں یونیورسٹی کے وائس چانسلر اس وقت مسلمان ہیں۔ دلی یونیورسٹی کے پروفیسر مونس رضا، جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں پروفیسر ایم ایس اگوانی، جامعہ ملیہ میں ڈاکٹر ظہور قاسم۔ ہمدرد یونیورسٹی میں پروفیسر رشید الظفر۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں سے جو چیز سب سے زیادہ اٹھا لی گئی ہے، وہ شکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو چیز انھیں ملی ہوئی ہے، اس پر وہ شکر نہیں کرتے۔ اور جو چیز نہیں ملی، اس پر فریاد کرتے ہیں۔ شکر کرنے پر خدا کی نعمتوں میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ اور ناشکری کرنے پر خدا کی نعمتیں چھین لی جاتی ہیں۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۸۹

مسٹر جناح کی وفات ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ کو ہوئی۔ ہندستان نے ۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ کو اپنی فوجیں حیدر آباد میں داخل کر دیں اور حیدر آباد اسٹیٹ پر قبضہ کر لیا۔ تاریخوں کی اس قربت کی وجہ سے پاکستانی سمجھتے ہیں کہ ہندستان مسٹر جناح سے ڈرتا تھا۔ جب تک وہ زندہ تھے، ہندستان کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ حیدر آباد کے خلاف فوجی کارروائی کرے جس نے آزادی کے بعد پاکستان سے تعلق قائم کر لیا تھا جیسے ہی مسٹر جناح کا خاتمہ ہوا، ہندستان نے فوراً اپنی فوجیں حیدر آباد میں داخل کر دیں۔ اس کے جواب میں ہندستان کے لوگ کہتے ہیں کہ حیدر آباد کے خلاف "پولیس ایکشن" کی تاریخیں پہلے مقرر کی جا چکی تھیں۔

میں کہوں گا کہ پاکستان کی سیاست اگر ایک شخص کی ذات پر منحصر تھی تو ایسے پاکستان کو بنوانا ہی غلط تھا۔ ہر شخص (بشمول جناح) ایک روز مرنے والا تھا۔ جب کہ پاکستان کو اس کے بعد بھی باقی رہنا تھا۔ پھر ایسے پاکستان کو بنوانے کی ضرورت کیا تھی۔ جس کی امیدوں کا سہارا ایسی کمزور ڈور ہو جس کو بہرحال ٹوٹ جانا ہے۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۸۹

لارڈ بولنگ بروک (Lord Bolingbroke) کا ایک قول ہے کہ ہر آدمی کی عقل اس کے لئے دار الاستخارہ کی حیثیت رکھتی ہے:

Every man's reason is every man's oracle.

قدیم یونان میں مذہبی دار الاستخارہ (Oracle) ہوا کرتا تھا۔ یہاں آکر لوگ مخصوص انداز میں اپنے مفروضہ دیوتاؤں سے مشورہ یا پیشگی رائے طلب کرتے تھے۔ اس کا جواب انھیں مبہم اور پر اسرار طور پر ملتا تھا جس کو وہ مقدس سمجھ کر قبول کر لیتے تھے۔ گویا اوریکل کا مطلب ہے پر اسرار مشیر جس پر اعتماد کیا جائے۔

ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ اس کی عقل جو کچھ اسے سمجھا دے، اس کو وہ صحیح سمجھ کر پکڑ لیتا ہے۔ سچا انسان وہ ہے جو اپنی عقل کے خول سے باہر نکلے اور چیزوں کے بارہ میں حقیقت واقعہ کے اعتبار سے رائے قائم کرے نہ کہ محض اپنی ذاتی سوچ کے اعتبار سے۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۸۹

۲۹ اکتوبر اور ۳۰ کی درمیانی رات ہے۔ گھڑی میں ایک بج رہے ہیں۔ آج دیوالی ہے۔ ہر طرف سے پٹاخوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ فضا دھوئیں سے بھر گئی ہے۔ شور وغل سے اپنے ذہن کو پھیرنے کے لئے میں لکھنے پڑھنے میں مشغول ہوگیا یہاں تک کہ رات کے ایک بج گئے۔

بچپن میں میں سنتا تھا کہ دیہات کی ہندو عورتیں اپنے گھروں میں سوپ بجا کر کہتی ہیں: "اسّر پیٹھیں دلدّر نکلیں" یعنی گھر میں برکت آئے اور نحوست اس سے نکل جائے۔ اب اس رسم نے پرشور پٹاخہ بازی کی صورت اختیار کرلی ہے۔ دہلی میں ہر سال دیوالی کی رات کو اتنے زیادہ پٹاخے چھوڑے جاتے ہیں کہ رات کا بیشتر حصہ دھماکوں سے گونجتا رہتا ہے اور پورے شہر کی فضا دھوئیں اور گیس سے بھر جاتی ہے۔

اس بے معنی رسم کے پیچھے شرک ہے۔ ہندو اپنے مشرکانہ عقیدہ کے تحت سمجھتے ہیں کہ دیوالی کی رات کو شور کرنے سے دلدّر (نحوست) بھاگ جاتی ہے۔ اسی طرح اس ملک کی تمام برائیوں اور خرافات کے پیچھے مشرکانہ عقائد شامل ہیں۔ اس ملک کی اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہاں سے شرک کا خاتمہ نہ ہو۔ اس ملک کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کو شرک سے نکال کر توحید کے عقیدہ پر قائم کیا جائے۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۸۹

انڈیا ٹوڈے انگریزی کا مشہور ہفت روزہ ہے۔ اس نے اپنا اردو اڈیشن نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لئے کاتب اور اڈیٹر رکھ لئے گئے۔ حتی کہ اس کے پہلے شمارہ کی کتابت بھی ہوگئی۔ اس درمیان میں ان کی ٹیم یہ سروے کر رہی تھی کہ انڈیا ٹوڈے اگر اردو میں نکلے تو اس کی اشاعت کتنی ہوگی۔ ٹیم نے جائزہ لے کر بتایا کہ ۱۵۔۲۰ ہزار تک اس کی اشاعت ہوسکتی ہے۔ اس رپورٹ کے بعد فوراً اسکیم ختم کر دی گئی۔

انڈیا ٹوڈے کا معیار یہ ہے کہ پرچہ کی اشاعت کم از کم پچاس ہزار ہونی چاہئے۔ اس سے کم تعداد کو وہ شمار کے قابل نہیں سمجھتے۔ دوسری طرف مسلم صحافت کا حال یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے کسی پرچہ کی اشاعت پندرہ ہزار ہوجائے تو وہ پرفخر طور پر اعلان کرے گا کہ میرا پرچہ پندرہ

ہزار کی تعداد میں چھپتا ہے۔ کتنا فرق ہے ایک صحافت میں اور دوسری صحافت میں۔

یکم نومبر ۱۹۸۹

م۔ افضل (پیدائش ۱۹۵۲) اخبار نو دہلی کے مالک اور اڈیٹر ہیں۔ وہ ملاقات کے لئے آئے اور اپنی صحافت کے بارہ میں تفصیل کے ساتھ بتاتے رہے۔ ان کے اندر وقت کا شعور بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے کہا " دیر میں نے کبھی نہیں کی زندگی میں"۔ مثلاً ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ کو سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کو قتل کیا گیا تو م۔ افضل صاحب کا پرچہ کتابت ہو کر پریس جا چکا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ پرسوں جب میرا پرچہ چھپ کر بازار میں آئے گا تو ہر آدمی کے ذہن میں وزیر اعظم کے قتل کا واقعہ ہوگا۔ اس وقت میرا موجودہ پرچہ کون پڑھے گا۔ انھوں نے پرچہ پریس سے واپس منگا لیا اور دو رات اور ایک دن کی مسلسل محنت کے بعد نیا پرچہ تیار کیا جو سارا کا سارا اندرا گاندھی کی باتوں اور تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ ان کا یہ پرچہ خوب بکا۔ اچانک ان کے پرچہ کی اشاعت بڑھ گئی۔

اسی طرح ۱۷ اگست ۱۹۸۸ کو سابق صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق ایک ہوائی حادثہ میں ہلاک ہوگئے۔ اس وقت بھی م افضل صاحب کا پرچہ تیار تھا۔ دوبارہ انھوں نے سوچا کہ میرا پرچہ جب چھپ کر دو دن کے بعد بازار میں آئے گا تو اس میں ضیاء الحق کے بارہ میں کچھ نہ ہوگا، جب کہ لوگ سب سے زیادہ اسی کو پڑھنا چاہیں گے۔ وہ فوراً پاکستان روانہ ہوگئے۔ اسلام آباد پہنچ کر ضیاء الحق کے جنازہ میں شرکت کی۔ آنکھوں دیکھا حال تیار کیا۔ پاکستانی اخبارات کی کاپیاں خریدیں۔ تصویریں حاصل کیں۔ اور پھر فوراً واپس آکر پورا پرچہ از سر نو مرتب کر ڈالا۔ یہ پرچہ بہت بکا۔ اخبار نو کی اشاعت کئی گنا بڑھ گئی۔

م افضل صاحب نے یہ سب باتیں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیں۔ اس کو سن کر میں نے کہا کہ دوسرے اخبار والوں میں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ دوسرے لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ ——— کل کے دن آدمی کیا پڑھے گا، میں یہ دیکھتا ہوں کہ کل کے دن آدمی پر کیا بیتے گا۔ چنانچہ عام اخباروں اور رسائل کے برعکس میں نے مذکورہ دونوں واقعات پر بالکل مختلف انداز سے لکھا۔ ملاحظہ ہو، اندرا گاندھی کے قتل پر الرسالہ دسمبر ۱۹۸۴، صفحہ ۷۔ ضیاء الحق کی موت پر الرسالہ اکتوبر ۱۹۸۸

صفحہ ۳۔ "زمین سے محروم"

۲ نومبر ۱۹۸۹

کئی برس سے میں ایک سوال سے دوچار تھا۔ جب میں کسی مسلمان کی تحریر پڑھتا یا مسلمانوں کی کسی ملکی یا غیر ملکی کانفرنس میں شرکت کرتا تو اکثر ایک چیز مجھے پریشان کرتی تھی۔ یہ لوگ ایک طرف مسلمانوں کو داعی بتلاتے ہیں، اور دعوت و تبلیغ کے الفاظ لکھتے اور بولتے ہیں۔ دوسری طرف عین اسی وقت وہ دوسروں کے خلاف نفرت اور احتجاج کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ حالاں کہ دعوت اور نفرت، اور دعوت اور احتجاج دونوں متضاد باتیں ہیں۔ میں سخت الجھن میں رہتا تھا کہ آخر یہ پڑھے لکھے لوگ اس تضاد کو کیوں نہیں جانتے۔

آج فجر کے وقت اچانک اس سوال کا جواب میرے ذہن میں آیا۔ اصل یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے "داعی" ہونے کو جانا، مگر انھوں نے دوسروں کے "مدعو" ہونے کو دریافت نہیں کیا۔ یہی سادہ سی وجہ ہے جس نے ان تمام لوگوں کو فکری اور عملی تضاد میں مبتلا کر رکھا ہے۔

اپنے داعی ہونے کو جاننا اس وقت تک آدھی بات ہے جب تک اس کے ساتھ دوسرے کے مدعو ہونے کو نہ جانا جائے۔ اس قسم کی ادھوری دریافت کبھی آدمی کے اندر صحیح داعیانہ نفسیات پیدا نہیں کر سکتی۔ ایسے آدمی کے لئے دعوت اظہار فخر ہوگی۔ وہ دوسروں پر برتری حاصل کرنے کے ہم معنی ہوگی۔ مگر جو شخص دوسروں کے مدعو ہونے کو جان لے، اس کا کلام تواضع کا کلام ہوگا۔ وہ دوسروں کا خیر خواہ بن جائے گا۔ حتی کہ وہ مدعو کی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرکے اس کے لئے دعا کرنے لگے گا۔

۳ نومبر ۱۹۸۹

ہمارے دفتر کے پاس سڑک کے دوسری طرف کمیونیٹی سنٹر ہے۔ اس کی چہار دیواری پر دہلی کے کسی میڈیکل سنٹر نے اشتہار کے طور پر لکھ دیا کہ اسقاط بذریعہ مشین:

Abortion by machine.

جلی حرفوں میں لکھا ہوا یہ اشتہار ہمارے دفتر کے عین سامنے تھا۔ اس کو پہلی بار میں نے دیکھا تو مجھے غصہ آیا۔ میں نے چاہا کہ اس کو مٹا دوں۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ اس پر صبر کر لیا جائے اور حالات

کا انتظار کیا جائے۔ ایک سال کے بعد آج میں نے غور کیا تو اشتہار کی عبارت مٹ چکی تھی۔ وہاں کٹے پٹے حروف کے سوا کچھ اور دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"انتظار" کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ اس دنیا میں برائی ایک اجنبی اور نا محمود چیز ہے۔ جب بھی یہاں کوئی برائی پیدا ہوتی ہے تو فطرت کا نظام خود ہی اس کو ختم کرنے کے لئے متحرک ہو جاتا ہے۔ اگر ہم انتظار کر سکیں تو ہم دیکھیں گے کہ فطرت نے زیادہ کامیاب طور پر اس مسئلہ کا خاتمہ کر دیا ہے جس کو ہم صرف ناکام طور پر ختم کرنا چاہتے تھے۔

۴ نومبر ۱۹۸۹

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے کہا: بولنا ایک ذمہ داری ہوتی ہے۔ جو لوگ بولنے کی ذمہ داری کے احساس سے چپ ہو جائیں، وہی لوگ اس قابل ہیں کہ وہ بولیں۔ چلنے کی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے جن کے قدم رک گئے ہوں، وہی لوگ اس قابل ہیں کہ وہ چلیں۔ کرنے کی ذمہ داری کے احساس سے جن پر لرزہ طاری ہوتا ہو وہی اس قابل ہیں کہ ان کو کرنے کا موقع دیا جائے۔

۵ نومبر ۱۹۸۹

سوویت روس نے ۲۷ ستمبر ۱۹۷۹ کو اپنی فوجیں افغانستان میں داخل کر دی تھیں۔ اس کے بعد افغان مجاہدین امریکہ کی مدد سے روسیوں کے خلاف لڑتے رہے۔ آخر کار ۸ فروری ۱۹۸۸ کو روسی صدر گورباچیف نے اعلان کیا کہ روسی فوجیں افغانستان سے واپس چلی جائیں گی۔ ۱۵ مئی ۱۹۸۸ سے یہ انخلا شروع ہوا۔ ۱۵ فروری ۱۹۸۹ کو روس کا آخری فوجی دستہ افغانستان سے چلا گیا۔

اس کے بعد سے افغانی مجاہدین اور افغانی حکومت کے درمیان خوں ریز جنگ جاری ہے۔ مگر مجاہدین اب تک ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت کو ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اب دو تجویزیں سامنے آئی ہے۔ ۳۱ اکتوبر کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے یہ تجویز منظور کی ہے کہ افغان مجاہدین اور ڈاکٹر نجیب مشترکہ گورنمنٹ بنائیں۔ دوسری تجویز کچھ افغانیوں کی ہے کہ سابق حکمراں ظاہر شاہ (مقیم روم) کو واپس بلایا جائے۔ مگر مجاہدین دونوں میں سے کسی تجویز پر راضی نہیں۔

میرے نزدیک زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ افغانی مجاہدین دونوں میں سے کسی ایک تجویز پر راضی ہوجاتے۔ وہ ڈاکٹر نجیب کے ساتھ عارضی گورنمنٹ بناکر مطالبہ کرتے کہ آزادانہ الکشن کرایا جائے۔ ظاہر شاہ کو علامتی حکمراں بناکر آزادانہ انتخاب کا انعقاد کیا جاتا۔ اس کے بعد عوام جن لوگوں کو چنتے وہ حکومت کرتا۔ مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان میں خون خرابہ کے سوا کچھ اور ہونے والا نہیں۔

۶ نومبر ۱۹۸۹

عبدالمتین بنارسی صاحب الرسالہ کے کاتب ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے ایک ہندو سے پوچھا "دسہرہ کیا ہے"۔ اس نے فوراً جواب دیا: جیسے آپ کے یہاں تعزیہ ہے ویسے ہی ہمارے یہاں دسہرہ ہے۔ آپ کے یہاں محمد لیلا ہے، ہمارے یہاں رام لیلا ہے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے کس طرح حق اور باطل کا فرق مٹا دیا ہے۔ محرم کا جلوس۔ میلاد النبی کا جلوس اور اس طرح کے دوسرے مظاہروں نے اسلام اور غیر اسلام کی امتیازی حیثیت کو ختم کر دیا ہے۔ آجکل کچھ مسلم رہنما یہ تقریر کر رہے ہیں کہ موجودہ حکومت مسلمانوں کے ملی تشخص کو مٹا رہی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حکومت کو یہ بدنامی اپنے سر لینے کی ضرورت نہیں۔ مسلمان پہلے ہی اس تشخص کو زیادہ بڑے پیمانے پر اپنے آپ مٹا چکے ہیں۔

۷ نومبر ۱۹۸۹

ڈاکٹر محمد نایف قصد ملاقات کے لئے آئے۔ وہ شام کے باشندے ہیں۔ آجکل وہ سعودی عرب کے ایک مستشفیٰ (اسپتال) میں ڈاکٹر ہیں جو الرأس میں بنایا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سعودی عرب میں سعودی اور غیر سعودی کی تفریق ہر سطح پر جاتی ہے۔ البتہ امریکنوں کو ان کے یہاں بہت اونچا مقام حاصل ہے۔

انھوں نے کہا کہ سعودی عرب میں خلاف اصول اور خلاف شریعت باتیں ہیں۔ مگر کوئی آدمی ان کے خلاف بولنے کی جرأت نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ جو شخص باہر سے وہاں آتا ہے۔ دھیرے دھیرے اس کا احساس مردہ ہوجاتا ہے۔ چنانچہ سعودی عرب میں یہ مثل مشہور ہے: السعودیۃ مقبرۃ لعلماء

المسلمین (سعودی عرب مسلم علماء کا قبرستان ہے)

۸ نومبر ۱۹۸۹

قرآن میں سابق اہل کتاب کا یہ جرم بتایا گیا ہے کہ وہ اہل کفر کے قول کی تقلید کرتے ہیں۔ (یضاهؤن قول الذین کفروا) موجودہ زمانہ کے ہندستانی مسلمان اپوزیشن کی مضاہاۃ کر رہے ہیں۔

ہندستان میں فرقہ وارانہ فساد کا جو مسئلہ ہے، اس میں مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے اپوزیشن پارٹی کی بولیاں بولتے ہیں۔ اپوزیشن لیڈر اپنے سیاسی مفاد کے لئے حکمراں پارٹی کو برا کہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ سارا الزام "ایڈمنسٹریشن" پر ڈال کر حکمراں پارٹی کو ڈسکریڈٹ کرنا چاہتے ہیں۔ یہی بولی مسلمانوں نے ان سے لے لی ہے۔ جب کہیں فساد ہوتا ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اپوزیشن کے دفتروں سے چھپے ہوئے فارم لیتے ہیں اور ان پر اپنا دستخط ثبت کر کے ان کو شائع کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

یہ بلاشبہ عین وہی جرم ہے جس میں سابق اہل کتاب مبتلا ہوئے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس معاملہ میں قرآن وحدیث کو دیکھیں اور قرآن وحدیث کے مطابق مسلمانوں کو رہنمائی دیں۔ اگر وہ اپوزیشن کی بولی بولتے رہے تو ان کا بھی وہی انجام ہوگا جو سابق اہل کتاب کا ہوا۔

۹ نومبر ۱۹۸۹

آج مولانا کوثر نیازی (اسلام آباد، پاکستان) ملاقات کے لئے آئے۔ آجکل وہ پاکستان کی مرکزی اسمبلی کے ممبر ہیں۔ اس سے پہلے امور مذہبی کے وزیر رہ چکے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ سابق صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے اپنے آخری دور میں ایک میٹنگ کی۔ اس میں علماء اور دانشوروں کو بلایا۔ میں بھی اس میں شریک تھا۔

انھوں نے بتایا کہ میری باری آئی تو میں نے ضیاء الحق صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے میرے نزدیک اسلام کی سروس نہیں کی۔ بلکہ آپ نے اس کے حق میں ڈس سروس (Dis-service) کیا ہے۔ اس سے پہلے لوگ یہ امید باندھے ہوئے تھے کہ اسلام آئے گا تو ان کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ آپ نے حکومت پر قبضہ کر کے اعلان کیا کہ اسلام آگیا۔ مگر عوام نے

دیکھا کہ ان کے مسائل اور زیادہ بڑھ گئے۔ قومی اور علاقائی عصبیتیں پہلے سے زیادہ جاگ اٹھیں۔ جہاں پہلے پچاس روپیہ رشوت دینا ہوتا تھا، وہاں اب پانچ سو روپیہ رشوت دینا پڑتا ہے۔ وغیرہ

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب لوگوں کی نظریں اسلام سے ہٹ گئیں۔ اب وہ اپنے مسائل کے لئے دوسری دوسری چیزوں کی طرف دیکھنے لگے ہیں۔

۱۰ نومبر ۱۹۸۹

حکیم عبدالحمید صاحب (ہمدرد دواخانہ) کے بھائی حکیم محمد سعید صاحب کراچی میں رہتے ہیں۔ وہاں انھوں نے بہت بڑا دواخانہ قائم کیا ہے۔ اخبار نو کے اڈیٹر م افضل صاحب نے ان کا انٹرویو لیا۔ انھوں نے حکیم محمد سعید صاحب سے جو سوالات کئے، ان میں سے ایک سوال یہ تھا آپ کے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید صاحب گوشہ نشیں قسم کے انسان ہیں۔ اس کے برعکس آپ عوامی زندگی میں بہت زیادہ متحرک رہتے ہیں۔ آپ دونوں میں اتنا زیادہ فرق کیوں۔

حکیم محمد سعید صاحب نے جواب دیا: عوامی زندگی گزارنے کے محرکات متعدد ہو سکتے ہیں۔ مگر ایک جذبہ بہرحال یہ ہوتا ہے کہ انسان خود کو مقبول عام بنائے اور داد وصول کرے۔ یہ انسانی کمزوری ہے۔ حکیم عبدالحمید صاحب نے اس کمزوری پر قابو پالیا ہے، میں اس کے لئے کوشاں ہوں (اخبار نو، ۱۰ نومبر ۱۹۸۹)

موجودہ پریس کے زمانہ میں یہ بیماری بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ جس شخص کے اندر کچھ امتیازی صلاحیت ہوتی ہے وہ فوراً شہرت کا طالب بن جاتا ہے۔ عوامی مقبولیت حاصل کرنا اور لوگوں سے داد وصول کرنا اس کا سب سے بڑا مذہب بن جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کچھ لوگ اپنی زبان سے بھی اس کا اقرار کر لیتے ہیں اور دوسرے لوگ زبان سے اس کا اقرار نہیں کرتے اگرچہ ان کی روز وشب کی سرگرمیاں خاموش زبان سے ہر وقت پکار رہی ہوتی ہیں کہ ان کی پوری زندگی شہرت اور مقبولیت کے رخ پر چل رہی ہے۔

۱۱ نومبر ۱۹۸۹

ابن جوزی نہایت ذہین اور اعلیٰ پایہ کے عالم تھے۔ امام ذہبی نے ان کی بابت لکھا ہے کہ ایک

بار بغداد میں شیعہ اور سنی کے گروہوں میں یہ بحث ہوئی کہ علی افضل تھے یا ابو بکر افضل تھے۔ سنی گروہ کہتا تھا کہ ابو بکر تمام صحابہ میں افضل ہیں۔ شیعہ گروہ کہتا تھا کہ علی سب میں افضل ہیں۔ آخر کار دونوں گروہوں میں طے ہوا کہ اس معاملہ میں ابن جوزی سے رجوع کیا جائے۔ ابن جوزی کے پاس جب یہ مسئلہ آیا تو انھوں نے دونوں گروہوں کی بات سننے کے بعد ایک مختصر جملہ کہہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ دونوں میں سے افضل وہ ہے جس کی لڑکی ان کے عقد میں تھی (افضلھما من کانت ابنتہ تحتہ) یہ جملہ ایسا ہے جس میں ضمیر کے مرجع کا تعین نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس کو سن کر دونوں گروہ خوش ہوگئے۔ ہر ایک نے اس کو اپنے معنی میں لے لیا۔ سنی گروہ نے سمجھا کہ ابو بکر افضل تھے، کیوں کہ ان کی بیٹی عائشہ رسول اللہ کے عقد میں تھیں۔ شیعہ گروہ نے سمجھا کہ علی افضل تھے، کیوں کہ رسول اللہ کی بیٹی فاطمہ سے ان کا نکاح ہوا تھا۔

جواب کا یہ طریقہ اس وقت مفید ہے جب کہ فتنہ کو دفع کرنا مقصود ہو مگر جب اظہار حق کا موقع ہو تو جواب کا یہ طریقہ درست نہیں۔

۱۲ نومبر ۱۹۸۹

غزوۂ حنین کے بعد حج تھا۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر کو امارت حج کے لئے روانہ کیا۔ اس کے بعد سورۃ التوبہ اتری۔ اس میں حکم تھا کہ حج کے موقع پر اعلان کر دیا جائے کہ اس سال کے بعد کسی مشرک کو کعبہ کا حج کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد کو حضرت علی کو روانہ کیا کہ مکہ جا کر لوگوں کے درمیان اس بات کا اعلان کر دو۔

حضرت علی روانہ ہوئے تو مکہ پہنچنے سے پہلے درمیان راستہ میں حضرت ابو بکر مل گئے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابو بکر نے ملاقات ہوتے ہی فوراً پوچھا: امیر اومامور (تم امیر بنا کر بھیجے گئے ہو یا تمہاری حیثیت مامور کی ہے) حضرت علی نے کہا کہ میں امیر نہیں ہوں بلکہ مامور ہوں (بل مامور) اس کے بعد دونوں مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ (تفسیر ابن کثیر ۲/۳۲۴)

۱۳ نومبر ۱۹۸۹

ٹامس جیفرسن (Thomas Jefferson) امریکہ کا تیسرا صدر تھا۔ وہ ۱۷۴۳ میں پیدا ہوا۔

اور ۱۸۲۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ بہت سی زبانیں جانتا تھا اور ایک بے حد ذی علم آدمی تھا۔ آج ٹائمس آف انڈیا میں اس کا ایک قول نقل کیا گیا ہے کہ تاجر کا کوئی ملک نہیں ہوتا :

The merchant has no country.

جیفرسن نے جو بات تاجر کے بارہ میں کہی، وہی بات داعی کے بارہ میں بھی صحیح ہے۔ داعی ایک عالمی شخصیت ہوتا ہے۔ وہ سارے انسانوں تک اپنا پیغام پہنچانا چاہتا ہے۔ اس لئے ساری دنیا اس کا ملک ہے۔ اس کے وطن کی حد کہیں ختم نہیں ہوتی۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما اگر اس راز کو جانتے تو وہ ہندستان کی تقسیم کا مطالبہ لے کر نہ اٹھتے۔ اور نہ "آزاد مسلم لینڈ" کی وہ تحریکیں اٹھتیں جو آجکل ہر جگہ چلائی جا رہی ہیں۔

۱۴ نومبر ۱۹۸۹

دور آخر کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو پیشین گوئیاں منقول ہیں، ان کا مطلب بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آخری زمانہ میں سارے عالم میں اسلام کی سیاسی حکومت قائم ہو جائے گی۔ مجھے اس تشریح سے اتفاق نہیں ہے۔

میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ دور آخر میں اللہ تعالیٰ ایسے اسباب مہیا فرمائیں گے کہ اسلام کی آواز ساری دنیا میں پھیل جائے گی۔ حتی کہ اسلام کو ایک خاص قسم کا فکری غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ جیسے قدیم زمانہ میں شرک کے مقابلہ میں توحید کو عمومی فکری غلبہ حاصل ہوا۔ اگرچہ ساری دنیا میں اسلام کی سیاسی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔

مسند احمد میں تمیم داری سے یہ روایت آئی ہے کہ یہ دین وہاں تک پہنچ جائے گا جہاں تک رات اور دن پہنچتے ہیں۔ اللہ کسی مٹی یا بال کے گھر کو نہیں چھوڑے گا جس میں یہ دین داخل نہ ہو جائے۔ وہ عزت والے کو عزت دے گا اور ذلت والے کو ذلیل کرے گا۔ (لیبلغن ھٰذا الامر ما بلغ اللیل والنہار ولا یترک اللہ بیت مدر ولا وبر الا ادخلہ ھٰذا الدین

۱۵ نومبر ۱۹۸۹

ہماری زمین کا تین چوتھائی حصہ پانی کے نیچے ہے۔ اس کا پانچواں حصہ برف سے ڈھکا ہوا ہے۔ یہ پانی انتہائی حیرت انگیز چیز ہے۔ جب کوئی عالم فلکیات اپنی دوربین قریبی سیاروں پر

مرتکز کرتا ہے تو وہ سب سے پہلے یہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا وہاں پانی اور آکسیجن موجود ہے۔ مگر ابھی تک زمین کے سوا کہیں پانی کی دریافت نہ ہو سکی۔

پانی کے بے شمار خواص ہیں۔ مثلاً سمندر گرم موسم میں فضا سے گرمی جذب کر لیتے ہیں۔ اور سرد موسم میں اس کو خارج کر کے فضا کو گرم کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سمندر کے کنارے کے مقامات کا موسم سال بھر تقریباً یکساں رہتا ہے۔ یہ سمندر پوری آباد دنیا میں موسموں میں توازن قائم رکھنے کا کام کرتے ہیں۔

۱۶ نومبر ۱۹۸۹

پاکستانی تحریک کے رہنماؤں نے پہلے 'اینٹی ہندو تحریک' چلا کر زمین کا ایک ٹکڑا حاصل کیا۔ اس کے بعد یہ کہنا شروع کیا کہ اسلامی پاکستان کی تعمیر کے لئے اہل پاکستان با کردار بن جائیں۔ اسی طرح اسلام پسند رہنما مصر اور پاکستان وغیرہ میں یہی بولی بول رہے ہیں۔ پہلے وہ "ظالم حکمراں" کے خلاف لوگوں کو ابھاریں گے۔ اس کے بعد اپیل کریں گے کہ آپ لوگ اپنے اندر کردار کی طاقت پیدا کریں تاکہ آپ مطلوبہ نظام قائم کر سکیں۔

یہ بات احمقانہ حد تک غلط ہے۔ کردار ذاتی محرک سے بنتا ہے نہ کہ نظامی محرک سے۔ کوئی آدمی دوسرے کے لئے نہیں کماتا۔ اسی طرح کوئی آدمی بیرونی محرک کے لئے باکردار بھی نہیں بنتا۔ جو لوگ "نظام" کے نام پر افراد سے باکردار بننے کی اپیل کرتے ہیں وہ اپنی سطحیت کا ثبوت دیتے ہیں اور دوسروں کے بارہ میں کمتر اندازہ کا۔

۱۷ نومبر ۱۹۸۹

بھاگلپور (بہار) میں ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۹ کو فساد شروع ہوا۔ اس فساد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد یہ سب سے زیادہ بھیانک فساد تھا۔ مگر مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے صرف بعد کو ہونے والے نقصان کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ اس کے آغاز کی کہانی کوئی بیان نہیں کرتا۔

۲۴ اکتوبر کو بھاگلپور میں رام شیلا کا جلوس نکلا۔ اس میں چند ہزار ہندو تھے جن میں اکثریت عورتوں کی تھی۔ سات ٹرکوں پر اینٹیں اور عورتیں تھیں۔ مرد پیچھے چل رہے تھے۔ یہ جلوس

وشوہندو پریشد کی طرف سے نکالا گیا تھا اور مہادیو پرشاد اس کی قیادت کر رہا تھا۔ جلوس والے اس قسم کا نعرہ لگا رہے تھے: جئے ماں کالی، تاتارپور کرو خالی۔

جلوس جب مسلم محلہ میں پہنچا تو مسلم نوجوان سڑک پر جمع ہو گئے۔ انھوں نے جلوس کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ جلوس والے اس کو اپنی فتح سمجھ رہے تھے کہ وہ مسلم علاقہ (چھترپور) سے گزر جائیں۔ اور مسلمان اپنی فتح اس میں سمجھ رہے تھے کہ وہ جلوس کو آگے بڑھنے نہ دیں۔ تناؤ بڑھا یہاں تک کہ وہاں کے "مسلم اسکول سے جلوس پر بموں کی بارش کی گئی اور دھماکے پر دھماکے ہونے لگے"۔ چھترپور کے مسلم نوجوان سڑک پر جمع ہو کر جوابی نعرے لگانے لگے۔ پولیس نے روکنا چاہا تو انھوں نے مزید بم پھینکنا اور پتھراؤ کرنا شروع کر دیا (نئی دنیا، ۷ا نومبر ۱۹۸۹)

اس کے بعد پورے شہر میں افواہیں پھیلنا شروع ہو گئیں۔ اس طرح مسلمانوں نے ہندوؤں اور پولیس دونوں کو اپنا دشمن بنا لیا۔ اس کے بعد دونوں نے مل کر اتنی تباہی مچائی کہ اس کے تصور سے لرزہ طاری ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد اشتیاق قریشی جو مولانا علی میاں کے خاص ساتھیوں میں سے ہیں۔ انھوں نے "بھاگل پور میں قتل و خوں ریزی نے ۱۹۴۷ کی یاد تازہ کر دی" کے عنوان کے تحت اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ "یہ سزا کیوں دی گئی، کیا محض چند پتھروں کے پھینکنے سے"۔ یہی انداز تمام مسلمانوں کا ہے۔ وہ مسلمانوں کے قصور کو چھپا کر یک طرفہ طور پر ہندوؤں کو اور حکومت کو برا کہتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ طریقہ اسلام تو کیا ہوگا، وہ کفر بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ اسلام خوف خدا پر کھڑا ہوتا ہے اور کفر خوف انسان پر اور اس روش کا دونوں میں کسی سے بھی تعلق نہیں۔

۱۸ نومبر ۱۹۸۹

موجودہ زمانہ میں جن لیڈروں یا پارٹیوں کو کسی ملک میں سیاسی ووٹ ملے ہیں۔ وہ زیادہ تر منفی ووٹ (Negative vote) تھے نہ کہ مثبت ووٹ۔ مثلاً ۱۹۷۷ میں جنتا پارٹی کو ہندستانی ووٹروں کی غیر معمولی حمایت حاصل ہوئی۔ یہ صرف اس لئے تھا کہ ایمرجنسی کے نفاذ کی وجہ سے لوگ اندرا گاندھی سے بہت زیادہ ناراض تھے۔

یہی حال مسلم ملکوں کا ہے۔ مثلاً آیت اللہ خمینی کو ایران میں جو عوامی حمایت ملی وہ شاہ رضا

کے خلاف غصہ کی بنا پر تھی۔ اسی طرح مصر یا پاکستان میں جن مسلم رہنماؤں کو مقبولیت حاصل ہوئی وہ زیادہ تر اس لئے تھی کہ انھوں نے اپنے ملک کے "ظالم" حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ وغیرہ

۱۹ نومبر ۱۹۸۹

تبلیغی جماعت کے کچھ لوگ ملاقات کے لئے آئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ گمراہ مسلمانوں کی اصلاح کے لئے آپ اپنے دل میں جو ہمدردی اور خیر خواہی پاتے ہیں کیا وہی ہمدردی اور خیر خواہی آپ گمراہ ہندوؤں کی ہدایت کے لئے بھی اپنے سینہ میں پاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ پھر آپ قرآن کے معنی میں تبلیغی نہیں ہیں۔ اپنے ہم قوموں کی اصلاح کے لئے خیر خواہ بننے سے آپ داعی یا مبلغ نہیں ہو جاتے۔ داعی اور مبلغ حقیقۃً وہ شخص ہے جس کا داعیانہ احساس اتنا بڑھے کہ اس کے سینہ میں غیر قوموں کے لئے ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ موج زن ہو جائے۔

۲۰ نومبر ۱۹۸۹

الشیخ عبد المجید الزندانی (۵۰ سال) مشہور عرب علما میں سے ہیں۔ آجکل وہ مکہ میں مقیم ہیں اور "سائنس اور قرآن" کے موضوع پر کام کر رہے ہیں۔ ان کے معاون احمد الصاوی (مصری) آج ملاقات کے لئے آئے۔

انھوں نے بتایا کہ شیخ زندانی افغانی جہاد کے بارہ میں بے حد پرامید ہیں۔ وہ کئی بار افغانستان جا چکے ہیں۔ افغانی جہاد کے بارہ میں شیخ زندانی یہ کہتے ہیں کہ افغانی مجاہدین نے مسلمانوں کے سر کو ایک بار اور اونچا کر دیا ہے۔ یہ اسلام کی تاریخ اور اس کی عظمت کو از سر نو دنیا میں برپا کرنے کی کوشش ہے (عن الجہاد الافغانی یقول الشیخ الزندانی: لقد رفع المجاهدون الافغان رؤس المسلمین مرة اخری بعد ان نکست. انما محاولة لاعادة تاریخ ومجد الاسلام من جدید)

میں اس رائے کو سراسر خوش فہمی سمجھتا ہوں۔ بالفرض روس مکمل طور پر افغانستان سے بے تعلق ہو جائے اور بالفرض ڈاکٹر نجیب کی حکومت ختم ہو جائے۔ اور بالفرض یہ ناقابل قیاس واقعہ بھی ظہور میں آجائے کہ افغانستان میں مجاہدین کی متحدہ حکومت قائم ہو جائے تب بھی اسلام کی تاریخ عظمت کو

دہرانے سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اسلام کی تاریخ عظمت کے اعادہ کے لئے دنیا میں اسلام کا فکری غلبہ لانا ضروری ہے۔

۲۱ نومبر ۱۹۸۹

ٹائمس آف انڈیا (۲۰ نومبر ۱۹۸۹) میں فرانس میں مسلمان (Muslims in France) کے عنوان سے ایک رپورٹ چھپی ہے۔ یہ رپورٹ اخبار مذکور کے نامہ نگار مقیم پیرس ویجو نروانی (Vaiju Naravane) نے تیار کی ہے۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ فرانس میں تقریباً تین ملین مسلمان ہیں۔ یہ زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو مسلم ملکوں سے آکر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ مختلف تفصیلات دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ مہاجرین کی یہ آبادی فرانس میں ووٹ دینے کا حق نہیں رکھتی:

The immigrant population in France does not have the right to vote.

مسلمانوں اور دوسرے مہاجرین کے اپنی تہذیبی شناخت (identity) کے بارہ میں مطالبات کی وجہ سے بہت سے فرانسیسی یہ کہنے لگے ہیں کہ ان مہاجرین سے چھٹکارا حاصل کرو اور فرانس کو دوبارہ فرانسیسی کے حوالے کردو:

Get rid of the immigrants and give France back to the French.

مسلمان بیرونی ملکوں میں جہاں بھی جاکر آباد ہوئے ہیں۔ وہ "سکنڈ کلاس سٹیزن" بن کر رہتے ہیں۔ وہ وہاں کے حالات سے ایڈجسٹمنٹ کئے ہوئے ہیں۔ مگر یہی مسلمان اپنے ملک (مثلاً ہندستان) میں چاہتے ہیں کہ وہ کسی ایڈجسٹمنٹ کے بغیر رہیں۔ یہی وہ تضاد ہے جس نے ہندستان جیسے ملکوں میں مسلمانوں کو برباد کر رکھا ہے۔

۲۲ نومبر ۱۹۸۹

فقہ میں بے شمار ایسے مسائل بن گئے ہیں جن کا قرآن و حدیث میں کوئی ذکر نہ تھا۔ اس نے دین کی وسعت کو غیر ضروری طور پر تنگی میں تبدیل کر دیا ہے۔

مثال کے طور پر فقہ حنفی کی مشہور کتاب 'فتاویٰ عالمگیری' میں یہ مسئلہ درج ہے کہ غیر مسلم کے ہاتھ کا، یا اس کے برتن) کا کھانا درست نہیں۔ اگر کوئی مسلمان ناموافق حالات میں گھر جانے کی بنا پر ایک دو مرتبہ کھالے تو کوئی ہرج نہیں، مگر اس پر مداومت کرنا مکروہ ہے (ان ابتلی به المسلم مرة او مرتين فلا بأس واما الدوام عليه فيكره، كتاب الكراهية)

بخاری میں ایک کتاب (باب قبول الهدية من المشركين) کے تحت یہ حدیث موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غیر مسلم عورت کی زہر آلود بکری کا کھانا قبول کیا اور اس میں سے کھایا۔ اس لئے یہ فقہاء یہ نہیں کرسکتے تھے کہ اس کو بالکل حرام قرار دیدیں۔ البتہ انھوں نے اس کو مکروہ بتادیا اور کہہ دیا کہ اگر ایسا ایک دو بار ہو تو جائز ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کافر کے ساتھ کھانا کھایا۔ ہم نے مسئلہ کو اسی پر محمول کیا ہے۔ مگر اس پر مداومت کرنا مکروہ ہے (ان كان ذالك مرة او مرتين يجوز لان النبى صلى الله عليه وسلم اكل مع كافرة فحملناه على ذالك ولكن يكره المداومة عليه، (نفع المفتی والسائل)

یہ مسئلہ سراسر بے بنیاد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں صرف ایک بار حج ادا کیا پھر کیا بار بار حج ادا کرنا مکروہ ہو جائے گا۔ اصل یہ ہے کہ بعد کے دور میں امت کے اندر دعوت کا ذہن ختم ہوگیا، اسی نے اس قسم کے لغو مسائل پیدا کر دئے۔

۲۳ نومبر ۱۹۸۹

بنجمن فرینکلن (Benjamin Franklin) ایک متنوع شخصیت کا آدمی تھا۔ وہ امریکہ میں ۱۷۰۶ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۷۹۰ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا قول ہے کہ ایک سڑا ہوا سیب اپنے ساتھ کے سیبوں کو بھی خراب کر دیتا ہے:

The rotten apple spoils his companions.

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال کچھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ آج وہ ایک بگڑی ہوئی قوم ہیں۔ چنانچہ جب غیر قوم کا کوئی آدمی اسلام قبول کر کے ان کی جماعت میں داخل ہوتا ہے تو وہ بھی دھیرے دھیرے ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ تاہم اگر ایسا ہو کہ نو مسلم بہت بڑی تعداد میں مسلمانوں کے اندر داخل ہوں تو برعکس نتیجہ ظاہر ہوگا۔ اب مسلمان نو مسلموں کے اثر سے دوبارہ ایک زندہ قوم

بن جائیں گے۔

۲۴ نومبر ۱۹۸۹

ٹائمس آف انڈیا کے نامہ نگار مقیم پیرس ویجو زوانی کی ایک رپورٹ ٹائمس آف انڈیا کے شمارہ ۲۴ نومبر میں شائع ہوئی ہے۔ وہ لکھتے کہ ہندستان اگرچہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت (world's largest democracy) ہے۔ مگر ہندستان کا الکشن (۲۲ نومبر) فرنچ میڈیا میں کوئی جگہ نہ پا سکا۔ ٹیلی وژن، ریڈیو، اخبارات اس کے بارہ میں بالکل خاموش رہے۔

فرانس کی ایک خاتون وائلٹ گراف (Violette Graff) ہندستان کی مذہبی اقلیتوں کی ماہر سمجھی جاتی ہے۔ مذکورہ نامہ نگار نے ان سے انٹرویو لیا۔ گفت گو کے دوران ہندستان کے مسلمانوں کا ذکر آیا۔ انٹرویور نے کہا کہ کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ کا اصل سبب یہ ہے کہ انڈیا میں کوئی 'مسلم لیڈرشپ' نہیں۔

خاتون نے جواب دیا کہ بات یہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ انڈیا میں کسی مسلم لیڈرشپ کا ابھرنا سخت مشکل ہوگیا ہے۔ مسلمانوں میں کوئی واحد سیاسی لیڈر ابھرے تو اس کو Separatist کہا جائے گا اور اس کو نیا جناح (New Jinnah) کا لقب دے دیا جائے گا۔ اور اگر مسلمانوں کا ایسا لیڈر ہو جو گورنمنٹ سے قریب ہو تو کہا جائے گا کہ یہ تو شومین (Showman) ہے۔

یہ بات نہایت صحیح ہے۔ موجودہ ہندستان میں اگر کوئی "مسلمان" "جناح" کے انداز میں بولے تو وہ حکومت کی نظر میں مشتبہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ "سرسید" کے انداز میں کام کرنا چاہے تو مسلمان اس کو مشتبہ سمجھ لیتے ہیں۔ یہ سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر منقسم ہندستان میں مسلمانوں کی کوئی طاقت ور لیڈرشپ ابھر نہ سکی۔

موجودہ ہندستان میں "جناح" جیسی لیڈرشپ کا ابھرنا عملاً ممکن ہے مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ "سرسید" جیسی مسلم لیڈرشپ یقیناً مسلمانوں کے لئے مفید ہو سکتی ہے مگر موجودہ مسلمانوں میں ایسے کسی لیڈر کا ابھرنا ممکن نہیں۔

۲۵ نومبر ۱۹۸۹

پاکستان کے مولانا کوثر نیازی ہندستان آئے تھے۔ وہ بمبئی بھی گئے۔ وہاں بلٹز (اردو)

کے نمائندہ ہارون رشید نے ان کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو بلٹز (اردو) کے شمارہ ۲۵ نومبر ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا ہے۔

انٹرویو ور نے ایک سوال یہ کیا کہ "آپ کی حکومت ڈھائی لاکھ بہاریوں کو بنگلہ دیش کے کیمپوں میں کیوں سڑا رہی ہے۔ مولانا کوثر نیازی نے جواب دیا کہ بے شک وہ لوگ پاکستانی ہیں۔ ان کو واپس بلانے کے لئے پاکستان کے پاس رقم کی کمی بھی نہیں۔ تاہم بعض اسباب رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ایک سبب یہ بتایا کہ سندھیوں کو یہ خطرہ ہے کہ یہ بہاری اگر کراچی آ کر آباد ہو گئے تو آبادی کا توازن بگڑ جائے گا، اس لئے وہ شور مچاتے ہیں۔

پاکستان بننے سے پہلے ہندو اور مسلمان کے درمیان اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ تھا۔ اس سے بچنے کے لئے پاکستان بنایا گیا۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو معلوم ہوا کہ دوبارہ یہی مسئلہ مہاجر مسلمان اور سندھی مسلمان کی صورت میں موجود ہے۔ بلکہ زیادہ شدید طور پر۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کسی مسئلہ کا حل نہیں تھا۔ البتہ اس نے مسائل میں اضافہ کر دیا۔

۲۶ نومبر ۱۹۸۹

لارنس اسٹرن (Laurence Sterne) ۱۷۱۳ میں انگلینڈ میں پیدا ہوا۔ ۱۷۶۸ میں وفات پائی۔ ۱۷۵۹ میں اس نے ایک (Satire) لکھا۔ اس کا نام ایک سیاسی رومان (A Political Romance) تھا۔ اس کو چرچ کے لوگوں نے جلا دیا۔ اس کے بعد اس نے ایک کہانی لکھی جس کا نام Tristram Shandy تھا۔ اس کو لندن کے پرنٹر (رابرٹ ڈاڈسلے) نے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ مگر یہی شخص بعد کو انگریزی کا مشہور ناول نگار بنا۔ حتیٰ کہ خود اس کی زندگی اور کارناموں پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں۔

آدمی کے اندر اگر صلاحیت ہو اور وہ محنت کرے تو یقیناً وہ کامیاب ہو کر رہتا ہے خواہ ابتدائی طور پر ساری دنیا نے اس کو رد کر دیا ہو۔

۲۷ نومبر ۱۹۸۹

جی ڈی گادرے (واردھا ۱۹۲۰) ملاقات کے لئے آئے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ان کا تعلق آر ایس ایس سے ہو گیا تھا۔ اب وہ صوفی ازم سے متاثر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۲۵

میں وہ امراوتی کے ایک اسکول میں پڑھتے تھے اور آر ایس ایس کی شاکھا میں شامل تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۵ سال تھی۔

ایک روز جب کہ شاکھا کے طلبہ جمع تھے، ڈاکٹر ہیڈگواڑ (بانی آر ایس ایس) وہاں آئے۔ انھوں نے طلبہ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا مقصد کیرکٹر بلڈنگ ہے۔ ہم پالی ٹکس سے دور رہ کر اچھے آدمی بنانا چاہتے ہیں۔

پھر ڈاکٹر ہیڈگواڑ نے کہا کہ مانو ایک مسلمان لڑکی سڑک پر تانگہ میں بیٹھی ہوئی جارہی ہے۔ کچھ ہندو لڑکے اس کو چھیڑتے ہیں۔ اس وقت تمہارا فرض کیا ہوگا۔ طلبہ چپ رہے۔ ڈاکٹر ہیڈگواڑ نے خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا کہ شاکھا میں تم جو ڈنڈے چلانا سیکھ رہے ہو، اس وقت تم یہ ڈنڈا ان ہندوؤں پر چلاؤ اور اس مسلم لڑکی کو بچاؤ۔

یہ واقعہ سن کر میں نے کہا: پہلے زمانہ میں ایک فرقہ پرست کے اندر بھی کچھ اخلاق ہوتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں قوم پرودوں کے اندر بھی کوئی اخلاق موجود نہیں۔

۲۸ نومبر ۱۹۸۹

اسلام کی ابتدائی تین صدیوں تک تصوف اور صوفیاء کا کوئی وجود نہ تھا۔ ظہور اسلام کے تین سو سال بعد بصرہ میں حسن بصری کے شاگردوں میں اس کا ظہور ہوا۔ مثلاً عبد الواحد بن زید وغیرہ۔ مسیحی رہبانوں کے زیر اثر یہ لوگ صوف (اون) کے کپڑے کو افضل سمجھتے تھے۔ کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت مسیح اون کے کپڑے پہنا کرتے تھے۔ اسی بنا پر یہ لوگ صوفی کے نام سے مشہور ہوئے۔

صوفیاء کا کہنا تھا کہ عبادت کی بنیاد محبت ہے۔ وہ خوف خدا کو کمتر چیز سمجھ کر نظر انداز کرتے تھے۔ ایک صوفی کا قول ہے کہ میں اللہ کی عبادت اس کی جنت کی طمع میں یا اس کی جہنم کے ڈر سے نہیں کرتا (انا لا أعبُد اللّٰہ طمعاً في جَنّتہ ولا خوفاً من نارہ)

یہ ایک لغو بات ہے۔ قرآن میں پیغمبروں کے بارہ میں ہے کہ وہ اللہ کو خوف اور طمع کے جذبہ سے پکارتے تھے (یَدْعُونَ رَبَّھُمْ خوفاً وَّطَمَعاً) اس کے علاوہ یہ بات عقل عام کے خلاف ہے۔ ایک شخص شیر کو قریب سے دیکھ رہا ہو تو اس کا رنگ اور اس کی ساخت اس کو اچھی

لگ سکتی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اس کو شیر کا ڈر بھی لگا رہے گا۔ اسی طرح اللہ کے احسانات کی بنا پر بندہ کے دل میں اس کے بارہ میں شکر اور محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ خدا کا قادر مطلق اور محاسب و مجازی ہونا آدمی کو اندیشہ ناک بھی بنا تا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بندہ اور خدا کے تعلق میں محبت کا دخل بھی اتنا ہی ہے جتنا خوف کا، خوف کا دخل بھی اتنا ہی ہے جتنا محبت کا۔ یہاں ان دونوں جذبات کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

۲۹ نومبر ۱۹۸۹

امام عبد الرحمٰن ابن جوزی غالباً ۵۰۸ھ (۱۱۱۶ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰۱ء میں وفات پائی۔ وہ اسلامی تاریخ کے بڑے علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ تحصیل علم کا انھیں بے حد شوق تھا۔ لکھتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں دوسرے ہم سبق لڑکے دجلہ کے کنارے کھیلنے چلے جاتے تھے۔ اور میں کسی کتاب کو لے کر اس کے مطالعہ میں مشغول رہتا تھا۔ ان کا یہی حال زندگی بھر رہا۔ اپنی بابت لکھتے ہیں کہ میری طبیعت کتابوں کے مطالعہ سے کبھی سیر نہیں ہوتی تھی۔ جب کسی نئی کتاب پر میری نظر پڑ جاتی تو ایسا معلوم ہوتا گویا میں نے کوئی خزانہ پالیا ہے (کانی وقعت علی کنز)

مطالعہ کا یہی شوق آدمی کو عالم بناتا ہے۔ ابن جوزی نے بہت سی نہایت قیمتی کتابیں لکھی ہیں۔ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ میں نے شمار کیا تو ان کی کتابوں کی تعداد ایک ہزار پائی۔

۳۰ نومبر ۱۹۸۹

آج انسان کی کمزوریوں کو سوچ کر آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے کہا : خدایا، مجھ کو ان لوگوں میں لکھ لیجئے جنھوں نے عاجز بنا دئے جانے سے پہلے اپنے عجز کا اقرار کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ عجز ہی تمام اعمال کا خلاصہ ہے۔ آدمی جب سچائی کا اعتراف کرتا ہے تو حقیقۃً وہ اپنے عجز کا اعتراف کرتا ہے۔ آدمی جب سجدہ میں اپنا سر رکھتا ہے تو وہ خدا کے مقابلہ میں اپنے عجز کامل کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح تمام دینی اعمال کی اصل روح عجز کا احساس ہے وہی عمل سچا عمل ہے جس کے اندر عجز کی روح پائی جائے۔ جو عمل عجز سے خالی ہو، اس عمل کی کوئی حقیقت نہیں۔

اسلام کی اصل روح عجز و تواضع ہے نہ کہ فخر و ناز۔

یکم دسمبر ۱۹۸۹

ایک صاحب سے گفت گو کرتے ہوئے میں نے کہا : دعوت فخر کا اظہار نہیں، دعوت تواضع کا اظہار ہے۔ اس کا پیغام روشنائی سے تحریر نہیں کیا جاتا بلکہ آنسوؤں سے لکھا جاتا ہے۔ دعوت وہ پیغام ہے جو نفرت کی زبان میں نہیں دیا جاتا، بلکہ محبت کی زبان میں دیا جاتا ہے۔ وہ نعروں کے ذریعہ نہیں بلکہ دعاؤں کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ دعوت ایک ربانی عمل ہے نہ کہ کسی قسم کا قومی عمل۔

۲ دسمبر ۱۹۸۹

جب میں پیدا ہوا تو روس میں اشتراکی انقلاب (۱۹۱۷) پر تقریباً آٹھ سال گزر چکے تھے۔ اس کے بعد اشتراکی روس کے بارہ میں جو کچھ پڑھا، اس سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ روس میں مذہب کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ روس میں مذہبی آزادی نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دعوت دین کا کام اب صرف "آزاد دنیا" میں ہو سکے گا۔ کیونسٹ دنیا میں دعوت دین کے کام کی کوئی صورت نہیں۔

مگر اللہ تعالیٰ کے قانون دفع (البقرہ ۲۵۱) نے کام کیا۔ اشتراکی انقلاب کے ۷۰ سال بعد حالات بدلنا شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ اکتوبر ۱۹۸۹ میں لوگوں نے دیکھا کہ برلن وال ٹوٹ رہی ہے۔ اب یکم دسمبر ۱۹۸۹ کو ٹیلیویژن دیکھنے والوں نے ساری دنیا میں یہ منظر دیکھا کہ سوویت یونین کا وزیر اعظم گورباچوف خود ویٹیکن جاتا ہے اور وہاں پوپ سے ہاتھ ملا کر یہ اعلان کرتا ہے کہ روس میں مکمل مذہبی آزادی بحال کر دی جائے گی اور ویٹیکن اور ماسکو کے درمیان سفارتی تعلقات قائم کیے جائیں گے۔

اس تبدیلی نے روس میں دوبارہ مذہبی کام کے دروازے کھول دیے ہیں۔ مگر مجھے شبہ ہے کہ اس کا فائدہ صرف عیسائی طبقہ کو ملے گا۔ مسلمان اس کے فائدے حاصل کرنے سے محروم رہیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائی لوگ معاملات کی حد کو جانتے ہیں۔ مگر مسلمان حد کو نہیں جانتے۔

ہر آزادی محدود آزادی ہے۔ روس میں مذہب کی آزادی بھی محدود آزادی رہے

گی۔ مگر موجودہ زمانہ میں "مکمل اسلام" کے علم برداروں نے جو ذہن بنایا ہے، وہ اس حقیقت کو سمجھنے میں مانع بن جاتا ہے۔ اور ملے ہوئے مواقع کو استعمال کرنے سے محروم رہتا ہے۔

۳ دسمبر ۱۹۸۹

حیدر آباد کے روزنامہ سیاست (یکم اکتوبر ۱۹۸۹) میں جناب انصر بیگ صاحب کا مضمون چھپا تھا جس کا عنوان تھا: "ہندستان اقلیتوں کا ملک" اس مضمون میں مسلمانوں کے بارہ میں یہ درج تھا کہ "مسلمانوں نے انگریزوں کی آمد سے پہلے سات سو سال تک ہندستان پر حکومت کی تھی"۔ اس کے جواب میں شری کاشی ناتھ ایم اے، ایل ایل بی کا مضمون قومی آواز (۲ دسمبر ۱۹۸۹) میں شائع ہوا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ یہی ذہن فساد کی جڑ ہے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ ہم نے اس ملک میں سات سو سال (یا ایک ہزار سال) تک حکومت کی ہے۔ دوسری طرف ہندو کہتے ہیں کہ ہم ایک ہزار سال کی محکومی کے بعد آزاد ہوئے ہیں۔ اس طرح دونوں فرقوں کے درمیان تناؤ پیدا ہوتا ہے اور دنگے وجود میں آتے ہیں۔

مجھے شری کاشی ناتھ کی اس بات سے اتفاق ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں نے مسلمانوں کو دوبارہ جگانے کے لئے ان کا ماضی کا دور حکومت یاد دلایا۔ اس کی وجہ سے پوری مسلم قوم میں حاکمانہ نفسیات پیدا ہو گئی۔ کسی نے کہا کہ ہم نے اس ملک میں سات سو سال تک حکومت کی ہے۔ کسی نے کہا کہ ہم نے اس ملک میں ہزار سال تک حکومت کی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہندوؤں میں ردعمل پیدا ہوا۔ ۱۹۴۷ کے بعد وہ سوچنے لگے کہ یہ مسلمان ماضی میں بھی ہمارے اوپر حکومت کرتے رہے اور اب ملک کا بٹوارہ کرنے کے بعد بھی وہ ہم کو حاکم اور محکوم کی نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے دونوں کے درمیان تعلقات غیر معتدل ہو کر رہ گئے۔ ہندستان میں فرقہ وارانہ ظلم کے جو واقعات ہو رہے ہیں وہ سب اسی کا شاخسانہ ہیں۔

۴ دسمبر ۱۹۸۹

کمیونسٹ دنیا اور سرمایہ دار دنیا میں تقریباً ۷۰ سال سے رقابت قائم تھی۔ دونوں بلاک اپنی قومی دولت کا بہترین حصہ ہتھیار بنانے پر خرچ کر رہے تھے جس کو بوقت جنگ استعمال کر سکیں۔ مگر پچھلے ایک سال کے اندر صورت حال مکمل طور پر بدل گئی۔ اب دونوں بلاکوں میں جنگ

کے بجائے مفاہمت کی باتیں کی جارہی ہیں۔ حتی کہ دونوں اس پر گفت گو کر رہے ہیں کہ اپنے خوفناک ہتھیاروں کو ختم کر دیں۔

ٹائمس آف انڈیا (۴ دسمبر ۱۹۸۹) میں اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے مسٹر مدھو لمے نے بجا طور پر کہا ہے کہ جنگ اب عالمی طاقت یا سماجی تبدیلی کے ذریعہ کی حیثیت سے ناممکن چیز بن چکی ہے۔ ایک جوہری جنگ انسانیت کی بربادی کے ہم معنی ہوگی۔ اس کے بعد کوئی بھی شخص زندہ نہیں رہے گا جو اپنی فتح کی تقریب منا سکے:

War as an instrument of world power or social change is now an impossibility. A nuclear war would spell the ruin of mankind. Nobody would remain alive to clebrate the victory. (p. 7)

یہ ان لوگوں کا حال ہے جن کے پاس فوجی طاقت ہے۔ وہ جنگ کے بجائے امن کی باتیں کر رہے ہیں۔ دوسری طرف مسلم رہنما جن کے پاس کوئی طاقت نہیں، وہ مسلمانوں کے جلسوں میں "مسلح انقلاب" پر تقریریں کر رہے ہیں۔ اس قسم کی عسکری تقریروں کا تعلق اسلام سے تو کیا ہوگا، ان کا عقل سے بھی کوئی تعلق نہیں۔

۵ دسمبر ۱۹۸۹

دیوبند کے دو عالم ملاقات کے لئے آئے۔ ان سے گفت گو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آجکل جگہ جگہ "تحفظ نبوت کانفرنس" ہو رہا ہے۔ میں اس قسم کی کانفرنسوں کو بالکل بے معنی سمجھتا ہوں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے "تحفظ آفتاب کانفرنس" منعقد کی جائے۔ سورج براہ راست خدا کی طاقت سے قائم ہے، اس کے لئے تحفظ کانفرس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی طرح نبوت کی حفاظت بھی خدا نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ اس کے لئے بھی یہ ضرورت نہیں کہ تحفظ کانفرنس منعقد کی جائے۔

مسلمانوں کی اصل ذمہ داری پیغام نبوت کی پیغام رسانی ہے۔ یعنی پیغمبر نے اپنے بعد جو دین چھوڑا ہے اس کو دنیا کی تمام قوموں تک پہنچانا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان دعوت نبوت کا کام نہیں کرتے، البتہ وہ تحفظ نبوت کی کانفرنسیں کر رہے ہیں۔ اس قسم کا فعل مسلمانوں کی اصل

مسئولیت کا کسی بھی درجہ میں بدل نہیں۔

۶ دسمبر ۱۹۸۹

ہندستانی لوک سبھا (پارلیمنٹ) میں کل ۵۲۹ سیٹیں ہیں۔ ان میں سے ۵۲۵ سیٹوں کے لئے ۲۲ نومبر ۱۹۸۹ کو الکشن ہوا۔ چار بڑی پارٹیوں کے کامیاب ممبروں کی تعداد یہ ہے:

کانگرس (آئی)	۱۹۳
جنتا دل	۱۴۱
بھارتیہ جنتا پارٹی	۸۸
مارکسی کیونسٹ پارٹی	۳۲

جنتا دل نے بی جے پی اور کیونسٹ پارٹی کو ساتھ لے کر مرکزی وزارت بنائی ہے۔ دہلی کے امام عبد اللہ بخاری نے مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ جنتا دل کو ووٹ دیں۔ فسادات کی وجہ سے چوں کہ مسلمان حکمراں پارٹی کانگرس سے سخت ناراض تھے، اس لئے انھوں نے بہار اور یوپی میں بڑی تعداد میں جنتا دل کو ووٹ دیا۔ قومی آواز (۶ دسمبر ۱۹۸۹) کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے:

'نئے وزیر اعظم وی پی سنگھ اپنے وزیروں کا انتخاب کرتے وقت امام عبد اللہ بخاری سے کئے ہوئے اپنے وعدے بھول گئے جو انھوں نے الکشن سے پہلے امام عبد اللہ بخاری سے کئے تھے۔ امام بخاری کی خواہش تھی کہ مسٹر عارف محمد خاں اور مسٹر ارن نہرو کو کیبنٹ میں شامل نہ کیا جائے۔ کیوں کہ عارف محمد خاں نے مسلم پرسنل لا کی مخالفت کی تھی اور مسٹر ارن نہرو نے یکم فروری ۱۹۸۶ کو بابری مسجد کا تالا کھلوا کر اس کا جھگڑا بڑھایا تھا۔ مگر وی پی سنگھ نے ان دونوں صاحبان کو اپنی کیبنٹ میں شامل کر لیا۔'

جو لوگ سیاسی پارٹیوں سے الکشنی وعدے لیں اور الکشنی وعدوں کا اعتبار کریں، ان سے زیادہ نادان اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

۷ دسمبر ۱۹۸۹

کارل پاپر (Karl Popper) نے ۱۹۸۸ میں لندن اکونومسٹ میں الکشن کے بارہ میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ڈیموکریسی کے نظام میں الکشن کے ذریعہ ووٹروں

کو جو موقع دیا جاتا ہے، وہ اپنی پسندیدہ حکومت چننے سے زیادہ اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اپنی ناپسندیدہ حکومت کو ہٹا سکیں :

Elections in a democracy offer an opportunity not so much to choose a government you like but to keep away a government you dislike.

ہندستان میں ایمرجنسی کے بعد ۱۹۷۷ کا الکشن اور راجودھیا میں شیلانیاس (۹ نومبر ۱۹۸۹) کے بعد ۲۲ نومبر ۱۹۸۹ کا الکشن اس کی نہایت واضح مثالیں ہیں۔ ان دونوں مواقع پر مسلمانوں نے کانگرس پارٹی کے خلاف ووٹ دیا۔ مگر یہ صرف منفی ووٹ (Negative vote) تھا۔ مسلمان کانگرس سے خفا تھے، اس لئے انھوں نے ان پارٹیوں کے حق میں ووٹ دیدیا جو کانگرس کے خلاف کھڑی ہوئی تھیں۔

اس قسم کی منفی ذہنیت (Negative sentiment) کا سب سے زیادہ نقصان خود مسلمانوں کو ہوا ہے۔ ان کے اکثر ووٹ ضائع ہو گئے۔ چنانچہ ۲۲ نومبر کے الکشن کے بعد جو لوک سبھا (پارلیمنٹ) بنی ہے، اس میں مسلمان ممبروں کی تعداد ہمیشہ سے کم ہے۔ آٹھویں لوک سبھا میں مسلم ممبروں کی تعداد چالیس تھی، موجودہ نویں لوک سبھا میں مسلم ممبروں کی تعداد ۳۴ ہے۔

۸ دسمبر ۱۹۸۹

موجودہ زمانہ کا مزاج یہ ہے کہ ہر چیز کو بلا واسطہ طور پر اس کے براہ راست ذرائع سے جانے۔ یہی مزاج مذہبی معاملہ میں بھی کام کرتا ہے۔ چنانچہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو اسلام کو پڑھنا چاہتا ہے وہ دوسروں کی لکھی ہوئی کتابوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ وہ براہ راست قرآن وحدیث سے جاننا چاہتا ہے کہ اسلام کیا ہے۔

دور جدید کے اس مزاج نے "ترجمہ" کی اہمیت بہت زیادہ بڑھا دی ہے۔ جو لوگ عربی نہیں جانتے، وہ چاہتے ہیں کہ انھیں قرآن وحدیث کے ترجمے (بلا تشریح) ملیں تاکہ وہ ان کے ذریعہ اسلام کو سمجھ سکیں۔ موجودہ زمانہ کے رہنماؤں نے اس راز کو نہیں جانا۔ چنانچہ خود تو بے شمار کتابیں لکھتے رہے، مگر صحیح تراجم فراہم کرنے کی کوشش نہ کی۔

میں نے اس سلسلہ میں چار کتابوں کا انتخاب کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ ان کتابوں

کے صحیح اور مستند ترجمے تیار کئے جائیں۔ اولاً انگریزی میں اور اس کے بعد دوسری زبانوں میں یہ کتابیں یہ ہیں:

قرآن

مشکوٰۃ المصابیح

سیرۃ ابن کثیر

حیاۃ الصحابہ

ان کتابوں کے صحیح اور مستند ترجمے اگر تیار ہو جائیں اور ان کو اچھے طریقہ پر چھاپ کر لوگوں تک پہنچا دیا جائے تو بلاشبہ یہ موجودہ زمانہ میں دعوت اسلامی کا سب سے بڑا کام ہوگا۔

۹ دسمبر ۱۹۸۹

ہندستان کی نویں لوک سبھا جس کا الکشن ۲۲ نومبر ۱۹۸۹ کو ہوا ہے، اس میں ہندو فرقہ کے انتہاپسند عناصر ہر بار سے زیادہ کامیاب ہو کر آئے ہیں۔ مہنت اویدہ ناتھ ہندو مہاسبھا کے ٹکٹ پر گورکھپور سے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ کامیاب ہو گئے۔

ٹائمس آف انڈیا کا نمائندہ مہنت اویدہ ناتھ سے گورکھپور میں ملا تھا۔ اس کی رپورٹ مذکورہ اخبار کے شمارہ ۲۳ نومبر ۱۹۸۹ میں شائع ہوئی ہے۔ رپورٹر کے بیان کے مطابق، مہنت جی نے ہندو لیڈروں کے خلاف سخت غصہ کا اظہار کیا وہ اپنی تنقید بدھا سے شروع کرتے ہیں جس کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ وہ ہندستان کی تمام مصیبتوں کا سرچشمہ ہے۔ بدھا نے ہم کو برداشت کا نعرہ دیا۔ اشوک نے اس کو مزید آگے بڑھایا۔ اسی طرح پنچ شیل وغیرہ۔ دیکھئے کہ ان باتوں نے آج ہم کو کہاں پہنچا دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ برداشت بزدلی ہے۔ برداشت کے نظریہ نے ہندوؤں کو نامرد بنا دیا ہے۔ اگر اہنسا ہی ہمارا مذہب ہے تو ہمارے دیوتا اور ہماری دیویاں ہتھیار کیوں اٹھائے ہوتے ہیں:

Mahant Avaidhnath begins at the beginning. From Buddha—whom he describes as the fountainhead of India's ills. "Buddha gave us the slogan of tolerance. Ashoka took it up. Panchsheel and all that. And see where it has landed us today. I say tolerance is cowardice. Tolerance has made Hindus impotent," declares the demagogue. "If ahimsa was truly our religion, why do our gods and goddesses carry weapons?" he asks.

موجودہ زمانہ میں جو لوگ مذہب کے نام پر اٹھے ہیں، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ، سب لڑائی کی بات کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ سیکولرزم کے نام پر اٹھے ہیں، وہ امن وسلامتی کی بات کرتے ہیں۔ یہ فرق بڑا عجیب ہے۔

۱۰ دسمبر ۱۹۸۹

سید ابو الاعلیٰ مودودی پاکستان میں "نظام مصطفیٰ" کے نفاذ کا نعرہ لے کر اٹھے۔ ان کے نزدیک مفروضہ نظام مصطفیٰ کے قیام کی راہ میں واحد رکاوٹ پاکستان کے حکمراں افراد تھے۔ چنانچہ حکمراں افراد کو گرانے کے لئے انھوں نے ہر ممکن تدبیر اختیار کی۔ ۱۹۶۵ میں صدر ایوب خاں کے خلاف پاکستان کے تمام سطحی لیڈر متحد ہو گئے، ان میں سید ابو الاعلیٰ مودودی بھی تھے۔ انھوں نے ایوب خاں کو گرانے کے لئے مس فاطمہ جناح کو ان کے مقابلہ میں کھڑا کیا۔ حالاں کہ اس سے پہلے وہ خود لکھ چکے تھے کہ اسلام میں عورت کو سربراہ مملکت بنانا جائز نہیں۔

اب سید ابو الاعلیٰ مودودی کے نظریاتی شاگرد "کشمیر لبریشن فرنٹ" یہی لایعنی فعل کشمیر میں کر رہے ہیں۔ وہ کشمیر میں "نظام مصطفیٰ" قائم کرنے کا نعرہ لے کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ اور تخریب کاری کے ذریعہ پوری وادی کے امن کو غارت کر دیا ہے۔ ۸ دسمبر ۱۹۸۹ کو انھوں نے مرکزی وزیر داخلہ مفتی سعید کشمیری کی لڑکی ڈاکٹر روبیہ سعید کو اغوا کر لیا جو سری نگر میں منی بس سے سفر کر رہی تھی اور اسپتال میں اپنی ڈیوٹی کر کے گھر واپس جا رہی تھی۔

میرے نزدیک مس فاطمہ جناح کو ایوب کے مقابلہ میں صدارت کے لئے کھڑا کرنا، اور مفتی سعید کی غیر شادی شدہ لڑکی کو سڑک سے اغوا کرنا دونوں یکساں درجہ کے واقعات ہیں اور دونوں نام نہاد نظام مصطفیٰ کے علمبرداروں نے کئے ہیں۔ یہ سیاست بازی کی دھن میں اسلام کی حدود کو پار کرنا ہے۔ ایک شخص شراب پی کر اتنا بڑا جرم نہیں کرتا جتنا پاکستان اور کشمیر کے نام نہاد اسلام پسند کر رہے ہیں۔

۱۱ دسمبر ۱۹۸۹

مسلمانوں کے نام نہاد لیڈر بدترین رہنما ثابت ہوئے ہیں۔ وہ ہر الکشن میں مسلمانوں سے منفی ووٹ (Negative vote) دلواتے ہیں۔ اس کا سب سے زیادہ نقصان خود مسلمانوں

کو پہنچتا ہے۔

۱۹۶۷ کے الکشن میں آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت ابھری۔ مولانا علی میاں، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی نے اپوزیشن کی ' نان کانگرس ازم کا ساتھ دیا۔ علی میاں نے مسلمانوں سے کہا کہ مسلمان کانگرس کو ہرا کر اپنی طاقت کا ثبوت دیں۔ مسلمانوں نے بڑے پیمانے پر کانگرس کے خلاف ووٹ دیا۔ اس کے نتیجہ میں کئی ریاستوں میں غیر کانگرسی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ ان حکومتوں نے ریاستی پولیس میں فرقہ پرست عناصر کو بھر دیا۔

ایمرجنسی کے بعد ۱۹۷۷ میں الکشن ہوا۔ اب دوبارہ مسلم لیڈروں نے مسلمانوں کو اکسایا کہ وہ کانگرس کے خلاف ووٹ دیں۔ کانگرس کو شدید ناکامی ہوئی۔ مرکز میں جنتا پارٹی کی حکومت قائم ہوئی۔ اس بار پہلے سے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر پولیس میں فرقہ پرست ہندو بھر دئے گئے۔

فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمان بری طرح پولیس کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں، وہ اسی کا کرشمہ ہیں۔ ان فسادات میں مسلمانوں کی تباہی ۵۰ فیصد مسلمانوں کے عدم برداشت کی وجہ سے ہوتی ہے اور ۵۰ فیصد مسلمانوں کے منفی ووٹ (Negative vote) کی پالیسی کی وجہ سے۔

۱۲ دسمبر ۱۹۸۹

روی الترمذی عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقد أُخِفْتُ فی اللّٰہ وما یخاف احد ولقد اوذِیْتُ وما یُوذی احد (ترمذی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اللہ کے راستہ میں اتنا ڈرایا گیا جتنا کسی کو نہیں ڈرایا گیا۔ اور مجھے اتنا ستایا گیا جتنا کسی کو نہیں ستایا گیا)

اس طرح کی روایتیں جو حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں، ان کا مطلب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کا کوئی کام حکمت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ "ایذاء برائے ایذاء" خدا کی شان کے خلاف ہے۔

اس کی ایک نفسیاتی توجیہ میری سمجھ میں آتی ہے۔ انسان کے دماغ میں اتھاہ صلاحیتیں ہیں۔ مگر ابتدائی حالت میں وہ سوئی ہوئی ہوتی ہیں۔ واحد چیز جو انھیں جگاتی ہے وہ زندگی کی مصیبتیں ہیں۔ بشرطیکہ مصیبتیں پڑنے پر آدمی اپنے آپ کو منفی ردعمل سے بچا سکے۔

میرا خیال ہے کہ آدمی کے دماغ کے سل (Brain cells) مصیبتوں سے متحرک ہوتے ہیں۔ زیادہ مصیبت کا مطلب زیادہ دماغی سل کا متحرک اور بیدار ہونا ہے۔ کسی آدمی کے اندر جتنا زیادہ دماغی سل حرکت میں آئیں گے، اتنا ہی زیادہ وہ بے پناہ ہوتا چلا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہی معاملہ اعلیٰ ترین شکل میں پیش آیا۔

۱۳ دسمبر ۱۹۸۹

ایک جرمن عالم نفسیات ولیم اسٹرن (Willian Stern) نے ذہانت کی جانچ (Intelligence test) کا ایک طریقہ نکالا۔ بعد کو امریکہ کے عالم نفسیات لیوس ٹرمن (Lewis Terman) نے اس کو اختیار کر لیا۔ دوسرے بہت سے علما نفسیات نے اس کا اعتراف کیا اور وہ عام طور پر ذہانت کی جانچ کے لئے اسٹینڈرڈ طریقہ مانا جانے لگا۔ اس کا نام (Intelligence quotient) ہے۔ مختصر طور پر اس کو آئی کیو (IQ) کہا جاتا ہے۔

مگر محققین نے اس طریقہ کے بارہ میں سخت شبہات ظاہر کئے ہیں۔ مثلاً لیون کامن (Leon Kamin) نے کہا ہے کہ اس قسم کی ہر جانچ دماغ کی صلاحیتوں کو جاننے کا صرف ایک کمتر رہنما ہے:

Every test is only a rough guide to real abilities.

حقیقت یہ ہے کہ دماغ قدرت کا ایک انتھاہ خزانہ ہے۔ دماغ کی صلاحیتیں اس سے زیادہ ہیں کہ وہ کسی حسابی یا میکانکی جانچ کی حد میں سما سکیں۔

۱۴ دسمبر ۱۹۸۹

جان ہیوڈ (John Heywood) لندن میں ۱۴۹۷ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۵۷۵ میں بلجیم میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ڈراما اور کہانی لکھتا تھا۔ اس کا ایک قول ہے کہ ایک چاہنے والے دل کے لئے کوئی چیز مشکل نہیں:

Nothing is impossible to a willing heart.

یہ قول نہایت صحیح ہے۔ مگر 'چاہنے' کا مطلب سادہ معنوں میں صرف آرزو نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب سچی طلب ہے۔ جس آدمی کے اندر کسی چیز کی سچی طلب پیدا ہو جائے تو وہ اس کے لئے اپنی ساری

طاقت صرف کرتا ہے۔ وہ اس کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے۔ یہی طلب آدمی کے اندر خود بخود وہ تمام عملی اور اخلاقی اوصاف پیدا کر دیتی ہے جو کسی چیز کے حصول کے لئے ضروری ہے۔ اور جب کسی آدمی کے اندر ضروری عملی اور اخلاقی اوصاف پیدا ہو جائیں تو ایسا شخص یقیناً کامیاب ہو کر رہتا ہے۔ کوئی چیز اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی۔

۱۵ دسمبر ۱۹۸۹

پاکستان میں مرکز میں بے نظیر بھٹو کے تحت پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہے۔ اور وہاں کے سب سے بڑے صوبہ پنجاب میں نواز شریف کے تحت اسلامی اتحاد کی۔ دونوں میں مسلسل محاذ آرائی قائم ہے۔ نوائے وقت (۱۱ دسمبر ۱۹۸۹) نے اپنے اداریہ میں لکھا ہے:

"ایک تجزیاتی رپورٹ کے مطابق، وفاقی حکومت اور پنجاب کی حکومت کے درمیان سیاسی محاذ آرائی کے نتیجہ میں قومی معیشت کو ایک سال کے دوران ۶۵ ارب روپیہ کا نقصان پہنچ چکا ہے"۔

اخبار نے اس کے علاوہ اور بہت سے نقصانات گنائے ہیں۔ ہندستان میں ہندو اور مسلمان کے درمیان محاذ آرائی تھی۔ اس سے بچنے کے لئے پاکستان بنایا گیا تو وہاں مسلمان اور مسلمان کے درمیان محاذ آرائی شروع ہو گئی۔ کتنے نادان تھے وہ لوگ جو یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کے نام سے ایک الگ مسلم خطہ بنوانے کے بعد ٹکراؤ اور محاذ آرائی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

۱۶ دسمبر ۱۹۸۹

۹ دسمبر ۱۹۸۹ کے اخبارات یہ تند و تیز خبر لائے کہ مرکز کے کشمیری وزیر داخلہ مفتی سعید کی ۲۳ سالہ لڑکی ڈاکٹر روبیہ سعید کو کشمیر لبریشن فرنٹ کے مسلم نوجوانوں نے اغوا کر لیا ہے۔ اس کے بعد کئی روز تک یہی خبر اخباروں کے صفحہ اول کی اہم ترین خبر بنی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۴ دسمبر ۱۹۸۹ کے اخبارات نے بتایا کہ پانچ دہشت گرد قیدیوں کو چھوڑ کر ڈاکٹر روبیہ کو رہا کرا لیا ہے۔

کشمیر کے مسلم نوجوان جو آزادیٔ کشمیر کی تحریک چلا رہے ہیں، انھوں نے اس واقعہ پر فتح کی خوشی منائی۔ مگر یہ واقعہ بے حد خطرناک الارم تھا۔ چنانچہ ۱۶ دسمبر کے اخبارات نے بتایا کہ کشمیر میں پھر فوجی کارروائی شروع کر دی گئی ہے۔ ہندستان ٹائمس (۱۶ دسمبر) کی سرخی یہ ہے:

بظاہر ایسا معلوم ہوتا کہ دہلی کی حکومت ڈاکٹر روبیہ کے واقعہ کو بطور عذر استعمال کرے گی اور کشمیر کے انتہا پسند مسلم نوجوانوں کو کچلنے کی پوری کوشش کرے گی۔ اور غالباً کوئی بھی ملک ان کی کھلی مدد کے لئے نہیں آئے گا۔

۱۷ دسمبر ۱۹۸۹

دیوار برلن (Berlin wall) ٹوٹ گئی۔ نومبر ۱۹۸۹ سے مغربی جرمنی اور مشرقی جرمنی کے درمیان آزادانہ آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ہٹلر نے جرمنی کو بڑا بنانے کے نام پر جو احمقانہ جنگ شروع کی، اس نے صرف یہ کیا کہ جرمنی کو چھوٹا کر دیا۔ اب دوبارہ جرمنی اپنی سابقہ حالت کی طرف جاتا ہوا نظر آتا ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۷ادسمبر ۱۹۸۹) کے صفحہ ۱۰ پر ایک تصویر ہے۔ ایسٹ جرمنی کے شہر لیپزگ (Leipzig) میں مردوں اور عورتوں کا ایک جلوس نکلا۔ وہ مختلف پوسٹر لئے ہوئے تھا۔ ان پوسٹروں پر اس قسم کے الفاظ لکھے ہوئے :

نازی دور رہیں (Nazis Keep out)

عظیم جرمنی نہیں (Great Germany? No)

عظمت کا جنون آخر کار پستی کے غار میں گرا تا ہے، فرد کو بھی اور قوم کو بھی۔ ہٹلر کی تاریخ اس کی نہایت عبرت ناک مثال ہے۔ مگر آج بھی ایسے افراد اور قومیں دنیا میں موجود ہیں جنھوں نے اس تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

۱۸ دسمبر ۱۹۸۹

۲۲ نومبر ۱۹۸۹ کے الکشن کے بعد مسٹر وی پی سنگھ ہندستان کے وزیر اعظم بن گئے ہیں۔ وہ چوں کہ سابق راجہ فیملی سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے ان کے حامی پرجوش طور پر یہ کہہ رہے ہیں کہ دہلی کے تخت پر پرتھوی راج چوہان واپس آگیا ہے۔ اس کے جواب میں ایک کانگرسی ممبر نے کہا چوہان کا اقتدار ۱۱۹۱ میں ختم ہو گیا تھا، کیا وی پی سنگھ کی حکومت بھی صرف ۱۹۹۱ تک باقی رہے گی :

Chauhan's reign ended in 1191 A.D.
V.P.'s government also last till 1991?

کانگریسی ممبر کے اس جملہ میں کوئی منطقی وزن نہیں۔ اس کے باوجود لفظی حسن اس کے اندر مکمل طور پر موجود ہے۔ الفاظ کا فتنہ بھی کتنا زبردست ہے۔

۱۹ دسمبر ۱۹۸۹

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (مقیم پیرس) پاکستان گئے۔ وہاں انھوں نے جناح ہال (لاہور) میں تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ پیرس اس وقت یورپ کا سب سے بڑا مسلم شہر بن گیا ہے۔ پیرس میں مسلمانوں کی تعداد پانچ لاکھ سے زیادہ ہے۔ وہاں لاتعداد مسجدیں ہیں۔ مسلمانوں کے قبرستان علاحدہ ہو گئے ہیں۔ حکومت نے تسلیم کیا ہے کہ یہ ایک بڑی اقلیت ہے۔ پیرس میں ہر جمعہ کو دو تین آدمی میرے پاس آتے ہیں اور اسلام قبول کرتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ اسلام کیوں لا رہے ہیں، ہمارے پاس تو کوئی ایسی شے نہیں ہے جو انھیں مائل کر سکے۔ ہمارے اندر توان کے لئے کوئی کشش نہیں ہے۔ پھر کون سی چیز ہے جو انھیں اسلام کی طرف مائل کر رہی ہے؟ (ماہنامہ میثاق، لاہور، دسمبر ۱۹۸۹، صفحہ ۶۶-۶۷)

آجکل ساری دنیا میں لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ یہ کسی تبلیغ کے بغیر اپنے آپ ہو رہا ہے۔ جب کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان انتہائی زوال کا شکار ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے لوگ اسلام کو اسلام کے لئے قبول کرتے ہیں نہ کہ مسلمانوں کے لئے۔

۲۰ دسمبر ۱۹۸۹

ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی امریکہ سے ہندستان آئے ہیں۔ آج وہ ہمارے مرکز میں آئے۔ وہ امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں "اسلام" کے بارہ میں لکچر دیتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اسلام کے فقہی مسائل یا علم کلام یا سیاسی نظام وغیرہ کی بات کی جائے تو امریکی طلبہ اس سے زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔ البتہ اگر اسلامی تصوف پر کہا جائے تو اس کو وہ بہت توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کے انسان کے لئے اسلام کے نظامی اپروچ میں زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں اس کے لئے اسلام کے روحانی اپروچ میں زیادہ دلچسپی ہے۔ ایسی

حالت میں کتنی نادانی ہوگی کہ "اسلام کا سیاسی نظام" جیسی کتابیں چھاپ کر مغربی ملکوں میں پھیلائی جائیں۔

۲۱ دسمبر ۱۹۸۹

کارل مارکس نے فیور باخ (Feuerbach) کے بارہ میں اپنے گیارھویں مقالہ میں کہا ہے کہ فلسفی یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ وہ دنیا کی تعبیر کریں۔ مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ دنیا کو بدلا جائے:

Philosophers have so far tried to interpret the world; the point, however, is to change it.

سو برس پہلے جب یہ بات کہی گئی تو وہ لوگوں کو اتنی اچھی معلوم ہوئی کہ ساری دنیا میں لوگ اس سے مسحور ہو گئے۔ بے شمار لوگوں نے اپنی بہترین صلاحیتیں اس کے لئے وقف کر دیں۔ بے شمار لوگوں نے جان و مال کی قربانیاں دیں۔ یہاں تک کہ اولاً روس میں، اور اس کے بعد دنیا کے بہت بڑے حصہ میں وہ اشتراکی تبدیلی آگئی جس کا اس نے اظہار کیا تھا۔

مگر آج آخری نتیجہ سامنے آنے کے بعد، یہ اشتراکی انقلاب سراسر بے معنی ثابت ہوا۔ وہ ان امیدوں میں سے کسی ایک امید کو بھی پورا نہ کر سکا جو اس انقلاب سے ابتداءً وابستہ کر لی گئی تھیں۔

۲۲ دسمبر ۱۹۸۹

امریکہ کا ماہنامہ ریڈرس ڈائجسٹ پندرہ زبانوں میں شائع ہوتا ہے اور اس کی مجموعی اشاعت ۲۸ ملین کاپی ہے۔ اپنی ۶۷ سالہ تاریخ میں پہلی بار اس نے اپنی مالی حیثیت کے بارہ میں اعداد و شمار شائع کئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ امریکی میگزین کی سالانہ آمدنی ایک ارب ۸۰ کروڑ ڈالر ہے۔

یہ جدید صحافت کا وہ تصور ہے جو اردو زبان کے وہم و گمان سے بھی زیادہ دور ہے۔ اردو شاعروں کو پڑھئے اور اردو خطیبوں کو سنئے تو ایسا معلوم ہوگا گویا اردو زبان تمام زبانوں کی سرتاج ہے۔ مگر اس کو زمین کے پامال راستوں کے سوا کہیں اور جگہ حاصل نہیں۔

۲۳ دسمبر ۱۹۸۹

ٹائمس آف انڈیا (۲۳ دسمبر) کے صفحہ اول کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مارچ ۱۹۸۹ کے آخر میں ہندستان کے اوپر بیرونی قرضوں کی مقدار 83,000 کروڑ روپیہ تھی۔ اب نئی حکومت کے زمانہ میں اس میں مزید اضافہ ہوگا۔

ہر نئی حکومت جو منتخب ہو کر آتی ہے، وہ قرضہ کی مقدار میں اضافہ کرتی ہے۔ اب تک کسی حکومت نے یہ خبر نہیں سنائی کہ اس نے قرضہ میں کمی کی ہے۔ آزادی کے بعد ہمارے یہاں نعروں کی سیاست رائج ہوئی۔ اور نعروں کی سیاست سے اس کے سوا کوئی اور نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

۲۴ دسمبر ۱۹۸۹

نوائے وقت پاکستان کا مشہور اخبار ہے جو بیک وقت لاہور، کراچی، راولپنڈی اور ملتان سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے شمارہ ۱۳ دسمبر ۱۹۸۹ میں "قائداعظم محمد علی جناح" کا ایک قول نقل کیا گیا ہے۔ ۱۴ جولائی ۱۹۴۷ کو انھوں نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا: "جب آپ جمہوریت کی باتیں کرتے ہیں تو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ آپ نے اسلام کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ ہم نے جمہوریت تیرہ سو سال پہلے سیکھ لی تھی۔

"قائداعظم" کا یہ پرفخر قول اخبار کے صفحہ ۳ پر درج ہے۔ اس کے بعد اسی اخبار کے صفحہ اول کو دیکھئے۔ وہاں ایک خبر کے تحت بتایا گیا ہے کہ ۱۲ دسمبر کو پنجاب لاہور میں وزیر قانون اور پارلیمانی امور نصر اللہ خاں دریشک (اسلامی اتحاد) ایک قرارداد پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ اپوزیشن (PPP) کے رکن فضل حسین نے کہا کہ ایوان کا کورم پورا نہیں ہے۔ اس لئے ایوان کی کارروائی غیر قانونی ہے۔ وزیر موصوف خاموش نہیں رہے تو فضل حسین نے ان کے پاس جا کر ان کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیا۔ اس پر "اسلامی اتحاد" کے دو ممبر دوڑ کر وہاں پہنچے اور فضل حسین راہی کو ہاتھ سے مارا۔ دونوں ارکان ایک دوسرے کو گندی گالیاں دینے لگے، اور ایک دوسرے پر آوازے کستے رہے۔ اس کے بعد اسپیکر نے ایوان کا اجلاس ملتوی کر دیا۔

یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی عام تصویر ہے۔ ایک طرف وہ اسلام کے ماضی کو اپنی تاریخ بنا کر اس پر فخر کرتے ہیں، دوسری طرف ان کی عملی حالت یہ ہے کہ مومنوں والا کردار تو درکنار ملحدوں

والا کردار بھی ان کے اندر نہیں پایا جاتا۔

۲۵ دسمبر ۱۹۸۹

ہنری وارڈ بیچر (Henry Ward Beacher) ۱۸۱۳ میں امریکہ میں پیدا ہوا، اور ۱۸۸۷ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ایک پروٹسٹنٹ لیڈر تھا۔ اپنی غیر معمولی تقریری صلاحیت کی وجہ سے اس نے کافی شہرت حاصل کی۔ بیچر کا ایک قول ہے کہ قانون آقا نہیں ہوتا بلکہ ملازم ہوتا ہے، وہ ان لوگوں کے اوپر حکومت کرتا ہے جو اس کی اطاعت کریں:

Laws are not masters but servants,
and he rules them who obeys them.

یہ انتہائی سادہ اور صحیح بات ہے۔ مگر یہی سادہ اور سچی بات موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں کے لئے بالکل لامعلوم رہی۔ انھوں نے افراد کے مزاج کو بنانے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ قانون کے نفاذ کے نام پر حکومتوں سے لڑائی لڑتے رہے۔ مثلاً مصر میں سید قطب اور پاکستان میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔

یہ لوگ اس حقیقت کو جانتے تو وہ اپنے ملک کی حکومت سے اعراض کرتے ہوئے اپنی ساری طاقت افراد کی اصلاح میں لگاتے۔ مگر انھوں نے افراد کی اصلاح کے محاذ کو چھوڑ کر حکومتوں سے ٹکراؤ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی کوششیں رائیگاں ہو کر رہ گئیں۔

۲۶ دسمبر ۱۹۸۹

دنیا کی ہر راحت جنت کی ایک جھلک ہے، اور دنیا کی ہر مصیبت جہنم کا ایک تعارف آدمی اگر اس حقیقت کو جان لے تو اس کا ہر دن معرفت کا دن بن جائے۔ اس کا ہر تجربہ اس کے لئے روحانی ترقی کا ذریعہ ثابت ہو۔

۲۷ دسمبر ۱۹۸۹

پاکستان کے اخبار نوائے وقت (یکم دسمبر ۱۹۸۹) میں "قائداعظم نے فرمایا" کے زیر عنوان نمایاں طور پر مسٹر محمد علی جناح کا یہ قول نقل کیا گیا ہے ——— ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا۔ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں

ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں (اسلامیہ کالج، پشاور، ۱۳ جنوری ۱۹۴۸)
یہ جملہ گریمر کے لحاظ سے صحیح مگر حقیقت کے اعتبار سے غلط ہے۔ اسلام کے اصولوں کے تجربہ کا آغاز زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے سے نہیں ہوتا، بلکہ انسان کو حاصل کرنے سے ہوتا ہے۔ ہمارے رہنماؤں کو اپنی ساری کوشش انسان کو بدلنے پر صرف کرنا چاہئے تھا۔ اس کے بعد پاکستان اپنے آپ قائم ہو جاتا۔ مگر جب انھوں نے انسان کو بدلنے کا کام نہیں کیا تو زمین کا ٹکڑا ملنے کے باوجود مطلوبہ پاکستان نہ بن سکا۔

'پاکستان بناؤ' جیسے نعروں پر فوراً بھیڑ اکٹھا ہو جاتی ہے۔ مگر 'انسان بناؤ' کے پیغام پر کبھی بھیڑ جمع نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام لیڈر پہلی قسم کے نعروں پر دوڑ رہے ہیں۔ کوئی بھی نہیں جو دوسری قسم کے پیغام کو لے کر اٹھے۔

۲۸ دسمبر ۱۹۸۹

رومانیہ کا اسٹالنسٹ صدر نکولا چاؤسسکو کو ۲۵ دسمبر ۱۹۸۹ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس کی بیوی بھی قتل کر دی گئی۔ اس کے بھائی نے خودکشی کر لی۔ پچھلے ۲۴ سال سے وہ رومانیہ کا ڈکٹیٹر بنا ہوا تھا۔ رومانیہ کے تمام ذرائع و وسائل کو اس نے اپنی ذات کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ اس کا غرور اتنا بڑھا ہوا تھا کہ آخر وقت میں اس نے ان فوجی افسروں سے بھی بدتمیزی کے ساتھ بات کی جو اس کے قتل کا فیصلہ کر رہے تھے۔ حالاں کہ اس کے چند لمحہ بعد اس کی خون میں لت پت لاش زمین پر پڑی ہوئی تھی۔

اس سلسلہ کی تفصیلات اور تصویروں کو اخبار میں دیکھ کر میری زبان سے نکلا ـــــ آدمی کتنا زیادہ مجبور ہے مگر وہ اپنے آپ کو کتنا زیادہ آزاد سمجھتا ہے۔ آدمی کتنا زیادہ عاجز ہے مگر وہ کتنی زیادہ سرکشی کرتا ہے۔ آدمی کتنا زیادہ کمزور ہے مگر اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو کتنا زیادہ جاننے والا سمجھتا ہے۔ آدمی صرف بندہ ہے۔ مگر پہلا موقع پاتے ہی وہ اس طرح عمل کرنے لگتا ہے جیسے کہ وہ اس دنیا کا خدا ہو۔

۲۹ دسمبر ۱۹۸۹

آج اچاریہ منی سوشیل کمار کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں

۳ بجے شام کا وقت مقرر ہوا۔ اس کے مطابق ان کے سنٹر واقع ڈیفنس کالونی (نئی دہلی) میں میری ملاقات ہوئی۔ میں وہاں پہنچا تو سید شہاب الدین صاحب پہلے سے وہاں موجود تھے۔ منی سوشیل کمار بابری مسجد۔ رام جنم بھومی جھگڑے کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں آج انھوں نے چند لوگوں کو ابتدائی گفت گو کے لئے بلایا تھا۔

شہاب الدین صاحب وکیلانہ انداز میں اپنا دعویٰ پیش کر رہے تھے۔ اس کے مقابلہ میں منی سوشیل کمار نرم اور دھیمے انداز میں کبھی کبھی بولتے تھے۔ جب شہاب الدین صاحب چلے گئے تو منی سوشیل کمار نے کہا کہ میں اس معاملے میں پڑکر اس کو حل کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک کانفرنس بلانا چاہتا ہوں۔ مگر جب سے میں نے اپنے اس ارادہ کا ذکر کیا ہے، میرے پاس کئی مسلمانوں کے ٹیلی فون آچکے ہیں کہ اگر وحید الدین خاں کو اس میٹنگ میں شریک کیا گیا تو وہ اس میں نہیں آئیں گے۔ منی سوشیل کمار نے مجھ سے کہا کہ آپ کو میں اس ملک کے لئے ایک لائٹ سمجھتا ہوں۔ آئندہ پورا دیش آپ سے روشنی لے گا۔ منی سوشیل کمار سے حسب ذیل چار بار میری ملاقاتیں ہوئی ہیں:

فروری ۱۹۶۵	ورلڈ فیلوشپ آف ریلیجنز	دہلی
نومبر ۱۹۸۵	انٹر نیشنل ریلیجس اسمبلی	نیویارک
مارچ ۱۹۸۷	وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس	نئی دہلی
دسمبر ۱۹۸۹	اچاریہ منی سوشیل کمار آشرم	نئی دہلی

۳۰ دسمبر ۱۹۸۹

سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کے زمانہ میں جو ایمرجنسی لگی، اس سے ہندو اور مسلمان دونوں حکومت سے سخت ناراض تھے۔ اس کے بعد ۱۹۷۷ میں الکشن ہوا تو دونوں کانگرس کے خلاف ووٹ دینے پر تلے ہوئے تھے۔ اس وقت دہلی کے 'شاہی امام' سید عبداللہ بخاری نے مسلمانوں کی آواز میں آواز ملا کر تقریریں کیں کہ کانگرس کو ہراؤ۔ لوگوں نے کانگرس کے خلاف ووٹ دیا اور کانگرس پارٹی الکشن میں ہار گئی۔ اس کے بعد پرانی دہلی کی بوسیدہ دیواروں پر اس مضمون کا پوسٹر لگایا گیا:

۱۲کروڑ ہندستانی عوام کے بے تاج بادشاہ سید عبد اللہ بخاری

یہ پوسٹر دیواروں پر سے تو اگلے دن ہی ختم ہو گئے۔ مگر میری فائل میں ایک پوسٹر اب بھی پھٹی ہوئی حالت میں موجود ہے۔ اب حالیہ الکشن (نومبر ۱۹۸۹) میں دوبارہ مسلمان فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے کانگرس سے بگڑے ہوئے تھے۔ دوبارہ سید عبد اللہ بخاری نے ان کی ہم نوائی کرتے ہوئے کانگرس مخالف تقریریں کیں۔ مسلمانوں نے بھی کانگرس کے خلاف ووٹ دیا۔ کانگرس ہار گئی۔ اب دہلی کے اخبار اردو مورچہ (۲۸ دسمبر ۱۹۸۹) نے ایک مضمون شائع کیا ہے۔ اس کی سرخی یہ ہے:

آزادی وطن کے بعد پہلی سچی مسلم قیادت شاہی امام سید عبد اللہ بخاری

یہ سب میرے نزدیک الفاظ سے کھیلنا ہے۔ ایک ہزار بار بھی کانگرس ہارے تو اس سے مسلمانوں کا کوئی فائدہ ہونے والا نہیں۔ مسلمانوں کا فائدہ صرف اپنی تعمیر کے ذریعہ ہوگا نہ کہ دوسروں کی تخریب کے ذریعہ۔

۳۱ دسمبر ۱۹۸۹

پانچ جنیہ (دہلی) آر ایس ایس والوں کا ہندی اخبار ہے۔ اس نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اس کے کالم میں ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں مستقل لکھا کروں۔ اس سلسلہ میں کئی آرٹیکل چھپ چکے ہیں۔ اخبار کے ٹیلیفون اور پانچ جنیہ کے پڑھنے والوں کے خطوط سے اندازہ ہوا کہ اس سلسلہ کو بہت پسند کیا جا رہا ہے۔

پانچ جنیہ کے دفتر سے ایک بینک چیک ملا۔ وہ ہر مطبوعہ آرٹیکل کا معقول معاوضہ دینا چاہتے ہیں۔ مگر میں نے چیک واپس کر دیا۔ میں نے کہا کہ میں مضامین دینے کا سلسلہ جاری رکھوں گا، مگر اس کے معاوضہ میں کوئی رقم قبول نہیں کروں گا۔

مسلم رہنماؤں میں یہ فکر بہت عام ہے کہ ہندوؤں میں اپنی بات پہنچانے کے لئے ہندی اور انگریزی میں اخبار یا رسالہ نکالا جائے۔ پچھلے ۵۰ سال میں اس اعلان کے ساتھ درجنوں اخبار اور رسالے ہندی اور انگریزی زبان میں نکالے گئے ہیں، اور سب کے سب ناکام رہے ہیں۔ زیادہ قابل عمل طریقہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اچھے لکھنے والے لوگ ہندی اور انگریزی میں مضامین اور خطوط لکھیں اور ان کو ہندوؤں کے جاری کردہ پرچوں میں چھپوائیں۔

١٩٩٠

یکم جنوری ۱۹۹۰

میں نے اپنی زندگی کا پہلا مضمون غالباً ۱۹۴۰ میں لکھا تھا۔ اس وقت میں مدرستہ الاصلاح (اعظم گڈھ) میں عربی کا طالب علم تھا۔ اس مضمون کا عنوان تھا: جوشِ عمل۔ اس کے بعد سے میں تقریباً ہر روز کچھ نہ کچھ لکھتا رہا ہوں۔ ۱۹۹۰ میں پہنچ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے لگ بھگ پچاس سال لکھنے یا لکھنے کی مشق میں گزارے ہیں۔

کیا چیز ہے جو کسی آدمی کو لکھنے والا یا صاحب قلم بناتی ہے، اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے تو میں کہوں گا کہ اس کی پہلی لازمی شرط مطالعہ ہے۔ آدمی جتنا زیادہ مطالعہ کرے گا، اتنا ہی زیادہ وہ اچھا لکھنے والا بنے گا۔

تحریر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے علمی تحریر، دوسری ہے تخلیقی تحریر۔ علمی تحریر کے لئے صرف مطالعہ کافی ہے۔ مگر تخلیقی تحریر کو وجود میں لانے کے لئے مطالعہ کے ساتھ گہرا تجربہ بھی لازماً ضروری ہے۔ خاص طور پر وہ سنگین تجربات جو آدمی کے دل و دماغ کو ہلا دیں، جو اس کی شخصیت کے چھپے ہوئے پہلوؤں کو بیدار کر دیں۔ زلزلہ خیز تجربات سے گزرے بغیر حقیقی معنوں میں کسی تخلیقی تحریر کو وجود میں لانا ممکن نہیں۔

تاہم تجربات سے سیکھنے کے لئے شعور کی بلندی ضروری ہے۔ کثرت مطالعہ سے آدمی کا شعور بلند ہوتا ہے۔ اور جس آدمی کا شعور بلند ہو چکا ہو، وہی تجربات سے کوئی بڑا سبق لے سکتا ہے۔ اور اس کو تخلیقی تحریر میں منتقل کر سکتا ہے۔

۲ جنوری ۱۹۹۰

پاکستان کے اخبار نوائے وقت (۲۵ دسمبر ۱۹۸۹) میں محمد ظفیر صاحب کے حوالے سے یہ روایت شائع ہوئی ہے کہ ۳ جون ۱۹۴۷ کے اعلان منصوبہ تقسیم برعظیم کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ والے بزرگ مسلم لیگی لیڈر رسید بدر الدجیٰ کے توسط سے قائد اعظم محمد علی جناح کے ساتھ ایک خصوصی ملاقات کی اور پوچھا کہ جو اور جس طرح کا پاکستان آپ نے قبول کیا ہے، اس سے ہندستان کے ساتھ مسلمان بھی تین حصوں میں بٹ جائیں گے۔ قائد اعظم نے فرمایا کہ اس وقت میں نے ایک قلعہ مسلمانوں کو لے دیا ہے۔ جہاں وہ اپنی قوتیں مجتمع کریں اور اپنی اہلیتوں سے

کام لے کر اپنے شاندار ماضی کا احیا کریں۔ مجھے جو کام کرنا تھا وہ میں نے کر دیا۔"

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی ایک مضمون میں پاکستان کو اسلام کا آہنی قلعہ بتایا تھا۔ مگر واقعات نے بتایا کہ مسٹر جناح اور ان کے ہم خیال لوگوں کا نظریہ سراسر غلط تھا۔ نصف صدی گزرنے پر بھی پاکستان اسلام کا قلعہ نہ بن سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کبھی اسلام کا قلعہ نہیں بنتا۔

میرے نزدیک پاکستان بنوانا مسلمانوں کے لئے ایک جرم کا درجہ رکھتا ہے۔ مسلمانوں پر لازم تھا کہ پہلے ہندستان کے ہندوؤں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کریں، اور اس کو تمام ضروری دعوتی آداب کے ساتھ تکمیل کے مرحلہ تک پہنچائیں۔ دعوتی عمل کی انجام دہی کے بعد حسب حالات انھیں اگلا اقدام تجویز کرنا تھا۔ دعوتی مرحلہ سے گزرے بغیر پاکستان کا مطالبہ ہرگز درست نہ تھا۔ پاکستان کا نام "مملکت خداداد" رکھنے سے وہ اسلامی نہیں بن سکتا۔

۳ جنوری ۱۹۹۰

قومی آواز (یکم جنوری ۱۹۹۰) کے صفحہ اول کی سرخی یہ تھی: "وادی کشمیر میں آج سے تمام سینما گھر بند" خبر میں بتایا گیا تھا کہ کشمیر کی ایک انتہا پسند تنظیم "اللہ ٹائگرز" نے تمام سینما گھروں کے مالکوں کو دھمکی دی ہے کہ یکم جنوری سے وہ اپنے سینما گھروں میں فلم دکھانا مکمل طور پر بند کر دیں۔ ورنہ ان کے سینما ہال کو بم سے اڑا دیا جائے گا۔ اسی طرح سیکڑوں ویڈیو لائبریریوں کو بھی اپنا کاروبار بند کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ وادی میں شراب کی دکانوں کو بھی ان تنظیموں نے بند کروا دیا ہے۔ عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اسلامی پردہ کے بغیر گھر سے نہ نکلیں۔ خلاف ورزی کرنے والے کئی بار بم کا نشانہ بن چکے ہیں۔ اس لئے لوگوں نے خوف کے تحت ان حکموں پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔

ممکن ہے کہ کچھ نادان اسلام پسند اس سے خوش ہوں۔ مگر میں اس کو بالکل لغو سمجھتا ہوں۔ بم کی طاقت سے کبھی سماج میں کوئی انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ اس کا زندہ ثبوت مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ممالک (رومانیہ، ایسٹ جرمنی، چیکوسلواکیا، ہنگری، پولینڈ، وغیرہ) ہیں۔ تقریباً نصف صدی تک یہاں حکومتی طاقت کے زور پر کمیونسٹ سماج بنانے کی کوشش کی گئی۔

مگر آخر کار وہاں بغاوت ہوگئی۔ اور کمیونزم کو ذلیل ہو کر مشرقی یورپ سے نکلنا پڑا۔

کشمیر کے دہشت پسند نوجوانوں کے پاس اس طاقت کا ہزارواں حصہ بھی نہیں ہے جو سوویت روس کے پاس تھا۔ ایسی حالت میں جو لوگ اس کو "نظام مصطفیٰ" قائم کرنے کا نام دیں وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جس کا تعلق اسلام سے تو کیا ہوگا، اس کا تعلق عقل سے بھی نہیں۔

۴ جنوری ۱۹۹۰

صحیح مسلم میں ہے کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نافع بن عبد الحارث کو مکہ کا حاکم مقرر کیا تھا۔ ایک روز حضرت عمر عسفان میں تھے۔ اتفاق سے نافع بن عبد الحارث بھی وہاں آ گئے۔ حضرت عمر نے ان کو عسفان میں دیکھ کر پوچھا کہ مکہ میں تم کس کو اپنی جگہ رکھ کر آئے ہو۔ انھوں نے کہا کہ ابن بزی کو مقرر کیا ہے جو کہ میرا آزاد کردہ غلام ہے۔ حضرت عمر نے کہا: استخلفت مولی۔ یعنی ایسی ذمہ داری کے منصب پر تم نے ایک آزاد کردہ غلام کو مقرر کر دیا۔ نافع بن عبد الحارث نے جواب دیا: انہ قارئ الکتاب وعالم بالفرائض (اس نے قرآن کو پڑھا ہے اور وہ فرائض کا عالم ہے)

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ اسلام میں ساری اہمیت آدمی کی لیاقت کی ہے۔ نسل اور رنگ اور رشتہ اور قومیت اور اس طرح کی دوسری چیزیں اسلام میں قابل لحاظ نہیں۔

۵ جنوری ۱۹۹۰

مسند احمد کی ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص تین دن سے کم میں پورا قرآن پڑھے وہ اس کو سمجھنے سے محروم رہے گا۔ لا یفقہ من یقرأ فی اقل من ثلاث) روایت میں آیا ہے کہ آپ نے حضرت عبد اللہ بن عمر کو سات دن سے کم میں یا پانچ دن سے کم میں قرآن ختم کرنے کی اجازت نہیں دی۔

اس طرح کی واضح ممانعت کے باوجود امت میں مسلسل ایسے لوگ پائے گئے ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ روزانہ ایک قرآن ختم کرتے تھے۔ بلکہ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے فضائل میں بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک دن میں کئی بار قرآن ختم کیا کرتے تھے۔

ان لوگوں نے اس بدعت کو اس طرح جائز کیا کہ انھوں نے یہ کہہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو مشقت سے بچانے کے لئے ایسی ہدایت فرمائی تھی۔ مگر یہ توجیہ بالکل لغو ہے۔ یہ بے معنی توجیہ ان حضرات کے دماغ میں اس لئے آئی کہ انھوں نے "ختم" کو کام سمجھ لیا، انھوں نے "تدبر" کو کام نہیں سمجھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی اسلامی کام ہی نہیں ہے کہ ایک شخص آندھی اور طوفان کی طرح ہر وقت بس قرآن کے الفاظ دہراتا رہے۔ قرآن کے سلسلہ میں اصل کام یہ ہے کہ اس پر غور کرکے اس سے ہدایت اخذ کی جائے نہ کہ اس کو فرفر پڑھتے رہنا۔

۶ جنوری ۱۹۹۰

منشی پریم چند کے لڑکے شری امرت لال کی ایک انگریزی کتاب گھر بٹوارہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۴ میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس میں مصنف نے لکھا تھا:

" یہ بالکل غیر ممکن نہیں ہے کہ موجودہ ووٹ زدہ اقتدار کے کھیل میں اردو کو کسی نہ کسی دن ایک علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے۔ مگر ہم کو یقین ہے کہ ایسا کرنا اس ملک کے مفاد میں نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اردو زبان کی حیثیت ایک غیر سیکولر عنصر کی ہے جس میں نہایت طاقتور مذہبی رجحانات موجود ہیں جو سیکولر یک جہتی کے منافی ہیں"

اس کتاب کی اشاعت کے پانچ سال بعد اکتوبر ۱۹۸۹ میں یوپی میں (نیز بہار میں) اردو کو علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔ مذکورہ کتاب کے مصنف ہندی کے ادیب ہیں، اور انھیں اردو سے سخت عناد ہے۔ اس کے باوجود ان کی یہ حقیقت نگاری حیرت انگیز ہے کہ انھوں نے پانچ سال پہلے اس کو سمجھ لیا تھا ـــــ جب کہ عام لوگوں کا حال یہ ہے کہ کسی چیز سے انھیں نفرت ہو جائے تو اس کے بارہ میں وہ کسی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

۷ جنوری ۱۹۹۰

مولانا ہارون صاحب میواتی (امام کالی مسجد) شام کو ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ راجیو گاندھی حکومت نے ۱۴ نومبر ۱۹۸۹ کو چارٹرڈ جہاز کے ذریعہ دہلی کے دس علما کو اجودھیا بھیجا تھا۔ اس میں مولانا ہارون صاحب، مولانا مفتی مکرم صاحب، مولانا احمد علی

قاسمی وغیرہ شامل تھے۔ دہلی سے لکھنؤ تک یہ لوگ ہوائی جہاز سے گئے۔ لکھنؤ اسٹیشن پر امبیسڈر کاروں کا قافلہ موجود تھا۔ وہ ان کو لکھنؤ سے اجودھیا اس طرح لے گیا کہ ان کے آگے اور پیچھے پولیس کی جیپ چل رہی تھی۔

۲۲ نومبر ۱۹۸۹ کو جنرل الکشن ہونے والا تھا۔ ۹ نومبر کو وشو ہندو پریشد وغیرہ نے اجودھیا میں شیلانیاس رکھی۔ مسلمانوں میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ ہندو بابری مسجد کی جگہ رام مندر بنا رہے ہیں اور کانگرس سرکار ان کو روک نہیں رہی ہے۔ چنانچہ دہلی کے علما کا قافلہ خصوصی اہتمام کے ساتھ اجودھیا لے جایا گیا تاکہ وہ مقامی واقعہ کو دیکھ کر یہ بیان دے دیں کہ بابری مسجد محفوظ ہے، اور شیلانیاس اس کی حد سے دور رکھی گئی ہے۔

الکشن سے پہلے (اکتوبر۔ نومبر) میں دہلی اور یوپی کے مقامات پر فسادات ہوئے۔ مثلاً بھاگلپور میں ۲۴ اکتوبر کو سخت فساد ہوا۔ مسلمان کہتے ہیں کہ کانگرس حکومت نے فساد کروائے۔ یہ دراصل اپوزیشن کی بولی ہے۔ جو حکومت مسلم ووٹ لینے کے لئے اتنی بے قرار ہو کہ وہ علماء کو خصوصی جہاز سے اجودھیا لے جائے، کیا وہ عین الکشن سے پہلے مسلمانوں کو مروائے گی تاکہ مسلمان اس کو ووٹ نہ دیں۔

۸ جنوری ۱۹۹۰

۱۹۶۷ سے ۱۹۷۴ تک میں الجمعیۃ ویکلی (دہلی) کا اڈیٹر تھا۔ اس زمانہ میں میں نے الجمعیۃ ویکلی کے تین فائل بنائے۔ جب الجمعیۃ بند ہوا تو اس کے تین مکمل فائل میرے پاس موجود تھے۔ میں نے احتیاط کی غرض سے تینوں فائل تین جگہ رکھوا دئے۔ ایک مجلد فائل محمد احمد صاحب (کشن گنج) دہلی کے گھر پر رکھا۔ اور دوسرا مکمل فائل اپنے بھائی کے پاس، اعظم گڈھ (محلہ بدرقہ) بھیج دیا۔

مگر آج میرے پاس صرف وہی ایک فائل محفوظ ہے جو میں نے خود اپنے پاس رکھا تھا۔ محمد احمد صاحب پہلے میرے ہم خیال تھے۔ بعد کو وہ جماعت اسلامی سے متاثر ہو گئے۔ اس کے بعد وہ میرے مخالف بن گئے۔ اس مخالفت میں وہ یہاں تک گئے کہ انھوں نے الجمعیۃ کی فائل، جو ان کے پاس بطور امانت تھی، اس پر قبضہ کر لیا۔ بہت دن تک میں ان سے تقاضا کرتا رہا، جب دیکھا

کر وہ دینے والے نہیں ہیں تو خاموش ہو گیا۔ اعظم گڈھ کے مکان پر جو فائل تھا، اس کی وہ لوگ حفاظت نہ کر سکے۔ ۱۹۸۹ میں میں نے یہ فائل اعظم گڈھ سے منگوالی۔ مگر جو پارسل مجھے ملا اس میں صرف نصف پرچے تھے۔ بقیہ نصف ضائع ہو گئے۔

انسان کو چاہئے کہ وہ صرف اپنے آپ پر اعتماد کرے۔ اگر اس نے دوسروں کے اعتماد پر کوئی اقدام کیا تو اس کو نہایت تلخ تجربات پیش آئیں گے اور مایوسی اور ناکامی اس پر مستزاد ہو گی۔

۹ جنوری ۱۹۹۰

اردو اخبارات کے بارہ میں میرا تجربہ اتنا تلخ ہے کہ میں اردو اخبارات کی رپورٹ کی بنیاد پر کبھی کوئی مضمون نہیں لکھتا۔ بار بار کے تجربہ میں میں نے پایا ہے کہ اردو اخبارات کی رپورٹنگ نہایت ناقص ہوتی ہے۔

قومی آواز، اسٹاف کے اعتبار سے اردو کا سب سے معیاری اخبار سمجھا جاتا ہے۔ قومی آواز (دہلی) کے شمارہ ۷ جنوری ۱۹۹۰ میں صفحہ اول پر ایک خبر تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ دو بچوں نے غلطی سے ایک سفوف کھالیا۔ وہ زہر تھا۔ چنانچہ اس کو کھاتے ہی بچے مر گئے۔ اس سلسلہ میں یہ جملہ تھا کہ "پولیس کی اطلاع کے مطابق، ان بچوں نے نمک سمجھ کر کوئی سفید پاؤڈر کھانا شروع کر دیا۔"

خبر کا یہ جزء مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ کیوں کہ نمک ایسی چیز نہیں جس کو کوئی شخص "کھانا شروع کر دے"۔ اس کے بعد میں نے انگریزی اخبار میں اس خبر کو تلاش کیا۔ معلوم ہوا کہ پولیس کے اطلاع نامہ میں شکر (sugar) کا لفظ تھا جس کو اردو اخبار میں نمک بنا دیا گیا۔ یہ وہی خبر ہے جس پر میں نے اپنا مضمون "اخلاقی زہر" لکھا۔ یہ مضمون بعد کو الرسالہ ستمبر ۱۹۹۰ میں شائع ہوا۔

۱۰ جنوری ۱۹۹۰

مولانا عبدالغفار حسن صاحب (فیصل آباد، پاکستان) الرسالہ کے مشن سے پوری طرح متفق ہیں۔ تاہم ان کو ایک اختلاف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ الرسالہ میں پاکستان پر کوئی تنقید نہ کی جائے۔ ان کا خط مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۹۸۹ مجھے بہت دیر سے دہلی میں ملا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں: "ایک ضروری گزارش یہ ہے کہ پاکستان کے بارہ میں آپ کے بعض منفی جملے الرسالہ میں پیش نہ آئیں تو یہاں الرسالہ

کے حلقہ کی توسیع بہتر شکل میں ہوسکتی ہے۔ اب جب کہ پاکستان بن چکا ہے تو ایسی تجاویز پیش کی جانی چاہئیں جن سے خرابیوں کی اصلاح ہو اور یہ ملک صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بن سکے۔"

بنیادی سوال یہ ہے کہ قیام پاکستان کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ پاکستان کی صورت میں تقسیم ملک کی محفوظ ترین تعبیر یہ ہوسکتی ہے کہ اس کو ہجرت قرار دیا جائے۔ مگر ہجرت ہمیشہ اتمام حجت کے بعد ہوتی ہے، اس سے پہلے نہیں۔ ہندو قوم مسلمانوں کے لئے مدعو کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر مسلمانوں نے قومی سطح پر اپنی جو نمائندگی کی، وہ یہ تھی کہ انھوں نے ہندو قوم کو نہ تو اسلام کی دعوت دی اور نہ ان پر اتمام حجت کیا۔ اس کے بجائے انھوں نے یہ کیا کہ آغاز ہی میں تقسیم ملک کا مطالبہ لے کر کھڑے ہوگئے۔

حضرت یونس علیہ السلام کی مثال بتاتی ہے کہ دعوت دینے کے باوجود اگر داعی اس کو اتمام حجت تک پہنچائے بغیر ہجرت کر جائے تو اس کو دوبارہ قوم کی طرف واپس آنا پڑتا ہے۔ پھر کیا پاکستانی مسلمان اللہ تعالیٰ کے یہاں حضرت یونس سے بھی زیادہ اونچا مقام رکھتے ہیں کہ انھیں اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنا نہ پڑے۔

میرے نزدیک پاکستانی مسلمانوں کی نجات صرف اس میں ہے کہ وہ حضرت یونس علیہ السلام کی طرح اپنی "ہجرت" کو خطا قرار دے کر اس سے واپس لوٹیں۔ اس واپسی سے میری مراد ارضی اور جغرافی واپسی نہیں ہے بلکہ مزاجی اور فکری واپسی ہے۔ پاکستان کے مسلمانوں نے تقسیم کے بعد "ہندو نفرت" پر اپنی قومی پالیسی کی بنیاد رکھی ہے۔ اس نفرت کو انھیں ذبح کرنا ہوگا۔ سیاسی ڈپلومیسی کے طور پر نہیں بلکہ داعیانہ خیر خواہی کے تحت انھیں ہندو قوم سے خوشگوار تعلق قائم کرنا ہوگا۔ اور یہ سب کچھ یک طرفہ طور پر کرنا ہوگا۔ یہی ان کی واپسی ہے اور اس واپسی کے بغیر پاکستانیوں کے لئے کامیابی کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔

۱۱ جنوری ۱۹۹۰

ہر آدمی دوسروں کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے، مگر کوئی آدمی نہیں جو اپنے آپ کو مرتا ہوا دیکھے۔ دوسروں کی موت کو آدمی صرف دوسروں کی موت سمجھ لیتا ہے۔ دوسروں کی موت میں وہ اپنی موت کی تصویر نہیں دیکھ پاتا۔

اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اپنی موت کا ادراک اپنی نفی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ یہ اپنی ہلاکت سے واقف ہونا ہے۔ اور کون ہے جو خود اپنی نفی کرے۔ کون ہے جو اپنے آپ کو ہلاکت کے تختہ پر چڑھائے۔

۱۲ جنوری ۱۹۹۰

ایک مفکر کا قول ہے کہ مصیبت کے وقت جو چیز آدمی کو بچاتی ہے وہ صرف امید ہے:

In adversity a man is saved by hope.

یہ بات نہایت صحیح ہے۔ میں اس میں صرف یہ اضافہ کروں گا کہ امید کا سب سے بڑا سرچشمہ اللہ کی ذات پر یقین ہے۔ ہر دوسری چیز جس سے امید قائم کی جائے، کہیں نہ کہیں اس کی حد آجاتی ہے۔ کسی نہ کسی وقت وہ آدمی کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ مگر جو شخص اللہ کو پاکر اپنی امیدیں اس سے وابستہ کرلے، اس کے لئے کوئی حد نہیں۔ وہ امید کا ایسا سرا پالیتا ہے جو کسی بھی حال میں اس سے جدا نہیں ہوتا۔

۱۲ جنوری ۱۹۹۰

موجودہ زمانہ کے ملحد مورخین مذہب کو ایک سماجی مظہر (Social phenomenon) کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین اسلام کو ایک تاریخی مظہر (Historical phenomenon) کے طور پر دیکھتے ہیں۔ بظاہر دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ کیوں کہ دونوں ہی اس واقعہ سے بے خبر ہیں کہ مذہب اصلاً ایک روحانی ڈسپلن ہے۔ سچا مذہب فرد انسانی میں ربانی حقیقت کے تمکن سے پیدا ہوتا ہے۔

مذہب ایک لطیف ترین دریافت ہے۔ ایک شخص پر جب حقیقت خداوندی کا انکشاف ہوتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں وہ اپنی عبدیت کو دریافت کرتا ہے تو اسی کا نام مذہب ہے۔ مذہب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے نہ سماجی ظاہرہ ہے اور نہ تاریخی ظاہرہ۔ مذہب دراصل ایک نفسیاتی ظاہرہ ہے۔ مذہب یہ ہے کہ ایک انسان ربانی انسان بن جائے۔ یہ پورا واقعہ نفسیات کی سطح پر ہوتا ہے۔ اس واقعہ کے خارجی اثرات حسب حالات سماج اور تاریخ پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مگر وہ مذہب کا خارجی ظہور ہے نہ کہ مذہب کی اصل حقیقت۔

کراچی کے انگریزی ہفت روزہ ' دی مسلم ورلڈ' کے شمارہ ۱۶ دسمبر ۱۹۸۹ کے ایک مضمون کو دیکھ کر مذکورہ بالا تاثرات میرے ذہن میں آئے۔

۱۴ جنوری ۱۹۹۰

لارڈ چسٹر فیلڈ (Chester Field) ۱۶۹۴ میں لندن میں پیدا ہوا، اور ۱۷۷۳ میں لندن ہی میں اس کی وفات ہوئی۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۳ جنوری ۱۹۹۰) نے اس کا ایک قول نقل کیا ہے کہ سیاست داں نہ محبت کرتے ہیں اور نہ نفرت۔ جذبات نہیں بلکہ مفاد ان کی رہنمائی کرتے ہیں:

Politicians neither love nor hate. Interest, not sentiment, directs them.

مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے روزانہ یہ شکایت کر رہے ہیں کہ سیاست داں اور حکمراں ان کے دشمن ہیں۔ وہ ان کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ اس قسم کی شکایت بالکل لغو ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمان سیاسی لیڈروں کو یہ یقین نہیں دلا سکے کہ ان کا مفاد اس میں ہے کہ وہ مسلمانوں کا ساتھ دیں۔ اس لئے وہ ان لوگوں کا ساتھ دے رہے ہیں جس کا ساتھ دینے میں انھیں اپنا سیاسی فائدہ نظر آتا ہے۔ اس معاملہ میں شکایت اور احتجاج سراسر احمقانہ ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے اندر کوئی ایسی خصوصیت پیدا کریں کہ سیاسی لیڈروں کا مفاد ان سے وابستہ ہو جائے۔ اس کے بعد وہ دیکھیں گے کہ سیاسی لیڈروں کے بارہ میں ان کی شکایت اپنے آپ ختم ہو گئی ہے۔

۱۵ جنوری ۱۹۹۰

قرآن میں ہے کہ تیرے رب کی قسم ہم ان سے ضرور پوچھیں گے (الحجر ۹۲) دوسری طرف قرآن میں ہے کہ اُس دن کسی انسان یا جن سے اس کے گناہ کی بابت نہ پوچھا جائے گا (الرحمٰن ۳۹)

بظاہر ان دونوں آیتوں میں تضاد ہے۔ ایک آیت میں ہے کہ ضرور سوال کیا جائے گا، اور دوسری آیت میں ہے کہ سوال نہ کیا جائے گا۔ مگر یہ تضاد کی بات نہیں۔ اصل یہ ہے دونوں جگہ سوال کا لفظ الگ الگ مفہوم میں ہے۔

ایک سوال وہ ہے جو تحقیق حال کے لئے کیا جائے۔ آخرت میں اس قسم کے سوال کی ضرورت نہ ہوگی۔ کیوں کہ وہاں سب کچھ عیاں ہو جائے گا۔ آدمی کے ارادے اور اس کی نیتیں اس طرح اس کے

چہرے اور جسم پر نمایاں ہو جائیں گے کہ وہ بغیر بولے ہوئے سب کچھ بتا رہا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں آخرت میں کسی مجرم سے اس نوعیت کی پوچھ گچھ کی ضرورت نہ ہوگی جو دنیا کی پولیس کو پیش آتی ہے۔ دنیا میں لوگ باعتبار ظاہر دکھائی دیتے ہیں، آخرت میں لوگ باعتبار باطن دکھائی دیں گے۔

دوسرا سوال وہ ہے جو توبیخ کے لئے کیا جائے۔ اس قسم کا سوال آخرت میں لوگوں سے ہوگا۔ یہ گویا بہ شکل سوال ان کی بابت اس فیصلہ کا اعلان ہوگا جس سے وہ انکار کی جرأت نہ کر سکیں گے۔

۱۶ جنوری ۱۹۹۰

سید اظہر حسن موہانی (۱۸۸۱-۱۸۵۱) کے لڑکے فضل الحسن حسرت موہانی کو 'سید الاحرار' کہا جاتا ہے۔ انھوں نے ۱۹۰۳ میں علی گڑھ سے بی اے پاس کیا۔ ان کو انگریزوں سے اور انگریزی سامان سے شدید نفرت تھی۔ وہ ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے سب سے پہلے عدم تعاون کا نعرہ بلند کیا۔

ماہنامہ جامعہ (نومبر ۱۹۸۹) میں حسرت موہانی پر ایک مضمون ہے۔ اس میں ایک واقعہ ان الفاظ میں درج ہے: بائیکاٹ اور سودیشی تحریک کے دوران انھیں اپنے ایک دوست کے یہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ شدید سردیوں کے دن تھے۔ رات کو اوڑھنے کے لئے میزبان نے انھیں ایک کمبل دیا۔ یہ کمبل چوں کہ سودیشی نہیں تھا، اس لئے حسرت موہانی نے ساری رات سردی میں ٹھٹھرنا گوارا کیا۔ مگر کمبل استعمال نہیں کیا (صفحہ ۸)

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کے اس قسم کے واقعات جن کو فخر کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، وہ صرف نادانی کے واقعات ہیں۔ ان کی کوئی اہمیت نہ دین کے اعتبار سے ہے اور نہ دنیا کے اعتبار سے۔

۱۷ جنوری ۱۹۹۰

اطہر صدیقی صاحب (منٹو روڈ، نئی دہلی) نے ایک واقعہ بتایا۔ یہ واقعہ ۱۵ جنوری ۱۹۹۰ء کو دہلی کے ہولی فیملی اسپتال میں پیش آیا۔

مفتی عبد الخالق (مفتی واڑہ، میرٹھ) ہولی فیملی میں داخل تھے۔ ان کو پیشاب میں تکلیف

ہوگئی تھی اور وہاں ان کا آپریشن ہونا تھا۔ ان کی لڑکی نازلی آل انڈیا میڈیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ملازم ہے۔ انسی ٹیوٹ میں کینسر ریسرچ کا اسپتال (IRCH) ہے، وہاں نازلی لیبورٹری میں ٹیکنیشین کے طور پر کام کرتی ہے۔ کینسر ریسرچ کے اس ادارہ میں ڈاکٹر راجیو کمار پروفیسر ہیں اور لیبورٹری کے انچارج بھی ہیں۔

نازلی نے ڈاکٹر راجیو کمار سے ۱۵ جنوری کے لئے چھٹی لی۔ اس نے ڈاکٹر راجیو کمار کو بتایا کہ اسی دن میرے والد کا ہولی فیملی اسپتال میں صبح ۸ ½ بجے آپریشن ہے، اس لئے میں نہ آسکوں گی۔ ۱۵ جنوری کو تقریباً پونے نو بجے ڈاکٹر راجیو کمار اچانک ہولی فیملی آگئے۔ انھوں نے دیکھا کہ مفتی عبد الخالق ابھی تک آپریشن تھیٹر میں نہیں گئے ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اسپتال والے خون مانگ رہے ہیں، اور چوں کہ مفتی صاحب کا کوئی دوست یا رشتہ دار خون دینے کے لئے موجود نہیں اس لئے آپریشن روک دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر راجیو کمار نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو میں اپنا خون دیتا ہوں۔ مفتی عبد الخالق صاحب نے منع کیا۔ ڈاکٹر راجیو کمار نے کہا کہ اگر آپ اس لئے منع کر رہے ہیں کہ میں ہندو ہوں تو البتہ دوسری بات ہے، ورنہ میں خون دینے کے لئے تیار ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ڈاکٹر راجیو کمار نے اسی وقت پانچ سو سی سی (CC) خون دیا۔ اس کے بعد مفتی عبد الخالق کا آپریشن ہوا۔ ڈاکٹر راجیو کمار کا خون کا بلڈ گروپ بی ہے۔

ہولی فیملی میں کثرت سے مسلمان ہوتے ہیں، مگر کسی نے اپنا خون نہیں دیا۔ اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ ہندو ایک جاندار قوم ہیں۔ افسوس کہ مسلمانوں نے ہندو قوم کو نہیں پہچانا۔ اور انتہائی احمقانہ طور پر ہندوؤں کو اپنا دشمن بنالیا۔

۱۸ جنوری ۱۹۹۰

۲۷ نومبر ۱۹۸۹ کو جے پور میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ ۲۴ نومبر کے الکشن میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے ۸۸ ممبر کامیاب ہو کر ہندستانی پارلیمنٹ میں پہنچ گئے۔ اس کے بعد انھوں نے فتح کی خوشی منائی۔ چنانچہ جے پور میں بھی فتح کا جلوس نکالا گیا۔ اس جلوس میں اس قسم کے نعرے لگائے جا رہے تھے:

بچہ بچہ رام کا، باقی سب حرام کا
مسلمان کے دو استھان، پاکستان یا قبرستان

اس پر مسلمان بھڑک اٹھے۔ انھوں نے جلوس پر پتھراؤ کیا۔ اب دونوں فرقوں میں ٹکراؤ شروع ہوگیا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کو نقصان پہنچایا، ہندوؤں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔ قتل، آتش زنی، لوٹ سے پورا شہر قبرستان ہوگیا۔ مسلمانوں کا زیادہ نقصان ہوا۔ (قومی آواز ۱۶ جنوری ۱۹۹۰)

ان فسادات کا علاج میرے نزدیک صبر و اعراض ہے۔ مسلمان اگر صبر کرلیں تو فساد اول مرحلہ ہی میں ختم ہوجائے اور جان و مال کے نقصان کی نوبت نہ آئے۔ ان ہندو مسلم فسادات کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس ملک میں دعوت کے تمام مواقع بالکل برباد ہوکر رہ گئے ہیں۔

۱۹ جنوری ۱۹۹۰

ملی جمیعۃ علما کا ایک وفد بھاگل پور گیا تاکہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۹ کو ہونے والے فساد کا جائزہ لے۔ اس کی رپورٹ مولانا محمد حنیف صاحب (مالیگاؤں) کے قلم سے شائع ہوئی ہے۔ آغاز میں فرماتے ہیں:

"ہندستان میں فسادات مسلمانوں کا مقدر بن چکے ہیں۔ تقسیم کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوا تو آج تک باقی ہے۔ بھارت کرن کا خواب دیکھنے والے متعصب ہندو کسی طرح یہ نہیں چاہتے کہ مسلمان ہندستان میں اپنے کردار، اسلامی روایات اور مذہبی تشخص کے ساتھ انفرادی حیثیت سے زندہ رہیں۔ لیکن انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام اور مسلمانوں کے سوا کوئی قوم نہیں جس کے پاس اخلاق و کردار اور عقیدہ و فکر کی وہ انمول قدریں موجود ہوں جس پر مذہب کی بنیاد قائم ہے"
(ہفت روزہ ملی جمیعۃ، ۱۲ جنوری ۱۹۹۰)

یہ بات ایک یا دوسرے لفظ میں موجودہ ہندستان کے تمام مسلم رہنما کہتے ہیں۔ ان کا دعوا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے خلاف فساد اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اسلامی تشخص کے ساتھ اس ملک میں رہنا چاہتے ہیں۔ یہ بات سراسر لغو ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قرآن کے صریح بیان سے ٹکرار ہی ہے۔ قرآن میں تو یہ ہے کہ انتم الاعلون ان کنتم مومنین (آل عمران ۱۳۹) اور ان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شیئا (آل عمران ۱۲۰) ان آیات کے مطابق اسلامی تشخص کسی مسلم قوم کو ضرر سے محفوظ رکھتا ہے، وہ اس کے لئے سربلندی کی ضمانت ہے، ایسی حالت میں کیوں کر ممکن

ہے کہ اسلامی شخص ہی کسی قوم کو مبتلائے فساد کرنے کا سبب بن جائے۔

۲۰ جنوری ۱۹۹۰

آج کے اخبارات میں رج نیش کی موت کی خبر تھی۔ خبر کے مطابق، پونہ کے رج نیش پورم میں رج نیش پر دل کا دورہ پڑا اور اس میں ان کا انتقال ہوگیا۔ بوقت انتقال ان کی عمر ۵۸ سال تھی۔

رج نیش کی انگریزی تقریر (آڈیو کیسٹ اور ویڈیو کیسٹ پر) میں نے سنی ہے۔ اس کے اندر تقریر کا غیر معمولی ملکہ تھا۔ اس نے اپنی اس صلاحیت کی بنا پر بے شمار لوگوں کو متاثر کیا۔ امریکہ کی فورڈ کمپنی کا موجودہ وارث بھی ان کے شاگردوں میں تھا۔ وہ ہیرے کی گھڑی پہنتا تھا۔ اس کے پاس ۹۱ رولس رائس کاروں کا قافلہ تھا۔ وغیرہ، وغیرہ۔

پہلے وہ اچاریہ رج نیش کہے جاتے تھے۔ اس کے بعد بھگوان رج نیش کہے جانے لگے۔ آخر میں انھوں نے، اپنے کو صرف رج نیش کہلانا پسند کیا۔ بے شمار دولت اور لاکھوں معتقدین کے باوجود ان کی زندگی آخر میں نہایت خستہ ہوگئی۔ ہندستان ٹائمس (۲۰ جنوری ۱۹۹۰) میں رج نیش کی آخری دنوں کی تصویر ہے۔ اس میں وہ اپنا دونوں ہاتھ اسی طرح اٹھائے ہوئے ہیں جس طرح مسلمان دعا کے وقت دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں۔ رج نیش نے خدا بننا چاہا۔ مگر ان کے آخری انجام نے انھیں بتایا کہ انسان بندہ ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

۲۱ جنوری ۱۹۹۰

ایک انگریزی داں مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہندوؤں کی اور ہندستانی حکومت کی سخت برائی کرتے رہے۔ یہ قوم حد درجہ متعصب ہے۔ یہ انتہائی تنگ نظر ہے۔ اس کا مذہب صرف خود غرضی ہے۔ مسلمانوں کی وہ بدترین دشمن ہے۔ وغیرہ۔ مگر تفصیلات معلوم کرنے کے بعد میرا فیصلہ یہ تھا کہ غلطی خود مذکورہ مسلمان کی ہے۔

وہ ۱۹۵۰ میں ہندستان چھوڑ کر لندن چلے گئے۔ وہاں انھوں نے برٹش پاسپورٹ لے لیا۔ وہ پاکستانیوں کی مدد سے انگریزی میں ایک اخبار (مسلم نیوز) نکالتے رہے۔ اس میں مسلمانوں کے عام انداز کے مطابق ہندستان مخالف مضامین شائع ہوتے تھے۔ لندن میں یہ اخبار نہ چل سکا۔ اس کے بعد وہ پاکستان چلے گئے اور وہاں سے دوبارہ اپنا اخبار جاری کیا۔ مگر پاکستان میں بھی

بالآخر اس کو بند کرنا پڑا۔ اس کے بعد وہ ہندستان لوٹ آئے۔ اب انھیں شکایت ہے کہ ہندستانی حکومت انھیں شہریت نہیں دے رہی ہے۔

یہی عام مسلمانوں کا مزاج ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ جو چاہیں کریں، مگر انھیں اپنے عمل کا نتیجہ بھگتنا نہ پڑے۔ جو شخص ہندستان چھوڑ دے اور انگلینڈ اور پاکستان سے ایسا اخبار نکالے جو ہندستان کی نظر میں قابل اعتراض ہو، اس کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو مذکورہ مسلمان کے ساتھ ہوا۔ مگر انھیں اپنی غلطی کا اعتراف نہیں۔

۲۲ جنوری ۱۹۹۰

"افسانہ" سے متعلق مضمون میں یہ سطریں پڑھنے کو ملیں: افسانوں کا فن ایک ایسا فن ہے جس کے ذریعہ قاری کو گرفت میں لے کر اس طرح متاثر کیا جاسکتا ہے کہ اسے اس کی خبر تک نہیں ہونے پاتی"۔

جذباتی تاثر کے لئے یہ بات صحیح ہوسکتی ہے۔ مگر کسی حقیقی ذہنی تبدیلی کے لئے یہ بالکل بے معنی بات ہے۔ ذہنی تبدیلی ایک شعوری واقعہ ہے۔ جب تک آدمی کے شعور کو بدلا نہ جائے، اس کے اندر کوئی ذہنی انقلاب نہیں آسکتا۔ اور شعوری تبدیلی ایک باخبری کا عمل ہے، اس کو بے خبری کے ذریعہ ظہور میں لانا ممکن نہیں۔

۲۳ جنوری ۱۹۹۰

بدر الدین احمد صاحب (پیدائش ۱۹۲۸) مراد آباد کے رہنے والے ہیں۔ وہ کئی سال سے الرسالہ پڑھ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے الرسالہ سے کیا سبق لیا۔ انھوں نے کہا کہ بہت سا سبق۔ اس میں سے خاص سبق جو میں نے لیا وہ اعراض ہے۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ کے علاوہ میں نے کہیں صبر و اعراض کی بات نہیں سنی۔ حالاں کہ یہ زندگی کا راز ہے۔ اور خود میں نے اپنے تجربہ میں پایا ہے کہ یہ مسائل کا بہترین حل ہے۔

الرسالہ کے پڑھنے والے بیشتر لوگ اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے قوم کے افراد کو صرف لڑنا بھڑنا، جلسہ جلوس کرنا، نعرہ لگانا سکھایا۔ کسی نے بھی یہ نہیں کیا کہ وہ لوگوں کو زندگی کا راز بتائے۔

۲۴ جنوری ۱۹۹۰

پچھلے چند مہینوں سے کشمیر میں توڑ پھوڑ کی سیاست جاری ہے۔ ہندستان میں ان لوگوں کو دہشت گرد کہا جاتا ہے۔ مگر کشمیر میں ان کو مجاہد، جنگ جو اور حریت پسند کے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ اس وقت تقریباً سو تنظیمیں کشمیر میں سرگرم ہیں:

کشمیر لبریشن فرنٹ، پیپلس لیگ، آپریشن بالاکوٹ، حزب اسلامی، حزب اللہ، اللہ ٹائگرز، حزب المجاہدین، ضیا ٹائگرز، ضرب مومن، حزب جہاد، اسلامک اسٹوڈینٹس لیگ، البدر، حزب مومن، العمر مجاہدین، اسٹوڈینٹس لبریشن موومنٹ، الکربلا، الخمینی، حسینی ٹائیگرز۔ وغیرہ

آخری ۳ تنظیمیں شیعہ مسلمانوں کی ہیں، اور بقیہ سنی مسلمانوں کی۔ ہر تنظیم آزاد ہے۔ ان میں سے کچھ تنظیمیں آزاد کشمیر کا نعرہ لگا رہی ہیں اور کچھ الحاق پاکستان کا۔ کچھ تنظیمیں سیکولر ہیں اور کچھ اسلامی نعرے استعمال کر رہی ہیں۔

اس قسم کی تحریک جیسی کہ آجکل کشمیر میں اٹھی ہے، اس کے لئے صرف دو میں سے ایک تباہی مقدر ہے۔ یا تو یہ کہ ہندستان اس کو فوجی طاقت سے کچل دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ یہ تحریک اپنے مقصد کو پالے اور کشمیر کو آزادی حاصل ہو جائے۔ مگر یہ کامیابی بھی بہت جلد ناکامی میں تبدیل ہو جائے گی۔ کیوں کہ جو لوگ آج ہندوؤں سے لڑ رہے ہیں وہ آئندہ خود آپس میں لڑینگے۔

۲۵ جنوری ۱۹۹۰

آج میں نے اپنے لڑکے ثانی اثنین کو اپنے کمرہ میں بلایا۔ میں نے کہا کہ میری صحت اب بہت کمزور ہو گئی ہے۔ کچھ نہیں معلوم کہ میری زندگی کے کتنے دن اور باقی ہیں۔ میں نے کئی بار سوچا کہ میں اپنے بعد کے لئے تم کو کچھ نصیحت یا ہدایت لکھ دوں۔ اس سلسلہ میں کئی کاغذ لکھے۔ مگر لکھ کر انھیں پھاڑتا رہا۔ کوئی نصیحت یا وصیت نامہ مجھے کافی نظر نہیں آیا۔

میری زندگی کا تجربہ یہ ہے کہ حالات اتنے غیر متوقع طور پر بدلتے ہیں کہ پیشگی طور پر کوئی شخص ان کو جان نہیں سکتا اور نہ ان کے بارہ میں کوئی صحیح نصیحت کر سکتا۔ اس لئے اب میں اپنے بعد کے لئے نہ تمہیں کوئی مشورہ دے رہا ہوں اور نہ کوئی وصیت۔ صرف ایک بات کی تم کو تاکید کرتا ہوں، اور وہ دعا اور استخارہ ہے۔ میرے بعد جو بھی صورت پیش آئے، تم ہمیشہ دعا اور استخارہ کرتے

رہنا۔ یہی واحد آخری نصیحت ہے جو میں تم کو کر رہا ہوں۔ میں خود ساری زندگی دعا اور استخارہ کے تحت کام کرتا رہا ہوں، تم بھی یہی کرنا۔ انشاء اللہ تم کو اللہ تعالٰی کی طرف سے رہنمائی ملتی رہے گی۔

۲۶ جنوری ۱۹۹۰

سوویت روس کا وہ حصہ جو ترکی اور ایران سے ملتا ہے، اس میں آجکل جنگ جاری ہے۔ یہاں آذربائیجان کے علاقہ میں شیعہ مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اور آرمینیا کے علاقہ میں عیسائیوں کی اکثریت۔ عیسائی تعلیم اور تنظیم میں آگے ہونے کی وجہ سے اس علاقہ کے اہم اقتصادی اداروں پر قابض ہیں، حتی کہ آذربائیجان کے مسلم علاقہ میں بھی۔

اس کے خلاف عرصہ سے مسلمانوں میں ناراضگی پائی جاتی تھی۔ ایران نے اس کو شہ دیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں لڑائی شروع ہو گئی۔ روسی حکومت نے اس کو دبانے کی کوشش کی تو وہ لوگ خود حکومت سے لڑ گئے۔ آجکل اخبارات میں روزانہ اس کی خبریں آرہی ہیں۔

یہی صورتحال اکثر مقامات پر ہے۔ مگر یہ اقتصادی پسماندگی کو دور کرنے کا طریقہ نہیں۔ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پچھڑے ہوئے طبقات میں علم اور شعور پیدا کیا جائے۔ دوسروں سے لڑ کر کوئی قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

۲۷ جنوری ۱۹۹۰

نظام الدین ایسٹ میں ایک مسلم اسکول (نیو ہورائزن) ہے۔ یہاں اوکھلے کا ایک مسلم لڑکا زیر تعلیم ہے۔ اس لڑکے نے اپنے گھر یا مسلمانوں کی مجلس میں ہندو مسلم فساد کا ذکر سنا تھا۔ اس کے مطابق اس نے کہا کہ ہندو بہت ظالم ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کو جلاتے ہیں، مارتے ہیں۔ وغیرہ۔ میں اس کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ آخر میں میں نے کہا کہ اگر ایک لڑکا آئے اور تم کو ایک گھونسا مارے تو تم کیا کرو گے۔ اس نے جوش کے ساتھ کہا کہ میں اس کو سو گھونسا ماروں گا۔ میں نے کہا کہ ہندو مسلم فساد کا قصہ بھی یہی ہے۔ مسلمان ہندوؤں کو ایک گھونسا مارتے ہیں تو ہندو انھیں سو گھونسا مارتے ہیں۔ مسلمان ہندوؤں کے جلوس پر پتھر پھینکتے ہیں تو ہندو ان کے اوپر گولیوں کی بوچھار کر دیتے ہیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم گھرانے نوجوانوں کو کس قسم کی تربیت دے رہے ہیں۔

۲۸ جنوری ۱۹۹۰

محمد یونس سلیم صاحب (پیدائش ۱۹۱۲) ملاقات کے لئے آئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ حیدر آباد کے ایک مسلم نوجوان نے دہلی میں تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ ہماری جو مانگ ہے اس کو پہلے ہم نے اردو میں کہا، مگر آپ نے کچھ نہیں کیا۔ ہم نے خیال کیا کہ آپ شاید اردو نہیں سمجھتے۔ اس کے بعد ہم نے انگریزی میں اپنی مانگ آپ کے سامنے رکھی۔ مگر اب بھی آپ نے کچھ نہیں کیا۔ اب ہم نے طے کیا ہے کہ پنجابی میں آپ سے بات کریں۔ شاید یہی ایک زبان ہے جس کو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ (پنجابی زبان سے مراد تشدد کی زبان ہے)

یہی موجودہ مسلمانوں کا عام ذہن ہے۔ کوئی اس بات کو ایک لفظ میں کہتا ہے اور کوئی دوسرے لفظ میں۔ یہ باتیں صرف مسلمانوں کی مایوس نفسیات کی علامت ہیں، وہ اصل مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔

۲۹ جنوری ۱۹۹۰

تقسیم کے بعد ہندستان کے مسلمان عام طور پر پاکستان کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ لوگوں کے ذہن میں پاکستان کا ایک افسانوی تصور تھا۔ ہر آدمی اس انتظار میں رہتا تھا کہ موقع ملے تو وہ پاکستان چلا جائے، تاکہ وہ اپنے خوابوں کی دنیا پا سکے اور وہاں ترقی کرے۔

مگر ۱۹۷۱ میں جب خود پاکستان کے دو حصے (مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان) آپس میں بدترین لڑائی لڑے اور بالآخر دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تو مسلمانوں کے اندر نئی سوچ پیدا ہوئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ انھیں ہندستان ہی میں رہنا ہے اور یہیں کام کرنا ہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ ۱۹۷۱ کے بعد ہندستان کے مسلمانوں نے اقتصادی میدان میں کافی ترقی کی ہے۔ اور اس کی وجہ ان کا یہی ذہنی استحکام ہے جو بنگلہ دیش بننے کے نتیجہ میں ان کے اندر پیدا ہوا۔

اب شاید اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کا دوسرا انتظام کشمیر کی صورت میں کیا ہے۔ ۱۹۸۹ کے آخر میں کشمیر میں دہشت گردی شروع ہوئی جو اب شدت کے ساتھ جاری ہے۔ کشمیر کے مسلمان "آزاد کشمیر" کا نعرہ لے کر کھڑے ہوئے ہیں۔ پاکستان در پردہ ان کا ساتھ دے رہا ہے۔ اور بموں اور گولیوں کے ذریعہ یہ تحریک پورے زور شور کے ساتھ چلائی جا رہی ہے۔ مگر تقریباً یقینی ہے کہ ہندستان اپنی فوجی قوت کے ذریعہ اس متشددانہ تحریک کو کچل دے گا۔ اس کے بعد کشمیری بالکل خاموش

ہوکر ہندستان کا حصہ بن کر رہنے لگیں گے۔

جس دن ایسا ہوگا اس دن ہندستانی مسلمانوں کی اصلاح کا کام مکمل ہو جائے گا۔ ہندستان کے مسلمانوں کا اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ان کے اندر عدم برداشت کا مزاج ہے جس کے نتیجہ میں بار بار ہندوؤں سے ٹکراؤ ہوتا ہے اور یک طرفہ طور پر مسلمان برباد ہوتے ہیں۔ کشمیر کی موجودہ تحریک کی ناکامی سے مسلمانوں کے موجودہ ذہن کی حوصلہ شکنی ہوگی۔ اور وہ برداشت کے ساتھ رہنے پر راضی ہو جائیں گے۔ جب ایسا ہوگا تو اس کے فوراً بعد مسلمانوں کی ترقی کا سفر بھی بلا رکاوٹ شروع ہو جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔

۳۰ جنوری ۱۹۹۰

بلیا سے ایک مسلمان وکیل صاحب کا خط موصول ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ " بعد احترام عرض ہے کہ میں قوم وملت کے فلاحی سلسلے میں ایک پٹیشن (petition) عدالت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں کچھ اعداد وشمار کی اشد ضرورت ہے "

مسلمان تقریباً ۵۰ برس سے یہی کر رہے ہیں۔ وہ اپنی فلاح اور ترقی کے لئے قانون اور حکومت کی طرف دیکھتے ہیں۔ اور جب قانون اور حکومت کی طرف سے ان کی امیدیں پوری نہیں ہوتیں تو وہ ان کے خلاف احتجاج اور فریاد میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

میرے نزدیک یہ بات لغویت کی حد تک بے فائدہ ہے۔ کسی قوم یا فرد کی فلاح وترقی کا دار ومدار اس کی اپنی محنت پر ہے نہ کہ قانون اور حکومت پر۔ مسلم رہناؤں نے اس معاملہ میں مسلمانوں کو نہایت غلط رہنمائی دی۔ انھوں نے مسلمانوں کو یہ نہیں بتایا کہ تمہارے مسائل کا سبب تمہاری اپنی کوتاہیاں ہیں۔ وہ اس معاملہ میں ہمیشہ حکومت اور قانون کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہی مسلمانوں کا عام ذہن بن گیا۔ اب مسلمانوں کی سب سے بڑی خیرخواہی یہ ہے کہ ان کے اس ذہن کو بدلا جائے۔ ان کے ذہن کو خارج سے ہٹا کر داخل کی طرف موڑ دیا جائے۔

۳۱ جنوری ۱۹۹۰

۳۰-۳۱ جنوری ۱۹۹۰ کو میں پپلی مزرعہ (پنجاب) میں تھا۔ یہ ضلع انبالہ

(پنجاب) کا ایک گاؤں ہے۔ اب اس کو جمنا نگر میں شامل کرکے ہریانہ کا جزء بنادیا گیا ہے۔

یہاں میری ملاقات ایک مسلمان سے ہوئی۔ ان کی عمر ۱۱۵ سال ہے۔ ابھی تک وہ چلتے پھرتے ہیں۔ انھیں عینک کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے پیروں پر چلتے ہوئے مجھ سے ملاقات کے لئے آئے۔ تاہم ان کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ قبر کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ انسان اگر ۵۰ سال یا ۶۰ سال میں نہ مرے، تب بھی وہ "۱۱۵ سال" سے زیادہ جی نہیں سکتا۔ اس دنیا میں اربوں اور کھربوں انسان پیدا ہوئے۔ مگر ان میں سے کوئی شخص بھی ہمیشہ کے لئے زندہ نہ رہ سکا۔

یکم فروری ۱۹۹۰

ابن تیمیہ کی ایک مشہور کتاب الصارم المسلول علی شاتم الرسول ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اس نقطۂ نظر کی حمایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شتم کرنے والا علی الاطلاق طور پر قابل قتل ہے۔

اس سلسلہ میں ابن تیمیہ کے سامنے یہ سوال آیا کہ عرب کے بہت سے لوگ جو مسلم طور پر شتم اور ایذا رسانی کے مجرم تھے، اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں قتل نہیں کرایا۔ مثلاً عبد اللہ بن ابی کو۔ ابن تیمیہ نے اس کی جو توجیہ کی ہے وہ نہایت عجیب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تو یہ فرمایا کہ عبد اللہ بن ابی کو ہم اس لئے قتل نہیں کر رہے ہیں کہ لوگ یہ کہہ کر ہم کو بدنام کریں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کر رہے ہیں۔ مگر ابن تیمیہ نے یہ لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ابی کو اس لئے قتل نہیں کیا کہ اسلام اس وقت کمزور تھا۔ (صفحہ ۱۷۵)

دوسرے لفظوں میں یہ کہ رسول اللہ نے اپنے قول کے مطابق عبد اللہ بن ابی کو بر بنائے اصول قتل نہیں کیا۔ مگر ابن تیمیہ یہ کہتے ہیں کہ آپ نے اس کو بر بنائے ضعف قتل نہیں کیا۔ استغفر اللہ۔

۲ فروری ۱۹۹۰

۳ جنوری ۱۹۹۰ کو حیدرآباد میں ایک نام نہاد سمینار ہوا۔ اس کا موضوع "اسلام میں اہانت رسول کی سزا" تھا۔ حیدرآباد کے کچھ لوگوں نے مجھے بتایا کہ یہ سمینار میرے مخالفین نے کیا تھا اور اس کا مقصد میرے بارہ میں یہ بیان جاری کرنا تھا کہ میں نے نعوذ باللہ اہانت رسول کا

جرم کیا ہے۔ سیمنار کے شرکا اس کی جرأت تو نہ کر سکے۔ البتہ اس کے صدر نے اپنے خطبہ میں دہلی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کا یہ جملہ نقل کیا کہ وحید الدین خاں صاحب کو اہانت امت کی سزا ملنی چاہئے۔" (ماہنامہ دعوت وعزیمت، دہلی، فروری ۱۹۹۰، صفحہ ۳۷)

مذکورہ "خطبہ" میں مزید کہا گیا کہ "ہندستان کے تمام چوٹی کے علماء، خواہ ان کا تعلق مدارس اسلامیہ سے ہو یا مختلف اسلامی تحریکوں سے، وہ سب وحید الدین خاں کی تحریروں کو وقت کا ایک بڑا فتنہ سمجھتے ہیں۔" صفحہ ۳۸۔

آج اگر میں اس پر کوئی تبصرہ کروں تو شاید وہ قبل از وقت ہوگا۔ اس لئے میں اس پر فیصلہ کو مستقبل کے لئے چھوڑتا ہوں۔ اور اگر دنیا میں اس کا فیصلہ نہ ہو سکا تو قیامت کے دن تو بہر حال اس کا فیصلہ ہونا ہے جہاں فیصلہ کا اختیار تمام تر خداوند ذو الجلال کو ہوگا نہ کہ ان شخصیتوں کو جن کو لوگوں نے آج "چوٹی کے علماء" کا لقب دے رکھا ہے۔

۳ فروری ۱۹۹۰

آج ٹائمس آف انڈیا نے ایک شخص کا قول نقل کیا ہے —— صرف داعیہ وہ چیز ہے جو لوگوں کے اعمال میں کردار کی صفت پیدا کرتا ہے:

It is motive alone that gives character to the actions of men

یہ بات فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ انسان کے ظاہری اعضا سب کے سب دماغ کی ہدایت کے تحت متحرک ہوتے ہیں۔ اس لئے قدرتی طور پر اعمال میں اصل اہمیت داعیہ یا محرک کی ہو جاتی ہے۔ کسی فرد یا قوم کو دوبارہ اٹھانے کے سلسلہ میں اصل کام یہ ہے کہ اس کے اندر گہرا داعیہ پیدا کر دیا جائے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ حرکت میں آجائے گا۔ داعیہ پیدا ہونے کے بعد کوئی رک نہیں سکتا۔ اسی طرح داعیہ کے بغیر عملی سرگرمیوں کا ظہور میں آنا بھی ممکن نہیں۔

۴ فروری ۱۹۹۰

مولانا بدر جمال اصلاحی (۴۲ سال) ملاقات کے لئے آئے۔ وہ سرائمیر اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں اور آجکل جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ میں استاد ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ عرب عالم محمد المجذوب کی ایک کتاب مشاہداتی فی الہند ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے تفصیل سے میرا ذکر کیا

ہے اور لکھا ہے کہ وحید الدین خاں جس انداز میں دین کی خدمت کر رہے ہیں، وہی آج دین کی خدمت کرنے کا صحیح طریقہ ہے۔ وغیرہ

مولانا بدر جمال صاحب نے بتایا کہ مولانا ابو بکر غازی پوری سعودی عرب گئے۔ وہاں ان کی ملاقات شیخ محمد المجذوب سے ہوئی۔ مولانا ابو بکر نے ان سے کہا کہ وحید الدین خاں کا آپ نے اپنی کتاب میں اتنے شاندار انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ حالاں کہ وہ تو ایک بے حیثیت آدمی ہیں۔ شیخ محمد المجذوب نے جواب دیا کہ اس معاملہ میں آپ مجھے معاف رکھیں۔ کیوں کہ آپ لوگوں (ہندستانی علماء) کا ذہن بہت تنگ ہے۔ وہ اپنے سوا کسی کا اعتراف کرنا نہیں جانتے۔

۵ فروری ۱۹۹۰

ٹائمس آف انڈیا نے کسی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ـــــ کچھ لوگوں کے لئے سونے سے بھی زیادہ محبوب چیز عزت ہوتی ہے:

To few is honour dearer than gold.

سونا صرف اس شخص کے لئے اہمیت رکھتا ہے جس کو ابھی سونا نہ ملا ہو۔ جس آدمی کو سونا مل جائے، اس کے لئے ساری اہمیت عزت و شہرت کی ہو جاتی ہے۔ ایک صاحب منصب نے ایک بار فخر کے ساتھ کہا تھا کہ مجھ کو سونے اور چاندی کے سکوں سے خریدا نہیں جا سکتا۔ اس پر میں نے یہ تاثر درج کیا تھا کہ ـــــ کچھ لوگ فخر کرتے ہیں کہ وہ چاندی اور سونے کے سکوں میں بک نہیں سکتے۔ مگر عین اسی وقت وہ شہرت و عزت کے سکوں میں بکے ہوئے ہوتے ہیں۔

۶ فروری ۱۹۹۰

آج اردو اخبار قومی آواز کے پہلے صفحہ کی جلی سرخی یہ تھی: ' ۴ ہزار پاکستانی دراندازوں کی جموں میں تخریب کاری ' بظاہر اس کا مطلب یہ تھا کہ چار ہزار پاکستانی جموں کی آبادی میں گھس آئے ہیں اور ہندستانی علاقہ (جموں) میں تخریبی کارروائیاں کر رہے ہیں۔

اس کو پڑھ کر میں نے سمجھا کہ آجکل دونوں ملکوں میں جس جنگ کی بات ہو رہی تھی، وہ جنگ شاید شروع ہو گئی۔ مگر آج کا ٹائمس آف انڈیا دیکھا تو اس کی سرخی یہ تھی:

4000 Pakistanis try to cross over

واقعہ کے اعتبار سے انگریزی سرخی صحیح تھی۔ کیوں کہ اصل واقعہ یہ تھا کہ جموں شہر سے ۲۵ کیلو میٹر کے فاصلہ پر رنبیر سنگھ پورہ کے پاس پاکستان کی طرف سے تقریباً ۴ ہزار آدمی ہندستان مخالف نعرہ لگاتے ہوئے آئے۔ اور سرحد پار کرکے ہندستانی علاقہ میں گھسنے کی کوشش کی۔ مگر ہندستانی فوجیوں نے ان کے اوپر فائرنگ کی۔ چند آدمی مرے اور کچھ زخمی ہوئے۔ اس کے بعد وہ لوگ واپس بھاگ گئے۔

اردو اخبار کی سرخی زرد صحافت کی مثال ہے۔ اور یہ زرد صحافت اردو اخبارات میں شروع سے چھائی رہی۔ الہلال سے لے کر اب تک اردو اخبارات کا یہی انداز رہا ہے۔

۷ فروری ۱۹۹۰

میرے لڑکے ثانی اثنین کے یہاں پچھلے ماہ چوتھا بچہ پیدا ہوا ہے۔ مگر ہمارے یہاں ابھی تک کوئی کھلونا نہیں آیا ہے۔ میں نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ گھر میں کھلونا داخل نہ ہو۔ کل میں گھر کے اندر گیا تو ثانی اثنین کی بچی سعدیہ (۱۰ سال) خوشی خوشی ایک کھلونا لائی اور مجھ کو دکھا کر کہنے لگی کہ یہ ہماری پھوپھی نے ہم کو دیا ہے۔ مجھے غصہ آگیا۔ میں نے کھلونا اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور اس کو نیچے الماری میں بند کر دیا۔

سعدیہ روتی رہی۔ مگر میں نے کھلونا اس کو نہیں دیا۔ اگلے دن میں گھر کے اندر گیا تو میری بیوی (سعدیہ کی دادی) نے کہا کہ سعدیہ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ اللہ میاں تو دادا سے بھی زیادہ بڑے ہیں۔ میں نے کہا ہاں۔ اس نے کہا کہ اگر اللہ میاں چاہیں تو وہ دادا سے ہم کو کھلونا دلوا دیں گے۔ میں نے کہا کہ ہاں۔ اس کے بعد سعدیہ سجدہ کی حالت میں جا کر کہنے لگی: اللہ میاں، دادا سے ہم کو کھلونا دلوا دیجئے۔

یہ واقعہ سن کر میرا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے کھلونا لا کر سعدیہ کو دے دیا۔ خدا کا نام درمیان میں آنے کے بعد مجھے اچھا نہیں لگا کہ میں کھلونا سعدیہ کو نہ دوں۔

۸ فروری ۱۹۹۰

۱۹۸۸ کے آخر میں سلمان رشدی کی کتاب شیطانی آیات (The Satanic Verses) شائع ہوئی۔ ۱۴ فروری ۱۹۸۹ کو ایران کے آیت اللہ الخمینی نے فتویٰ دیا کہ رشدی سزائے موت کا مستحق ہے، اس کو قتل کر دیا جائے۔ مسلم علما اور دانشوروں اور رہنماؤں نے اس فتوے کی پرزور حمایت کی۔

رشدی کے خلاف بے شمار جلسے اور جلوس کے مظاہرے ہوئے۔ مگر رشدی برطانی پولیس کی حفاظت میں زندہ رہا۔ اور آیت اللہ خمینی ۳ جون ۱۹۸۹ کو انتقال کر گئے۔ اس کے علاوہ بہت سے مسلمان اپنے پر تشدد مظاہروں میں ہلاک ہو گئے۔

ہفت روزہ نئی دنیا (۹ فروری ۱۹۹۰) نے لکھا ہے کہ "لندن کے ایک ہوٹل کے کمرہ میں ایک بم دھماکہ میں ایک ۲۱ سالہ فرانسیسی مسلمان ہلاک ہو گیا۔ اس واقعہ کی تحقیقات کے نتیجہ میں انکشاف ہوا ہے کہ ہوٹل کے کمرہ میں یہ فرانسیسی مسلمان بم بنا رہا تھا جس کے اچانک پھٹ جانے سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ ایک گروپ نے جس کا ہیڈ کوارٹر بیروت میں ہے، دعوا کیا ہے کہ یہ بم سلمان رشدی کو قتل کرنے کے لئے بنایا جا رہا تھا مگر بدقسمتی سے بم بنانے والا خود ہی اپنے بم کا شکار ہو گیا۔ وہ رشدی کو اس کا نشانہ نہ بنا سکا" صفحہ ۴

اس قسم کے واقعات محض اتفاقی ہوتے ہیں۔ مگر اسی قسم کا کوئی اتفاق جب کسی مفروضہ بزرگ کے معاملہ میں پیش آجائے تو وہ ان کے معتقدین کی نگاہ میں بزرگ کی بزرگی کو آخری طور پر مسلم اور ثابت شدہ بنا دیتا ہے۔ اگر یہ کوئی معیار ہو تو ایسے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اس کے مطابق رشدی کو بھی ایک بزرگ تسلیم کریں۔

۹ فروری ۱۹۹۰

پاکستان کے اخبار نوائے وقت (یکم فروری ۱۹۹۰) میں صفحۂ اول پر ایک خبر ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ لاہور میں ۳۱ جنوری ۱۹۹۰ کو ایک جلسہ ہوا۔ اس کے مقررین میں پاکستان کے سابق چیف جسٹس یعقوب علی خاں بھی تھے۔ انھوں نے کہا کہ:

"عدلیہ کے ارکان کا فرض انصاف فراہم کرنا ہوتا ہے۔ انھیں اس بات کو پیش نظر نہیں رکھنا چاہئے کہ ان کے فیصلہ سے کوئی خوش ہوتا ہے یا ناخوش۔ اور اس کے فیصلہ سے اس کی ذات پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اگر کسی جج کو اس کے حلف کے خلاف کسی عہدہ پر فائز رہنے پر مجبور کیا جائے تو اس کے لئے اس عہدہ کو خیرباد کہنا ہی دانش مندی ہوگی۔ پاکستان کی عدلیہ سے بعض ایسے فیصلے صادر ہوئے ہیں جن سے خود عدلیہ نے اپنے ہی مختلف فیصلوں کے بخئے ادھیڑ دئے۔ انھوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ اگر نصرت بھٹو کیس (بمقابلہ ضیاء الحق) میں نظریۂ ضرورت کے تحت "انحراف" کی

اصطلاح نہ نکالی جاتی تو ہماری سیاسی تاریخ آج قطعی مختلف ہوتی۔ سپریم کورٹ اگر نصرت بھٹو کیس میں یہ فیصلہ دیتی کہ مارشل لا حکومت قانونی نہیں ہے تو اس سے پوری قوم کا ضمیر جاگ اٹھتا۔"

جنرل محمد ضیاء الحق نے ۵ جولائی ۱۹۷۷ کو پاکستان میں فوجی انقلاب کیا اور ذوالفقار علی بھٹو کی منتخب حکومت کو ختم کر کے خود صدارت کے تخت پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد انھوں نے "قانون ضرورت" کے تحت اپنی حکومت کے حق میں جواز کا فیصلہ حاصل کر لیا۔ یہ ایک روایت کو توڑنا تھا۔ جب صدر ریاست اس طرح کی روایت کو توڑے تو پوری قوم روایت شکنی کی راہ پر چل پڑتی ہے۔ اس کے بعد کوڑے کی منطق سے اس کو روایت شکنی سے روکا نہیں جاسکتا۔

۱۰ فروری ۱۹۹۰

طرابلس سے ٹیلیفون آیا۔ شیخ محمد سلیمان القائد نے انگریزی کتابیں زیادہ تعداد میں مانگی ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی الرسالہ ہر ماہ ۳۰ عدد بھیجنے کے لئے کہا۔ انھوں نے بتایا کہ لیبیا کے علاوہ مغرب اور تیونس وغیرہ میں بھی الرسالہ کا مشن پھیل گیا ہے۔ اور بڑی تعداد میں لوگ اس کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔

شیخ محمد سلیمان القائد میں تنظیم کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ انھوں نے الرسالہ کے مشن کو بخوبی طور پر سمجھا ہے۔ وہ رات دن محنت کر کے اس مشن کو پھیلانے میں مشغول ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس مشن کے "لینن" ہیں۔ جس طرح مارکس کے نظریہ کو لینن نے عملاً قائم کیا۔ الرسالہ کی فکر کو ان شاء اللہ وہ عملاً قائم کریں گے۔ اس رخ پر وہ تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔

۱۱ فروری ۱۹۹۰

آج ایک نوجوان ڈاکٹر آئے۔ انھیں عرب میں ایک کام مل گیا ہے۔ وہ ۳ مارچ کو وہاں کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔ ان کے ماموں اس سے پہلے عرب میں رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میرے ماموں نے مجھ کو یہ نصیحت کی ہے کہ تم جب وہاں پہنچو تو بس اپنے کام سے کام رکھنا۔ کوئی چیز خلاف مزاج دیکھو تو اس پر تنقید نہ کرنا۔ وہاں کے نظام سے مکمل مطابقت کر کے رہنا۔

میں نے کہا کہ آپ کے ماموں صاحب نے آپ کو بہت اچھی اور کارآمد نصیحت کی ہے۔ مگر ماموں صاحب سے کہئے کہ یہی نصیحت وہ ہندستان کے مسلمانوں کو بھی کریں۔ میں نے کہا کہ یہ عجیب

بات ہے کہ مسلمان عرب میں جاتے ہیں تو وہاں کے نظام سے خوب ایڈجسٹ کرکے رہتے ہیں۔ مگر ہندستان میں وہ ایڈجسٹ کرکے رہنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان جس طرح باہر کے ملکوں میں وہاں کے حالات سے مطابقت کرکے رہتے ہیں، اسی طرح اگر وہ ہندستان میں رہنے لگیں تو ان کے سارے مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں۔

۱۲ فروری ۱۹۹۰

انڈین اکسپریس (۱۰ فروری ۱۹۹۰) میں کشمیر کے بارہ میں ایک نہایت منصفانہ اور آزادانہ مضمون چھپا ہے۔ اس کے لکھنے والے ایک ہندو صحافی اروند کلا (Arvind Kala) ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وادی کشمیر، جہاں ۹۵ فیصد مسلمان آباد ہیں، ان کے ساتھ آزادی کے بعد سے برابر ناانصافی ہوتی رہی ہے۔ خاص طور پر الکشن میں بہت زیادہ دھاندلی کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے ان کے اندر مایوسی پیدا ہوئی ہے۔ اور وہ آزاد کشمیر یا الحاق پاکستان جیسے نعرے لگا رہے ہیں۔ اس کا جواب گولی نہیں ہے بلکہ ان کو مطمئن کرنا ہے۔

اس سلسلہ میں مضمون نگار نے لکھا ہے کہ عقلمندی یہ ہے کہ جب کشمیری یہ کہیں کہ ہم انڈیا سے الگ ہونا چاہتے ہیں تو اس پر بہت زیادہ ردعمل ظاہر نہ کیا جائے:

It is wise not to over-react when Kashmiris say they want to leave the Indian Union.

یہ ایک نہایت اہم اصول ہے۔ اکثر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جو لفظ بولتا ہے وہ اس کے اصل جذبات سے زیادہ ہوتا ہے۔ وہ شدت اظہار کا مظہر ہوتا ہے نہ کہ بیان واقعہ کا۔ اگر اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو مخالف فریق سے معاملہ کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔

۱۲ فروری ۱۹۹۰

آج رات کو خواب میں ایک چھپا ہوا اخباری مضمون پڑھا۔ اس میں ایک "ٹاپر" کا قصہ تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ تم کو یہ کامیابی کیسے ملی۔ اس نے مختصر جواب دیا کہ میں نے پڑھا، میں نے ٹاپ کیا۔ اس کے بعد میں نے خواب ہی میں الرسالہ کے صفحہ اول کے لئے ایک مضمون بنایا جو اس طرح تھا۔

طالب علم : میں نے پڑھا
میں نے محنت کی
میں نے ٹاپ کیا

۱۴ فروری ۱۹۹۰

کچھ مسلم نوجوانوں سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تعلیم حاصل کرو۔ مگر جب مسلمانوں کو اسکول اور کالج میں داخلہ ہی نہ ملے تو پڑھیں گے کیوں کر۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل بے بنیاد عذر ہے۔ میرے بھائی عبد المحیط خاں اور میرے بھتیجے شکیل احمد خاں کو بنارس ہندو یونیورسٹی میں داخلہ ملا۔ اور دونوں نے وہاں انجنیئرنگ کی ڈگری امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ آپ اگر واقعی پڑھنا چاہیں تو کوئی آپ کو روک نہیں سکتا۔

پھر میں نے اپنی مثال دی۔ عربی مدرسہ میں عربی تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں نے یہ چاہا کہ انگریزی زبان کی اعلیٰ تعلیم حاصل کروں۔ یہ غالباً ۱۹۴۴ کی بات ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) میں عربی مدارس کے طلبہ کے لئے داخلہ کی ایک صورت پہلے سے موجود ہے۔ اس کے مطابق میں نے جامعہ ملیہ میں داخلہ کا ارادہ کیا تھا۔

میرے چچا زاد بھائی مولانا اقبال احمد سہیل کا ڈاکٹر ذاکر حسین سے بہت قریبی تعلق تھا۔ میں سہیل صاحب کا ایک سفارشی خط لے کر اعظم گڈھ سے دہلی آیا اور اوکھلا پہنچ کر ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملاقات کی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ملنساری اور خوش اخلاقی مشہور ہے۔ مگر کسی نا معلوم سبب کے تحت انھوں نے میرے ساتھ نہایت خشک رویہ اختیار کیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انھوں نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کے لئے بھی نہیں کہا۔ میں سہیل صاحب کا خط دے کر ان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے خط پڑھا اور اس کے بعد مزید کچھ پوچھے بغیر سادہ طور پر داخلہ لینے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں پرائیویٹ طور پر انگریزی پڑھوں گا۔ سالہا سال کی محنت کے بعد خدا کے فضل سے میں نے اتنی انگریزی سیکھ لی کہ ہر طرح کی انگریزی کتاب پڑھ سکتا ہوں۔ جامعہ کے انگریزی کے استاد انوار علی خاں سوز مرحوم الرسالہ کے قاری تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ وحید الدین خاں انگریزی عبارتوں کا جو ترجمہ کرتے ہیں اس سے اچھا ترجمہ ہم لوگ نہیں کر سکتے ہیں۔

۱۵ فروری ۱۹۹۰

قرآن میں منکرین کو یہ چیلنج دیا گیا کہ اگر تم کو اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے میں شک ہے تو اس کے جیسی ایک سورہ بنا کر لاؤ (فأتوا بسورة من مثله) اس پر ایک شخص نے کہا کہ میں اس چیلنج کا جواب دیتا ہوں۔ دیکھو قرآن میں ہے کہ والسماء ذات البروج۔ اس کے جواب میں میں کہتا ہوں کہ والنساء ذات الفروج۔

یہ چیلنج کا جواب نہیں بلکہ مسخرہ پن ہے۔ اس جملہ کی ساخت ہی بتا رہی ہے کہ کہنے والے نے بطور تمسخر یہ بات کہی تھی نہ کہ سنجیدہ جواب کے طور پر۔

۱۶ فروری ۱۹۹۰

۷ فروری ۱۹۹۰ کو کراچی میں فساد ہوا۔ اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ پاکستان کے اخبار نوائے وقت (۸ فروری ۱۹۹۰) کے صفحہ اول پر اس کی تفصیلی خبر تھی۔ اس کا عنوان تھا: کراچی میں آگ اور خون کا کھیل۔

بھاگلپور سے مولانا محمد اکرام الدین قاسمی تشریف لائے۔ انھوں نے بھاگلپور کے فساد (۲۴ اکتوبر ۱۹۹۰) کی مفصل رپورٹ تیار کی ہے جو ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس رپورٹ کا نام ہے:

آگ اور خون کی ہولی

میں نے کہا کہ بھاگلپور کے فساد کو آپ لوگ ہندو کے خانہ میں ڈالتے ہیں۔ یہ بتائیے کہ کراچی کے فساد کو آپ کس کے خانہ میں ڈالیں گے۔ مسلمان اگر صرف اس ایک بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں تو وہ یقیناً اس حل کو پا لیں گے جس کو استعمال کرکے اس ملک سے فسادات کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۷ فروری ۱۹۹۰

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال ایک نہیں بلکہ بہت سے ہوں گے۔ مثلاً ایک روایت میں ہے کہ دجال ۳۰ ہوں گے (ثلاثون دجالون) ایک روایت میں ہے کہ دجال جب بولے گا تو اس کی آواز مشرق سے مغرب تک سنائی دے گی۔

ان روایتوں کی بنا پر میرا گمان یہ ہے کہ دجاجلہ دراصل دور پریس کے لیڈر ہیں۔ موجودہ زمانہ کے لیڈر متفقہ طور پر تمام برائیوں کی جڑ ہیں۔ اور یہ لیڈر یقینی طور پر ان چیزوں کی

بدولت ظہور میں آئے ہیں جن کو موجودہ زمانہ میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کہا جاتا ہے۔

پہلے زمانہ میں شہرت پسند اور جاہ طلب انسانوں کے لئے اپنے شوق کی ایک حد ہوتی تھی۔ آج اشاعت کے جدید ذرائع نے اس کو لامحدود حد تک وسیع کر دیا ہے۔ اس لئے اس قسم کے لوگوں کا شوق بھی لامتناہی طور پر بڑھ گیا ہے۔ یہی حال مسلم لیڈروں کا بھی ہے، خواہ وہ بے ریش لیڈر ہوں یا باریش لیڈر۔

موجودہ زمانہ کے تمام لیڈر شہرت کے لیڈر ہیں۔ یعنی وہ مشہور ہو گئے اس لئے وہ لیڈر بن گئے۔ لیڈری کے اس سستے ذریعے نے موجودہ زمانہ کے لیڈر پیدا کئے ہیں، اور یہی وہ لیڈر ہیں جنھوں نے موجودہ زمانہ میں ہمارے تمام مسائل پیدا کئے ہیں۔

۱۸ فروری ۱۹۹۰

بمبئی کے دو صاحب ملنے کے لئے آئے۔ دونوں کا تعلق تبلیغی جماعت سے ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ آجکل عمرہ کو اسمگلنگ والوں نے اپنے کاروبار کا ذریعہ بنالیا ہے۔ وہ لوگوں کو عمرہ کے ویزا پر مکہ مدینہ بھیجتے ہیں۔ وہ وہاں سے ان کے لئے اسمگلنگ کا سامان لے کر آتے ہیں۔

دوسرے صاحب نے کہا کہ میں آپ کو اس سے بھی زیادہ سخت بات بتاؤں۔ پچھلے سال میں حج کے لئے گیا۔ وہاں میں نے ایک شخص کو دیکھا جو پاکٹ ماری میں بمبئی میں پکڑا گیا تھا۔ میں نے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک منظم کاروبار ہے۔ کچھ لوگ فقیروں اور پاکٹ ماروں کو حج کے زمانہ میں مکہ مدینہ بھیجتے ہیں۔ وہ وہاں جاکر بھیک مانگتے ہیں اور پاکٹ ماری کرتے ہیں۔ آجکل یہ ایک زبردست بزنس بنا ہوا ہے۔

میں نے کہا کہ بمبئی میں بال ٹھاکرے اور سلمان رشدی کے خلاف بڑی بڑی مہمیں چلائی جاتی ہیں۔ پھر اس قسم کے مجرمین کے خلاف کوئی مہم کیوں نہیں چلائی جاتی۔ انھوں نے کہا کہ علانیہ مہم چلانا تو درکنار، لوگ اس سے بھی ڈرتے ہیں کہ سعودی حکام کو خط لکھ کر اس کی خبر کر دیں۔ کیوں کہ وہ ڈرتے ہیں کہ جو لوگ اس قسم کا کاروبار کر رہے ہیں، وہ ان کو جان سے مار ڈالیں گے۔

۱۹ فروری ۱۹۹۰

توہمات، قدیم زمانہ میں علم کی راہ میں رکاوٹ تھے۔ یہ توہمات طفیلی پودوں (Parasites)

کی طرح علم کی ترقی کو روکے ہوئے تھے۔ اسلام نے توہمات کو ختم کیا۔ اس کے بعد علم کا سفر ترقی کی طرف شروع ہوگیا۔

خلافت راشدہ اور بنو امیہ کے زمانہ تک نقلی علوم کو ترقی دی گئی۔ بنو عباس کے زمانہ میں بغداد میں بیت الحکمت قائم ہوا، اور سیکولر علوم کی ترقی کا دور شروع ہوگیا۔ ترقی کا یہی سلسلہ ہے جو اسپین ہوتا ہوا یورپ پہنچا اور یورپ کی جدید علمی ترقی کا سبب بنا۔

اسلام نے علم کو توہمات سے آزاد کیا، مگر وہ اس کو اخلاقی دائرہ کا پابند بنائے ہوئے تھا۔ یورپ نے علم کو اخلاقی پابندی سے آزاد کر دیا۔ یہاں سے علم میں ایک نئی خرابی پیدا ہوگئی۔ جدید علم توہمات سے آزاد تھا۔ مگر یورپ نے آزادی کی حد کو نہیں سمجھا۔ اس نے علم کو اخلاقی حدود سے بھی آزاد کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں جدید علم میں دوبارہ نئی نئی برائیاں پیدا ہوگئیں۔

۲۰ فروری ۱۹۹۰

مسٹر نانی اے پالکھی والا ہندستان کے مشہور قانون داں ہیں۔ ان کا ایک مضمون ٹائمس آف انڈیا (۲۰ فروری ۱۹۹۰) میں چھپا ہے۔ یہ ہندستان کے انکم ٹیکس ایکٹ کے بارہ میں ہے۔

مسٹر پالکھی والا نے لکھا ہے کہ ہمارے ملک کی وزارت قانون تبدیلی کے خبط (change mania) کی شکار ہے۔ اس کو گویا تبدیلی کا جنون ہے۔ چنانچہ پچھلے ۳۰ سال میں ہندستان کے انکم ٹیکس ایکٹ میں تین ہزار ترمیمات (Amendments) کی جاچکی ہیں۔

ان تبدیلیوں کی بنا پر انکم ٹیکس قانون میں بے حد پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مالی مقدمات کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ یونائٹڈ کنگڈم میں ۲۹ ملین انکم ٹیکس دینے والے ہیں۔ مگر ان کے یہاں ہائی کورٹ میں آنے والے مقدمات کی تعداد سال میں صرف ۳۰ ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں انڈیا میں صرف سات ملین ٹیکس ادا کرنے والے ہیں۔ مگر یہاں ہائی کورٹ میں جانے والے مقدمات کی تعداد سالانہ چھ ہزار سے زیادہ ہوتی ہے:

The flood of litigation is heavier than ever before.

ہندستان میں آزادی (۱۹۴۷) کے بعد جو برائیاں پیدا ہوئیں، ان میں سے ایک تبدیلی کا خبط تھا۔ ہر شعبہ میں مسلسل تبدیلی کی جانے لگی۔ حتی کہ تبدیلی کو ترقی کے ہم معنی سمجھ لیا گیا۔ اس خبط

نے آخر کار ملک کو برباد کر کے رکھ دیا۔

۲۱ فروری ۱۹۹۰

میسور کے سلطان ٹیپو انگریزوں سے لڑتے ہوئے ۱۷۹۹ میں ہلاک ہو گئے۔ ان کی سلطنت ختم ہو گئی۔ اقبال کے خیال کے مطابق یہ مسلم دنیا کا نا قابل تلافی حادثہ تھا۔ انھوں نے اپنی ایک نظم میں کہا کہ ٹیپو مسلمانوں کی ترکش کا آخری تیر تھا۔

ترکش مارا خدنگ آخریں

میرے نزدیک یہ ایک لغو بات ہے۔ کوئی بھی شخص مسلمانوں (یا اسلام) کی ترکش کا آخری تیر نہیں۔ اسلام ایک کامل مذہب ہے۔ اس کی ترکش کے تیر کبھی ختم ہونے والے نہیں، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

اس قسم کی تمام باتیں دعوتی ذہن نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسلام کی اصل طاقت دعوت ہے۔ اگر مسلمان اس کو جان لیں تو وہ کبھی کسی کے بارہ میں "ترکش مارا خدنگ آخریں" کا لفظ نہ بولیں۔ کیوں کہ دعوت ایک ایسی طاقت ہے جو کبھی اور کسی حال میں ختم ہونے والی نہیں۔

۲۲ فروری ۱۹۹۰

قومی آواز (۲۲ فروری ۱۹۹۰) کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ رام کی مفروضہ جنم بھومی (اجودھیا) میں رام کی مندر تعمیر کرنے کے نام پر وشو ہندو پریشد اور اس کی ہمنوا تنظیموں نے ایک ارب ۴۸ کروڑ روپیہ جمع کیا ہے۔

رام مندر کے نام پر جب اتنی بڑی رقم جمع ہو چکی ہے تو اب اس کا دو ہی انجام ہو سکتا ہے۔ یا تو اجودھیا میں مجوزہ رام مندر تعمیر ہو۔ اور اگر بالفرض رام مندر تعمیر نہ ہوا تو اس رقم کے بٹوارہ کے لئے خود ہندوؤں میں آپس کی جنگ شروع ہو جائے گی۔ دونوں میں سے ہر صورت ملک کے لئے تباہ کن ہے۔ رام مندر کی تعمیر اپنے نتیجہ کے اعتبار سے دوسرا پاکستان ہے۔ یہ ہندو مسلم جھگڑے کو مزید پچاس سال کے لئے زندہ کر دینا ہے۔ اور اگر دوسری صورت ہو تو یہ ہندو سوسائٹی میں کرپشن میں اضافہ کے ہم معنی ہوگا جو پہلے ہی بہت زیادہ بڑھ چکا ہے۔

ملک کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ اس قسم کے جھگڑوں کو چھوڑ کر قومی اشوز کو مرکز توجہ بنایا جائے۔

۲۳ فروری ۱۹۹۰

غالباً ۲۵ سال پہلے کی بات ہے۔ لکھنؤ میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ وہ ایک عربی مدرسہ کے تعلیم یافتہ تھے۔ اس کے بعد انھوں نے کچھ انگریزی بھی سیکھی تھی۔ گفت گو کے دوران انھوں نے کہا: صحابہ کا یہ حال تھا کہ وہ اللہ کے خوف سے روتے تھے۔ آج بھلا کوئی شخص ایسا ہو سکتا ہے جو اللہ کے خوف سے روئے۔

میرا احساس یہ ہے کہ یہی دوسرے مسلمانوں کا حال بھی ہے۔ موجودہ مسلمان اس اسلام سے آشنا نہیں جو قرآن کی آیت أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ کی صفت رکھتا ہو۔ مزید یہ کہ یہ محرومی صرف محرومی تک نہ رہی۔ اس نے لوگوں کے اندر ایک گمراہی بھی پیدا کر دی۔ لوگ کیفیت والے دین کو نہیں پا سکتے تھے، اس لئے انھوں نے کیت والے دین کو ایجاد کر لیا۔

روزانہ ایک یا کئی قرآن ختم کرنا۔ اللہ یا لاالٰہ الا اللہ یا اور کسی کلمہ کا ورد کرنا۔ نوافل کی کثرت، وغیرہ۔ یہ سب اسی نوعیت کی چیزیں ہیں۔ کیفیت والا دین جب لوگوں کو حاصل نہ ہوا تو کیت والے دین میں اضافہ کر کے انھوں نے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ انھوں نے دین کی بلندی کو پا لیا ہے۔ حالاں کہ یہ سب گمراہی اور بدعت ہے نہ کہ ہدایت اور دین داری۔

۲۴ فروری ۱۹۹۰

ڈاکٹر شمس الآفاق (منسٹری آف ہیلتھ، نئی دہلی) ملاقات کے لئے آئے۔ وہ الرسالہ سے پوری طرح متفق ہیں۔ گفت گو کے دوران انھوں نے کہا کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ "آپ کی انٹگریٹی ڈاؤٹ فل معلوم ہوتی ہے"۔ یعنی یہ کہ میں خدانخواستہ ہندوؤں کا یا حکمرانوں کا ایجنٹ ہوں۔ جو کچھ کہتا ہوں مفاد کے تحت کہتا ہوں۔

میں نے کہا کہ ستمبر ۱۹۸۹ کے آخری ہفتہ میں لیبیا میں انٹرنیشنل کانفرنس تھی۔ مختلف ملکوں کے کئی سو آدمی وہاں آئے۔ میں بھی شریک ہوا۔ اخبار نو (دہلی) کے ایڈیٹر م۔ افضل صاحب بھی اس میں شریک تھے۔ ان سے آپ پوچھ لیجئے۔ ہم لوگ طرابلس کے ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے۔ اس کے بعد اسپیشل جہاز کے ذریعہ تمام لوگ طرابلس سے بنغازی لے جائے گئے تاکہ وہاں صدر قذافی سے ملاقات کر سکیں۔ تمام شرکا خوشی خوشی وہاں گئے۔ میں اکیلا طرابلس کے ہوٹل میں ٹھہرا رہا۔ میں قذافی سے ملنے نہیں

گیا۔ اپنے اس استغنا کی وجہ سے میں نے پانچ سو ڈالر کھو دیا۔

فروری ۱۹۹۰ کے دوسرے ہفتہ میں نئی دہلی میں مولانا ابوالکلام آزاد پر انٹرنیشنل سیمنار ہوا۔ اس میں مجھے مدعو کیا گیا تھا۔ پروگرام میں میرا نام بھی چھاپ دیا گیا۔ اس سیمنار میں نہ صرف باہر کے بہت سے لوگوں سے ربط قائم کرنے کا موقع تھا، بلکہ وزیراعظم ہند (وی پی سنگھ) سے ملنا، ان کے ساتھ ڈنر کھانا اور دوسرے فوائد تھے۔ میرے پاس سیمنار کی تمام چیزیں میرے گھر پر بھیج دی گئیں۔ مگر میں وہاں سرے سے شریک ہی نہیں ہوا۔ کیا مفاد پرست لوگ ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر آفاق صاحب نے کہا کہ یہ سب باتیں آپ کو الرسالہ میں شائع کرنی چاہئیں تاکہ لوگوں کے شبہات ختم ہوں۔ میں نے کہا کہ جو لوگ الرسالہ کی سطروں سے مجھ کو نہ سمجھ سکے وہ اس کی خبروں سے بھی مجھ کو نہیں سمجھ سکتے۔

۲۵ فروری ۱۹۹۰

رفیق احمد صدیقی (مٹیا محل، دہلی) انجنیئر ہیں۔ آجکل وہ ظہران کی پٹرولیم یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ظہران میں جماعت اسلامی کے بہت سے لوگ ہیں۔ وہ اپنا ہفتہ وار اجتماع کرتے تھے۔ اس کو گورنمنٹ نے روک دیا۔ مگر آجکل انھوں نے دوبارہ اجازت لے لی ہے۔ اب وہ برابر اپنے اجتماعات کر رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ اجازت ان کو ضرور کچھ یقین دہانی کر کے ملی ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ انھوں نے ذمہ داروں کو یقین دلایا کہ ان کا کوئی سیاسی مقصد نہیں ہے۔ اس کے بعد انھیں اجازت مل گئی۔ میں نے کہا کہ یہ سراسر منافقانہ بات ہے۔ کیوں کہ سیاست اور حکومت تو جماعت اسلامی کے عقیدہ میں شامل ہے۔ اسلامی حکومت قائم کرنا ہی ان کا اصل مقصد ہے۔ اسی لئے وہ پاکستان کے ہر حکمراں سے ٹکراؤ کرتے رہے ہیں۔ مگر سعودی عرب میں انھوں نے یہ کہہ دیا کہ سیاست سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔

جماعت اسلامی کے لوگ اگر تقریر اور جلوس اور بیانات کا طریقہ اختیار کرتے تو اجازت ملنا تو درکنار، انھیں سعودی عرب سے نکال دیا جاتا۔ اسی طرح اگر وہ اپنے سیاسی نظریہ کا اعلان کرتے تب بھی ہرگز انھیں اجازت نہ ملتی۔ میں نے کہا کہ یہ مسلمان بھی کیسے عجیب ہیں۔ سعودی عرب میں وہ منافقت کی سطح پر جا کر ایڈجسٹمنٹ کرنے کے لئے تیار ہیں اور ہندستان جیسے ملک میں وہ

حکمت کی سطح پر بھی ایڈجسٹمنٹ کرنے پر راضی نہیں۔

۲۶ فروری ۱۹۹۰

میری عمر ۶۶ سال ہوگئی۔ اگر مجھے بتانا ہو کہ میری پوری زندگی کے مطالعہ اور تجربہ کا آخری حاصل کیا ہے، تو میں کہوں گا کہ —— اللہ تعالیٰ نے ایک مسٹر نتھنگ (Mr. Nothing) کو پیدا کیا اور اس کے اوپر (Thing) کا پردہ ڈال دیا۔

انسان کے پاس بظاہر دماغ ہے، علم ہے، طاقت ہے، اسباب و وسائل ہیں۔ مگر یہ سب کا سب ظاہری پردہ ہے۔ اس پردہ کے اندر داخل ہو کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ انسان کی کسی چیز کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کا ایک علٰحدہ وجود ہے۔ اس کا یہ علٰحدہ وجود دنیا سے لے کر آخرت تک باقی رہے گا۔ مگر انسان کا سب کچھ سراسر اللہ کی ذات پر منحصر ہے۔ دنیا میں بھی اگر وہ کچھ پاتا ہے تو وہ اللہ کے دئے سے پاتا ہے۔ اور آخرت میں بھی وہ جو کچھ پائے گا اللہ کے دئے سے پائے گا۔

انسان کے پاس ارادہ ہے مگر اس کے اندر تنفیذ کی طاقت نہیں۔ انسان کے پاس فکر ہے مگر حالات کے اوپر اس کا کنٹرول نہیں۔ اس کو چاہنے کا اختیار ہے۔ مگر اس کو کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔

۲۷ فروری ۱۹۹۰

ایک صاحب سعودی عرب میں انجینئر ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ انڈیا میں مسلمانوں کے لئے ترقی کے مواقع نہیں۔ کیوں کہ مسلمانوں کو یہاں جان بوجھ کر سپرس (suppress) کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ آٹھ سال سے عرب میں ہیں۔ کیا وہاں آپ نے اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات دیکھی۔ انھوں نے کہا کہ بہت سی باتیں ہیں۔ مثلاً وہاں ایک امریکی انجینئر کے لئے تنخواہ بھی زیادہ ہے اور عزت بھی زیادہ۔ مگر ہماری تنخواہ بھی کم ہے اور عزت بھی کم۔

میں نے کہا کہ پھر کیا آپ نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس کا کوئی سوال ہی نہیں۔ وہاں سسٹم کے خلاف کوئی شخص بولے تو فوراً اس کو واپس روانہ کر دیں گے۔ کوئی زیادہ گڑبڑ کرے تو اس کو جیل میں بند کر دیں گے۔ میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سپرس کئے جانے کا مسئلہ عرب میں بھی ہے۔ چوں کہ وہاں آپ مصالحت کر کے رہتے ہیں اس لئے وہاں آپ سپرس نہیں کئے جاتے۔

پھر میں نے کہا کہ ہندستان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کے مسلمان یہاں کے حالات سے ہم آہنگی

کر کے رہنے کے لئے تیار نہیں ۔ یہاں وہ احتجاج اور ٹکراؤ کر کے رہنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھ وہ صورت پیش آرہی ہے جس کو آپ جیسے لوگ سپرشن (suppression) کا نام دیتے ہیں۔ اگر مسلمان یہاں موافقت کے ساتھ رہیں جس طرح وہ باہر کے ملکوں میں رہتے ہیں تو یہاں بھی ان کو وہی مواقع ملنے لگیں گے جو ان کو دوسرے ملکوں میں مل رہے ہیں۔

۲۸ فروری ۱۹۹۰

سیوان (بہار) کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے اندر ایمان کی چنگاری تو موجود ہے، صرف اس کو ہوا دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد وہ بھڑک کر شعلہ بن جائے گی۔ میں نے کہا کہ موجودہ مسلمانوں پر یہ مثال صادق نہیں آتی۔ صحیح بات یہ ہے کہ موجودہ مسلمان قوم مسلم پر ہیں۔ اب ان کو دین مسلم پر لانے کی ضرورت ہے۔

ایک ہے تلفظ کلمہ، اور ایک ہے معرفت کلمہ۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں جو ایمان ہے وہ تلفظ کلمہ کی سطح پر ہے۔ وہ معرفت کلمہ کی سطح پر نہیں ہے اور کلمہ کی معرفت کا نام ایمان ہے نہ کہ کلمہ کے الفاظ کو دہرانے کا۔

ایک آریہ سماجی ہندو اور ایک مسلمان مولوی میں مناظرہ ہوا۔ مولوی نے کہا کہ تم جہنم میں جاؤ گے۔ آریہ سماجی نے کہا کہ نہیں، میں جنت میں جاؤں گا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ کیا اس حدیث کو مانتے ہو کہ من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ مولوی صاحب نے کہا ہاں۔ آریہ سماجی نے بلند آواز سے کہا کہ پھر سنو، میں کہتا ہوں لا الٰہ الا اللہ۔ اب مولوی صاحب لاجواب ہو گئے۔ اس کا سبب یہی تھا کہ مولوی صاحب نے تلفظ کلمہ کو ایمان سمجھ لیا۔

یکم مارچ ۱۹۹۰

ایک صاحب نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں بہت سے بڑے بڑے مصلح پیدا ہوئے۔ بہت بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں۔ مگر سب بے فائدہ ثابت ہوئیں۔ میں نے کہا کہ ان تحریکوں اور ان شخصیتوں نے نتیجہ سے آغاز کرنا چاہا، اور اس دنیا میں نتیجہ سے آغاز ممکن نہیں۔

صحابہ کرام نے مکہ اور مدینہ میں ایک عمل کیا۔ اس کے بعد عالمی انقلاب کی صورت میں اس کا نتیجہ برآمد ہوا۔ موجودہ زمانہ کے مسلم مصلحین کو صرف نتیجہ کی خبر تھی، انھیں عمل کی خبر نہیں تھی۔ چنانچہ وہ نتیجہ کو

جذباتی انداز میں مسلمانوں کے سامنے بیان کرتے رہے۔ مثلاً اقبال کا یہ شعر:

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تونے　　وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تمام مصلحین دورِ نتیجہ کے بارہ میں اس قسم کی رومانی باتیں کہہ کر مسلمانوں کو جوش دلاتے رہے۔ کسی نے دورِ عمل کی حقیقتیں مسلمانوں کے سامنے بیان نہیں کیں۔ ایسی حالت میں وہی ہو سکتا تھا جو ہوا۔

۲ مارچ ۱۹۹۰

ہمارے دفتر سے متصل پارک آجکل بہت ہرا بھرا ہو رہا ہے۔ رنگ برنگ کے پھولوں کی کیاریاں اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی ہیں۔ کئی دن کی بدلی اور ٹھہر کے بعد آج پوری دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ صبح ۱۱ بجے میں نے چھت پر کھڑے ہو کر پارک کی طرف دیکھا تو وہ نہایت خوش نما معلوم ہوا۔

میں ابھی دیکھ رہا تھا کہ معمولی کپڑے میں ایک غریب عورت پارک کے اندر داخل ہوئی۔ وہ اس کے ایک کنارے بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ کچھ کھانے کی چیز تھی۔ وہ کنارے ایک جگہ بیٹھ کر کھانے لگی۔ میں نے عورت کو دیکھا تو میرے دل نے کہا کہ یہ عورت اپنی ذات کی بنیاد پر اس قسم کے پارک کی مالک نہیں بن سکتی۔ تاہم وقت کا نظام اس کو اجازت دے رہا ہے کہ وہ اس کے کنارے آکر بیٹھ سکے اور اس کی پربہار فضا میں شریک ہو۔

دل سے دعا نکلی کہ خدایا، میں اپنے عمل کے اعتبار سے جنت کا مستحق نہیں ہوں۔ تو چاہے تو اس غریب عورت کی طرح مجھے یہ اجازت دیدے کہ میں جنت کے ایک گوشہ میں قیام کر سکوں۔

۳ مارچ ۱۹۹۰

اقبال احمد صاحب (۵۹ سال) مراد آباد کے رہنے والے ہیں۔ ۱۳ اگست ۱۹۸۰ کو مراد آباد میں جو فساد ہوا تھا، اس کے بارہ میں انھوں نے تفصیلات بتائیں۔ یہ عید کا دن تھا۔ مسلمان عیدگاہ میں نماز کے بعد خطبہ سننے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں عیدگاہ سے متصل ایک نالہ ہے۔ اس کی طرف سے ایک خنزیر عیدگاہ میں گھس آیا۔ لوگوں نے اس کو بھگایا تو وہ ڈرتے ہوئے ایک صاحب کے پاس سے گزرا جو چادر بچھائے ہوئے اس پر بیٹھے تھے۔ خنزیر جب اس چادر کے پاس سے دوڑتا ہوا گزرا تو ان کی چادر پر اس کی کچھ چھینٹیں آگئیں۔

پاس ہی پولیس کا آدمی کھڑا ہوا تھا۔ انھوں نے درشت انداز میں پولیس کو مخاطب کرتے ہوئے

کہا کہ تم یہاں کھڑے ہوئے کیا دیکھ رہے ہو۔ دیکھتے نہیں کہ خنزیر نے میری چادر گندی کردی۔ ان کے غصہ پر پولیس والا بھی غصہ ہوگیا۔ اس نے کہا: ہم یہاں کیا سور کی رکھوالی کے لئے کھڑے ہیں۔ اب دونوں طرف سے تیزی بڑھی۔ یہاں تک کہ مسلمانوں نے ایک پولیس کو پکڑ کر اتنا مارا کہ وہ مرگیا۔

اس کے بعد پولیس والے آپے سے باہر ہوگئے اور انھوں نے ہندوؤں کو ساتھ لے کر مرادآباد کو بھون ڈالا۔ اقبال صاحب نے کہا کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ کسی کے ایگو (انا) کو پنچ (مس) نہ کرے۔ ورنہ اس کا ایگو سپر ایگو بن جائے گا اور اس کے بعد اگلا مرحلہ بریک ڈاؤن ہے۔

۴ مارچ ۱۹۹۰

مولانا انیس لقمان ندوی کے ساتھ فجر کی نماز کالی مسجد (نظام الدین) میں پڑھی۔ نماز سے واپس آتے ہوئے میں نے کہا کہ بعد کے دور میں مسلمانوں میں اسلام کا ظاہری ڈھانچہ تو باقی رہا۔ مگر اسلام کی اصل اسپرٹ گم ہوگئی۔ میں نے مثال دیتے ہوئے چند باتوں کا ذکر کیا — مثلاً مکہ اسپرٹ، حدیبیہ اسپرٹ، افعل ولاحرج اسپرٹ، حَسَن اسپرٹ۔

مکہ اسپرٹ سے مراد ہے یک طرفہ صبر کرتے ہوئے دعوت دینا۔ حدیبیہ اسپرٹ سے مراد ہے مشکلات کو چھوڑ کر مواقع کو استعمال (Avail) کرنا۔ افعل ولاحرج اسپرٹ یہ ہے کہ جزئیاتی مسائل کے اختلاف کو توسع کے خانہ میں ڈالتے ہوئے اصل دین پر توجہ صرف کرنا۔ حَسَن اسپرٹ یہ ہے کہ باہمی اختلاف اگر دو طرفہ بنیاد پر حل نہ ہو رہا ہو تو یک طرفہ دست برداری کے ذریعہ اختلاف کو ختم کردینا۔

۵ مارچ ۱۹۹۰

بھائی حبیب محمد صاحب (حیدرآباد) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اپنا کام بڑھایا، اسی کے ساتھ ذہنی الجھنیں بھی بڑھ گئیں۔ صنعت کے بارہ میں گورنمنٹ کے قوانین سخت پریشانی میں ڈالنے والے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ مسئلہ اور مقصد کو ایک دوسرے سے الگ کرلیجئے۔ مسئلہ پر اسی وقت تک توجہ دیجئے جب تک مقصد متاثر نہ ہو رہا ہو۔ جب مقصد متاثر ہوتا ہوا نظر آئے تو مسئلہ کو حالات کے حوالہ کرکے مقصد کو اختیار کرلیجئے۔ ذہنی پریشانی ہمیشہ ضروری اور غیر ضروری یا اہم اور غیر اہم کے درمیان فرق نہ کرنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔

۶ مارچ ۱۹۹۰

کلیم اللہ صاحب ایم ایس سی (سری نگر) شروع سے الرسالہ کے قاری ہیں۔ ان سے کشمیر کی موجودہ صورت حال پر گفتگو ہو رہی تھی۔ انھوں نے کہا کہ آجکل جس طرح کشمیر کے عوام سڑکوں پر نکل آئے ہیں، وہ بظاہر لوگوں کو حیرت انگیز لگتا ہے۔ کیوں کہ وہ اس کو اچانک سمجھتے ہیں۔ مگر یہ تو ایک لاوا ہے جو پچھلے ۴۰ سال سے پک رہا تھا، اب وہ اپنی حد پر پہنچ کر پھٹ گیا۔

اس کے بعد الرسالہ کے مشن پر گفتگو ہوتی رہی۔ انھوں نے کہا کہ میں الرسالہ کو ایک پائنیرنگ ورک سمجھتا ہوں۔ بظاہر الرسالہ صبر اور اعراض سکھا رہا ہے۔ مگر یہ بھی گویا ایک تعمیری لاوا ہے جو خاموشی سے اندر اندر پک رہا ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ یہ تعمیری لاوا پھٹ پڑے گا۔ اس وقت تمام دوسرے نظریات اس کے سیلاب میں بہہ جائیں گے۔

۷ مارچ ۱۹۹۰

ندوہ کے پندرہ روزہ اخبار تعمیر حیات (لکھنؤ) میں ایک مستقل صفحہ کھولا گیا ہے۔ اس میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کے نام "مشاہیر" کے خطوط چھاپے جا رہے ہیں۔ ایک صاحب نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ تعمیر حیات میں مشاہیر کے خطوط چھپ رہے ہیں، آپ کے الرسالہ میں اس قسم کے خطوط شائع نہیں ہوتے۔

میں نے کہا کہ "تعمیر حیات" مشاہیر کے خطوط چھاپتا ہے، ہم خالق مشاہیر کے خطوط چھاپ رہے ہیں۔

۸ مارچ ۱۹۹۰

ابوداؤد (کتاب الزکاۃ) میں ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں: لَاتَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ إِلَّا فِي سَبِيلِ اللهِ (ایک مالدار شخص کو زکوٰۃ لینا جائز نہیں۔ الّا یہ کہ وہ اللہ کے راستہ میں ہو)

یہ استثنا نہایت بامعنی ہے۔ عام لوگوں کی ضرورت صرف کھانا، کپڑا، اور بقدر ضرورت مکان ہے۔ مگر مجاہدین فی سبیل اللہ (داعی حق) کی ضروریات صرف انھیں چیزوں تک محدود نہیں ہوتیں۔ مثلاً ایک داعی حق، جو علم کی راہ سے دعوت کا کام کر رہا ہو، اس کے پاس لاکھوں روپیہ کی کتابیں ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح دوسرے قیمتی وسائل ہو سکتے ہیں۔ مگر ان سب کے باوجود یہ ممکن ہے کہ اس کو مدد کی ضرورت ہو۔ عام انسان باعتبار ضرورت محتاج ہوتے ہیں اور داعی باعتبار وسائل۔ اور وسائل کی کوئی حد نہیں۔

۹ مارچ ۱۹۹۰

جان کیمبل (John W. Campbell) نے مسلمانوں کے سائنسی کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام نے سائنس کو ایجاد کیا:

Islam invented science

سائنس مظاہر فطرت کی تسخیر سے ظہور میں آتی ہے۔ اسلام سے پہلے ساری دنیا میں انسان مظاہر فطرت کو پرستش کی چیز سمجھتا تھا۔ اس کا یہ ذہن مظاہر فطرت کی تسخیر میں رکاوٹ تھا۔ اسلام نے توحید کو غالب کیا اور شرک کا خاتمہ کیا تو اس کے بعد لوگوں میں تسخیری سوچ ابھری۔ اگر مظاہر پرستی (شرک) کا خاتمہ نہ کیا جاتا تو انسان کے اوپر سائنسی دور کا آغاز بھی نہ ہوتا۔

۱۰ مارچ ۱۹۹۰

ٹائمس آف انڈیا (۱۰ مارچ ۱۹۹۰) میں صفحہ اول پر یہ خبر ہے کہ ہندستان کے محکمہ انکم ٹیکس نے وشو ہندو پریشد کے جنرل سکریٹری مسٹر اشوک سنگھل کو نوٹس جاری کیا ہے کہ وہ محکمہ کے دفتر میں حاضر ہوں اور سات سو کرور (سات ارب) روپیہ کی اس رقم کا حساب دیں جو ان کی پارٹی نے رام جنم بھومی کی تعمیر کے نام پر جمع کیا ہے۔ یہ رقم ۱۹۸۸ اور ۱۹۸۹ کے درمیان دو سالوں کے اندر جمع کی گئی ہے۔ اخبار کے مطابق، اس رقم میں سے ۲۰۰ کروڑ روپیہ امریکہ میں مقیم ہندوؤں کی طرف سے آیا ہے۔

فروری ۱۹۸۷ میں نئی دہلی کی مشترک میٹنگ میں میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے جھگڑے کو تاریخ دانوں کے ایک بورڈ کے حوالہ کر دیا جائے۔ اس وقت ہندو سائڈ کے تمام لوگ اس تجویز پر راضی ہو گئے تھے۔ مگر اس وقت مسٹر شہاب الدین نے شور وغل کرکے اس تجویز کو منظور نہیں ہونے دیا۔ اب جب کہ وہ لوگ اس نام پر سات ارب روپیہ جمع کر چکے ہیں، اب ناممکن ہے کہ وہ اس معاملہ میں سابقہ تجویز پر راضی ہو سکیں۔

۱۱ مارچ ۱۹۹۰

ایمرسن (Ralph Waldo Emerson) بوسٹن میں ۱۸۰۳ میں پیدا ہوا۔ ۱۸۸۲ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ایک استاد اور مصنف تھا۔ اس کا ایک قول ہے کہ حالات کی کوئی تبدیلی کردار میں خرابی

کو درست نہیں کر سکتی:

No change of circumstances can repair a defect of character.

عام طور پر لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب کہیں بگاڑ دیکھتے ہیں تو اس کا سبب نظام (سسٹم) کو قرار دیکر مروجہ سیاسی نظام کو توڑنے کی دھواں دھار مہم شروع کر دیتے ہیں۔ مگر سیاسی نظام ٹوٹنے کے بعد بھی بگاڑ درست نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بگاڑ ہمیشہ افراد کے کردار میں خرابی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے بگاڑ کی درستگی افراد کی خرابی کو دور کرنے سے آئے گی نہ کہ حکمرانی کا نظام توڑنے سے۔

۱۲ مارچ ۱۹۹۰

رام جنم بھومی مکتی یگیہ سمیتی کے جنرل سکریٹری داؤدیال کھنہ، وشو ہندو پریشد جنرل سکریٹری اشوک سنگھل، بجرنگ دل کے لیڈر راجندر پنکج وونے کٹیار نے رامپور میں ایک مشترکہ پریس کانفرنس میں کہا:

"عدالت کا کوئی فیصلہ اس معاملہ میں ہم ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ رام جنم بھومی کا تعلق ہمارے جذبات سے ہے۔ کچھ شرپسند ہندوؤں نے ۳۱۳ مسجدوں کو مندروں میں تبدیل کرنے کی ایک لسٹ جاری کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانے کی کوشش کی ہے۔ مگر ہم اعلانیہ کہتے ہیں کہ رام جنم بھومی، بنارس کا مندر اور متھرا میں کرشن جنم بھومی، یہ تین ہمیں دیدیا جائے، پھر نہ تو ہم کسی دوسری عبادت گاہ کا مطالبہ کریں گے اور نہ ہی وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اور رام جنم بھومی کمیٹی رہے گی۔ تینوں مسجدوں اور عیدگاہ کو حکومت ہندوؤں کے حوالے کر کے ایک قانون بنادے جس کو ہم ماننے کے لئے تیار ہیں۔" قومی آواز، نئی دہلی، ۱۱ مارچ ۱۹۹۰

مسلمانوں میں کوئی سنجیدہ لیڈر نہیں۔ ورنہ وہ ہندو ذمہ داروں کی میٹنگ کر کے کہتے کہ دو شرط کے ساتھ ہمیں یہ تجویز منظور ہے۔ ایک یہ کہ انھیں تین مسجدوں پر فل اسٹاپ ہوگا، اس کے بعد کسی اور مسجد کا چیپٹر نہیں کھولا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ ان تین مسجدوں کے معاملہ کو تاریخ داں پروفیسروں کے ایک بورڈ کے حوالے کر دیا جائے اور وہ جو فیصلہ دے اس کو دونوں فریق تسلیم کر لیں۔ مجرد کلیم کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

اس طرح کے معاملات کا فیصلہ تاریخی ریکارڈ کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ محض دعوے کی بنیاد پر

۱۲ مارچ ۱۹۹۰

قرآن میں صحابہ کرام کے بارہ میں ہے کہ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ "وہ اللہ سے راضی ہو گئے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے منصوبہ میں اپنے آپ کو شامل کرنے پر راضی ہو گئے، خواہ اس کی راہ میں جو بھی قربانی دینی پڑے۔ صحابہ کے زمانہ میں اللہ کا خاص منصوبہ فتنہ (شرک جارح) کو ختم کرنا تھا۔ صحابہ کرام نے اس منصوبہ میں اپنے آپ کو پوری طرح دیدیا۔ اس کے لئے انھوں نے ہر قسم کی قربانیاں دیں۔ اور سب سے زیادہ مشکل قربانی جو انھوں نے دی وہ نفسیاتی قربانی تھی۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دور آخر میں اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ حق کا کلمہ ہر گھر اور ہر خیمہ میں داخل ہو جائے۔ موجودہ زمانہ میں وسائل اعلام (پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا) کی ترقی اس بات کا اشارہ ہے کہ اس دوسرے منصوبۂ الٰہی کی تکمیل کا وقت اب آگیا ہے۔ آج دوبارہ اہل ایمان کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اس خدائی منصوبہ میں شامل کریں اور اس کے لئے ہر قسم قربانی دیں۔ یہاں تک کہ اللہ کا کلمہ ہر چھوٹے اور بڑے گھر میں پہنچ جائے۔

جو لوگ ایسا کریں وہ "ورضوا عنہ" کے مصداق ٹھہریں گے۔ اور پھر وہ "رضی اللہ عنہم" کے انعام کے مستحق قرار دئے جائیں گے۔

۱۴ مارچ ۱۹۹۰

دین کی بہت سی باتیں مجھ کو اپنے ذاتی تجربہ سے سمجھ میں آئی ہیں۔ آجکل میں مضامین اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری تشخیص کے مطابق، امت اس وقت فکری تزکیہ کے مرحلہ میں ہے۔ ابھی وہ عملی اقدام کے مرحلہ میں نہیں۔ میری مسلسل کوشش یہ ہے کہ لوگوں کے اندر صحیح دینی فکر پیدا کروں۔ اس وقت یہی میرے نزدیک اصل کام ہے۔

یہ کام ابھی تکمیل کے درجہ تک نہیں پہنچا ہے۔ اگر جلد ہی میری وفات ہو جائے تو میں چاہتا ہوں کہ تعمیر فکر کا یہ کام میرے بعد بھی عرصہ تک جاری رہے۔ اس مقصد کے لئے میں مضامین جمع کر رہا ہوں جو میرے بعد الرسالہ میں چھپتے رہیں۔ اس طرح کئی سال تک لوگ الرسالہ، اس کی ایجنسی وغیرہ کے موجودہ کام میں مشغول رہیں گے۔

اس کام کے دوران سمجھ میں آیا کہ لا تکتبوا عنی غیر القرآن کی شاید ایک مصلحت یہ بھی تھی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حدیث کی کتابت سے روک دیا۔ اس طرح آپ نے امت کو اپنے بعد ایک عظیم الشان قسم کی علمی اور تعمیری مشغولیت دیدی۔ اگر تمام حدیثیں قرآن کی طرح آپ کی زندگی میں مدون ہو جاتیں تو آپ کے بعد لوگوں کے پاس تعمیری سرگرمیوں کا کوئی بڑا میدان نہ ہوتا۔

جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے، آپ کے بعد کئی سو سال تک مسلمانوں کے درمیان حدیث کی جمع و تدوین اور اس سے متعلق علوم کے لئے زبردست سرگرمیاں جاری رہیں۔ اس سے لوگوں کے اندر علمی ذوق بنا۔ انھیں تعمیری سرگرمیوں میں مشغولیت کا ایک وسیع میدان مل گیا۔ اس کام کے بے شمار براہ راست اور بالواسطہ فائدے ہوئے۔ اس طرح جو علمی فضا بنی اس کے نتیجہ میں دوسرے علوم پیدا ہوئے۔ انسانی تاریخ توہماتی دور سے نکل کر حقیقی علمی دور میں داخل ہوئی۔

۱۵ مارچ ۱۹۹۰

منظور احمد (ابن محمد اسماعیل) ۲۲ سالہ کشمیری نوجوان ہیں۔ وہ سرینگر کے محلہ خواجہ بازار میں رہتے ہیں۔ وہ ملاقات کے لئے آئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ وہ "مجاہدین" میں سے ہیں جو کہ آجکل کشمیر میں گولی اور بم کی سیاست چلا رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ سب کوئی کام نہیں۔ اصل کام پہلے بھی یہی تھا اور آج بھی یہی ہے کہ کشمیر کے مسلمان تعلیم حاصل کریں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی تعلیم کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پی یو سی کر کے چھوڑ دیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں عمر میں آپ کے باپ کے برابر ہوں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ موجودہ سرگرمیوں کو چھوڑ دیں اور تعلیم حاصل کریں۔ میں نے مزید کہا کہ اگر آپ کے گھر کے لوگ آپ کا تعلیمی خرچ نہ دیں تو میں ان شاء اللہ آپ کا پورا تعلیمی خرچ دوں گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ تعلیم کی تکمیل تک آپ ہر دوسری مشغولیت کو بالکل چھوڑ دیں۔ مگر وہ اتنے جوش میں تھے کہ میری پیشکش کو قبول نہ کر سکے۔

۱۶ مارچ ۱۹۹۰

پرانی فائل دیکھ رہا تھا۔ اس میں ایک کاغذ ملا۔ اس کاغذ پر ۲۸ جنوری ۱۹۷۹ کی تاریخ درج ہے اور اس میں یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔

"خدا کا شکر ہے کہ میں ایک ایسے ملک میں ہوں جہاں قانون کی حکومت ہے۔ اگر یہاں پیلاطس رومی (Pilate) کی حکومت ہوتی تو یہ ظالم مجھ کو سولی پر چڑھانے سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہوتے۔"

۱۷ مارچ ۱۹۹۰

سرینگر میں سورہ کے مقام پر شیخ محمد عبد اللہ (شیر کشمیر) کا مکان ہے۔ کشمیر کے لوگوں نے اس میں آگ لگا دی۔ اس کا بڑا حصہ جل گیا۔ سرینگر میں شیخ محمد عبد اللہ کی قبر پر مستقل پہرہ رہتا ہے۔ کیوں کہ اندیشہ ہے کہ کشمیر کے انتہا پسند ان کی قبر توڑ کر ان کی لاش نکالنے کی کوشش کریں گے تاکہ اس کی بے حرمتی کر سکیں۔

شیخ عبد اللہ (۱۹۰۵ - ۱۹۸۲) کی پوری زندگی میں کشمیری ان کو پوجتے رہے۔ اب یہی کشمیری ان کو غدار کہتے ہیں۔ ان کے جو اعلیٰ جذبات پہلے شیخ عبد اللہ کے لئے تھے، وہ جذبات اب پاکستان کے حق میں ہو گئے ہیں۔ آجکل ہر کشمیری بیتاب ہے کہ وہ ہندستان سے کٹ کر پاکستان سے مل جائے۔

کچھ کشمیریوں سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ جس طرح آپ لوگوں نے شیخ عبد اللہ کو سمجھنے میں غلطی کی، اسی طرح آپ لوگ اب پاکستان کو سمجھنے میں غلطی کر رہے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کی ہندستان سے علاحدگی کی تحریک کامیاب ہو گئی تو آئندہ آپ لوگ ٹھیک اسی طرح پاکستان سے بیزار ہو جائیں گے جس طرح آج شیخ عبد اللہ سے بیزار ہیں۔ مگر اس وقت آپ کے لئے کچھ بھی کرنے کا موقع نہ ہوگا۔

۱۸ مارچ ۱۹۹۰

مسز انیس جنگ ایک الٹرا ماڈرن خاتون ہیں۔ اس کے باوجود وہ ہر ہفتہ نظام الدین میں ایک بزرگ کے مزار (پتے شاہ) کے یہاں حاضری دیتی ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ جیسی ایک خاتون ایسا کیونکر کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم لوگ خواہ کتنا ہی زیادہ ماڈرن بن جائیں، مگر ہم کو اندرونی اعتماد حاصل نہیں ہوتا۔

انھوں نے کہا کہ جدت پسندی یقین و اعتماد کے مسئلہ سے دوچار ہے۔ ہم نے قدیم اعتماد کو کھو دیا ہے، اور اس کی جگہ اب تک ہم نئی بنیاد حاصل نہیں کر سکے ہیں:

Modernity is facing the problem of conviction. We have lost it, and we have not replaced it as yet.

حقیقت یہ ہے کہ "ماڈرن" لوگ سب سے زیادہ سچائی کے آگے جھکنے کے لئے تیار ہوتے ہیں، بشرطیکہ ان کی قابل فہم زبان میں سچائی کو ان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

یہ دور جدید کی ایک اہم دعوتی حقیقت ہے۔

۱۹ مارچ ۱۹۹۰

ہندستان کے مسلم لیڈروں نے ہندستان کے مسلمانوں کے مسئلہ کا حل پہلے یہ بتایا کہ ملک تقسیم کر دیا جائے۔ ۱۹۴۷ میں تقسیم ہو گئی۔ مگر خود مسلم لیڈروں کی نادانی سے کشمیر کا مسئلہ غیر حل شدہ باقی رہ گیا۔ اس کے لئے پاکستان نے ایک سے زیادہ بار حملہ کیا۔ مگر وہ اس کو حاصل نہ کر سکے۔ اب وہ کشمیر کے نوجوانوں کو تربیت دے کر اور انھیں امداد دے کر کشمیر کے اندر تخریب کاری کروا رہے ہیں۔

یہ مسئلہ کا حل نہیں۔ یہ مسئلہ کو مزید پیچیدہ بنانا ہے۔ مسلمانوں کے نام نہاد لیڈر اگر کچھ نہ کرتے، وہ صرف خاموش رہتے تو اب تک فطرت (نیچر) مسئلہ کو حل کر چکی ہوتی۔ مگر ان کی احمقانہ مداخلت صرف مسئلہ میں اضافہ کرتی جا رہی ہے۔

۲۰ مارچ ۱۹۹۰

بے شمار لوگ کسی تبلیغ کے بغیر اپنے آپ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام عین فطرت انسانی کے مطابق ہے۔

ہر آدمی میں پیشگی طور پر ہر قسم کے اچھائی کے ماڈل موجود ہیں۔ آدمی جب ایک لذیذ پھل یا ایک خوبصورت پھول کو پسند کرتا ہے تو وہ اسی لئے اس کو پسند کرتا ہے کہ وہ اس کے اپنے فطری ماڈل کے مطابق تھا۔ یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ آدمی کے اندر پیدائشی طور پر دین مطلوب (دین حق) کا ماڈل رکھ دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی جب دین حق کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ فوراً اس کو قبول کر لیتا ہے۔ کیوں کہ وہ اس کے اپنے ماڈل کے عین مطابق تھا۔

۲۱ مارچ ۱۹۹۰

طرابلس میں محمد سلیمان القائد کے مکان پر ٹیپ بج رہا تھا۔ مدینہ کی مسجد نبوی کے امام کی قرأت سنائی دے رہی تھی۔ اچانک مجھ پر ایک لمحاتی تجربہ گزرا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں قیامت کے میدان میں ہوں، اور وہاں انسان کے بولے ہوئے الفاظ کو اس کے سامنے دہرایا جا رہا ہے۔ یہ اعادہ اتنا کامل اور مکمل ہے کہ کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

ٹیپ کو سن کر اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جس طرح دنیا میں ایک انسان کی آواز دہرائی جا رہی ہے، اسی طرح آخرت میں اس کی محفوظ آواز دہرائی جائے گی تو یہ ایک استنباط ہوگا۔ مگر میرا مذکورہ واقعہ

استنباط نہیں تھا بلکہ وہ ایک تجربہ تھا۔ اس طرح کے تجربے مجھے کئی بار ہوئے ہیں۔

۲۲ مارچ ۱۹۹۰

طرابلس میں ایک عرب نوجوان نے اپنا خواب بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں ان کے پاس ہوں اور ان سے کہہ رہا ہوں کہ میرے پاس عرب لباس موجود نہیں۔ اس پر عرب نوجوان نے کہا کہ میرے پاس دو عربی لباس ہیں۔ ان میں سے ایک لباس میں اپنے پاس رکھتا ہوں اور ایک آپ کو دیدیتا ہوں۔ آپ اس کو استعمال کریں۔

اس خواب کی تعبیر بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ عرب دنیا میں ہمارا مشن بڑے پیمانے پر پھیلنے والا ہے۔ انشاء اللہ العزیز۔

۲۳ مارچ ۱۹۹۰

۲۳ مارچ کو پاکستان میں قومی دن سمجھا جاتا ہے اور اس کو "یوم پاکستان" کہا جاتا ہے۔ پاکستان کی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے اعلان کیا کہ ۲۳ مارچ کو اس سال خصوصی اہتمام کے ساتھ منایا جائے۔ کیوں کہ قرارداد پاکستان پر اب پچاس سال (۹۰ - ۱۹۴۰) پورے ہوگئے ہیں۔ اس کے جواب میں نواز شریف (چیف منسٹر پنجاب) نے اعلان کیا کہ پنجاب میں یوم پاکستان ۲۰ مارچ کو منایا جائے گا۔ (نوائے وقت ۲۴ مارچ ۱۹۹۰)

تاریخی اعتبار سے "یوم پاکستان" ۲۳ مارچ کو آتا ہے۔ مگر نواز شریف (اسلامی لیڈر) اور بے نظیر بھٹو (سیکولر لیڈر) کے درمیان اختلافات یہاں تک بڑھے کہ انھوں نے تاریخ کو بھی اپنا تابع بنالیا۔ جو پاکستان اسلامی اتحاد کے نام پر بنایا گیا تھا، اس کا حال یہ ہے کہ اب تاریخ کے مسلّمہ حقائق کے بارہ میں بھی وہاں کے لیڈروں میں اتفاق رائے نہیں۔ اس قسم کے سطحی لوگ اگر اسلامی نظام قائم کردیں تو وہ ایک ایسا معجزہ ہوگا جس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں موجود نہیں۔

۲۴ مارچ ۱۹۹۰

۱۸ - ۲۳ مارچ ۱۹۹۰ کو میں طرابلس (لیبیا) میں تھا۔ وہاں کے نوجوان طبقہ میں الرسالہ کا مشن بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ سیکڑوں کی تعداد میں تعلیم یافتہ عرب نوجوان اس سے متاثر ہیں۔ وہ لوگ دیوانہ وار میرے اجتماعات میں آتے تھے۔ میری تقریر سنتے تھے اور اس کو ٹیپ کی صورت

میں محفوظ کرتے تھے۔

۱۹۷۶ میں میں پہلی بار طرابلس گیا تھا۔ اس وقت وہاں مصر کے دکتور عبد الصبور شاہین سے ملاقات ہوئی۔ میری عربی زبان انھیں غیر اہم معلوم ہوئی۔ چنانچہ محمد سلیمان القائد سے بات کرتے ہوئے انھوں نے میرے بارہ میں کہا کہ میں سمجھتا تھا کہ وحید الدین خاں کچھ ہیں۔ مگر وہ تو کچھ نہیں۔ میں نے ان کو بالکل کمزور پایا۔ حتی کہ ایسا لگا کہ وہ بول بھی نہیں سکتے۔ ایسا آدمی کیا کر سکتا ہے (کنت اتوقع انہ شئ ولکن وجدتہ ضعیفا حتی انہ لا یکاد یبین۔ ماذا یستطیع ان یفعل مثلہ)

اب پندرہ سال بعد اسی طرابلس کے تعلیم یافتہ طبقہ میں الرسالہ کا مشن سب سے طاقت ور مشن بن رہا ہے۔ میرے قیام کے دوران عرب نوجوان میری باتوں کو سننے کے لئے اس قدر بے تاب رہتے تھے کہ انھوں بتایا کہ آجکل ہم لوگ سونا، کھانا، ہر چیز بھول گئے ہیں۔ آپ سے ملنے اور آپ کی بات سننے کے سوا ہمیں کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تعلیم یافتہ عرب نوجوانوں کی ایک بھیڑ روزانہ میرے پاس موجود رہتی تھی۔

۲۵ مارچ ۱۹۹۰

محمد سلیمان القائد نے ایک تعلیم یافتہ عرب کے بارہ میں بتایا کہ انھوں نے سید ابو الاعلی مودودی کی کتابیں پڑھی تھیں اور ان سے بہت متاثر تھے۔ اس کے بعد محمد سلیمان القائد نے ان کو میری عربی کتابیں اور مضامین کے عربی ترجمے پڑھائے۔ اس مطالعہ کے بعد ان کا سابقہ جوش ختم ہوگیا۔ تاہم انھوں نے اعتراف نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ دین کو سمجھنے کے لئے میں عجمیوں پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ (انی لا استطیع ان اعتمد علی الاعاجم فی فہم الدین)۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی کا نظریہ ان کے ذوق کے مطابق تھا۔ اس لئے انھیں یاد نہیں آیا کہ وہ عجمی ہیں۔ میری بات ان کے ذوق کے خلاف تھی اور اس کو وہ دلیل سے رد نہیں کر سکتے تھے تو انھوں نے کہہ دیا کہ وہ عجمی ہیں۔ اور دین کے معاملہ میں میں عجمیوں پر اعتماد نہیں کر سکتا۔

۲۶ مارچ ۱۹۹۰

امریکی میگزین ٹائم انٹرنیشنل کا شمارہ ۲۶ مارچ ۱۹۹۰ پڑھ رہا تھا۔ اس کے صفحہ ۴۳ پر ایک اشتہار نظر سے گزرا۔ یہ ایک امریکی بینک (Jyske Bank) کا اشتہار تھا۔ اس کا عنوان تھا ——

آپ کی سرمایہ کاری پر زیادہ بڑی واپسی:

Higher return of your investment.

میں نے سوچا کہ بینکوں کے اس قسم کے اشتہارات پر یقین کرکے کروروں آدمی اپنا سرمایہ بینکوں میں رکھتے ہیں تاکہ ان کی اصل انھیں مزید اضافہ کے ساتھ واپس مل سکے۔ اسی قسم کا زیادہ اہم اور زیادہ بامعنی اعلان خدا کی طرف سے کیا گیا ہے کہ تم اپنا اثاثہ دین کی راہ میں لگاؤ اور آخرت میں اس کو بہت زیادہ اضافہ کے ساتھ تمہاری طرف لوٹا دوں گا۔ مگر کوئی نہیں جو اس اعلان پر یقین کرے اور اپنا اثاثہ خدا کے سپرد کر دے۔

۲۷ مارچ ۱۹۹۰

آج کے ٹائمس آف انڈیا میں مسٹر راجیش کوچر (Rajesh Kochhar) کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے ـــــ رام کا اجودھیا کیا افغانستان میں تھا:

Was Rama's Ayodhya actually in Afghanistan?

مضمون میں بتایا گیا ہے کہ اجودھیا میں محکمۂ آثار قدیمہ نے بڑے پیمانہ پر کھدائی کی ہے۔ اس کھدائی سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی کہ رام اجودھیا میں پیدا ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب رام کا تاریخی تعلق اجودھیا سے ثابت نہ ہو تو رام جنم بھومی کا عقیدہ بھی افسانہ بن جاتا ہے۔

تعلیم یافتہ ہندوؤں کی طرف سے اس قسم کے مضامین کثرت سے چھپتے رہتے ہیں۔ وہ مسلم اخبارات میں بھی نقل ہوتے رہتے ہیں۔ مگر فروری ۱۹۸۷ میں جب میں نے یہ تجویز پیش کی کہ تاریخ کے پروفیسروں کا بورڈ بطور ثالث مقرر کیا جائے اور اس کے ذریعہ فیصلہ کیا جائے، تو مسلم قائدین اس تجویز کو قبول نہ کر سکے۔ مسلمانوں کے لیڈر اس راز کو نہیں جانتے کہ مجرد دعوا سے اجودھیا کے مسئلہ کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے ہمیں ہندوؤں کو کسی متفقہ بنیاد پر لانا پڑے گا اور وہ بلاشبہ ثالثی ہے۔ مگر مسلم لیڈر اتنے غیر سنجیدہ ہیں کہ ان سے کسی بھی معقول تجویز کی تائید کی امید نہیں کی جا سکتی۔

۲۸ مارچ ۱۹۹۰

۱۷ مارچ ۱۹۹۰ کو میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے طرابلس (لیبیا) گیا تھا۔ ۲۴ مارچ کی شام کو وہاں سے واپسی ہوئی۔ سفر سے واپسی کے بعد ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ

آپ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ آپ قذافی کے آدمی ہیں۔ قذافی سے آپ کے خصوصی تعلقات ہیں اور اس سے آپ مالی فائدے حاصل کرتے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ سراسر جھوٹی بات ہے۔ میں نے آج تک قذافی سے کسی بھی قسم کی مالی امداد نہیں لی ہے۔ حتیٰ کہ آج تک میں نے کبھی قذافی سے نجی ملاقات بھی نہیں کی جس کے مواقع میرے لئے پوری طرح موجود تھے۔ میں صرف کانفرنس کے لئے جاتا ہوں اور کانفرنس میں شرکت کے بعد واپس آجاتا ہوں۔

میں نے کہا کہ ۱۹ مارچ کو طرابلس کے فندق المھاری کے وسیع ہال میں کانفرنس ہو رہی تھی۔ دنیا بھر کے تقریباً ڈھائی سو آدمی وہاں جمع تھے۔ معمر قذافی وہاں آئے تو تمام لوگ کرسیوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ تقریر کے بعد جب وہ جانے لگے تو دوبارہ تمام لوگ کھڑے ہو گئے۔ میں اکیلا شخص تھا جو اپنی کرسی پر بیٹھا رہا۔ میں نہ آنے کے وقت کھڑا ہوا اور نہ جانے کے وقت۔ آپ کو اگر شبہ ہو تو میں آپ کو اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص کا پتہ دیتا ہوں اس کو خط لکھ کر آپ اس کی بابت پوچھ سکتے ہیں :

Phiroz Ahmad Khan, P.O. Box 20566
Gaborone, Botswana. (Tel. 374824)

اس سے پہلے جون ۱۹۸۷ میں میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے لیبیا گیا تھا۔ کانفرنس کے ممبران جن کی تعداد ۴۰ تھی، خصوصی طیارہ کے ذریعہ بنغازی لے جائے گئے تاکہ وہاں معمر قذافی کے خیمہ میں ان سے ملاقات کر سکیں۔ ہم سب لوگ خیمہ کے اندر بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں معمر قذافی وہاں آئے۔ ان کے آتے ہی تمام لوگ کھڑے ہو گئے۔ میں تنہا اپنی نشست پر بیٹھا رہا۔ یہ واقعہ ڈاکٹر حیات اسماعیل صاحب نے ٹیلیویژن پر دیکھا۔ وہ بنگلور کے رہنے والے ہیں اور طرابلس میں بطور انجنیئر کام کر رہے ہیں۔ آپ چاہیں تو ان سے اس واقعہ کی تصدیق کر سکتے ہیں۔

۲۹ مارچ ۱۹۹۰

طرابلس میں عرب نوجوانوں کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ قرآن کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ قرآن کی بات کو اپنے لفظوں میں ڈھال سکیں۔ جب آپ لفظ بدل دیں اسی وقت آپ معنی

تک پہنچتے ہیں (اذا بدلت اللفظ فقد ادرکت المعنیٰ)

اس کی ایک مثال قرآن کی وہ آیت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر ہم فرشتوں کے ذریعہ اپنا پیغام بھیجتے تب بھی ان کو انسان کے روپ میں بھیجتے، اور دوبارہ معاملہ کو اسی طرح مشتبہ کر دیتے جس طرح اب وہ مشتبہ ہو رہے ہیں (وللبسنا علیہم ما یلبسون)

اس آیت میں جس چیز کو سنت التباس کہا گیا ہے، وہ تقریباً وہی چیز ہے جس کو نظریۂ تعلیم میں اکتشافی طریقہ (Discovery method) کہا جاتا ہے۔ ایک تعلیمی طریقہ یہ ہے کہ طالب علم کو پوری بات نہ بتائی جائے بلکہ کچھ بتایا جائے اور کچھ چھوڑ دیا جائے، اور طالب علم سے کہا جائے کہ تم خود اپنی کوشش سے اس کو معلوم کرو۔ اس کی ایک سادہ مثال جغرافی نقشہ ہے۔ یعنی نقشہ کو اس طرح چھاپا جائے کہ اس میں لکیروں کے ذریعہ حدود ظاہر کئے گئے ہوں مگر ملکوں اور شہروں کے نام نہ لکھے گئے ہوں۔ پھر یہ سادہ نقشہ طالب علم کو دے کر کہا جائے کہ اس میں ملکوں کے نام لکھو۔

یہی طریقہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور معرفت کا رکھا ہے۔ اللہ کی طرف سے بہت کچھ بتانے کے باوجود کچھ چیزوں کو مشتبہ رکھا جاتا ہے تاکہ آدمی محنت کرکے اس کو دریافت کرے۔ بتائی ہوئی بات کو آدمی بہت زیادہ پکڑ نہیں پاتا۔ مگر جب وہ خود اپنے غور و فکر کے ذریعہ ایک چیز دریافت کرتا ہے تو وہ چیز آخری حد تک اس کے وجود میں سما جاتی ہے۔

۳۰ مارچ ۱۹۹۰

کسی قوم کو محرومی اور حق تلفی کے احساس پر اٹھانا اس کو ابدی بربادی کے گڑھے میں ڈالنا ہے۔ کیوں کہ ایسی قوم ہمیشہ محرومی کے احساس میں مبتلا رہے گی وہ کبھی ترقی نہ کر سکے گی۔

پاکستان کی تحریک احساس محرومی پر اٹھائی گئی۔ پاکستان بننے کے بعد یہی احساس محرومی بنگالیوں کے اندر پنجابیوں کے مقابلہ میں جاگ اٹھا اور پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا۔ اب خود پاکستان میں یہی احساس محرومی مہاجروں اور سندھیوں کو آپس میں لڑائے ہوئے ہے۔ اسی احساس محرومی کو لیکر کشمیر کے لوگ نام نہاد جہاد کر رہے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں ہمیشہ ایک آگے اور دوسرا پیچھے ہو جاتا ہے۔ یہ فرق کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ اس لئے پچھڑے ہوئے طبقات میں احساس محنت کو جگانا چاہئے نہ کہ

احساس حق تلفی کو۔ یعنی ان پچھڑے ہوئے لوگوں کو یہ کہہ کر نہیں ابھارنا چاہئے کہ فلاں نے تم سے تمہارا اثاثہ چھین لیا ہے، بلکہ انھیں یہ بتانا چاہئے کہ زندگی ایک دوڑ ہے۔ تم وقتی طور پر پیچھے ہو گئے ہو۔ اب زیادہ محنت کرو تاکہ تم دوبارہ آگے بڑھ سکو۔

۳۱ مارچ ۱۹۹۰

آج فجر کی نماز کے بعد کالی مسجد (نظام الدین) میں ایک صاحب تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ بھائیو، قرآن کی تلاوت کرو۔ قرآن وہ کتاب ہے کہ اس کے ایک حرف پر دس دس نیکی ہے۔ تورات اور انجیل کو یہ خصوصیت حاصل نہیں۔ یہ صرف قرآن کی خصوصیت ہے کہ اس کے ہر حرف پر دس نیکی رکھی گئی ہے۔

اسی طرح کی اور بہت سی باتیں وہ کہتے رہے۔ میں نے سوچا کہ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں امانی (النساء ۱۲۳) کہا گیا ہے۔ یعنی آرزوئیں اور خوش گمانیاں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان جس دین پر کھڑے ہوئے ہیں وہ امانی کا دین ہے نہ کہ خدا کا اتارا ہوا دین۔

یکم اپریل ۱۹۹۰

میرے اندر سوچنے کی عادت ہے۔ میں اکثر کسی آیت یا کسی حدیث کے بارہ میں سوچتا رہتا ہوں۔ آج نماز کے لئے مسجد جاتے ہوئے یہ بات میرے ذہن میں آئی کہ صف بندی کے لئے حدیث میں جو حکم آیا ہے اس کا مطلب کیا ہے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ نماز کی صف میں خوب مل کر کھڑے ہو۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ شیطان صف کے خلل میں بکری کے بچہ کی طرح داخل ہو رہا ہے (انی لاری الشیطان یدخل من خلل الصف کانها الحذف۔)

اس حدیث میں خلل کا مطلب مجرد جگہ (space) نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ جب لوگ پاؤں کو پھیلا کر ایک دوسرے سے ملیں گے تو خود ایک آدمی کے دونوں پیروں کے درمیان میں اتنی جگہ ہو جائے گی کہ اس کے اندر سے "بکری کا بچہ" گزر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں خلل سے مراد دو آدمیوں کے درمیان خلل ہے نہ کہ دو پیروں کے درمیان خلل۔

اس حدیث میں اصل زور باہم مل کر کھڑے ہونے پر ہے۔ باہم مل کر کھڑا ہونا اتفاق کی علامت ہے اور منتشر انداز میں کھڑا ہونا اختلاف کی علامت۔ چنانچہ یہی بات دوسری روایت میں ان

لفظوں میں ہے: استوُوا ولا تختلفوا فتختلف قلوبکم۔

۱۲ اپریل ۱۹۹۰

اسٹیونسن (R.L. Stevenson) ۱۸۵۰ میں اڈنبرا میں پیدا ہوا، ۱۸۹۴ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ایک رائٹر تھا۔ اس کا ایک قول ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ہم ان چیزوں سے محبت کرنے لگتے ہیں جن سے ہم نے نفرت کی تھی، اور وہ چیزیں ہمارے لئے قابل نفرت بن جاتی ہیں جن سے ہم نے محبت کی تھی:

In the course of time, we grow to love things we once hated and hate things we loved.

کشمیریوں کے بارہ میں یہ بات نہایت درست ہے۔ شیخ عبداللہ کی زندگی میں تمام کشمیری ان کو پوجتے تھے۔ اب وہی کشمیری شیخ عبداللہ کو غدار کہتے ہیں۔ انھوں نے ان کا گھر جلا دیا۔ وہ اس پر تلے ہوئے ہیں کہ شیخ عبداللہ کی قبر کو کھود کر ان کی ہڈیاں نکالیں اور ان کی بے حرمتی کریں۔

آجکل کشمیریوں پر پاکستان کی محبت سوار ہے۔ لیکن اگر بالفرض ایسا ہو جائے کہ کشمیر انڈیا سے الگ ہو کر پاکستان کے ساتھ شامل ہو جائے تو یقینی ہے کہ آئندہ انھیں پاکستان سے نفرت ہو جائے گی۔ کیونکہ تخیل کے مقابلہ میں عملی حقیقت ہمیشہ کمتر ہوتی ہے۔

اس معاملہ میں کشمیریوں کا حال وہی ہوگا جو مشرقی بنگال (بنگلہ دیش) کا ہوا۔ پہلے انھوں نے انڈیا سے نفرت کر کے اپنے آپ کو پاکستان میں شامل کیا۔ اس کے بعد وہ پاکستان کے دشمن اور انڈیا کے دوست بن گئے اور ۱۹۷۱ میں انڈیا کی مدد سے پاکستان سے لڑ کر علیحدہ ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی محبت بھی بے معنی ہے اور اس قسم کی نفرت بھی بے معنی۔

۱۳ اپریل ۱۹۹۰

۱۹۲۹ کا سال جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) کے لئے بڑا سخت سال تھا۔ مالی بحران کی وجہ سے جامعہ کے استادوں کی تنخواہیں رک گئیں۔ یہاں تک کہ آٹھ مہینے تک کسی کو تنخواہ نہیں ملی۔ حکیم اجمل خاں اس کی وجہ سے بہت فکرمند تھے۔ ایک دن انھوں نے قاضی عبدالغفار صاحب (استاد جامعہ) کو بلا کر انھیں اپنے پاس سے ایک ہیرے کی انگوٹھی دی۔ اور کہا کہ اس کو بمبئی لے جایئے

اور اس کو بیچ کر جو رقم ملے اس سے استادوں کی تنخواہ ادا کیجئے۔ اسی کے ساتھ حکیم صاحب نے ہدایت کی کہ اس انگوٹھی کو دلی میں فروخت نہ کرنا۔ 1929 میں اس انگوٹھی کی قیمت بیس ہزار روپیہ ملی تھی۔ اس رقم سے جامعہ کے استادوں کو تنخواہیں دی گئیں اور جو رقم بچی وہ جامعہ کے فنڈ میں جمع کر دی گئی۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ '1929' میں جو لوگ جامعہ کی تحریک میں شریک ہوئے وہ اس میں کن جذبات کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ مگر جامعہ اپنی پوری مدت میں اپنے بانیوں جیسا ایک انسان بھی پیدا نہ کر سکا۔ حکیم اجمل خاں جیسے لوگ جامعہ کے باہر پیدا ہوئے۔ مگر وہ جامعہ کے اندر پیدا نہ ہو سکے۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ مقصدی انسان کبھی "مقصدی درس گاہوں" میں پیدا نہیں ہوتے۔ وہ ہمیشہ حالات کی درس گاہ اور افکار کے سیلاب میں پیدا ہوتے ہیں۔

۴ اپریل ۱۹۹۰

نوائے وقت (یکم اپریل ۱۹۹۰) کے ایک مضمون میں پاکستان کی پچاس سالہ سیاست کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ سابق صدر محمد ایوب خاں کی بابت یہ الفاظ درج ہیں:

"صدارتی نظام کے تحت ایوب خاں مرحوم کے دور میں اتنی صنعت کاری ہوئی کہ لوگ اب تک ان کے گن گاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہر سو آسودگی و امن و امان کا دور دورہ جاری رہا۔ خوراک و دیگر اشیائے صرف کی قیمتوں میں اتنا حقیر اضافہ ہوا کہ کسی نے محسوس تک نہ کیا۔ بحیثیت گورنر مغربی پاکستان نواب امیر محمد خاں کالا باغ نے سیاست دانوں کو سرکاری معاملات میں دخیل نہ ہونے دیا۔ اور حکومت کا کاروبار کلیۃً انتظامیہ کے ہاتھوں میں رہا۔ محکموں کے سکریٹری اور سربراہ اپنے ذاتی فرائض کی انجام دہی کے ذمہ دار تھے جسے انھوں نے بطریق احسن نبھایا، کیونکہ قواعد و ضوابط کی پابندی کی راہ میں سیاست دانوں کی مداخلت آڑے نہ آتی تھی۔" صفحہ ۱۰۔

میرے نزدیک صدر ایوب خاں پاکستان کے سب سے بہتر حکمراں تھے۔ ان کو کھونے کی سب سے زیادہ ذمہ داری نام نہاد اسلام پسند گروہ پر ہے۔ اس نے ایوب خاں کی بعض کمیوں کو اچھالا۔ اور عوام کو ان کے خلاف بھڑکا دیا۔ حالانکہ اس طرح کی جزئی کمیاں ہر شخص میں ہوتی ہیں اور ان کے سلسلہ

میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ یا تو انھیں نظرانداز کیا جائے یا خیر خواہانہ انداز میں خاموشی کے ساتھ ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو کبھی کوئی پائدار حکومت قائم نہیں ہوسکتی۔

۵ اپریل ۱۹۹۰

سعودی عرب میں مسجدوں میں اجتماع کرنا منع ہے۔ مسجدوں میں صرف نماز کے لئے جمع ہونے کی اجازت ہے، کسی اور مقصد کے لئے نہیں۔ تبلیغی جماعت مسجد کو بنیاد بنا کر اپنا کام کرتی ہے۔ اس بنا پر سعودی عرب میں ان کا کام بالکل بند ہو گیا تھا۔

ایک تبلیغی بزرگ نے بتایا کہ اب تبلیغ والوں نے اس کا حل تلاش کر لیا ہے۔ وہ یہ کہ مسجد کے بجائے گھر کو بنیاد بنا کر وہ اپنا کام کر رہے ہیں۔ وہ سب کچھ جو پہلے مسجدوں میں ہوتا تھا اب گھروں میں کیا جا رہا ہے۔ البتہ یہ کام چھوٹے چھوٹے اجتماعات کی صورت میں کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ گھروں کے اندر بڑے اجتماعات کئے جائیں تو دوبارہ حکومت باخبر ہو جائے گی اور یہاں بھی کام بند کرنے کا حکم جاری ہو جائے گا۔

میں نے کہا کہ یہ بالکل درست ہے۔ یہ اسی روح کے مطابق ہے جو قرآن میں ہے کہ واجعلوا بیوتکم قبلۃ و اقیموا الصلاۃ۔ مگر عجیب بات ہے کہ سعودی عرب میں تو مسلمان مسجد کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئے اور ہندستان میں سڑک چھوڑنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ ہندستان کے فسادات زیادہ تر سڑک کی سیاست کے نتیجہ میں ہوتے ہیں۔ مگر مسلمان اس کے لئے تیار نہیں۔ سعودی عرب میں مسجد کو بنیاد بنا کر کام کرنے کے مواقع نہیں تھے تو انھوں نے گھر کو بنیاد بنا کر کام کرنا شروع کر دیا۔ یہی ہندستان میں کرنا چاہئے۔ یہاں اگر سڑک کو بنیاد بنا کر قومی تعمیر کے مواقع نہیں ہیں تو وہ سڑک کے باہر دوسرا میدان اپنے لئے تلاش کر لیں اور وہاں اپنا تعمیری کام جاری کر دیں۔

۱۶ اپریل ۱۹۹۰

کالی مسجد میں فجر کی نماز پڑھ کر نکلا۔ ذہن میں امام صاحب کی پرجوش تقریر تھی جو انھوں نے نماز کے بعد مقتدیوں کے سامنے کی تھی۔ سوچتے ہوئے اچانک زبان سے نکلا "مسئلہ خدا کا ہے، لڑ رہے ہیں انسان سے":

آج تمام دنیا کے مسلمان عمل یا زبان کے ذریعہ دوسری قوموں سے لڑ رہے ہیں۔ دوسری قوموں

کے ظلم اور مظاہرہ (سازش) کے خلاف ہر جگہ چیخ پکار برپا ہے۔ میں اس کو بالکل لغو سمجھتا ہوں۔ اس وقت مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ پیش آ رہا ہے، وہ انسان کی طرف سے نہیں ہے بلکہ براہ راست خدا کی طرف سے ہے۔ عہد خداوندی کے معاملہ میں مسلمانوں نے جو کوتاہی کر رکھی ہے۔ اس پر انھیں ہر جگہ تنبیہہ کی جا رہی ہے۔ مسلمان خدا کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرکے اس صورتحال سے نجات پا سکتے ہیں۔ دوسری قوموں سے لڑنا یا ان کے خلاف احتجاج کرنا کسی بھی درجہ میں ان کے مسئلہ کو حل کرنے والا نہیں۔

۷ اپریل ۱۹۹۰

انڈین ایرلائنز نے فرانس سے پندرہ ایربس (اے ۳۲۰) خریدی۔ ۱۸ فروری ۱۹۹۰ کو ان میں سے ایک ایربس بنگلور ہوائی اڈہ کے پاس گر کر تباہ ہو گئی۔ اس کے بعد بقیہ چودہ جہاز زمین پر اتار دئے گئے ہیں۔ ان کا استعمال بند کر دیا گیا ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۷ اپریل ۱۹۹۰) کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے انڈیا کو پچھلے چھ ہفتہ میں ۲۵ کروڑ روپے کا نقصان ہو چکا ہے۔ کرایہ کا نقصان اور ہوائی اڈوں پر ٹھہرانے کا جرمانہ سب ملاکر روزانہ چودہ لاکھ روپیہ کا نقصان ہو رہا ہے۔ دوسری طرف آج ہی کے اخبار میں یہ خبر ہے کہ ۱۱ اپریل ۱۹۹۰ سے انڈین ایرلائنز کے کرایہ میں پندرہ فیصد کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

آزادی کے بعد ملک میں جو حکومتیں قائم ہوئیں، ان کا مستقل ریکارڈ یہی ہے کہ وہ اپنے نکمے پن کی وجہ سے ملکی خزانہ پر بوجھ بڑھاتی ہیں اور پھر اس کی تلافی کے لئے ہر سال ٹیکس میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ آزادی سے ہندستان کو ایک نفسیاتی فخر کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔ بظاہر ۱۹۴۷ کے بعد جو ترقیاں نظر آتی ہیں وہ زمانہ کا عطیہ ہیں نہ کہ ہماری حکومتوں کا عطیہ۔

۸ اپریل ۱۹۹۰

قاضی عبدالغفار صاحب (۱۹۵۶ - ۱۸۸۹) مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ وہ آزادی کی تحریک میں شامل تھے۔ قومی آواز (۸ اپریل ۱۹۹۰) میں ان کے بارہ میں ایک مضمون سری نواس لاہوٹی کے قلم سے شائع ہوا ہے۔ وہ قاضی عبدالغفار کے حالات کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"قاضی صاحب نے علی گڑھ سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ان کے والد (خان بہادر ابرار احمد) نے گورنر سے کہہ کر ان کو آبپاشی کے محکمہ میں ملازم رکھوا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ گورنر

سے کوئی ہندستانی ملنے جاتا تو اسے اپنے جوتے اتار کر ننگے پیر جانا پڑتا تھا، اور یہی صورتحال قاضی صاحب کے ساتھ پیش آئی۔ حالانکہ یہ فل سوٹ زیب تن کئے ہوئے تھے۔ اس واقعہ سے ان کو بڑا صدمہ ہوا (جلد ہی بعد انھوں نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی)۔

قاضی صاحب اگر سوچتے کہ ملاقات کے یہی آداب مسلم بادشاہوں اور مسلم نوابوں کے یہاں بھی رائج ہیں تو یہ بات ان کو زمانہ کی بات لگتی، مگر اس طرح نہ سوچنے کی وجہ سے یہ بات انھیں انگریز کی بات محسوس ہوئی۔ پہلی صورت میں وہ اس کو زمانہ کے خانہ میں ڈالتے، دوسری صورت میں انھوں نے اس کو انگریز کے خانہ میں ڈال دیا۔

یہی غیر حقیقت پسندانہ طرز فکر ہے جس کی وجہ سے بے شمار مسلمان ردعمل کی نفسیات کا شکار ہو گئے۔ وہ انگریز نفرت میں مبتلا ہو کر انگریز سے لڑنے لگے۔ حالاں کہ اصل ضرورت یہ تھی انگریز کی طاقت اور مغربی تہذیب کو سمجھا جائے۔ مگر نفرت کی نفسیات اس میں رکاوٹ بن گئی کہ وہ معاملہ کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیں اور اس کے مطابق ملی تعمیر کا عمل جاری کریں۔

۹ اپریل ۱۹۹۰

روی ابوداؤد والنسائی وابن ماجه والامام احمد ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال: یأتی علی الناس زمان یأکلون فیه الربا۔ قیل له الناس کلهم۔ قال من لم یأکله ناله غبارہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ اس میں لوگ سود کھائیں گے۔ کہا گیا کہ سب لوگ۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص اس کو نہیں کھائے گا اس تک بھی اس کا غبار پہنچے گا۔

میرا خیال ہے کہ یہ حدیث دلائل نبوت میں سے ہے۔ موجودہ صنعتی دور میں تمام اقتصادی سرگرمیاں بینک سے وابستہ ہو گئی ہیں۔ آج آپ بازار سے ایک دیاسلائی بھی خریدتے ہیں تو اس کے ساتھ بالواسطہ طور پر سود کی ایک رقم ادا کرتے ہیں۔ یہ صورتحال تمام تر جدید صنعتی نظام کی پیداوار ہے۔ یہ ماضی میں بالکل موجود نہ تھی۔ ایسی حالت میں چودہ سو سال پہلے کسی کا ایسی بات کہنا صرف اسی وقت ممکن تھا جب عالم الغیب کی طرف سے اس کو مستقبل کے اس واقعہ کی خبر دے دی گئی ہو۔

یہ آپ کے پیغمبر خدا ہونے کا ایک ثبوت ہے۔

۱۰ اپریل ۱۹۹۰

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ گورنمنٹ میں بڑے عہدہ پر تھے۔ اب دہلی میں ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ جیسے علماء اسلام کو بالکل نہیں سمجھتے۔ آپ لوگ اسلام اور مسلمانوں کو الگ کرکے دیکھتے ہیں۔ حالاں کہ اسلام اور مسلمان دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ آپ لوگوں کے اس نظریہ نے اسلام کو جامد اور غیر ترقی یافتہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

میں نے کہا کہ بات اس طرح نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ جیسے لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام کو مسلمانوں کے عمل سے جانچنا چاہئے۔ اس کے برعکس ہمارا کہنا ہے کہ اصل معیار اسلام ہے، اور ہمیں چاہئے کہ مسلمانوں کے عمل کو اسلام کے معیار سے جانچیں۔

۱۱ اپریل ۱۹۹۰

پاکستان کے مشہور اخبار نوائے وقت (یکم اپریل ۱۹۹۰) میں محمد ابراہیم صاحب کا ایک مضمون چھپا ہے۔ مضمون نگار نے لکھا ہے کہ پاکستان میں "سیاست دانوں کا کردار کبھی مستحسن نہیں ہوا۔ ان کی بدعنوانیاں آغاز کار سے ہی سطح پر آگئیں۔ چنانچہ قائد اعظم (محمد علی جناح) کو بادل ناخواستہ یہ کہنا پڑا کہ ان کے پاس سب سکے کھوٹے ہیں۔"

میں کہوں گا کہ مسٹر جناح نے اپنی غلطی دوسروں کے سر ڈال دی۔ ان کو یہ بات پاکستان بنوانے سے پہلے جاننا چاہئے تھا کہ ان کے تمام سکے کھوٹے ہیں۔ اگر وہ پیشگی سوچ کے تحت نہ جان سکے، اس کو انھوں نے عملی تجربہ کے بعد جانا تو وہ قائد اعظم تو درکنار قائد اصغر بھی نہ تھے۔

۱۲ اپریل ۱۹۹۰

پروفیسر مشیر الحق (وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی) کو کشمیر کے جنگ جو نوجوانوں نے گولی مار کر ہلاک کردیا۔ ۱۱ اپریل کو ان کی لاش سری نگر سے دہلی بذریعہ ہوائی جہاز لائی گئی۔ ۱۱ اور ۱۲ اپریل کی درمیانی رات کو ساڑھے دس بجے نماز جنازہ جامعہ کے احاطہ میں پڑھی گئی۔ تقریباً پانچ ہزار آدمی جنازہ میں موجود تھے۔

جامعہ مڈل اسکول کے گراؤنڈ میں میں انتظار میں کھڑا تھا کہ نماز جنازہ شروع ہو تو میں اس میں شرکت کروں۔ اتنے میں شور بلند ہوا کہ مرکزی وزیر عارف محمد خاں جنازہ میں شرکت کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ جامعہ کے کچھ لڑکوں نے ان کے آتے ہی "واپس جاؤ" کے نعرے بلند کئے۔ ان پر پتھر مارے جس سے ان

کے سر میں زخم آئے۔ ان کی کار کو نقصان پہنچا۔ وغیرہ۔ یہ پر تشدد مظاہرہ جامعہ کی اسٹوڈنٹ یونین کے صدر کی قیادت میں ہوا۔ عارف محمد خاں پروفیسر مشیر الحق کے شاگرد ہیں۔ مگر انھیں جنازہ میں شرکت کے بغیر واپس جانا پڑا۔

جامعہ کے ایک استاد نے کہا کہ لڑکوں میں غم و غصہ تھا، اس لئے مرکزی حکومت میں کہلا دیا گیا تھا کہ وہاں کا کوئی آدمی جنازہ میں شریک نہ ہو۔ ورنہ لڑکے ہنگامہ کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں کو چاہئے تھا کہ اپنے لڑکوں کو منع کریں نہ کہ دوسروں کو شرکت جنازہ سے روکیں۔

جنازہ کا وقت وہ ہے جب کہ آدمی کا ذہن زندگی سے موت کی طرف مڑ جائے، وہ دنیا کے بجائے آخرت کے بارہ میں سوچنے لگے۔ ایسے وقت میں بھی مسلمانوں کے دل نرم نہیں ہوتے۔ جنازہ کے وقت نعرہ بازی اور سنگ باری کرنا خدا کے غضب کو بھڑکانا ہے۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے نوجوان اس قسم کے بیہودہ کاموں میں مشغول ہیں اور ان کے بڑے بالواسطہ طور پر ان کی تائید کر رہے ہیں۔

۱۳ اپریل ۱۹۹۰

آج ٹائمس آف انڈیا نے ٹامس کارلائل (Thomas Carlyle) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ محبت کرنے والا دل تمام علم کا آغاز ہے:

A loving heart is the beginning of all knowledge.

"محبت کرنے والا دل" ایک سادہ سی بات نہیں۔ محبت کرنے والا دل کسی شخص کو سخت محنت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اس دنیا میں طرح طرح کے شخصی اور قومی اسباب پیش آتے ہیں جو آدمی کے اندر دوسروں کے خلاف نفرت کے جذبات بھڑکاتے ہیں۔ اس لئے اس دنیا میں وہی شخص محبت کر سکتا ہے جو نفرت کے اسباب کے باوجود محبت کر سکے۔

جو آدمی اس اعلیٰ صلاحیت کا ثبوت دے، اس نے گویا اپنے اندر بلند فکری پیدا کر لی۔ اور بلند فکری ہی بلاشبہ تمام علمی و فکری ترقی کا سرچشمہ ہے۔

۱۴ اپریل ۱۹۹۰

کویت کا عربی ماہنامہ الوعی الاسلامی (رمضان ۱۴۱۰ھ، اپریل ۱۹۹۰) پڑھ رہا تھا۔ اس کے صفحہ ۶۲ پر عباسی خلیفہ ہارون الرشید کی ایک دعا نقل کی گئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

یاربِّ اَنْتَ اَنْتَ وَ اَنَا اَنَا۔ انا العَوّادُ بِالذَّنْبِ وَاَنْتَ العَوّادُ بِالمَغفِرَۃِ، فَاغْفِرْلِی۔

اے میرے رب، تو تو ہے اور میں میں ہوں۔ میں بار بار گناہ کرتا ہوں اور تو بار بار بخشش فرماتا ہے، پس تو مجھے بخش دے۔

اس دعا میں اپنی عبدیت اور خدا کی معبودیت کا جو والہانہ اعتراف ہے، وہ بہت عجیب ہے۔ اس میں دوسرا سبق یہ ہے کہ اسلام ایک ایسا نقطۂ نظر دیتا ہے کہ بادشاہ اپنی ساری بادشاہی کے باوجود اپنے کو چھوٹا سمجھنے پر مجبور ہو جائے۔

۱۵ اپریل ۱۹۹۰

کشمیر میں آجکل دہشت گردی کی جو تحریک چل رہی ہے، اس میں اسکولوں اور کالجوں کی عمارتوں کو بھی برباد کر دیا گیا ہے۔ قومی آواز (۱۴ اپریل ۱۹۹۰) کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ کشمیر میں بہت سے دہشت گرد پکڑے گئے ہیں۔ پولیس ان سے سوال وجواب کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں رپورٹ کا ایک حصہ یہ ہے:

"جب دہشت گردوں سے پوچھا گیا کہ انھوں نے وادی کشمیر میں اسکولوں کی عمارتوں کو کیوں آگ لگادی۔ انھوں نے اس کے جواب میں کہا کہ ان اسکولوں میں سیکولرزم کا سبق سکھایا جاتا ہے، جب کہ ہم نظام مصطفیٰ قائم کرنا چاہتے ہیں"۔

کشمیر کے ان انتہا پسندوں کے فکری رہنما اقبال، سید قطب اور ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔ اور ان کو ایران اور افغانستان کے 'جہاد' سے عملی جوش ملا ہے۔ اور یہ تمام لوگ مغربی طرز تعلیم کے سخت خلاف رہے ہیں۔ مثلاً ابوالاعلیٰ مودودی نے جدید تعلیم گاہوں کو "قتل گاہ" بتایا ہے۔ وغیرہ۔

میرے نزدیک یہ سب مجنونانہ باتیں ہیں۔ ان کا آخری انجام ملت کی بربادی کے سوا کسی اور شکل میں نکلنے والا نہیں۔

۱۶ اپریل ۱۹۹۰

آج رمضان ۱۴۱۰ھ کی ۱۹ تاریخ ہے۔ روزہ کے سلسلہ میں میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر کم کھاؤں تو پیٹ ہلکا رہتا ہے مگر دن بھر بھوک کا احساس غالب رہتا ہے۔ اور اگر زیادہ کھاؤں تو بھوک کا

احساس نہیں ہوتا، مگر سارے دن پیٹ بھاری رہتا ہے۔ میں نے دوسری صورت کے مقابلہ میں پہلی صورت کو ترجیح دی ہے۔ دن بھر پیٹ کا بھاری رہنا مجھے پسند نہیں۔ مجھ کو یہ بات زیادہ پسند ہے کہ طبیعت ہلکی رہے، خواہ وہ بھوک کی قیمت پر کیوں نہ ہو۔

موجودہ دنیا صرف کھونے کی دنیا ہے اور آخرت کی دنیا صرف پانے کی دنیا۔ آدمی کا حال بھی کیسا عجیب ہے۔ وہ محرومی کی دنیا میں پانا چاہتا ہے۔ اور جو دنیا پانے کے لئے ہے وہاں وہ مسلسل کھو رہا ہے۔

۱۷ اپریل ۱۹۹۰

کارل مارکس (۱۸۸۳ - ۱۸۱۸) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے موجودہ دنیا پر سب سے زیادہ فکری اثر ڈالا ہے۔ یہ بات اس اضافہ کے ساتھ صحیح ہے کہ اس سے متاثر ہونے والے لوگوں میں مسلمان بھی بڑی تعداد میں شامل تھے۔

مارکس سے متاثر ہونے والے مسلمانوں میں ایک طبقہ ہے جو باقاعدہ مارکسسٹ بن گیا۔ ان کے علاوہ بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو اپنے آپ کو مارکسی نہیں کہتے۔ مگر وہ نہایت گہرے طور پر مارکسی فکر سے متاثر ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے مارکسیت کو اسلامائز کیا۔

مارکسی فکر کے دو بڑے حصے ہیں۔ ایک اس کا مخصوص نظریہ، دوسرا اس کا طریقہ (Method) میرے نزدیک غلام احمد پرویز (۱۹۸۵ - ۱۹۱۰) نے مارکس کے نظریہ کو اسلامائز کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور ابو الاعلیٰ مودودی (۱۹۷۹-۱۹۰۳) وہ شخص ہیں جنھوں نے مارکسزم کے طریقہ کو اسلامائز کیا۔ مارکس کے طریقہ کا بنیادی پہلو شکست نظام ہے۔ اس کو ابو الاعلیٰ مودودی نے اسلامی اصطلاحوں میں لے لیا۔

حالانکہ مارکسی طریقہ اسلام کی عین ضد ہے۔ اسلام کا طریقہ اصلاً شکست ذہن ہے نہ کہ شکست نظام۔ ابو الاعلیٰ مودودی کی اسی فکر کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کے لٹریچر سے متاثر ہونے والے لوگ ساری دنیا میں سسٹم کو توڑنے والی باتیں کر رہے ہیں۔ اور جہاں مواقع ہیں، وہاں تشدد کے ذریعہ نظام کو توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر ان کے اندر صحیح اسلامی ذہن ہوتا تو وہ فکر میں تبدیلی لانے پر ساری طاقت خرچ کرتے نہ کہ سیاسی ڈھانچہ کو توڑنے پر۔

۱۸ اپریل ۱۹۹۰

مسلمانوں نے پیدائش، موت، شادی بیاہ وغیرہ مواقع پر بہت سے بدعتی طریقے اختیار کر لئے ہیں۔ مگر ان کی سب سے بڑی بدعتیں وہ ہیں جو انھوں نے مسجد اور عبادت کے ساتھ شامل کر رکھی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک اشتعال انگیز حد تک لغو بدعت یہ ہے کہ درود وسلام کے نام پر مسلمانوں نے کچھ خود ساختہ کلمات اور اشعار وضع کر لئے ہیں۔ مثلاً الصلاۃ والسلام علیک یا حبیب اللہ، یا اے خدا کے لاڈلے، وغیرہ۔ فجر کے وقت اذان سے پہلے یہ کلمات دیر تک مسجد میں دہرائے جاتے ہیں۔ اور نماز فجر کے بعد دوبارہ کئی مسلمان مل کر ان کو ادا کرتے ہیں۔

یہ خود ساختہ درود وسلام ہمیشہ لاؤڈ اسپیکر پر ہوتا ہے۔ یہ آوازیں تقریباً ایک میل کے دائرہ میں پھیلتی ہیں۔ مگر وہ دوسروں کے لئے صرف شور وغل ہوتا ہے، کیوں کہ مسجد کے باہر وہ صرف شور کی صورت میں سنائی دیتا ہے۔ غیر مسلموں کو بھی مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اس شور کو سنیں۔ نماز کسی زمانہ میں پرسکون عبادت کا نام تھی۔ اب لاؤڈ اسپیکر کے زمانہ میں وہ لوگوں کی نیند میں خلل ڈالنے اور لوگوں کے سکون کو برہم کرنے کا نام بن گئی ہے۔

ہندستان کے علماء اور رہنما آجکل سب سے زیادہ ملی تشخص کے مسئلہ پر تقریریں کر رہے ہیں۔ مگر میرے نزدیک اس سے کہیں زیادہ بڑا مسئلہ اس قسم کی بدعتیں ہیں جنھوں نے اسلام کے تشخص کو بگاڑ رکھا ہے۔ اس کی وجہ سے غیر مسلموں کی نظر میں نماز کی تصویر ایک مجنونانہ قسم کے شور وغل کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ جو لوگ ملی تشخص کو سب سے بڑا مسئلہ سمجھتے ہیں، وہ اسلامی اور عبادتی تشخص کے اس سنگین تر مسئلہ پر بالکل خاموش ہیں۔

۱۹ اپریل ۱۹۹۰

قرآن سے استدلال کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے خدا کے کلام سے خدا کی بات نکالنا۔ دوسرا ہے خدا کے کلام سے اپنی بات نکالنا۔ دوسرے طریقہ استدلال کی مثالیں شیعہ حضرات کے یہاں بہت پائی جاتی ہیں۔ مثلاً امام کے بارہ میں ان کا عقیدہ۔ ان کا کہنا ہے کہ نبوت کے بعد امامت کا تسلسل جاری ہے۔ امام نبی کی طرح مامور من اللہ ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ الائمۃ نور اللہ۔ اس کا ثبوت:

عن ابی خالد الکابلی سألت ابا جعفر عن قول اللہ عز وجل (آمنوا باللہ ورسلہ

و النور الذی انزلنا) فقال یا ابا خالد النور و اللہ الائمۃ (اصول کافی)
ابوخالد الکابلی کہتے ہیں کہ میں نے ابوجعفر (امام باقر) سے اس آیت کے بارہ میں پوچھا کہ "ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور اس نور پر جو ہم نے اتارا۔" انھوں نے جواب دیا کہ اے ابوخالد، نور سے مراد خدا کی قسم ائمہ ہیں۔

یہ حقیقی معنوں میں کوئی استدلال نہیں۔ یہ خدا کے کلام میں اپنی بات کو جوڑنا ہے۔ یہ میدان بے حد وسیع ہے۔ آپ قرآن سے ایک لفظ لیں اور اس میں جو لفظ چاہیں جوڑ دیں، اور کہیں کہ دیکھو، یہ میری بات قرآن میں موجود ہے۔

۲۰ اپریل ۱۹۹۰

پروفیسر مشیر الحق (۱۹۹۰-۱۹۳۳) کشمیر یونیورسٹی میں وائس چانسلر تھے۔ کئی دن سے ان کے بارہ میں تشویشناک خبریں آ رہی تھیں۔ کشمیر کے جنگجو نوجوانوں نے ۶ اپریل ۱۹۹۰ کو انھیں عین اس وقت اغوا کر لیا جب کہ وہ سرینگر میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لئے مسجد جا رہے تھے۔ وہ مسلسل دھمکی دے رہے تھے کہ ہمارے گرفتار ساتھیوں کو رہا کیا جائے ورنہ ہم مشیر الحق (اور دوسرے یرغمالوں) کو قتل کر دیں گے۔

۱۱ اپریل (۱۴ رمضان ۱۴۱۰ھ) کو صبح ۸ بجے میں اپنے مطالعہ کے کمرے میں تھا کہ اچانک میری اہلیہ کمرہ میں داخل ہوئیں۔ "ریڈیو نے خبر کی تصدیق کر دی" انھوں نے کہا۔ آج صبح آل انڈیا ریڈیو نے بتایا کہ کشمیری دہشت پسندوں نے پروفیسر مشیر الحق اور ان کے سکریٹری مسٹر عبد الغنی کو گولی مار دی اور ان کی لاش کو سڑک پر پھینک دیا۔

میری زبان سے بے ساختہ نکلا "یا اللہ، یا اللہ"۔ میں کتاب بند کر کے اٹھا۔ غسل خانہ میں جا کر وضو کیا۔ میرا دل ٹوٹ رہا تھا۔ غم کی شدت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے دماغ سے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے۔ بے اختیاری کے عالم میں میری زبان سے نکلا: خدایا، دو رکعت صلاۃ استہداء قبول فرمائیے۔ طلب ہدایت کی نیت سے دو رکعت نماز پڑھی۔ آخر میں ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ خدایا، آپ کے رسول کی امت بھٹک گئی۔ جھوٹے رہنماؤں نے دین رحمت کے ماننے والوں کو دین تخریب کے راستہ پر ڈال دیا۔ خدایا، اس امت کی ہدایت کا سامان کیجئے۔ اس امت کو بربادی سے بچا لیجئے۔

دین کے نام پر اسی بے دینی کا نام شاید دجالیت ہے۔

۲۱ اپریل ۱۹۹۰

لاہور کے اخبار وفاق (۱۰ اپریل ۱۹۹۰) میں مسٹر محمد علی جناح کے کچھ واقعات شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ مضمون نگار کے الفاظ میں یہ ہے:

"ایک مرتبہ ایک ہندو صحافی نے کہا کہ مسٹر جناح آج آپ کانگرس کو بہت برا بھلا کہہ رہے ہیں۔ حالاں کہ آپ خود پہلے کانگرس میں تھے۔ اور آپ وہیں سے ابھرے ہیں۔ مسٹر جناح نے اس کا پر لطف جواب دیا جس کو سن کر صحافی چپ ہوگیا۔ انھوں نے کہا: آپ کو معلوم ہے کہ میں کسی زمانہ میں مڈل اسکول میں بھی پڑھتا تھا"

مسٹر جناح کے نظریات سے مجھے اتفاق نہیں۔ مگر ان کا یہ جواب مجھے پسند آیا۔ اس طرح کے سوال کا یہ بہترین جواب ہے۔

۲۲ اپریل ۱۹۹۰

قدیم شاہی زمانہ میں ایک یا چند اشخاص بھی سیاست پر قابض ہو جاتے تھے۔ مگر جمہوریت کے زمانہ میں جو چیز فیصلہ کن ہے وہ تعداد ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ سیاست گنتیوں کا کھیل ہے:

Politics is the game of numbers

مگر مسلمان شاید یہ سمجھتے ہیں کہ سیاست الفاظ کا کھیل ہے۔ چنانچہ ہر آدمی الفاظ کے شعبدے دکھا رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ سیاست کا اونچا مینار تعمیر کر رہا ہے۔ سیاسی اعتبار سے ہندستانی مسلمانوں کے لئے پہلا ممکن کام یہ تھا کہ وہ اپنے ووٹوں کو متحد کریں۔ مگر پچاس سال کی ناکام سیاست کے باوجود وہ ایسا نہ کر سکے۔

دوسری چیز یہ تھی کہ وہ ہندستان کے دوسرے طبقات کو کم از کم سیاسی اعتبار سے اپنے ساتھ لے سکتے۔ مثال کے طور پر ان کے لئے ممکن تھا کہ وہ ہریجنوں کو سیاسی طور پر اپنے ساتھ کر لیں۔ بہت سے لیڈر یہ نعرہ لے کر اٹھے۔ مگر سب کے سب ناکام رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لیڈروں نے ہریجنوں کی ترقی کے لئے تو کچھ نہیں کیا۔ بس یک طرفہ طور پر ان کو اپنے لئے استعمال کرنے کی بات کرتے رہے۔ اسی صورت حال کی بابت ڈاکٹر امبیڈکر نے ان لفظوں میں شکوہ کیا تھا کہ مسلمان ہریجنوں کی حمایت تو چاہتے ہیں مگر انھوں نے کبھی بھی ہریجنوں کو اپنی حمایت نہیں دی:

The Muslims wanted the support of the scheduled castes, but they never gave their support to the scheduled castes. (p. 324)

اس قسم کی یک طرفہ ہوشیاری اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

۲۳ اپریل ۱۹۹۰

پاکستان کے اخبار نوائے وقت (۱۴ اپریل ۱۹۹۰) کے اداریہ کی سرخی ہے: "جناب صدر، داخلی سیز فائر کرائیے"۔ اس سرخی کا پس منظر یہ ہے کہ پاکستان میں، خاص طور پر سندھ میں تشدد کا طوفان برپا ہے۔ اخبار کے لفظ میں "باہمی سر پھٹول" اپنے شباب پر ہے۔ گولی اور آتش زنی روزانہ کا معمول بن گئے ہیں۔ نوائے وقت کے مطابق، کراچی آتش فشاں کے دہانے پر پہنچ چکا ہے اور دس ہزار فوجی کراچی میں قیام امن کے لئے متعین کئے جا چکے ہیں۔"

اس قسم کی باتیں میرے نزدیک سراسر بے معنی ہیں۔ آجکل میرے پاس دو پاکستانی اخبار آرہے ہیں۔ ایک نوائے وقت، دوسرا وفاق۔ دونوں اخبار کے صفحات کشمیری نوجوانوں کے پرتشدد واقعات سے بھرے ہوتے ہیں جن کو یہ اخبارات دہشت گردی کے بجائے جہاد کہتے ہیں۔ حتی کہ پروفیسر مشیر الحق جیسے بے ضرر انسان کے مجرمانہ قتل کو پاکستانی اخباروں میں مذمت تو درکنار، اظہار افسوس کا بھی کوئی لفظ پڑھنے کو نہیں ملا۔ نوائے وقت (۱۲ اپریل ۱۹۹۰) میں اس کی خبر ان الفاظ میں دی گئی ہے: "کشمیری حریت پسندوں نے کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر مشیر الحق اور ان کے سکریٹری عبد الغنی کو بھی ہلاک کر دیا ہے۔ اور گولیوں سے چھلنی دونوں کی نعشیں سرینگر میں مل گئی ہیں۔"

ایک طرف پاکستان کے باہر تشدد کو گلوریفائی کرنا اور دوسری طرف پاکستان کے اندر تشدد بند کرنے کی اپیل کرنا، دونوں متضاد باتیں ہیں۔ اور اس قسم کا تضاد کبھی اس دنیا میں واقعہ نہیں بنتا۔

۲۴ اپریل ۱۹۹۰

ڈاکٹر غلام محمد شاہ کشمیری (ترہ گام) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ کشمیر کے نام نہاد مجاہدین کا یہ کہنا ہے کہ "ہم بندوق کی نوک پر کشمیر میں اسلام لائیں گے۔"

میں نے کہا کہ پھر کشمیر کے ان مجاہدین کو کہنا چاہئے کہ وہ خدا اور رسول سے بھی زیادہ طاقت ور ہیں۔ کیوں کہ حضرت عائشہ کی روایت کے مطابق، عرب میں پہلے دلوں کو بدلا گیا، اس کے بعد اسلام کا قانون

نافذ کیا گیا۔ مگر کشمیری مجاہدین دلوں کو بدلے بغیر بم اور گولی کی منطق سے اسلام کا قانون نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اس طرح کشمیر میں اسلام تو نہیں آسکتا، البتہ تباہی اور بربادی ضرور آئے گی، اور یہ تباہی پچھلی تمام تباہیوں سے بڑھ کر ہوگی۔

میں نے کہا کہ اسلام میں جنگ برائے دفاع ہے نہ کہ برائے نفاذ اسلام۔ کسی گروہ میں اسلام کو لانے کے لئے سارا عمل دعوتی انداز میں کیا جاتا ہے۔ جنگ صرف اس وقت کی جاتی ہے جب کہ دفاع کے لئے لڑنے کی ناگزیر ضرورت پیش آئے۔ جنگ کو اشاعت اسلام کے ساتھ جوڑنے کا نظریہ سراسر لغو نظریہ ہے۔ اس کا خدا کے دین سے کوئی تعلق نہیں۔ جنگ کو اشاعت اسلام یا نفاذ اسلام کا ذریعہ بنانا ابو الاعلیٰ مودودی کی بدعت ہے جس کو انھوں نے "الجہاد فی الاسلام" میں پیش کیا ہے۔ مگر یہ ایسا نظریہ ہے جس کے لئے قرآن و حدیث میں کوئی دلیل موجود نہیں۔

۲۵ اپریل ۱۹۹۰

کراچی کے فضل الرحمان صاحب (۱۹۸۹ - ۱۹۳۶) اور فیصل آباد کے مولانا عبد الغفار حسن صاحب دونوں الرسالہ کے بہت قدرداں تھے۔ دونوں کئی سال سے کوشش کر رہے تھے کہ ڈکلیریشن مل جائے تو پاکستان سے الرسالہ کا اڈیشن نکالیں۔ مگر جنرل ضیاء الحق کی حکومت (۱۹۸۸ - ۱۹۷۷) کے زمانہ میں صحافت کے لئے قوانین اتنے سخت تھے کہ آخر وقت تک الرسالہ کا ڈکلیریشن نہ مل سکا۔

یہ بھی ایک مثال ہے کہ فوجی ڈکٹیٹر شپ اندھی ہوتی ہے۔ الرسالہ جو لوگ پڑھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ ایک غیر سیاسی پرچہ ہے۔ مزید یہ کہ اس کا مسلک یہ ہے کہ حکمرانوں سے ٹکراؤ نہ کرتے ہوئے تعمیری اور دعوتی میدان میں کام کرو۔ اس کے باوجود ضیاء الحق صاحب کی فوجی حکومت نے الرسالہ کے اجراء کے لئے ڈکلیریشن نہیں دیا۔

بے نظیر بھٹو کی جمہوری حکومت آئی تو صحافت کے قوانین نرم کر دئے گئے۔ چنانچہ بیک وقت دو ڈکلیریشن مل گئے۔ میں نے فضل الرحمان صاحب (فضل سنز لمیٹڈ) کو ترجیح دی۔ چنانچہ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادہ طارق رحمٰن صاحب نے الرسالہ کو کراچی سے چھاپنا شروع کر دیا ہے۔ مارچ ۱۹۹۰ میں اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا ہے۔ یہ مکمل طور پر دہلی اڈیشن کی نقل ہوتا ہے۔ پاکستان سے الرسالہ کی اشاعت الرسالہ مشن کے لئے ایک نئی جست ہے۔ اللہ تعالیٰ اس جست کو کامیابی عطا فرمائے۔

۲۶ اپریل ۱۹۹۰

آج رمضان (۱۴۱۰ھ) کے مہینہ کا آخری روزہ تھا۔ عید کے چاند کی عام رویت ہوئی۔ میں نے بھی نماز مغرب کے بعد چاند دیکھا۔ چاند کو دیکھتے ہی ایک عجیب احساس ہوا۔ زبان پر فوراً یہ کلمات آگئے:
اَللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ علینا بالامن و الامان والسلامۃ و الاسلام

رمضان کی پہلی تاریخ آئی تو میں ڈر رہا تھا کہ اس شدید موسم میں ایک مہینہ کا روزہ کس طرح پورا ہوگا۔ مگر آج جب کہ روزہ کا مہینہ ختم ہوگیا تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے روزہ کا مہینہ گویا آیا نہ تھا۔
اسی طرح بندہ جب آخرت کے راستہ پر چلنے کی بنا پر دنیا کی تکلیف اٹھاتا ہے تو آج یہ تکلیفیں بظاہر بہت سخت معلوم ہوتی ہیں۔ مگر جب آخرت آئے گی اور آدمی دنیا کے صبر اور مشقت کی جزا کو دیکھے گا تو اس کو ایسا محسوس ہوگا جیسے کہ اس نے کبھی تکلیف اٹھائی ہی نہ تھی۔

۲۷ اپریل ۱۹۹۰

آج عید کا دن ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کا ہفت روزہ اخبار "الجمعیۃ" کا عید نمبر (یکم شوال ۱۴۱۰ھ) آیا تو اس کے ورق پر جلی حرفوں میں یہ مضمون لکھا ہوا تھا:

عید کا دن مسلمانوں کی خوشی کا دن ہے۔
مگر جب خوشی کے حالات نہ ہوں
تو عید کا دن عہد کا دن ہوتا ہے

میں نے اس کو پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ عبارت میری لکھی ہوئی ہے۔ چنانچہ الجمعیۃ ویکلی کی پرانی فائل نکالی جب کہ الجمعیۃ میری ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے شمارہ ۲ جنوری ۱۹۶۸ میں صفحہ ۴ پر عین یہی مضمون میرے نام کے ساتھ چھپا ہوا ہے۔ اسی کو موجودہ الجمعیۃ میں میرے نام کے بغیر شائع کر دیا گیا ہے۔
اردو اخبارات و رسائل کثرت سے ایسا کر رہے ہیں۔ انھیں میرا نام چھاپنا تو گوارا نہیں۔ البتہ میرے مضامین کو وہ حوالہ کے بغیر بے دھڑک چھاپ رہے ہیں۔ جو قوم پست اخلاقی کی اس سطح پر ہو، اس سے آخر کسی بڑے کارنامہ کی توقع کس طرح کی جاسکتی ہے۔
"اعتراف" تمام نیکیوں کا آغاز ہے۔ جن لوگوں میں سے اعتراف اٹھ جائے وہ کوئی اور نیکی کا کام ہرگز نہیں کر سکتے۔

۲۸ اپریل ۱۹۹۰

احمد شوقی (۱۹۳۲-۱۸۶۸) ایک عرب شاعر تھے۔ ان کا دیوان شوقیات کے نام سے چھپا ہے۔ ان کو امیر الشعراء کا خطاب دیا گیا تھا۔ امیر شکیب ارسلان (۱۹۴۶-۱۸۷۱) احمد شوقی سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے اپنی ایک نظم میں احمد شوقی کے بارہ میں کہا تھا:

فرأیت شوقی لم یدع فی عصرہ قرناً یھز قناتہ لقناتہ

میں سمجھتا ہوں کہ شوقی نے اپنے زمانہ میں کوئی ہمسر نہیں چھوڑا جو اپنی لاٹھی کو اس کی لاٹھی سے ٹکرا سکے۔

شاعر الفاظ کی سطح پر اپنی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر ایسے شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے الفاظ کے ذریعہ بلند ترین خیالی قلعہ بنایا۔ مگر حقیقت کی دنیا میں وہ ملت کا کوئی قلعہ تعمیر کرنے سے عاجز رہے۔ الفاظ کی دنیا میں مسلمانوں کی لاٹھی سب سے زیادہ طاقت ور تھی، مگر واقعات کی دنیا میں دوسروں کی لاٹھی سب سے زیادہ طاقت ور۔

۲۹ اپریل ۱۹۹۰

۲۷ اپریل کو عید الفطر کا دن تھا۔ میں نے مسجد سرائے (نئی دہلی) میں عید کی نماز پڑھی۔ یہاں میں مقبرہ کے گنبد کے نیچے تھا۔ اس گنبد کے تحت تقریباً سو آدمی موجود تھے۔ جس وقت لوگ نماز کے بعد خطبہ سننے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک منظر میرے سامنے آیا۔ ایک مسلمان بچہ وہاں قبر کے پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک غبارہ تھا۔ اس غبارہ کو جوڑ کر بندر کی صورت میں بنایا گیا تھا۔ اس کے ساتھ لنگور جیسی لمبی دم بھی موجود تھی۔

بچہ اس بندر نما غبارہ کو ادھر اُدھر پھینک رہا تھا۔ وہ ہوا میں اڑ کر لوگوں کے سروں پر گر رہا تھا۔ میں نے دیکھا تو اس کی اس حرکت پر اس کے والد صاحب اس کو پیار کر رہے ہیں۔ اور دوسرے نمازی اس کو دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ اب فرض کیجئے کہ یہ بچہ ہندو ہوتا اور وہ بندر کی شکل کا غبارہ نمازیوں کے سروں پر اڑاتا تو کیا ہوتا۔ فوراً اس میں لوگوں کو ہندو سازش نظر آتی۔ نمازیوں کی نماز خراب ہو جاتی۔ مسجد کا تقدس مجروح ہو جاتا۔ اور پھر نماز کے فوراً بعد فرقہ وارانہ فساد رونما ہو جاتا۔

۳۰ اپریل ۱۹۹۰

مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ میں نے کب سے باقاعدہ روزہ رکھنا شروع کیا۔ مگر یہ یقینی ہے کہ جب

سے روزہ رکھنا شروع کیا، اس کے بعد پھر کبھی نہیں چھوڑا۔ مجھے شرم آتی ہے کہ رزق کا مالک یہ کہے کہ تم میرا کھانا اور پانی چھوڑ دو، پھر بھی میں خدا کا دیا ہوا کھانا اور پانی استعمال کرتا رہوں۔

میں کم ازکم پچاس سال سے اس طرح مسلسل روزہ رکھ رہا ہوں۔ مگر روزہ کی ایک لطیف حقیقت پہلی بار ۵۰ سال بعد موجودہ رمضان (۱۴۱۰ھ) میں میری سمجھ میں آئی۔ ۲۵ رمضان کو شام کا وقت تھا۔ بھوک پیاس کی شدت سے جسم نڈھال ہو رہا تھا۔ میں عصر کی نماز کے لئے کھڑا ہوا تو اچانک یہ دعا زبان پر آگئی:

خدایا، میں نے رمضان کے دن کا روزہ رکھا۔ مگر دوسرے بے شمار دنوں کے روزے میں نہ رکھ سکا۔ آپ اپنی رحمت سے میرے رمضان کے روزہ کا ثواب اتنا بڑھائیے کہ وہ میری تمام بے روزہ داریوں کو ڈھانپ لے۔

حدیث میں آیا ہے کہ دوسرے اعمال کا ثواب دس گنا سے سات سو گنا تک ہے۔ اور روزہ کا ثواب بے حساب گنا تک۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے روزہ کا ثواب بڑھا دے تو کیا عجب کہ وہ دوسری تمام بے روزہ داریوں کی تلافی کے لئے کافی ہو جائے۔

یکم مئی ۱۹۹۰

مشتاق احمد صاحب ایڈوکیٹ (پیدائش ۱۹۵۲) سپریم کورٹ دہلی میں پریکٹس کرتے ہیں۔ بھاگلپور کے فساد (فروری ۱۹۹۰) کا جائزہ لینے کے لئے وہ بھاگلپور گئے تھے۔ تین ہفتہ کے بعد واپس آئے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ ہندستان میں فسادات کا رکنا بہت مشکل ہے۔ کیوں کہ وہ براہ راست مصیبت زدگان کے سوا ہر ایک کے لئے انٹرسٹ کا مسئلہ بن چکا ہے۔ (۱) فساد جب ہوتا ہے تو غریب طبقہ کو لوٹنے کا موقع ملتا ہے (۲) گورنمنٹ کروروں روپیہ نقد اور سامان کی شکل میں ریلیف دیتی ہے۔ اس کا بیشتر حصہ انتظامی افسران کی جیب میں جاتا ہے۔ حتی کہ ایک بڑے فساد میں ایک ایک افسر دس دس لاکھ روپیہ تک کما لیتا ہے۔ (۳) لیڈروں کی لیڈری چمکتی ہے وہ ریلیف فنڈ کھول کر دوسروں کے پیسہ پر مفت کا کریڈٹ وصول کرتے ہیں (۴) اخبارات کی اشاعت بڑھ جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

حتی کہ اس انٹرسٹ میں خود مسلم لیڈروں کا بھی حصہ ہے جو فساد کے خلاف بیان دینے میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ملک میں فرقہ وارانہ فساد کس طرح ختم ہوگا۔

۲ مئی ۱۹۹۰

ایک صاحب نے کہا کہ سلمان رشدی کے معاملہ میں تمام علماء اور دانشوروں نے اعلان کیا کہ وہ اہانت رسول کا مجرم ہے اس لئے وہ مستوجب قتل ہے۔ مگر ایک آپ تھے جس نے رشدی کو قابل قتل قرار نہیں دیا۔ میں نے کہا کہ یوں نہ کہئے۔ اس طرح کہئے کہ رشدی کے معاملہ میں تمام علماء اور دانشوروں نے بے اصولی کا مظاہرہ کیا۔ صرف آپ تھے جس نے اس معاملہ میں اصول پسندی کا ثبوت دیا۔

سوال یہ ہے کہ رشدی جب واجب القتل ہے اور علماء اور دانشوروں کے نزدیک اس کا جرم ایسا ہے کہ کوئی بھی شخص جاکر اسے قتل کر دے تو ان تمام لوگوں نے رشدی کو قتل کیوں نہیں کیا۔ یا لندن پہنچ کر اس کو قتل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ نے رشدی سے زیادہ خود علماء اور دانشوروں کو بے نقاب کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوا ہے کہ ہمارے تمام لکھنے اور بولنے والے قول بلا فعل کی سطح پر ہیں۔ اور یہ بلاشبہ امت کے لئے بدترین علامت ہے۔

۳ مئی ۱۹۹۰

تبلیغی جماعت کے بانی مولانا محمد الیاس صاحب (۱۹۴۴ - ۱۸۸۵) کے بارہ میں ایک پرانے تبلیغی نے بتایا کہ ہندستان میں پہلی بار جب کچھ افراد جماعت بنا کر نکلے تو مولانا الیاس صاحب نے فرمایا: اللہ نے انگلینڈ کے سر پر ہتھوڑا مروا دیا۔

یہ واقعہ ۵۰ سال سے زیادہ کا ہے۔ مگر اب تک انگلینڈ کے سر پر ہتھوڑا نہ پڑسکا۔ اب تک تمام ہتھوڑے خود مسلمانوں کے سروں پر پڑ رہے ہیں۔ خود تبلیغی جماعت کا سارا کام مسلمانوں کے درمیان چل رہا ہے۔ "انگلینڈ" بالفاظ دیگر، غیر مسلم قوموں کو ابھی تبلیغ نے چھوا بھی نہیں۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے تمام مسلم مصلحین نے مسلمانوں کو اپنے کام کا مرکز بنایا اور امید قائم کی کہ اس سے عمومی سطح پر اسلامی انقلاب آجائے گا۔ یہ میرے نزدیک خوش فہمی ہے، اور موجودہ زمانہ کے تمام مسلم مصلحین اسی خوش فہمی میں مبتلا رہے ہیں۔

۴ مئی ۱۹۹۰

آج میں انشاء اللہ جنیوا کے راستے سے سینیگال (افریقہ) کے لئے روانہ ہو رہا ہوں۔ وہاں ایک اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لئے مجھے بلایا گیا ہے۔ الرسالہ نکلنے کے بعد مسلسل مجھے بیرونی اسفار

پیش آئے ہیں۔ ان سفروں کو میں خدا کی معجزاتی مدد سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ تمام مسلم جماعتوں اور تمام مسلم شخصیتوں نے متحدہ طور پر میرے خلاف عالمی سطح پر اتنا زیادہ پروپگنڈہ کیا اور مجھ کو اتنا زیادہ بدنام کیا کہ کسی بھی کانفرنس کی طرف سے میرے نام دعوت نامہ نہیں آنا چاہئے تھا۔ مگر اللہ تعالی نے دنیا کے ہر حصہ میں مجھے کانفرنسوں میں شرکت کا موقع دیا۔

یہ الرسالہ کے مشن کے لئے انتہائی ضروری تھا۔ ان کی وجہ سے الرسالہ میں جو سفرنامے چھپتے رہے۔ اس نے الرسالہ کی عمومی اشاعت میں بہت زیادہ مدد کی۔ اسی کے ساتھ مجھے ان سفروں کے ذریعہ جو بے شمار تجربے ہوئے وہ کسی اور ذریعہ سے نہیں ہو سکتے تھے۔ مشن کو پھیلانے میں یہ اسفار بہت معاون ثابت ہوئے۔

۵ مئی ۱۹۹۰

ٹائمس آف انڈیا (یکم مئی ۱۹۹۰) میں لندن کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ایک خبر چھپی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک پرانی کار جو تقریباً ۶۰ سال پہلے بنائی گئی تھی، وہ حال میں ۹ ملین پونڈ میں فروخت ہو گئی۔ ۱۹۳۱ میں پہلی بار اس کے خریدار نے اس کو ۶۵۰۰ پونڈ میں خریدا تھا۔ اس قسم کی چھ کاریں اس وقت دنیا میں موجود ہیں:

London: A 59-year-old Bugati Royale has become th world's most expensive car, drawing a price of more than £ 9 million from a group of Japanese businessmen.

The 3-ton luxury saloon — one of only six of its kind in existence — surpassed the previous record price of £ 8.5 million paid last November by a Japanese buyer for a 1963 Ferrari GTO, *The Sunday Times* of London reported.

The Bugatti cost 6,500 pounds when it was built in 1931.

دنیا میں کوئی کار اب تک اتنی مہنگی قیمت پر فروخت نہیں ہوئی۔ جبکہ مشینی معیار کے لحاظ سے آج کی ایک اعلیٰ کار کے مقابلہ میں وہ ایک معمولی کار ہے۔ اس کے قیمتی ہونے کا راز اس کی مشینی حیثیت میں نہیں ہے بلکہ اس کی تاریخی حیثیت میں ہے ——— تاریخ ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہے۔ اعلیٰ ٹکنالوجی اور سونے چاندی سے بھی زیادہ۔

عام کار محض کار ہے اور مذکورہ کار ایک تاریخی کار۔

۶ مئی ۱۹۹۰

ٹائم میگزین (یکم جنوری ۱۹۹۰) کے صفحہ ۱۴ - ۱۵ پر ایک تصویر ہے۔ اس میں دکھائی دے رہا ہے کہ ایک اونچی دیوار ٹوٹ گئی ہے اور اس ٹوٹے ہوئے مقام سے انسانوں کا سیلاب ایک طرف سے دوسری طرف جارہا ہے۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہے :

A wall comes tumbling down.

یہ دیوار برلن (Berlin Wall) ہے۔ دوسری عالمی جنگ (۱۸ - ۱۹۱۴) کے بعد جرمنی کی تقسیم ہوئی۔ مشرقی برلن سوویت روس کے حصہ میں آیا۔ تاہم یہاں کے لوگوں میں روس کے خلاف ناراضگی تھی۔ ۱۷ جون ۱۹۵۳ کو تقریباً ۵۰ ہزار ورکروں نے ایسٹ برلن میں بغاوت کر دی۔ اس وقت سوویت روس نے فوجی طاقت سے بغاوت کو کچل دیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۲ میں مشرقی اور مغربی برلن کے درمیان خار دار تار کھینچ دیا گیا۔

تاہم یہ دیوار لوگوں کو روکنے والی ثابت نہیں ہوئی۔ اس کے بعد اگست ۱۹۶۱ میں دونوں کے درمیان سخت کنکریٹ کی دیوار بنائی گئی۔ یہ دیوار ۹ فٹ اونچی اور ۸۵۰ میل لمبی تھی۔ دیوار کے اوپر برقی تار (Electrified fence) مزید لگائے گئے اور جگہ جگہ نگراں چوکیاں قائم کی گئیں۔ مگر انسانی سیلاب کے مقابلہ میں یہ تمام تیاریاں ناکافی ثابت ہوئیں۔ حالات کے دباؤ سے مجبور ہو کر خود سوویت روس نے دسمبر ۱۹۸۹ میں اس دیوار کو توڑنے کا حکم دے دیا۔

دیوار برلن کا ٹوٹنا گویا آخری نظام جبر کا ٹوٹنا ہے۔ اب تاریخ آخری طور پر آزادی کے مرحلہ میں داخل ہوگئی ہے۔ آزادیٔ کامل کا مرحلہ خدا کی طرف سے اس لئے لایا گیا ہے تاکہ اہل اسلام کے لئے دعوت و تبلیغ کے تمام مواقع کو آخری حد تک کھول دیا جائے۔

۷ مئی ۱۹۹۰

اقبال، سید قطب، ابوالاعلیٰ مودودی، ابوالحسن علی ندوی ان سب کے فکر کا مشترک خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان خدائی فوجدار اور محتسب کائنات ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ ساری دنیا میں نظام غیر حق کو توڑ کر نظام حق قائم کریں۔

یہ نظریہ موجودہ زمانہ میں ایک داخلی تضاد سے دوچار ہے۔ آدمی اگر واقعۃً اس پر چلے تو وہ حکمرانوں

کی طرف سے تعذیب کا شکار ہوگا۔ اور اگر وہ اس کو عملاً اختیار نہ کرے تو اپنے عقیدہ کی رو سے وہ منافق ٹھہرے گا۔ اسی تضاد کا یہ نتیجہ ہے کہ آج اس نظریہ کو ماننے والے ۹۵ فیصد سے زیادہ منافقت کی زندگی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ وہ خلیجی ممالک یا مغربی ممالک میں عملاً پوری طرح مصالحانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ البتہ اپنے کمرہ کے اندر تفریحی طور پر سیاسی باتیں کرکے اپنے کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ وہ اپنے عقیدہ پر قائم ہیں۔

اس نظریہ کا یہ داخلی تضاد لازمی طور پر مستقبل میں اس کو موت سے دوچار کرے گا۔ اس کے مقابلہ میں الرسالہ کا فکر اس قسم کے تضاد سے مکمل طور پر خالی ہے۔ الرسالہ کے فکر سے متاثر ہونے والے آدمی کو زندہ رہنے کے لئے منافق بننے کی ضرورت نہیں۔ الرسالہ کے مشن کی یہی خصوصیت اس بات کی ضامن ہے کہ وہ مستقبل میں مذکورہ فکر کے اوپر غلبہ حاصل کرلے گا۔

۸ مئی ۱۹۹۰

ریاض کے ہفت روزہ الدعوۃ (۳ مئی ۱۹۹۰) کے ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ سعودی عرب نے ۸۸ میں ۳۵ مسلم ملکوں کے ۷۷ ۔۔۔۔ بلین (۷۷ بلین) ریال مدد کے طور پر دیا۔ اگرچہ یہ امر مشتبہ ہے کہ ان ملکوں نے اس عظیم رقم کو واقعۃً ترقی کے کاموں میں صرف کیا ہے۔ تاہم یہ بات بجائے خود اہم ہے کہ ایک مسلم ملک آج اس پوزیشن میں ہے کہ وہ ایک سال میں ۷۷ بلین ریال مالی تعاون کے طور پر دوسروں کو دے سکے۔

۹ مئی ۱۹۹۰

سوویت روس میں ایک سو مسجدیں مسلمانوں کو واپس کردی گئی ہیں۔ حکومت روس نے سرکاری طور پر یہ اجازت دے دی ہے کہ سعودی عرب قرآن کی ایک ملین کاپیاں جدہ سے ماسکو پہنچائے۔ حال میں روس کے مسلمانوں نے ایک رسالہ "نور الاسلام" کے نام سے جاری کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ (الدعوۃ ۱۵ شوال المکرم ۱۴۱۰ھ)

سوویت روس کے بارہ میں اس طرح کے واقعات ابھی صرف چند سال پہلے تک ناقابل قیاس تھے۔ کیسی عجیب ہے یہ بات۔ مجھے یقین ہے کہ عالمی سیاست میں یہ تبدیلیاں براہ راست خدا کی طرف سے پیدا کی گئی ہیں تاکہ خدا کے دین کی اشاعت کسی روک اور مداخلت کے بغیر جاری رہ سکے۔

۱۰ مئی ۱۹۹۰

قادیانی جماعت کا ایک اردو سہ روزہ قادیان سے نکلتا ہے۔ اس کا نام ' بدر' ہے۔ اس کے شمارہ ۱۰ مئی ۱۹۹۰ کے صفحہ اول پر جو مضمون ہے، اس کی مفصل سرخی ان الفاظ میں قائم کی گئی ہے:

' صد سالہ جشن تشکر اور مباہلہ کے سال میں ایک لاکھ آٹھ ہزار افراد کا قبول احمدیت۔ جمہوریہ مالی میں سابقہ چالیس ہزار کے علاوہ مزید گیارہ ہزار افراد بیعت کر کے جماعت احمدیہ میں داخل ہو گئے''

جماعت احمدیہ (یا قادیانی جماعت) کو تمام علما نے متفقہ طور پر کافر قرار دیا ہے۔ اس کے مطابق وہ لوگ سراسر باطل پر ہیں۔ اس کے باوجود لاکھوں لوگ ان کے حلقہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ موجودہ زمانہ عجیب زمانہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلم اور کافر ہر ایک کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آخرت نہ آئے تو یہ معلوم کرنا ممکن نہیں کہ حق پر کون تھا اور باطل پر کون۔

۱۱ مئی ۱۹۹۰

آج دکار (سنیگال) کی کانفرنس میں کچھ لوگوں نے کشمیر کے بارہ میں تجویز پیش کی۔ ڈاکٹر معین الاسلام (ڈھاکہ) پیش پیش تھے۔ اس پر بحث ہو رہی تھی کہ تجویز کو زیادہ سخت الفاظ میں منظور کیا جانا چاہئے۔

میں نے کہا کہ کشمیر کا مسئلہ اس طرح حل نہیں ہو سکتا کہ آپ یہاں مغربی افریقہ میں بیٹھ کر ایک تجویز پیش کریں۔ اور اس پر بحث کریں کہ اس میں یہ لفظ رکھا جائے کہ وہ لفظ رکھا جائے۔ کچھ الفاظ گھٹا کر یا کچھ الفاظ بڑھا کر شاعری کی جا سکتی ہے، اس طرح کبھی تاریخ نہیں بنتی۔ کشمیر کا مسئلہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہے کہ وہ لفظی تجویزوں کے ذریعہ حل ہو سکے۔

پھر میں نے کہا کہ مسلمان خود غلطی کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے اس کی قیمت ادا کریں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ کشمیر کے مسلمانوں نے شیخ عبداللہ کو اپنا لیڈر بنایا۔ تمام کشمیری مسلمان شیخ عبداللہ کے ساتھ ہو گئے۔ شیخ عبداللہ نے کشمیر کا الحاق ہندستان کے ساتھ کر دیا۔ اب اپنے لیڈر کی غلطی کی قیمت آپ کو خود ادا کرنی پڑے گی۔ یہ ناممکن ہے کہ نئی دہلی آپ کی طرف سے اس کی قیمت ادا کرے۔

۱۲ مئی ۱۹۹۰

مکہ سے ایک عربی پرچہ نکلتا ہے جس کا نام الرابطہ ہے۔ اس کے شمارہ مئی ۱۹۹۰ میں نیپال کے مسلمانوں

کے بارہ میں ایک مضمون (المسلمون فی نیبال) شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ شکایت کی گئی ہے کہ اسلام اور عربی زبان کی تعلیم کی اجازت نیپال کے سرکاری اسکولوں میں نہیں ہے۔ (تعلیم الاسلام واللغۃ العربیۃ غیر مسموح بہ فی المدارس الحکومیۃ)

اس قسم کی شکایت کو میں بالکل بے معنی سمجھتا ہوں۔ پاکستان کے ہندو اگر یہ شکایت کریں کہ پاکستان کے سرکاری اسکولوں میں ہندو دھرم اور سنسکرت کی تعلیم کا انتظام نہیں ہے تو مسلمان اس شکایت کو بے وزن قرار دیں گے۔ مگر خود مسلمان اپنا یہ حق سمجھتے ہیں کہ وہ دوسروں کے بارہ میں اس قسم کی شکایت کریں اور یہ سمجھیں کہ وہ اپنی اس شکایت میں حق بجانب ہیں۔

۱۲ مئی ۱۹۹۰

مسٹر محمد مدار باوا (M.M. Bawa) مدراس سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ہندستانی فوج میں تھے۔ چار سال پہلے کرنل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ اس کے بعد سے وقف کونسل (نئی دہلی) کے سکریٹری ہیں۔

آج وہ ہمارے دفتر میں آئے۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۶۳ میں وہ راجوری (جموں وکشمیر) میں کیپٹن کی حیثیت سے تعینات تھے۔ وہ وہاں انیمل ٹرانسپورٹ کمپنی (Animal Transport Co.) کے انچارج تھے۔ اس شعبہ کے تحت ۳۰۰ خچر اور کچھ گھوڑے تھے۔ ان حیوانات کا گوبر ایک بڑے گڑھے میں ڈال دیا جاتا تھا اور اس کے اوپر مٹی پھیلا دی جاتی تھی۔ چھ ماہ کے بعد وہ نہایت عمدہ کھاد بن جاتی تھی۔

انھوں نے بتایا کہ انھوں نے اپنے جونیئر افسروں کے ذریعہ راجوری کے کشمیری مسلمانوں کے یہاں یہ پیغام بھیجا کہ ہمارے پاس کافی مقدار میں قیمتی کھاد موجود ہے۔ یہ ساری کھاد ہم آپ کو مفت دے دیں گے۔ اسی کے ساتھ ہم آپ کو بلاقیمت ٹرانسپورٹ بھی مہیا کریں گے۔ تاکہ آپ اس کھاد کو اپنے کھیت تک لے جاسکیں۔ مگر وہاں کے مسلمان اس پیش کش کو قبول نہ کر سکے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو کھاد کی ضرورت نہیں۔ ہم کو یہاں نہایت سستا غلہ (۸ آنہ کیلو گیہوں اور چاول) مل جاتا ہے۔ پھر ہم اس جھنجھٹ میں کیوں پڑیں۔

یہی کشمیری مسلمانوں کا اصل المیہ ہے۔ انھوں نے پچھلے ۵۰ سال بے فائدہ سرگرمیوں میں کھودئے۔ ان کو زراعت، تجارت، تعلیم اور دوسرے تعمیری میدانوں میں کام کرنے کے قیمتی مواقع حاصل تھے۔ مگر وہ ان مواقع کو استعمال کرنے میں ناکام رہے۔ اب جب کہ وہ زندگی کی دوڑ میں پچھڑ گئے ہیں وہ نئی دہلی سے اپنے پچھڑے پن کی قیمت وصول کرنا چاہتے ہیں۔ مگر حقائق کی دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔

۱۴ مئی ۱۹۹۰

کشمیر کے جنگ جو نوجوانوں نے ۶ اپریل ۱۹۹۰ کو دو اعلیٰ سرکاری افسروں کا اغوا کر لیا۔ ایک کے ایل کھیرا، اور دوسرے، پروفیسر مشیر الحق۔ ان دونوں کو انھوں نے یرغمال بنا لیا اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ ہمارے چار گرفتار ساتھیوں کو رہا کرو تو ہم ان کو چھوڑ دیں گے۔ حکومت نے کوئی توجہ نہ دی یہاں تک کہ ۸ اپریل کو انھوں نے مسٹر کھیرا کو گولی مار کر ان کی لاش سڑک پر پھینک دی۔ حکومت نے اب بھی کوئی توجہ نہ دی۔ چنانچہ انھوں نے دو دن بعد ۱۰ اپریل کی شام کو پروفیسر مشیر الحق کو بھی گولی مار دی۔ ان کی لاش سڑک پر پڑی ہوئی ملی۔

مسلم دانشوروں کے نزدیک یہ حکومت کے تعصب کا ثبوت ہے۔ مسٹر کھیرا ہندو تھے اور مشیر الحق مسلمان۔ جب ہندو مر چکا اور صرف مسلمان باقی رہ گیا تو حکومت نے اس معاملہ میں اپنی دل چسپی کھو دی۔ اس نے جنگ جوؤں کے مطالبہ کو نظر انداز کیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے مشیر الحق کو بھی مار ڈالا۔

مسلم دانشور اور رہنما ساری دنیا میں اسی قسم کے تبصرے کرنے میں مشغول ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں ایک غیر دانش مند قوم بن گئے ہیں۔ دانشمندی واقعات سے سبق لینے سے آتی ہے۔ اور مسلمانوں کو ہر واقعہ میں اغیار کا ظلم اور تعصب دکھایا جاتا ہے۔ انھیں کسی واقعہ میں کوئی سبق کی بات نہیں بتائی جاتی۔

مذکورہ واقعہ پر مسلمانوں کو یہ لکھنا چاہئے تھا کہ یہ جنگجو نوجوانوں کی بے تدبیری تھی۔ انھیں پیشگی طور پر یہ جاننا چاہئے تھا کہ ہندو کو مار دینے کے بعد حکومت اس معاملہ میں اپنی دل چسپی کھو دے گی۔ جو واقعہ خود کشمیری نوجوانوں کی بے تدبیری کو بتا رہا تھا، اس کو انھوں نے حکومت ہند کے تعصب کے خانہ میں ڈال دیا۔ اس قسم کے تبصرے کسی قوم کے ساتھ سب سے بڑا ظلم ہیں۔ وہ قوم کی تحمیق کے ہم معنی ہیں۔

۱۵ مئی ۱۹۹۰

مولانا حسرت موہانی (۱۹۵۱ - ۱۸۸۱) تحریک آزادی کے دوران نمایاں ہوئے۔ مسلمان ان کے بارے میں فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ انھوں نے ۱۹۲۱ میں مکمل آزادی کا رزولیوشن پیش کیا۔ جب کہ کانگرس نے پہلی بار ۱۹۲۷ میں پورن سوراج کی تجویز منظور کی۔ انھوں نے پانچ سال قید میں گزاری۔

ان کے بارے میں ایک مضمون قومی آواز (۱۳ مئی ۱۹۹۰) میں شائع ہوا ہے۔ مضمون نگار لکھتے ہیں کہ "علی گڑھ کالج میں ایک مرتبہ طلبہ میں یہ بات چل نکلی کہ وہ کس کو اپنا پیشوا سمجھتے ہیں۔ کسی نے سرسید احمد کا نام لیا۔ کسی نے دادا بھائی نوروجی کا اور کسی نے سریندر ناتھ بنرجی کا۔ مگر حسرت نے کہا کہ میں بال گنگا دھر تلک کو اپنا پیشوا سمجھتا ہوں۔ علی گڑھ کے ماحول میں حسرت کا کانگرس کی ہمنوائی کرنا اور بال گنگا دھر تلک کو اپنا سیاسی پیشوا سمجھنا ان کے سیاسی شعور اور انقلابی ذہنیت کا مظہر ہے"۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں مسلمانوں کے اندر کتنا زیادہ سیاسی جنون تھا۔ ہر آدمی جوش سیاست میں سرشار تھا اور کسی نہ کسی سیاسی لیڈر کو اپنا "پیشوا" بنائے ہوئے تھا۔

میرے نزدیک یہ سیاست غیر دینی بھی تھی اور احمقانہ بھی۔ غیر دینی اس لئے کہ مسلمان کا اصل کام دعوت آخرت ہے نہ سیاستِ آزادی۔ احمقانہ اس لئے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کو سیاست سے کچھ ملنے والا نہیں تھا۔ کیوں کہ سیاسی انقلاب سے فائدہ اٹھانے کے لئے جو بنیاد (Base) ضروری ہے، وہ مسلمانوں کے پاس موجود نہ تھی۔

۱۶ مئی ۱۹۹۰

۷ اپریل ۱۹۹۰ کے اخبار میں ایئربس (A-320) کا قصہ درج ہے۔ پندرہ ایئربس فرانس سے خریدی گئی۔ ہر ایک ایئربس کی قیمت ۶۵ کروڑ روپیہ سے زیادہ تھی۔ مگر وہ ہندستان کے لئے ناقص یا غیر موزوں ثابت ہوئی۔ بظاہر اس کی خریداری صرف اس لئے کی گئی کہ اس خریداری کے تحت حکومت کی کچھ اعلیٰ شخصیتوں کو پچاس کروڑ روپیہ سے زیادہ بطور رشوت کمانے کا موقع مل گیا۔

سودا راجیو گاندھی کی حکومت کے زمانہ میں ہوا تھا۔ موجودہ وی پی سنگھ کی حکومت اس سودے کی تحقیق کر رہی ہے۔ مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں اصل مجرم پکڑے نہ جا سکیں گے۔ کیونکہ حکومت کے دفتر میں وہ فائل موجود نہیں جو اس معاملہ میں دستاویزی شہادت کا کام دیتی۔ ٹائمس آف انڈیا (۹ مئی ۱۹۹۰) میں شہری ہوابازی کے وزیر مسٹر عارف محمد خان کا پارلیمنٹ کا بیان شائع ہوا ہے۔

انھوں نے کہا کہ وہ اس پوزیشن میں نہیں کہ وہ اس معاملہ کی تمام دستاویزیں پارلیمنٹ میں پیش کر سکیں۔ کیوں کہ ایک بہت اہم فائل غائب ہے:

He was not in a position to place all documents relating to the deal because one very vital file was missing.

دنیا کے دفتروں میں مجرم لوگ اپنی فائلیں گم کرا دیتے ہیں تاکہ وہ حکومت اور عدالت کی پکڑ سے بچ سکیں۔ اگر انھیں معلوم ہو کہ ان کی گم کردہ فائل دنیا میں گم ہوتی ہے۔ مگر آخرت میں وہ پوری طرح محفوظ رہتی ہے تو وہ کبھی ایسی بے فائدہ حرکت نہ کریں۔

۱۷ مئی ۱۹۹۰

مولانا بشیر احمد بھٹہ (پیدائش ۱۸۸۵) میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ وہ جمعیۃ علما ہند کے لیڈروں میں سے تھے۔ وہ اینٹوں کے بھٹہ کا کام کرتے تھے، اس لئے "بھٹہ" کے نام سے مشہور ہو گئے۔

ان کے بارے میں ایک مضمون قومی آواز (۱۳ مئی ۱۹۹۰) میں چھپا ہے۔ اس مضمون کا ایک اقتباس یہ ہے: "۱۹۲۱ میں خلافت کمیٹی کا ایک بڑا جلسہ سیوہارہ میں ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندو اور مسلمان ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے۔ ہندو سیاسی کارکن بھی خلافت کمیٹی کے ممبر بن گئے۔ اس کانفرنس میں دور دور تک آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے تھے۔ ایک راوی کا کہنا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں مالک اخبار "زمیندار" کانفرنس کی نجی محفل میں مجمع کو قہقہہ زار بنائے ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر حاضرین کے سامنے بڑھایا۔ لکھا تھا:

جو بارش زور کی ہوگی تو گر جائیں گی دیواریں   کہ اینٹیں ساری کچی ہیں بشیر احمد کے بھٹہ کی

ظفر علی خاں نے جو بات بشیر احمد کے بھٹہ کے بارے میں کہی، وہی خود ظفر علی خاں پر اور دوسرے تمام مسلم لیڈروں پر چسپاں ہوتی ہے۔ ہر ایک نے "کچی اینٹوں" پر اپنا سیاسی قلعہ کھڑا کرنا چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی ہی بارش میں ان کا خیالی قلعہ مسمار ہو کر رہ گیا۔

۱۸ مئی ۱۹۹۰

میرا کام کرنے کا جو کمرہ ہے، وہ گرمی کے موسم میں بہت زیادہ گرم رہتا ہے۔ ایک صاحب دوپہر کے وقت ملنے کے لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کا کمرہ تو تنور ہو رہا ہے۔ آپ یہاں کس طرح کام کرتے ہیں۔ آپ یہاں کولر لگوا لیجئے۔ اس سے آپ کو آرام ہو جائے گا اور آپ سکون کے ساتھ کام کر سکیں گے۔

میں نے کہا: آرام اچھی چیز ہے، مگر تکلیف اس سے بھی زیادہ اچھی چیز ہے۔ آرام سے جسمانی

سکون ملتا ہے اور تکلیف سے ذہنی تجربہ۔ اور سکون کے مقابلہ میں تجربہ بلاشبہ زیادہ بڑی چیز ہے۔

۱۹ مئی ۱۹۹۰

مولانا انیس لقمان ندوی سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ فقہا، اسلام نے بلاد کی تقسیم دو طرح کی ہے ـــــ دار الاسلام، دار الحرب۔ موجودہ زمانہ میں بعض علما نے اس میں ایک اضافہ "دار الامن" کا کیا ہے۔ یہ تقسیم جزئی طور پر درست ہے، مگر وہ کلی طور پر درست نہیں۔

صحیح تقسیم یہ ہے کہ بلاد کی تقسیم تین طرح پر کی جائے (۱) دار الدعوۃ (۲) دار الاسلام (۳) دار الحرب۔

فقہاء کے نزدیک وہ ملک جو دار الاسلام نہیں ہے، دار الحرب ہے۔ یہ بات صحیح نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ جو ملک جارحیت کا آغاز کر کے مسلمانوں سے برسرِ جنگ ہو جائے، وہ دار الحرب قرار پائے گا۔ دار الاسلام سے مراد وہ ملک ہے جہاں مسلمانوں کا غلبہ ہو اور وہ وہاں اسلام کے احکام جاری کرنے کے لئے آزاد ہوں۔

بقیہ تمام ممالک دار الدعوۃ ہیں۔ یعنی ان ملکوں میں مسلمانوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اسلام کی دعوت اس کے ضروری آداب و شرائط کے ساتھ پہنچائیں۔ اور مدعو قوم کی زیادتیوں کو یکطرفہ طور پر برداشت کرتے ہوئے اسے جاری رکھیں۔

۲۰ مئی ۱۹۹۰

دیوبند کے ایک صاحب آئے۔ انھوں نے کہا کہ پہلے میں الرسالہ پڑھتا تھا۔ اب چھوڑ دیا۔ وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ الرسالہ میں سب غیر مسلموں کی مثالیں ہوتی ہیں۔ اسلامی تاریخ کی مثالیں نہیں ہوتیں۔

الرسالہ جون ۱۹۹۰ آج ہی پریس سے آیا تھا۔ میں نے اس کا ایک ایک صفحہ انھیں دکھایا۔ بیشتر مضامین مسلمانوں سے متعلق تھے یا ان میں قرآن و حدیث کا حوالہ تھا۔ ایک مضمون چاؤسسکو پر تھا۔ مگر اس سے موت اور آخرت کا سبق نکالا گیا تھا۔

پھر میں نے کہا کہ الرسالہ میں جو انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ وہ عین قرآن کا انداز ہے۔ اگر آپ کو الرسالہ کے انداز سے اختلاف ہے تو آپ کو قرآن کے انداز کو بھی غلط کہنا چاہئے۔ میں نے کہا کہ

آپ قرآن کو صرف تلاوت کے طور پر نہ پڑھئے بلکہ سمجھ کر پڑھئے تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن میں مکھی مچھر کی مثالیں ہیں۔ زمین اور آسمان کی مثالیں ہیں۔ اسی طرح قرآن میں فرعون اور نمرود کی مثالیں ہیں۔ عاد اور ثمود کی مثالیں ہیں۔ یہود اور نصاریٰ کی مثالیں ہیں۔ ان مثالوں کا ذکر کرکے قرآن میں سبق کا پہلو نکالا جاتا ہے۔

یہی انداز الرسالہ میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں مختلف قسم کے واقعات کو لے کر ان سے سبق کا پہلو نکالا جاتا ہے۔ یہ تو عین قرآنی انداز ہے۔ اس میں آخر اعتراض کی کیا بات ہے۔ وہ چپ ہو گئے۔

۲۱ مئی ۱۹۹۰

پاکستان کے اخبار نوائے وقت (۲۰ مئی ۱۹۹۰) کے صفحہ اول پر کشمیر میں بھارتی درندوں کے ظلم وستم' کا ذکر ہے۔ دوسری طرف یہی اخبار پاکستانیوں کے اوپر پاکستانیوں کے ظلم کی خبروں سے بھی بھرا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر پہلے صفحہ کی پہلی خبر سندھ میں فساد کے بارہ میں ہے۔ اس کی تین سطروں کی سرخی کے الفاظ یہ ہیں:

"حیدرآباد سندھ پر دوسرے روز بھی راکٹوں کی بارش۔ آٹھ افراد ہلاک۔ بے شمار مکان تباہ ہو گئے۔ ۲۵ سے زائد افراد زخمی۔ غیر سندھیوں کی دکانوں کو لوٹنے کے بعد آگ لگا دی گئی۔ قومی شاہراہ کو آٹھ گھنٹہ تک بند رکھا گیا۔ ایک رکشا والے کو زندہ جلا دیا گیا۔ پولیس نے سندھیوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ اعلیٰ افسر کا حکم ماننے کے بجائے ہتھیار پھینک دئے۔ متاثر خاندانوں کی حیدرآباد سے نقل مکانی۔ مساجد سے اعلان ہوتے رہے کہ ہم سندھ کی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ یہ "بھارتی درندوں" یا "پاکستانی ظالموں" کی بات نہیں، یہ مسلمانوں کے لیڈروں کی ناقابل بیان نادانی کے نتائج ہیں جو سرحد کے دونوں طرف نظر آرہے ہیں۔ یہ تقسیم کی مجنونانہ سیاست کے نتائج ہیں جو دونوں طرف کے مسلمان بھگت رہے ہیں اور شاید ابھی نامعلوم مدت تک بھگتتے رہیں گے۔

۲۲ مئی ۱۹۹۰

۱۱ اپریل ۱۹۹۰ کو دہلی کے تمام اخباروں میں پہلے صفحہ کی نمایاں خبر یہ تھی کہ پروفیسر مشیر الحق کو کشمیری دہشت گردوں نے قتل کر دیا۔ آج کے اخبارات میں پہلے صفحہ کی اہم خبر یہ ہے کہ میرواعظ مولوی فاروق

کو دہشت گردوں نے مار ڈالا۔ پروفیسر مشیر الحق کو اس وقت اغوا کر لیا گیا تھا جب کہ وہ جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لئے جا رہے تھے۔ میر واعظ فاروق کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ دن کو گیارہ بجے تین نوجوان ملاقات کے لئے آئے۔ وہ جب میر واعظ سے ملنے کے لئے ملاقات کے کمرہ میں داخل ہوئے تو انھوں نے ریوالور نکال لیا۔ پندرہ گولیوں سے انھیں چھلنی کر کے بھاگ گئے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کشمیر کے نادان نوجوانوں کی متشددانہ تحریک ناکام ہو چکی ہے۔ وہ "ہندو کشی" سے مایوس ہو کر "مسلم کشی" کی سطح پر اتر آئے ہیں۔ اب تک بظاہر کشمیر کی نام نہاد تحریک کا رخ حکومت ہند کی طرف تھا، اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشمیری مختلف گروہ بن کر آپس میں لڑیں گے۔ نادانی کے تحت اٹھائی ہوئی تحریک کا انجام ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔

۲۳ مئی ۱۹۹۰

یہ ۱۸ نومبر ۱۹۷۷ کا واقعہ ہے۔ میں مانو پریوار (آصف علی روڈ) کی میٹنگ میں گیا تو میں نے دیکھا کہ موتی رام صراف وہاں ہیں اور خلاف معمول ایک پستول اپنے کندھے سے لٹکائے ہوئے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ موتی رام صراف کے مکان کے پاس پارک میں کچھ ہندوؤں نے ایک مندر بنا لیا ہے اور وہاں گھنٹہ بجانا شروع کر دیا ہے۔ موتی رام صراف نے اس کو پارک سے ہٹانے کے لئے مقدمہ کر دیا ہے۔ وہ لوگ چوں کہ مارنے کی دھمکی دے رہے ہیں، اس لئے موتی رام ہر وقت پستول اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

میں نے موتی رام سے کہا کہ آپ اس مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ محلہ والے آپ کا ساتھ نہیں دیں گے، اور جہاں تک اجازت کا سوال ہے، وہ لوگ کسی نہ کسی طرح ڈی ڈی اے سے اجازت حاصل کر لیں گے۔ موتی رام نے بگڑ کر کہا: آپ نے نہ مانو پریوار کو سمجھا اور نہ قرآن کو سمجھا۔

آخر کار وہی ہوا۔ مندر بنانے والے کامیاب رہے اور موتی رام شکست کھا کر چپ ہو گئے۔ ہندو سماج اور مسلم سماج دونوں کا آج یہی حال ہے۔ دونوں میں بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو خرافات کو پسند نہیں کرتی، مگر خرافاتی لوگوں کے شر سے ڈر کر ہر ایک نے خاموشی اختیار کر لی ہے۔

۲۴ مئی ۱۹۹۰

پرتاب گڑھ (یوپی) کے دو صاحبان ملنے کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ اس علاقہ میں سید

محمد ابن نصیر آبادی ایک بزرگ گزرے ہیں۔ ہندستان کی آزادی (۱۹۴۷) سے پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔ پرتاب گڑھ میں ان کا اکثر دورہ ہوتا تھا۔ یہاں کے عوام میں ان کے بارہ میں طرح طرح کے قصے مشہور ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ وہ بہت جلالی آدمی تھے۔ وہ داڑھی منڈوں سے مصافحہ نہیں کرتے تھے۔ کسی کو دیکھتے کہ اس کی مونچھیں بڑی بڑی ہیں تو اس کو پکڑ کر قینچی سے اس کی مونچھیں کاٹ دیتے۔ پالکی پر سفر کرتے تھے۔

ایک مرتبہ وہ پرتاب گڑھ آئے۔ یہاں ایک مسلمان تھانہ دار تھا جو داڑھی مونڈتا تھا اور بڑی بڑی مونچھ رکھتا تھا۔ وہ ملاقات کے لئے آیا۔ بزرگ موصوف نے حسب عادت قینچی نکالی اور اس کی مونچھ کاٹ دینا چاہا۔ تھانہ دار کو اپنے عہدہ اور طاقت پر ناز تھا، اس نے مزاحمت کی۔ بزرگ اس کو پٹک کر اس کے سینہ پر چڑھ گئے اور قینچی سے اس کی مونچھ کو کاٹ دیا۔ بعد کو کسی نے تھانہ دار سے پوچھا کہ تم تو اتنے طاقتور ہو، تم نے کیوں اپنی مونچھ کٹوالی۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے دیکھا کہ میرے دائیں اور بائیں ایک ایک شیر ہیں، ایسی حالت میں میں کیا کر سکتا تھا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان اسی قسم کے جھوٹے قصے کہانیوں میں مشغول ہیں۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر ان کے اندر حقیقت پسندانہ فکر پیدا نہ ہو سکا۔

۲۵ مئی ۱۹۹۰

۱۹۸۰ میں دارالعلوم دیوبند میں انقلاب آیا۔ "قاسمی گروپ" کی جگہ "مدنی گروپ" دارالعلوم پر قابض ہوگیا۔ اس انقلاب میں مولانا وحید الزماں کیرانوی نے قائدانہ رول ادا کیا تھا۔ مگر اب مولانا اسعد مدنی نے ان کو دارالعلوم سے نکال دیا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا وحید الزماں کے حامی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔

آج مولانا عبداللہ طارق نے بتایا کہ وہ ایک وفد لے کر بذریعہ کار علی گڑھ گئے، تاکہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے بعض ارکان سے ملیں اور انھیں اس "ظلم" کے خلاف آواز اٹھانے کے لئے تیار کریں۔

میں نے کہا کہ آپ لوگوں کی یہ دوڑ دھوپ بالکل بے فائدہ ہے۔ یہ تو وہی ہوا جو تاریخ میں

ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ اس قسم کی تحریکوں میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ انقلاب کی کامیابی سے پہلے نشانہ خارجی نظام ہوتا ہے، اس لئے سب متحد رہتے ہیں۔ مگر انقلاب کی تکمیل کے بعد "کریڈٹ کون لے گا" کے سوال پر وہ خود آپس میں ٹکرا جاتے ہیں۔

میں نے کہا کہ اس طرح کے انقلاب کی کامیابی کا واحد راز یہ ہے کہ اس کے لئے اٹھنے والے بے نفس ہوں۔ مثلاً عرب میں مہاجرین اور انصار مل کر انقلاب لائے، مگر انقلاب کے بعد جب خلافت کا سوال آیا تو انصار یک طرفہ طور پر مہاجرین کے حق میں دستبردار ہو گئے۔

دوسرے تمام انقلابات میں ہم دیکھتے ہیں کہ انقلاب کی تکمیل کے بعد لوگ آپس میں لڑنے لگتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک چاہتا ہے کہ اس کا کریڈٹ مجھے دیا جائے۔ مثلاً دیوبند کی مثال میں مولانا اسعد مدنی اس کو اپنا کارنامہ سمجھتے ہیں، اور مولانا وحید الزماں اس کو اپنا کارنامہ بتاتے ہیں۔ یہ دوانا کا ٹکراؤ تھا جس کی قیمت مولانا وحید الزماں کو بھگتنی پڑی۔ مولانا وحید الزماں نے اگر انصار مدینہ کی روش اختیار کی ہوتی تو ایسا نہ پیش آتا۔ (انتقال ۱۵ اپریل ۱۹۹۵)

۲۶ مئی ۱۹۹۰

مسٹر دھرم ویر (Dharam Vira) ۱۹۴۷ کے بعد مرکزی حکومت میں سکریٹری تھے۔ جواہر لال نہرو نے ان کو پاکستان سے آنے والے شرنارتھیوں کا شعبہ دیا تھا۔ انھوں نے ہندستان ٹائمس (۲۶ مئی) میں اپنی یادداشت (Reminiscences) شائع کی ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ تقسیم کے بعد پاکستان سے شرنارتھیوں کا سیلاب چلا آرہا تھا۔ ان کے پاس ظلم و ستم کی ہولناک داستانیں ہوتی تھیں۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ کتنی ہی بار ایسا ہوا کہ میں آفس سے گھر دن کا کھانا کھانے کے لئے گیا۔ وہاں میری رہائش پر شرنارتھیوں کا ہجوم موجود ہوتا۔ وہ میرا انتظار کر رہے ہوتے۔ میں برداشت کے ساتھ ان کی باتیں سنتا اور اس کے بعد گھر کے اندر کھانے کے لئے جاتا۔ مگر ان کی مصیبت کی داستانیں سن کر میری بھوک اڑ جاتی۔ جب کھانا میز پر رکھا جاتا تو میں اپنی بیوی سے معذرت کرتے ہوئے یہ کہتا کہ مجھے افسوس ہے۔ مگر اس وقت میں کھا نہیں سکتا۔ ان کی مصیبت کی کہانیاں سننے کے بعد میرے اندر وہ دل اور وہ اشتہاء کیسے باقی رہ سکتی تھی کہ میں کھانا کھاؤں۔

تقسیم کے نتیجہ میں ٹھیک اسی قسم کے واقعات پاکستان میں بھی پیش آئے۔ "تقسیم نے دونوں

طرف مسائل میں اضافے کئے، مگر کوئی ایک مسئلہ بھی حل نہیں کیا۔

۲۷ مئی ۱۹۹۰

میرے لڑکے ڈاکٹر ثانی اثنین خاں کا نکاح ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۴ کو ہوا۔ ابتداءً اس کے یہاں تین لڑکیاں ہوئیں۔ اس کے بعد ۲۰ جنوری ۱۹۹۰ کو ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام میرے والد کے نام پر سلمان فرید رکھا گیا۔ بچہ نہایت تندرست اور خوبصورت تھا۔ جو شخص دیکھتا اس کی تعریف کرتا۔ مگر کل وہ اچانک بیمار ہوا، اور آج صبح ۹ بجے گنگا رام اسپتال (نئی دہلی) میں اس کا انتقال ہوگیا۔

یہ واقعہ اتنا عجیب ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ اس کی مصلحت کیا ہے۔ آج دوپہر بعد نظام الدین کے قبرستان میں اس کی تدفین ہوئی۔ جب ہم لوگ قبرستان پہنچے اور میں نے اس کی لاش گاڑی سے نکال کر اپنے ہاتھ پر لی اور اس کو اٹھائے ہوئے قبر کی طرف چلا تو بے اختیار میرے دل نے کہا: جو مجھ کو اٹھاتا اس کو آج میں اپنے بوڑھے ہاتھوں سے اٹھا رہا ہوں۔ خدا کے مقدرات بھی کیسے عجیب ہیں۔

۲۸ مئی ۱۹۹۰

جماعت اسلامی ہند کے سابق امیر مولانا ابواللیث ندوی جماعت کی امارت سے الگ ہوگئے ہیں۔ مولانا محمد سراج الحسن صاحب جماعت کے نئے امیر مقرر ہوئے ہیں۔ سہ روزہ دعوت (۲۸ مئی ۱۹۹۰) کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ نئے امیر کی صدارت میں جماعت کی مجلس شوریٰ کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ اس میں جو فیصلے کئے گئے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ مولانا جلال الدین انصر عمری کو نائب امیر برائے 'تربیت' مقرر کیا گیا ہے۔ (دسمبر ۱۹۹۰ میں مولانا ابواللیث صاحب کا انتقال ہوگیا۔) میرے نزدیک یہ تقرر سادہ لوحی کے سوا اور کچھ نہیں۔

جماعت اسلامی کے سنجیدہ حلقہ میں پچھلے پچاس برس سے یہ محسوس کیا جاتا رہا ہے کہ جماعت کے افراد میں سیاسی ذہن تو خوب پیدا ہو جاتا ہے، مگر روحانی پہلو بالکل کمزور رہتا ہے۔ غالباً ۱۹۵۳ میں مرکز جماعت (رامپور) میں ایک شعبہ تربیت قائم ہوا۔ اس کے انچارج مولانا سید حامد علی تھے۔ اس کے تحت پندرہ روزہ تربیتی پروگرام چلایا گیا۔ میں اس کے پہلے بیچ میں شامل تھا۔ مگر چند ہی مہینے میں وہ بے فائدہ قرار دے کر ختم کر دیا گیا۔ اب اسی مقصد کے لئے نائب امیر تربیت کا تقرر کیا گیا ہے۔

" تعبیر کی غلطی" میں میں اس کو تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں کہ جماعت اسلامی کے افراد میں روحانی پہلو پیدا نہ ہونے کا سبب ان کی سیاسی تفکیر ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا نظریہ جس پر جماعت اسلامی اٹھی ہے، وہ عین اپنی فطرت کے اعتبار سے سیاسی ذہن بناتا ہے۔ اس لئے جماعت کے افراد میں روحانیت لانے کے لئے سب سے پہلے اس سیاسی نظریہ کی غلطی کا اعلان کرنا ہوگا۔ ہندو قوم کے افراد میں جو مالی کرپشن ہے، اس کے خلاف ان کے مصلحین برابر لکھتے اور بولتے رہتے ہیں۔ مگر ایک فیصد بھی اس میں کمی نہ آسکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مالی کرپشن کا سبب یہ ہے کہ ہندو عقیدہ میں دولت ایک دیوی ہے۔ جب تک اس مشرکانہ عقیدہ کو ختم نہ کیا جائے اس وقت تک ہندوؤں کا مالی کرپشن ختم نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جب تک ابوالاعلیٰ مودودی کے سیاسی نظریہ کو ترک نہ کیا جائے، جماعت کے افراد میں روحانی مزاج نہیں لایا جا سکتا۔

۲۹ مئی ۱۹۹۰

ٹائمس آف انڈیا (۲۶ مئی ۱۹۹۰) میں بمبئی کے مسٹر بینکشور کا خط چھپا ہے۔ انھوں نے پرفخر انداز میں لکھا ہے:

If democracy has succeeded at all in any Muslim-dominated country in the world, it has only been for a short while in Pakistan and Bangladesh. Thanks to the influence of India's example... The Muslim League, which fought for Pakistan, still exists in India. Can you ever imagine the Hindu mahasabha being allowed to function in Pakistan or Bangladesh? (S.S. Bankeshwar)

اگر جمہوریت کبھی کسی مسلم اکثریت کے ملک میں کامیاب ہوئی ہے تو وہ صرف مختصر مدت کے لئے پاکستان اور بنگلہ دیش میں ہوئی ہے، اور وہ بھی ہندستان کی مثال کی بدولت جو کہ اب بھی یہاں پائی جارہی ہے۔ مسلم لیگ جو کہ پاکستان کے لئے لڑی تھی، وہ اب بھی ہندستان میں موجود ہے۔ کیا آپ تصور کر سکتے کہ ہندو مہاسبھا کو پاکستان یا بنگلہ دیش میں کام کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔

اس کو پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ اسی طرح مسلمانوں نے کچھ امتیازی باتیں اپنے موافق تلاش کر لی ہیں اور وہ ان پر فخر کرتے ہیں (مثلاً یہ کہ ہندستان میں برابر ہندو مسلم فسادات ہو رہے ہیں۔ مگر پاکستان میں ۱۹۴۷ کے بعد کوئی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا) ہندو ہندو مذہب کا نام لیتے ہیں اور مسلمان اسلام کا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں کا مذہب صرف ایک ہے، اور وہ فخر ہے۔ دونوں ہی قومی فخر میں

جی رہے ہیں، البتہ دونوں الگ الگ الفاظ بولتے ہیں۔

۳۰ مئی ۱۹۹۰

دارالعلوم دیوبند کے ایک طالب علم عبید اللہ احمد حیدر آبادی (۲۰ سال) ملاقات کے لئے آئے۔ ان کو نصیحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اگر آپ زندگی میں بڑی کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو محنت کیجئے۔ محنت کے بغیر یہاں کوئی ترقی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اس دنیا کا اصول ایک لفظ میں یہ ہے ــــ کم محنت کم ترقی، زیادہ محنت زیادہ ترقی۔

۳۱ مئی ۱۹۹۰

حیدر آباد کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے شکایت کے انداز میں کہا کہ پولیس ایکشن کے بعد جب ہندستان نے حیدر آباد پر قبضہ کیا تو اس کے بعد منصوبہ بند طور پر مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے نکال دیا گیا۔ میں نے کہا کہ یہ تو عین وہی فعل ہے جو اس سے پہلے خود مسلمان کر چکے ہیں۔ ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں جب حیدر آباد میں مسلمانوں کا اقتدار تھا تو تمام سرکاری ملازمتیں مسلمانوں کو دے دی گئی تھیں۔ اب ۱۹۴۷ کے بعد جب دوسرے فریق کی باری آئی تو وہ یہی طریقہ مسلمانوں کے ساتھ اختیار کر رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ اس کے خلاف احتجاج اور فریاد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آپ حیدر آباد کے مسلمانوں سے کہئے کہ تم کو اگر سرکاری ملازمتیں نہیں مل رہی ہیں تو اس پر افسوس نہ کرو بلکہ تجارت کے میدان میں داخل ہو کر ترقی کرو۔ اور تجارت کا میدان یقیناً ملازمت کے میدان سے بہت زیادہ بڑا ہے۔

یکم جون ۱۹۹۰

قرآن میں منکرین کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ جب ان کو قرآن کی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ متکبرانہ طور پر اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر وہ آیات قرآن میں کوئی 'شئی' جان لیں تو فوراً اس کا استہزاء کرنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے سخت عذاب ہے۔ (الجاثیہ ۸-۹)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن میں ایسی 'شئی' رکھی ہی کیوں گئی جس میں استہزاء کی گنجائش ہو۔ اس کا مقصد آزمائش ہے۔ تاکہ خدا قیامت میں ان سے کہے کہ تم جب شوشہ والی بات کو جاننے میں اتنے ذہین تھے تو حقائق کو جاننے میں اتنے بے وقوف کیوں بن گئے۔

۲ جون ۱۹۹۰

دہلی کے انگریزی ہفت روزہ نیشن (یکم جون ۱۹۹۰) میں قدیم دہلی کی کچھ شخصیتوں کا حال چھپا ہے۔ ان میں سے ایک لالہ کیدارناتھ ہیں۔ وہ لالہ رام جس کے لڑکے تھے۔ لالہ رام جس دہلی کے ایک حلوائی تھے۔ ان کے لڑکے لالہ کیدارناتھ نے تعلیم حاصل کی اور برطانی دور میں سشن جج بنے۔

لالہ کیدارناتھ نے تعلیم کی اہمیت کو سمجھا۔ انھوں نے اپنے باپ کے نام پر رام جس کالج قائم کیا۔ اس کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں دہلی میں اسکول کھولے۔ حتی کہ ان کے قائم کردہ پرائمری اسکولوں کی تعداد میونسپل پرائمری اسکولوں سے بھی زیادہ ہوگئی۔

لالہ کیدارناتھ نے اپنی پوری زندگی تعلیم کے لئے وقف کر دی۔ اپنی کمائی اور اپنے باپ کی کمائی سب انھوں نے اسی راہ میں لگادی۔ حتی کہ اپنا گھر بھی دے دیا۔ آخر عمر میں وہ ایک ہوسٹل میں رہتے تھے اور عام طلبہ کی طرح خوراک اور قیام کے لئے پندرہ روپیہ ماہانہ ادا کرتے تھے:

> **The founder of the college gave away all his savings to these institutions. He himself lived in the hostel along with the Students and paid Rs. 15 for monthly boarding and lodging.**

موجودہ زمانہ میں ہندوؤں میں ایسے ہزاروں افراد پیدا ہوئے۔ مگر مسلمانوں میں غالباً کوئی بھی نہیں۔ سرسید نے بھی صرف کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر سوچا۔ ابتدائی اسکولوں کی اہمیت کو وہ بھی نہ سمجھ سکے۔

۳ جون ۱۹۹۰

الطاف حسین حالی (۱۹۱۴ - ۱۸۳۷) نے سو سال پہلے اپنی مشہور کتاب "مسدس" لکھی۔ اس میں اس وقت کے مسلمانوں کی حالت زار کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے — امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

اس کے بعد پچھلے سو برس کے درمیان مسلمانوں کے اندر بے شمار تحریکیں اٹھیں۔ انھوں نے زلزلہ خیز ہنگامے برپا کئے اور ہمالیائی شخصیتیں پیدا کیں۔ انھیں میں سے ایک پاکستان کی تحریک بھی ہے جس کے بانی کو پاکستان میں صرف "قائد اعظم" کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ ان کے نام کے ساتھ (مسٹر محمد علی جناح) کہنا ان کی توہین ہے۔

مگر سو برس بعد آج بھی مسلمانوں کی حالت ویسی ہی ہے یا اس سے بھی بدتر۔ پاکستان کے روزنامہ نوائے وقت (۳۰ مئی ۱۹۹۰) میں اس موضوع پر ایک مضمون چھپا ہے۔ اس مضمون کا عنوان دوبارہ حسب ذیل ہے:

امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

اس مضمون کا پہلا پیرگراف یہ ہے: ہر باشعور مسلمان کو یہ احساس ہے کہ امت مسلمہ دنیا بھر میں ظالم اور جابر قوتوں کی مشق ستم بنی ہوئی ہے۔ ہر سمت سے مسلمانوں پر ایک متحد اور منظم یلغار ہے۔ جس کے پیچھے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کا جذبہ کارفرما ہے۔ خون مسلم کی اس قدر ارزانی شاید چشم فلک نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی ہوگی۔ (صفحہ ۳)

سوال یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ان کے دشمن کیوں سرگرم ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ یہ دشمن مسلسل اپنے منصوبوں میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ اور مسلمانوں کی تمام جوابی کوششیں حبط اعمال کا شکار ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

۴ جون ۱۹۹۰

سعودی حکومت اور سوویت روس کے درمیان سفارتی تعلقات قائم نہیں ہیں۔ ایک ملک کا جہاز دوسرے ملک میں اترنا اب تک مطلق ممنوع تھا۔ مگر حال میں سوویت روس کے اندر جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، اس کے بعد نئے واقعات سامنے آرہے ہیں۔

مئی ۱۹۹۰ میں سوویت یونین کی ایروفلاٹ (Aeroflot) نے جدہ اور ماسکو کے درمیان ۲۸ پروازیں کیں۔ اور قرآن کے ایک ملین نسخے جدہ سے ماسکو پہنچائے۔ قرآن کے یہ نسخے سعودی کنگ فہد نے روسی مسلمانوں کو ہدیۃً دئے ہیں۔ اور وہ تاشقند، سمرقند، قازان اور باکو وغیرہ میں رہنے والے مسلمانوں کو دئے جائیں گے۔ اس معاملہ کو طے کرنے کے لئے ایک سعودی ٹیم ماسکو گئی تھی جس کے قائد یوسف اخضر تھے۔ کنگ فہد نے اس کے لئے ایروفلاٹ کو خصوصی اجازت دی کہ وہ جدہ میں اتر سکے۔ نیز اس کے جہازوں کو ایئرپورٹ ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔

یہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں کیسی عجیب تبدیلیاں ظہور میں آئی ہیں جو عین اسلامی دعوت کے حق میں ہیں۔

۵ جون ۱۹۹۰

خواجہ حسن نظامی کو مولانا محمد علی جوہر نے اپنے اخبار میں لکھا تھا کہ وہ "برٹش ایجنٹ" ہیں (نیشن ویکلی، نئی دہلی، ۱ - ۱۵ جون ۱۹۹۰) موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں یہ طریقہ عام رہا ہے۔ ابوالکلام آزاد کو ہندوؤں کا ایجنٹ کہا گیا، محمد علی جناح کو انگریزوں کا ایجنٹ۔ وغیرہ۔

تنقید کا یہ طریقہ نہایت لغو ہے۔ یہ غیر اسلامی بھی ہے اور اسی کے ساتھ حد درجہ سطحی بھی۔ مسلمانوں میں اس طرز تنقید کا رواج بتاتا ہے کہ مسلمان اپنے کردار کے اعتبار سے کتنا زیادہ پیچھے جاچکے ہیں۔

۶ جون ۱۹۹۰

رنگون (Rangoon) برما کا مشہور شہر ہے۔ اب اس کا نام یانگون (Yangon) کر دیا گیا ہے۔ یہ حقیقۃً تبدیلی نہیں ہے، بلکہ سابقہ نام کی طرف واپسی ہے۔ برمی زبان میں اس شہر کو یانگون کہا جاتا تھا۔ انگریزوں نے اپنے تلفظ کے مطابق، اس کو رنگون لکھنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد وہ رنگون کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اب قومی حکومت نے دوبارہ اس کو یانگون کہنا شروع کر دیا ہے۔

تلفظ کے فرق کا یہ مسئلہ ہر زبان میں ہوتا ہے۔ یہی فرق عربی زبان میں بھی پایا جاتا تھا۔ ایک ہی لفظ کو مختلف قبائل مختلف تلفظ کے ساتھ بولتے تھے۔ چنانچہ قرآن نازل ہوا تو لوگوں نے اس کو اپنے لہجے میں لکھنا شروع کر دیا۔ حضرت ابوبکر کے زمانہ میں جب قرآن باضابطہ طور پر لکھا گیا تو اس کو صرف قریش کے لہجہ پر لکھا گیا۔ بقیہ لہجوں پر لکھے ہوئے قرآن کے حصوں کو جلا دیا گیا۔ اس جلانے کی وجہ یہی لہجہ کا اور تلفظ کا فرق تھا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو قرآن کے بارہ میں لوگوں کے درمیان غیر ضروری طور پر بے شمار اختلافات پیدا ہو جاتے۔

۷ جون ۱۹۹۰

پاکستان کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ انڈیا میں مسلمانوں کے خلاف امتیاز (Discrimination) پایا جاتا ہے۔ اور یہی یہاں کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے۔ یہ چیز ان کی ترقی کو روکے ہوئے ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ ہندستان کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ دوسروں کا تعصب اور امتیاز نہیں بلکہ ان کی اپنی ذہنی پسماندگی (Intellectual backwardness) ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو ایک نیا نقطۂ نظر ہے۔ معاشی پسماندگی اور تعلیمی پسماندگی کا لفظ ہم نے سنا تھا

مگر ذہنی پسماندگی کا لفظ اس سے پہلے کبھی نہیں سنا۔ میں نے کہا کہ ذہنی پسماندگی سے مراد یہ ہے کہ آدمی فکری محدودیت میں مبتلا ہو۔ اس کی سوچ اس قابل نہ ہو کہ وہ حقائق کو سمجھے اور اس کے مطابق اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کرے۔

مثلاً اسی امتیاز والی بات کو لیجئے۔ مجھے اس سے اختلاف نہیں کہ ہندستان میں وہ چیز پائی جاتی ہے جس کو آپ جیسے لوگ امتیاز سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر جب ہم مختلف سماجوں کا تقابل کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کا "امتیاز" ہر سماج میں پایا جاتا ہے۔ وہ جس طرح ہندستان میں ہے اسی طرح پاکستان اور عرب ممالک میں ہے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ امتیاز زندگی کی ایک ناگزیر حقیقت ہے نہ کہ سادہ معنوں میں ایک کے خلاف دوسرے کا امتیاز۔

۸ جون ۱۹۹۰

پاکستان کی ایک انگریزی جرنلسٹ مسز نسیم زہرا انٹرویو کے لئے آئیں۔ میں نے وہی باتیں کہیں جو میں الرسالہ میں لکھتا رہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ آپ ایسی باتیں کرتے ہیں گویا کہ ہندستان میں مسلمانوں کا کوئی مسئلہ نہیں۔ مگر میں نے دہلی میں مسٹر کے آر ملکانی اور دوسرے ہندو دانشوروں سے بات کی۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کو مسلمانوں سے اپنا تاریخی بدلہ چکانا ہے:

We have to settle, historical scores.

میں نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ وہ لوگ ایسا کہتے ہیں۔ مگر میں ان باتوں کو نہ کوئی حقیقی خطرہ سمجھتا اور نہ مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں کوئی واقعی رکاوٹ۔

میں نے کہا کہ یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں اس طرح کا چیلنج ہمیشہ باقی رہے گا۔ آپ اس کو کبھی ختم نہیں کر سکتے۔ آپ کا اصل کام یہ ہے کہ حسن تدبیر اور اپنی منصوبہ بندی کے ذریعہ اپنے آپ کو اتنا طاقت ور بنائیں کہ لوگوں کی اس طرح کی باتیں بے اثر ہو کر رہ جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عرب کے لوگ اس سے بھی زیادہ سخت باتیں کہتے تھے مگر آپ نے اپنے اعلیٰ منصوبوں کے ذریعہ اس کو بے اثر بنا دیا۔

۹ جون ۱۹۹۰

۱۹۸۲ میں لندن کے سفر میں میری ملاقات ایک ہندستانی مسلمان سے ہوئی۔ ان سے میری

پہلی ملاقات ان کے مکان پر ہوئی تھی۔ انھوں نے گفتگو کے دوران بتایا کہ ہندستان کی فلاں یونیورسٹی سے میں نے فلاں سبجکٹ پر ماسٹر ڈگری لے لی تھی۔ اس لئے مجھے لندن میں آسانی سے کام مل گیا۔ اگر میرے پاس ماسٹر ڈگری نہ ہوتی تو یہاں کوئی معقول کام تلاش کرنا مشکل ہوتا۔ انھوں نے اپنے بچوں کے بارے میں فخر کے ساتھ بتایا کہ وہ یہاں کے اسکولوں میں باقاعدہ پڑھ رہے ہیں۔

اس کے دو دن بعد لندن کے ایک اسلامک سنٹر میں پروگرام تھا۔ اس موقع پر میں نے "علم" کی اہمیت پر کچھ باتیں کہیں اور کہا کہ ہندستان کے مسلمانوں کے مسئلہ کا حل یہ ہے کہ انھیں تعلیم میں آگے بڑھایا جائے۔ اس کے بعد سوال وجواب کا مرحلہ شروع ہوا۔ مذکورہ صاحب نے سوال وجواب کے وقفہ میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ آپ علم کی باتیں کرتے ہیں۔ حالاں کہ اب یورپ میں ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو بے علمی (De-learning) کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے تمام مسائل علم کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں۔ قدیم زمانہ میں جب کہ انسان کے پاس علم کم تھا اس وقت انسان زیادہ پر امن زندگی گزار رہا تھا۔ اس لئے اب ہمیں سابقہ دور کی طرف واپس جانا چاہئے۔

میں نے سوچا کہ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو خود اپنا اور اپنے بچوں کا مسئلہ علم کے ذریعہ حل کر رہے ہیں اور دوسرے مسلمانوں کو بے علمی کا سبق دینا چاہتے ہیں۔

۱۰ جون ۱۹۹۰

آجکل سندھ (پاکستان) میں آگ لگی ہوئی ہے۔ مہاجرین کے خلاف نفرت اتنی بڑھ گئی ہے کہ سندھی جہاں انھیں پاتے ہیں، مارتے ہیں۔ مہاجر مرد اور عورتیں اپنے گھروں سے باہر نکلتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ہر طرف عدم تحفظ کا احساس چھایا ہوا ہے۔ پاکستان کی بری فوج کے سربراہ جنرل مرزا اسلم بیگ نے ۲۹ مئی ۱۹۹۰ کو حیدر آباد سندھ کا دورہ کیا جو بدترین فسادکا منظر پیش کر رہا تھا۔ پاکستان کے اخبار وفاق (۳۰ مئی ۱۹۹۰) کے صفحہ اول پر ایک نمایاں خبر میں بتایا گیا ہے کہ جنرل اسلم بیگ جب حیدر آباد سندھ کی سڑکوں سے گزرے تو وہاں سے شہریوں نے نعرے لگائے:

المدد المدد، پاک فوج المدد۔

سندھ کے مسلمان پاکستانی فوج کی مدد کس کے خلاف مانگ رہے تھے۔ جواب یہ ہے کہ خود وہاں کے مسلمانوں کے خلاف۔ پاکستانی مسلمانوں کا ایک طبقہ پاکستانی مسلمانوں کے دوسرے طبقہ سے اپنے

آپ کو سخت خطرہ میں محسوس کرتا ہے، اس لئے وہ فوج کی مدد مانگ رہا ہے۔

پاکستان یہ کہہ کر بنوایا گیا تھا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے خطرہ ہے۔ مگر پاکستان بننے کے ۵۰ سال بعد یہ حال ہے کہ مسلمانوں کو اس سے بھی زیادہ بڑا خطرہ خود اپنے مسلم بھائیوں کی طرف سے پیش آرہا ہے۔

سندھ کی کل آبادی ۲۰ ملین ہے۔ اس میں مہاجرین ۶ فیصد ہیں۔ یہ مہاجر زیادہ تر کراچی اور حیدرآباد میں آباد ہیں۔

۱۱ جون ۱۹۹۰

۱۳ مئی ۱۹۹۰ کو میں فرینکفرٹ سے دہلی آرہا تھا۔ یہ لفتھانسا کا جہاز تھا۔ میں نے ایر ہاسٹس سے کہہ دیا تھا کہ 'ڈرنک' میں مجھے صرف فروٹ جوس چاہئے۔ ناشتہ آیا تو ایک چھوٹے سفید پلاسٹک کے گلاس میں عنابی رنگ کا مشروب تھا۔ میں نے سمجھا کہ یہ سیب کا جوس ہے۔ اٹھا کر منھ سے لگایا۔ ایک قطرہ منھ میں گیا تھا کہ سخت کڑوا معلوم ہوا۔ میں نے فوراً گلاس کو ٹرے میں رکھ دیا۔

کچھ دیر کے بعد ایر ہاسٹس آئی۔ میں نے پوچھا کہ کیا یہ شراب ہے۔ اس نے بتایا کہ ہاں یہ انگور کی بنی ہوئی ہلکی شراب ہے جس کو کاگنیک (cognac) کہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ جب ہلکی شراب اتنی کڑوی ہے تو دوسری شراب کتنی زیادہ کڑوی ہوتی ہوگی۔ مگر جب کوئی چیز نشہ بن جائے تو آدمی اس کو چھوڑ نہیں پاتا، خواہ وہ فی الحقیقت کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔

۱۲ جون ۱۹۹۰

ایک مسلمان شاعر نے "دہلی" کا مرثیہ لکھا ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:

داستاں دہلی مرحوم کی اے دوست نہ چھیڑ نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

اس شعر میں بظاہر "دہلی" کا لفظ ہے۔ مگر اس سے مراد مسلم اقتدار والی دہلی ہے۔ ورنہ دہلی سے مراد اگر دہلی شہر ہو تو دہلی شہر تو آج بھی مزید ترقی یافتہ صورت میں موجود ہے۔ پھر اس کو مرحوم کہنے یا اس کا مرثیہ لکھنے کی کیا ضرورت۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے مسلمانوں کے اندر جو نفسیات بنائی، وہ تمام تر حکومتی نفسیات ہے۔ موجودہ مسلمانوں کو صرف اس دنیا سے دلچسپی ہے جس میں مسلمان حکومت کر رہے ہوں۔

جس دنیا میں مسلمانوں کو سیاسی حکمراں کی حیثیت حاصل نہ ہو اس سے مسلمانوں کو کوئی دلچسپی نہیں۔

یہ نفسیات سراسر باطل ہے۔ مسلمان وہ ہے جو داعی ہو۔ اور داعی ہر حال میں اہل عالم سے محبت کرنے والا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو اپنا یہ سیاسی مزاج بدلنا ہوگا اور اس کے بجائے داعیانہ مزاج اپنے اندر پیدا کرنا ہوگا۔ ورنہ خدا کی دنیا میں ان کے لئے ذلت اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

۱۳ جون ۱۹۹۰

مہاراشٹر کی حکومت مہاراشٹر کی اردو اکیڈمی (بمبئی) کو اس سے پہلے پانچ لاکھ روپیہ سالانہ کی مالی امداد دیتی تھی۔ مہاراشٹر کے موجودہ وزیر اوقاف مسٹر جاوید خان نے ریاست کے وزیر اعلیٰ مسٹر شرد پوار سے اپیل کی کہ اس امداد میں اضافہ کیا جائے۔ وزیر اعلیٰ نے اس درخواست کو قبول کرتے ہوئے مہاراشٹر کی اردو اکیڈمی کی امداد کو بڑھا کر ۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ کر دیا۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے کہ آج بھی ہندستان میں مسلمانوں کے لئے کتنے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔ اگر مہاراشٹر میں ۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ کی اس رقم کو اردو کی ترقی کے لئے واقعۃً استعمال کیا جائے تو چند سال میں ریاست کے اندر "اردو انقلاب" آجائے۔ مگر مجھے امید نہیں کہ اس گراں قدر رقم کا کوئی واقعی فائدہ اردو کو پہنچ سکے گا۔ کیوں کہ اس کے لئے ضرورت ہے کہ لگن اور دیانت داری اور اتحاد کے ساتھ کام کیا جائے، اور یہ چیز موجودہ مسلمانوں کے اندر موجود نہیں۔

۱۴ جون ۱۹۹۰

میں قرآن کا حافظ نہیں ہوں۔ مگر بار بار پڑھنے کی وجہ سے قرآن کی بیشتر آیتیں مفہوم کے اعتبار سے میرے ذہن میں رہتی ہیں۔ جب بھی کوئی بات پیش آتی ہے تو اس سے متعلق آیت کا خاکہ ذہن میں آجاتا ہے۔

ایسے مواقع پر کبھی آیت کے تمام الفاظ ذہن میں آتے ہیں اور کبھی آیت کا ایک دو لفظ۔ جب آیت کا ایک دو لفظ ذہن میں آتا ہے تو میں قرآن کا انڈکس (المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم) دیکھتا ہوں۔ اس سے پوری آیت اور اس کا حوالہ فوراً معلوم ہو جاتا ہے۔ جب میں گھر پر ہوتا ہوں تو قرآن کا یہ انڈکس ہر وقت میرے پاس ہوتا ہے اور روزانہ بار بار اس سے مدد لیتا رہتا ہوں۔

ایک بار میں سفر میں تھا۔ کسی موضوع سے متعلق ایک آیت ذہن میں آئی۔ آیت کا مفہوم ذہن میں تھا۔

مگر اس کا صرف ایک عربی لفظ مجھ کو یاد تھا۔ میں نے حافظ کی تلاش کی۔ مسجد میں ایک حافظ مل گئے۔ ان کو میں نے آیت کا ایک لفظ بتایا۔ انھوں نے ایک لمحہ میں پوری آیت پڑھ دی۔ اور بتا دیا کہ یہ کس سورہ میں اور اس کے کس رکوع میں ہے۔

اس تجربہ کے بعد میں نے سوچا کہ مسلمانوں میں قرآن سے رہنمائی کا ذوق نہیں۔ اگر قرآن سے رہنمائی لینے کا ذوق ہو تو یہ حفاظ قرآن کے چلتے پھرتے زندہ انڈکس بن جائیں۔ ہر جگہ اور ہر وقت لوگ ان سے آیتوں کے حوالے پوچھ کر ان کے ذریعہ سے قرآنی رہنمائی لیتے رہیں۔

۱۵ جون ۱۹۹۰

دین کا اصل مقصد انسان کو ربانی انسان بنانا ہے۔ یہی تمام انبیاء کا مشترک مشن تھا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ایک مزید کام وہ تھا جس کو قرآن میں ختم فتنہ کہا گیا ہے یعنی شرک کا تعلق اقتدار سے توڑ دینا تاکہ توحید کی راہ میں کوئی سیاسی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

اس کے نتیجہ میں اسلام کی تاریخ وجود میں آئی اور مسلمانوں کی حکومت زمین کے بڑے رقبہ میں قائم ہوگئی۔ اب حکومت کو چلانے کے لئے قانونی نظام کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت نے فقہائے اسلام کو پیدا کیا۔ انھوں نے حکومت کا نظام چلانے کے لئے احکام و قوانین کا ایک پورا ڈھانچہ مرتب کر دیا۔ موجودہ زمانہ میں مغربی قوموں کا عروج ہوا اور مسلم حکومتیں براہ راست یا بالواسطہ طور پر ٹوٹ گئیں۔ مسلمانوں میں اس کا ردعمل ہوا۔ اور دوبارہ حاکمانہ حیثیت حاصل کرنے کے لئے ساری دنیا میں اسلام کے نام پر سیاسی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ان اسباب کے نتیجہ میں تمام مسلمانوں کے ذہن پر سیاسی طرز فکر غالب آگیا ہے۔ پوری مسلم قوم (Power conscious) ہوگئی۔ مسلمانوں کے اس سیاسی مزاج نے ان کو حقیقی اسلام سے دور کر دیا ہے۔ وہ اسلام کے نام پر غیر اسلام میں مبتلا ہیں۔

ذہن کے بگاڑ کا یہ مسئلہ سیکڑوں سال سے چلا آرہا ہے۔ تصوف کی تحریک غالباً یہی تھی کہ مسلمانوں کو دوبارہ "سیاسی اسلام" سے نکال کر ربانی اسلام کی طرف لایا جائے۔ صوفیاء کا یہ مقصد درست تھا مگر اس کے لئے انھوں نے غلط طریق کار اختیار کیا۔ ربانیت حاصل کرنے کا اصل طریقہ تفکر ہے۔ مگر اس کو انھوں نے اوراد پر قائم کر دیا۔ موجودہ زمانہ میں تبلیغی جماعت بھی

اسی قسم کی اصلاحی کوشش کے طور پر اٹھی۔ مگر اس نے بھی یہ غلطی کی کہ فضائل کو ربانی بیداری کا ذریعہ بنایا۔ حالاں کہ ربانی بیداری کا صحیح ذریعہ ذہنی معرفت ہے۔

اب پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں میں سیاسی مزاج کو ختم کیا جائے۔ اور اس کی جگہ ربانی مزاج پیدا کیا جائے۔ جب تک یہ ذہنی اصلاح نہ ہو مسلمانوں میں کوئی حقیقی اسلامی بیداری نہیں آسکتی۔

۱۶ جون ۱۹۹۰

آرنلڈ ٹوائن بی (۱۹۷۵ - ۱۸۸۹) ایک ممتاز انگریز مورخ ہے۔ (۵۵-۱۹۴۵) میں اس کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ مگر اس کے بعد اس کا زوال ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ یہودی قوم اور یہودی مذہب پر تنقید کرتا تھا۔ وہ اسرائیلی ریاست کا حامی نہ تھا۔ اس نے علانیہ طور پر عربوں کی حمایت کی۔ اس نے یروشلم جانے کے لئے اسرائیلی دعوت نامہ قبول نہیں کیا۔

اس کے نتیجہ میں یہودی اس کے مخالف ہوگئے۔ یہودیوں کے تعلیم یافتہ لوگوں نے اس کے خلاف کتابیں اور مضامین لکھنا شروع کیا۔ اس کے یہودی مخالف خیالات (Anti-Jewish view) کی بنا پر اس کو اتنا زیادہ بدنام کیا گیا کہ لائق ہونے کے باوجود اس کو نہ سر کا خطاب ملا اور نہ نوبل انعام دیا گیا۔

آرنلڈ ٹوائن بی اسلام سے متاثر تھا۔ اس نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ مستقبل کا مذہب اسلام ہوگا۔ عرب۔ اسرائیل معاملہ میں وہ ہمیشہ عربوں کی حمایت کرتا تھا۔ اس نے ہندستان اور پاکستان کا سفر کیا اور ایک کتاب (Between Oxus and Jamuna) لکھی۔ اس میں وہ ہندستان کی جمہوریت کے مقابلہ میں صدر ایوب خاں کی بیسک ڈیموکریسی کی تعریف کرتا ہے۔ وغیرہ

(ہندستان ٹائمس، ۳ جون ۱۹۹۰)

ان تمام باتوں کے باوجود کسی قابل ذکر مسلمان نے اس سے دعوتی ملاقات نہیں کی۔ ورنہ عین ممکن ہے کہ وہ اسلام قبول کر لیتا۔ مسلم شخصیتوں کے اندر یہی دعوتی جذبہ کا فقدان موجودہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے۔ حتی کہ مسلم دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ملیں گے جنھوں نے آرنلڈ ٹوائن بی اور اس قسم کے دوسرے لوگوں کا تفصیلی مطالعہ کیا ہو۔

۱۷ جون ۱۹۹۰

پاکستان کے مشہور اردو اخبار نوائے وقت (۹ جون ۱۹۹۰) کے صفحہ اول کی ایک خبر یہ ہے:
وزیر مملکت خزانہ مسٹر احسان الحق پراچہ نے ۸ جون کو اسلام آباد میں ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ پاکستان کے موجودہ دفاعی اخراجات ہمارے مجموعی غیر ترقیاتی اخراجات کا ۸۰ فیصد ہو چکے ہیں۔ مزید یہ کہ پاکستان نے جو بین اقوامی قرض لے رکھے ہیں، ان قرضوں پر سود کی ادائگی کی رقم اس سے بھی زیادہ ہے۔ اس طرح اب دفاع سے زیادہ رقم سود کی ادائگی پر خرچ ہو رہی ہے۔"

یہ ہے پچاس برس بعد اس پاکستان کا انجام جس کو مفکر اسلام اقبال، قائد اعظم جناح، اور شیخ التفسیر شبیر احمد عثمانی اور اس طرح کے دوسرے لوگوں نے بنوایا تھا۔ ۴۷ سے پہلے جب کہ میں عقلی پختگی کے دور تک نہیں پہنچا تھا، اس وقت بھی وجدانی طور پر میں پاکستان کی تحریک کو ایک لغو تحریک سمجھتا تھا۔ اور اب تو میرا خیال ہے کہ ساری معلوم تاریخ میں شاید سب سے بڑی حماقت وہی کی گئی ہے جس کا نام پاکستان ہے۔

۱۸ جون ۱۹۹۰

صفیہ ظفر (لکھنؤ) کا ایک قسط وار مضمون قومی آواز میں چھپا ہے۔ وہ یورپ کا سفر کرتی ہوئی امریکہ پہنچیں۔ ڈیرائٹ کی یادداشت کے تحت وہ لکھتی ہیں:

"ایرپورٹ پر ڈاکٹر عاصم بھائی موجود تھے۔ عاصم بھائی کے جماعت اسلامی کے زوردار رکن ہونے کی وجہ سے ان کی چھت کے نیچے بین اقوامی اجتماع ہوتا رہتا ہے۔ ان کے دوستوں میں کوئی ترکی کا ہے، کوئی عرب، کوئی مصر اور کوئی امریکن، کوئی حبشی۔ اسلامیات پر بحثیں ہوتی رہتی ہیں۔ اسلامی انقلاب کے آنے کے امکانات پر مباحثہ ہوتا ہے۔ اور خوب کھانے پینے کا دور بھی چلتا رہتا ہے۔ امریکہ میں جتنے آرام کے ساتھ کام کرتے میں نے عاصم بھائی کو دیکھا اور کسی کو نہیں دیکھا۔" قومی آواز، ۷ اجون ۱۹۹۰۔

ڈاکٹر عاصم کانپور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۹۶۲ کے نصف اول میں ایک بار میں کانپور گیا تھا اور وہاں مرزا امتیاز بیگ کے یہاں ٹھہرا تھا۔ اس وقت کانپور میں ڈاکٹر عاصم صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مولانا مودودی کے پرجوش مداحوں میں سے تھے۔

اوپر کے اقتباس میں جماعت اسلامی کے افراد کا جو ذکر ہے، وہ ان کا صحیح ترین موجودہ نقشہ ہے۔ اس وقت جماعت اسلامی کے افراد کی عین وہی حالت ہے جو موجودہ کیونسٹوں کی ہے۔ جماعت اسلامی کے افراد عام دنیاداروں کی طرح "خوب کھانے پینے" کی زندگی گزارتے ہیں۔ البتہ فارغ اوقات میں وہ اسلامی سیاست پر گرما گرم گفت گو کرتے رہتے ہیں۔ اسلام ان کے لئے ٹیبل ٹاک کا ایک موضوع ہے۔ اور ٹیبل ٹاک کے لئے ظاہر ہے کہ خشوع اور تضرع اور انابت و اخبات کا موضوع اتنا دلچسپ نہیں ہو سکتا جتنا اسلامی سیاست کا موضوع۔

۱۹ جون ۱۹۹۰

جون ۱۹۶۷ میں میں دہلی آیا۔ اسی ابتدائی زمانہ کی بات ہے۔ جماعت اسلامی ہند کی طرف سے جماعت کا ایک آل انڈیا اجتماع منعقد کرنے کا اعلان کیا گیا۔ اس اعلان کے بعد میں جماعت اسلامی کے مرکزی دفتر (دہلی) میں گیا۔ وہاں میری ملاقات مرکزی قیم (جنرل سکریٹری) سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں نے پوچھا کہ آپ نے کل ہند اجتماع منعقد کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اس میں ملک بھر سے جماعت اسلامی کے افراد جمع ہوں گے۔ اس موقع پر آپ انھیں کیا خاص پیغام دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے میرا سوال سن کر معصومانہ انداز میں جواب دیا: ابھی تو اس پر زیادہ غور نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ یہی بات تو سب سے پہلے سوچنے کی تھی، اور آپ حضرات نے اب تک اس پر غور ہی نہیں کیا۔

مجھے قیم صاحب کے اس جواب پر بہت تعجب ہوا۔ بعد کو میں نے سوچا تو سمجھ میں آیا کہ جماعت اسلامی کی موجودہ حالت کے اعتبار سے یہ جواب بالکل درست ہے۔ کیوں کہ جماعت اب کوئی تحریک نہیں ہے بلکہ صرف ایک ڈھانچہ ہے۔ اور جب کوئی جماعت تحریک کے مرحلہ سے گزر کر ڈھانچہ کے مرحلہ میں پہنچ جائے تو اس کا حال یہی ہوتا ہے۔

۲۰ جون ۱۹۹۰

مسٹر ایچ ایل کھیرا سری نگر (کشمیر) میں ایچ ایم ٹی کے جنرل منیجر تھے۔ کشمیر کے مسلم جنگجوؤں نے ان کو اغوا کر کے یرغمال بنا لیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ہمارے گرفتار شدہ ساتھیوں کو رہا کیا جائے۔ جب ان کا مطالبہ پورا نہیں کیا گیا تو وہ مسٹر کھیرا کو گاڑی پر بٹھا کر سڑک پر لائے۔ انھیں گاڑی سے اتار کر کہا کہ جائیے۔ جب وہ سڑک پر جانے لگے تو ان پر گولیوں کی بوچھار کر کے وہیں سڑک پر

انھیں ڈھیر کر دیا۔

یہ واقعہ ۱۰ اپریل ۱۹۹۰ کو دوپہر کے وقت ہوا۔ جب ریڈیو سے خبر پھیلی تو ہندوؤں میں اشتعال پیدا ہوا۔ اس سلسلہ میں مولانا اجتبا ندوی نے ۱۸ جون کی ملاقات میں بتایا کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے ہندو لڑکے ندوہ سے ملے ہوئے ہوسٹل کی چھت پر چڑھ گئے اور ندوہ کے اوپر پتھر برسانے لگے۔ وہ اشتعال انگیز نعرے لگا رہے تھے اور مسلمانوں کو گالیاں دے رہے تھے۔

میں نے پوچھا کہ پھر ندوہ والوں نے کیا کیا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا واضح صاحب (استاد ندوۃ العلماء) آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم لوگوں نے بالکل خاموشی اختیار کر لی۔ ندوہ کی طرف سے کسی بھی قسم کا کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا گیا۔ نہ ان کے نعروں کا جواب دیا گیا اور نہ ان پر پتھر پھینکا گیا۔ کچھ دیر تک وہ اپنی کارروائی کرتے رہے، اس کے بعد خود ہی پیچھے چلے گئے۔

ندوہ والے کہتے ہیں کہ الرسالہ بزدلی کا پیغام دیتا ہے۔ وہ اپنی تقریروں میں پرجوش طور پر جہاد اور مقابلہ کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر جب خود اپنا وجود فسادیوں کی زد میں آیا تو انھوں نے وہی کیا جو الرسالہ میں بتایا جاتا ہے۔ یعنی صبر و اعراض۔

۲۱ جون ۱۹۹۰

نیاز فتحپوری (۱۹۶۶-۱۸۸۴) کے یہاں پہلی اور دوسری بیوی سے لڑکا پیدا نہیں ہوا۔ بعد کو انھوں نے تیسری شادی کی اس سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ ابتدائی دور میں انھوں نے ایک شخص کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ ان کا نام غلام محمد خاں (وفات نومبر ۱۹۸۱) تھا۔ نیاز فتحپوری نے اس نام کو "نہایت غیر شاعرانہ" قرار دیا۔ اور ان کا نام بدل کر مجد د نیازی کر دیا (قومی آواز ۱۰ جون ۱۹۹۰)

نیاز فتحپوری کے بارہ میں میں نے یہ بات پڑھی تو مجھے یاد آیا کہ نوجوانی کی عمر میں میں بھی اکثر یہ لفظ بولا کرتا تھا۔ جو چیز میرے ذوق کے مطابق نہ ہوتی، اس کو میں کہہ دیتا تھا کہ یہ غیر شاعرانہ ہے، یہ غیر شاعرانہ حرکت ہے۔ نیاز فتحپوری اسی ادبی سطح پر رہ گئے۔ اس بارے میں ان کا معاملہ مَنْ شَبَّ عَلَىٰ شَيْءٍ شَابَ عَلَيْهِ کا ہوا۔ مگر میں ادبی سطح پر ٹھہر نہ سکا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے موجودہ حالت تک پہنچایا۔

اس پر سوچتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ پہلے جن مواقع پر میں "غیر شاعرانہ" کہا کرتا تھا، اب ان

مواقع پر میری زبان سے "غیر سائنٹفک" کا لفظ نکلتا ہے۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ میں جو شاعرانہ کا لفظ بولتا تھا، وہ حقیقۃً ادبی معنوں میں نہ تھا۔ اصل یہ ہے کہ میرے اندر سائنٹفک مزاج بچپن سے ہے۔ ابتدائی زمانہ میں میرا ماحول شعر و شاعری کا ماحول تھا۔ جب میں کسی بات کے متعلق کہتا تھا کہ یہ غیر شاعرانہ ہے تو یہ دراصل اپنے دل کی بات کو ماحول کی زبان میں ادا کرنا ہوتا تھا۔ بعد کو جب ماحول کا اثر ختم ہوا اور علم میں اضافہ ہوا تو "غیر شاعرانہ" لفظ کو ناموزوں سمجھ کر میں نے چھوڑ دیا۔ اور "غیر سائنٹفک" لفظ کو اپنے مدعا کے قریب تر پا کر اختیار کر لیا۔

۲۲ جون ۱۹۹۰

نیوٹن اصلاً ایک ریاضی داں اور سائنٹسٹ تھا۔ تاہم اس کو مذہب کے مطالعہ سے بھی دلچسپی تھی۔ اس نے بائبل کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اس کے سائنسی ذہن نے محسوس کیا کہ بائبل کی بہت سی باتیں درست نہیں ہیں۔ چنانچہ بائبل پر اس نے دو تنقیدی کتابیں لکھیں۔

نیوٹن انگلینڈ کا رہنے والا تھا۔ اس زمانہ میں پورے یورپ میں مسیحی چرچ کا اتنا غلبہ تھا کہ نیوٹن اپنی ان تحریروں کو شائع کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس کی یہ تحریریں اس کے گھر میں ایک صندوق میں پڑی رہیں۔ نیوٹن کے مرنے کے دو سو برس بعد پہلی بار ان کو شائع کیا گیا۔ نیوٹن کا انتقال لندن میں ۱۷۲۷ میں ہوا۔ اور اس کی مسیحیت مخالف تحریروں کو مرتب کرکے شائع کرنے کا کام پہلی بار ۱۹۳۴ میں ہو سکا۔

یہ زمانی فرق کی بات ہے۔ پچھلے زمانہ میں مذہب کے خلاف لکھنا یا بولنا بالکل ممنوع تھا۔ اس کو کفر سمجھا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں آزادیٔ فکر کو انسان کا ایک مسلّم حق سمجھا جاتا ہے۔ اسی آزادی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج کوئی شخص شام کو ایک مخالفانہ تحریر لکھے تو صبح کو وہ چھپ کر لوگوں کے سامنے آجائے گی۔ جب کہ پہلے نیوٹن جیسا آدمی بھی اس قسم کی تحریروں کو چھاپنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

۲۳ جون ۱۹۹۰

شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۶۲ - ۱۷۰۳) نے اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "مصطفوی شریعت کے لئے وقت آگیا ہے کہ برہان اور دلیل کے پیراہنوں میں ملبوس کرکے اسے میدان میں لایا جائے۔ شاہ ولی اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ حقیقۃً اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔

قدیم زمانہ روایتی زمانہ تھا۔ قدیم زمانہ میں روایتی استدلال کافی ہوتا تھا، مگر آج کا انسان روایتی استدلال کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ وہ عقلی اور سائنسی اسلوب میں بات کو سمجھنا چاہتا ہے۔

مثال کے طور پر ہندستان کے مسلم علما سب کے سب یکساں سول کوڈ کے مخالف ہیں۔ مگر اس کی مخالفت کے لئے ان کے پاس کہنے کی جو بات ہے وہ صرف یہ کہ یہ ہماری شریعت میں مداخلت ہے اور ہم شرعی مداخلت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کے جواب میں جدید طبقہ کہتا ہے کہ یہ کوئی دلیل نہیں۔ اگر آپ یکساں سول کوڈ کے خلاف ہیں تو آپ کو عقلی اور سائنسی دلیل سے اسے رد کرنا ہوگا۔ ورنہ آپ کی بات نہیں مانی جائے گی۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ ہم اپنے نقطۂ نظر کو مخاطب کے مسلّمہ دلائل سے ثابت کریں۔ (دیکھیں : الرسالہ ستمبر ۱۹۹۵)

۲۴ جون ۱۹۹۰

پنجاب اور کشمیر دونوں ریاستوں میں آجکل آزادی کی تحریک چل رہی ہے۔ دونوں جگہ سے روزانہ مار دھاڑ اور خون خرابہ کی خبریں آرہی ہیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ پنجاب اور کشمیر کے مسئلہ کے بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے۔

میں نے کہا کہ میری ایک ہی رائے دونوں جگہ کے بارہ میں ہے۔ تحریک چلانے والوں کو چاہئے کہ وہ یہ نہ دیکھیں کہ ان کے اپنے خیالات کے مطابق صحیح کیا ہے۔ بلکہ وہ یہ دیکھیں کہ موجودہ حالات میں ان کے لئے ممکن کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ سیاست نہیں کہ ناممکن پر سر ٹکرایا جائے۔ سیاست یہ ہے کہ ممکن کو قبول کر کے پر امن طور پر اپنی زندگی کی تعمیر کی جائے، جیسا کہ موجودہ زمانہ میں جاپان نے کیا ہے۔

۲۵ جون ۱۹۹۰

ایک سفر کے دوران ۲۰ مارچ ۱۹۹۰ کو میں طرابلس میں تھا۔ فندق المهاري میں اچانک ایک صاحب سامنے آگئے۔ انھوں نے السلام علیکم کہا۔ میں نے جواب دیا۔ مگر میں ان کو پہچان نہ سکا۔ انھوں نے کہا: "آدم مکدا" تب میری سمجھ میں آیا کہ یہ وہی صاحب ہیں جو ندوہ (لکھنؤ) کے زمانہ قیام (۶۷-۱۹۶۴) میں وہاں تھے اور ان سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ انھوں نے اپنا کارڈ دیا جس میں حسب ذیل پتہ لکھا ہوا تھا:

Adam Moosa Makda, P.O. Box 790
'Medina', 4, Hill Road, Beverley Hills,
Kwe Kwe (Que Que) Zimbabwe, Africa
Tel. Office: 3991, Res. 3894

آدم مکدا ایڈز قسم کے افریقی تھے۔ ندوہ میں قیام کرتے ہوئے انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی کے عربی کورس میں داخلہ لے لیا تاکہ وہاں سے "عالم" کا سرٹیفکٹ لے سکیں۔ ندوہ کے ذمہ دار اس قسم کے داخلہ کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ تاہم آدم مکدا جیسے افریقی طالب علم کے خلاف وہ کوئی کارروائی نہیں کرسکتے تھے۔ چنانچہ یہ کہہ دیا گیا کہ آدم مکدا کو ظفر الاسلام نے بہکا کر یونیورسٹی میں داخل کیا ہے۔ میں نے سنا تو میں نے کہا : اگر یہ صحیح ہو کہ ظفر الاسلام نے واقعۃً ایسا کیا ہے تو یہ میرے لئے ایک دریافت ہوگی کہ میں ایسے لڑکے کا باپ ہوں جو آدم مکدا کو بہکا سکتا ہے۔ خود آدم مکدا کا ردعمل یہ تھا کہ انھوں نے جب یہ بات سنی تو کہا کہ Rediculous (مضحکہ خیز)

۲۶ جون ۱۹۹۰

پاکستان کے اخبار نوائے وقت (۱۶ جون ۱۹۹۰) کے ایک ایڈیٹوریل نوٹ کا عنوان ہے : "تربیت یافتہ تخریب کار" اس کے تحت درج ہے کہ "وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے کہا ہے کہ انٹلی جنس کی اطلاعات کے مطابق، بھارت نے ۱۵۰ دہشت گرد پاکستان پہنچائے ہیں جنھیں افغانستان میں تربیت دی گئی ہے اور ان کا کام پاکستان میں تباہی پھیلانا ہے"۔

اگر یہ خبر صحیح ہو تو یہ عین وہی ہے جو ہونا چاہئے۔ پاکستان کے حکمرانوں نے اپنے زیر قبضہ کشمیر میں تخریب کاری کی تربیت کے کیمپ قائم کئے اور ہزاروں کشمیریوں کو تشدد کی تربیت دیکر ہندستانی کشمیر میں داخل کر دیا۔ یہ لوگ کشمیر میں ہندستانی حکومت کے خلاف دہشت گردی کی مہم چلائے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد یہ ناممکن ہے کہ ہندستان خاموش رہے۔ پاکستان کو کشمیر میں تخریب کاری کا منصوبہ بناتے ہوئے لازمی طور پر یہ سوچنا چاہئے تھا کہ اسی قسم کی جوابی تخریب ہندستان کی طرف سے پاکستان (سندھ) میں کی جائے گی۔ اگر پاکستان کے حکمراں اس سے بے خبر تھے تو ان کا مقام ایوان حکومت نہیں بلکہ عجائب خانہ ہے۔

کیسے عجیب ہوں گے وہ لوگ جو اس سادہ حقیقت کو نہ جانیں۔

۲۷ جون ۱۹۹۰

مسٹر محمد علی جناح نے تقسیم سے پہلے مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف ابھارا تو بیشمار مسلمان ان کے گرد جمع ہو گئے۔ ان کو قائد اعظم کا خطاب دیا گیا۔ مگر انھیں "قائد اعظم" نے تقسیم کے بعد بار بار مسلمانوں سے کہا کہ اب وہ سب کچھ کو بھلا کر پاکستان کی تعمیر میں لگ جائیں۔ مگر شاید پاکستان میں کوئی ایک بھی مسلمان نہ تھا جس نے ان کی اس آواز پر توجہ دی ہو۔

مثال کے طور پر نوائے وقت (۱۶ جون ۱۹۹۰) نے مسٹر محمد علی جناح کا یہ بیان ان الفاظ میں نقل کیا ہے: "میں پاکستان کے ہر مسلمان مرد اور عورت سے کہتا ہوں کہ وہ اپنے موجودہ غم واندوہ کے سیلاب میں نہ بہہ جائیں۔ انھوں نے اپنی قومی سلطنت قائم کرنے کے لئے بہت دکھ اٹھائے ہیں اور قربانیاں دی ہیں۔ اب یہ انھیں کا کام ہے کہ وہ پاکستان کی تعمیر کریں۔" (بیان، ۲۴ اگست ۱۹۴۷)

مسٹر جناح کی مقبولیت کا راز صرف یہ تھا کہ انھوں نے اینٹی ہندو لہجہ میں بات کیا۔ جو مسلمان بھی اینٹی ہندو لہجہ میں بات کرتا ہے، مسلمان اس کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں۔ ایسے بلانے والے بھی مجرم ہیں اور ایسے دوڑنے والے بھی مجرم۔ صحیح پکار وہ ہے جس میں دوسروں کی خیر خواہی اور اپنا احتساب ہو۔ مگر ایسا پکارنے والا آج کوئی بھی نہیں۔

۲۸ جون ۱۹۹۰

ایک صاحب نے کہا کہ آپ مسلمان لیڈروں پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے۔ مثلاً بابری مسجد کا حل کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ ہندو شاعرہ میرابائی کے ایک بھجن کا شعر ہے جو مفہوم کے اعتبار سے کچھ اس طرح ہے:

پتھر کی تو ناؤ بناوے اور کہے کرشن تو بیڑا پار لگا

مسلمانوں نے اپنے جھوٹے لیڈروں کی پیروی میں بابری مسجد کے مسئلہ کو آخری حد تک بگاڑ ڈالا ہے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ اس کا حل بتائیے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کسی نے اپنی ناؤ پتھر کی بنا رکھی ہو تو کوئی ملاح اس کو کیسے پار لگا سکتا ہے۔ یہی حال موجودہ زمانہ میں تمام مسلم مسائل کا ہے۔ مسلمان مسئلہ کے حل کے نام پر صرف مسئلہ کو پیچیدہ بنا رہے ہیں، ایسی حالت میں کوئی کرنے والا کیا کر سکتا ہے۔ اس دنیا میں مسائل دانش مندی سے طے ہوتے ہیں نہ کہ جذباتی ہنگاموں سے۔

۲۹جون ۱۹۹۰

بھاگلپور کے ایک ہندو تاجر سے ملاقات ہوئی۔ عبدالغفور صاحب (سابق چیف منسٹر بہار) نے ان کو مجھ سے ملنے کے لئے بھیجا تھا۔ گفتگو کے دوران تجارت اور تاجر کا ذکر آیا۔ انھوں نے کہا: بزنس مین کا بھگوان کون، اس کا گراہک۔

یہ ہندو ذہن کی صحیح تعبیر ہے۔ ہندو کا اصل مذہب پیسہ ہے۔ پیسہ گاہک سے ملتا ہے، اس لئے وہ گاہک کا پجاری ہے۔ ہندوؤں کا یہی عقیدہ ہے جس نے ان کے اندر تجارتی اخلاقیات پیدا کیا ہے۔ یعنی شیریں کلامی اور صبر و اعراض۔

یہی اخلاق مسلمانوں سے بھی مطلوب ہے۔ فرق یہ ہے کہ ہندوؤں میں یہ کردار ان کے مشرکانہ عقیدہ کے ذریعہ آیا ہے، اور مسلمانوں کے اندر یہ کردار توحید اور آخرت کے عقیدہ کے تحت پیدا ہوگا۔ اس اخلاق کے بغیر موجودہ دنیا میں کامیابی ممکن نہیں۔

۳۰جون ۱۹۹۰

مولانا محمد اقبال (مالیر کوٹلہ) نے بتایا کہ ۴۷ ۱۹ کے بعد اگرچہ پنجاب کا علاقہ مسلمانوں سے خالی ہو گیا تھا، مگر اب دوبارہ کثرت سے مسلمان آکر وہاں آباد ہو رہے ہیں۔ مثلاً لدھیانہ میں ایک لاکھ مسلمان دوبارہ آگئے ہیں۔ چنڈی گڑھ میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان دوبارہ آکر رہ رہے ہیں۔ اسی طرح امرتسر اور پنجاب کے دوسرے شہروں میں مسلمان دوبارہ آکر آباد ہو رہے ہیں۔ سردار لوگ ان کی دوبارہ آبادکاری اور مسجدوں کی بازیابی میں پورا تعاون دے رہے ہیں۔

سابق وزیر داخلہ سردار پٹیل (۱۹۵۰ - ۱۸۷۵) کا نظریہ یہ تھا کہ پنجاب کو مسلمانوں سے خالی کرانا ضروری ہے، ورنہ ہماری پاکستان سے ملنے والی سرحد کا دفاعی نظام مضبوط نہیں ہو سکتا۔ سردار پٹیل نے سکھوں کو اپنا سمجھا اور مسلمانوں کو غیر۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ انسان کتنا کم جانتا ہے۔ آج پنجاب کے سردار نئی دہلی کی حکومت کے سب سے بڑے دشمن ہو رہے ہیں۔ اور جن مسلمانوں کو پنجاب سے نکالا گیا تھا، وہ دوبارہ اسی پنجاب میں عزت کے ساتھ بسائے جا رہے ہیں۔

یکم جولائی ۱۹۹۰

عزیز الرحمٰن صاحب ملاقات کے لئے آئے۔ وہ حافظ محمد ابراہیم صاحب (۱۹۶۸ - ۱۸۸۹)

کے صاحبزادے ہیں۔ یو پی میں تین بار وزیر رہ چکے ہیں۔ ان کا وطن نگینہ ہے۔

انھوں نے اپنے والد کے حوالے سے بتایا کہ تقسیم کے بعد جب پہلی بار جواہر لال نہرو (سابق وزیر اعظم ہند) کراچی (سابق دار السلطنت پاکستان) گئے تو حافظ محمد ابراہیم صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہاں ان کی ملاقات چودھری خلیق الزماں سے ہوئی جو ۱۹۴۷ سے پہلے مسلم لیگ کے لیڈر تھے اور تقسیم کے بعد لکھنؤ چھوڑ کر پاکستان چلے گئے تھے۔ گفتگو کے دوران چودھری خلیق الزماں نے نہرو سے کہا: پاکستان تو حافظ ابراہیم نے بنوایا ہے۔

میں نے کہا کہ پاکستان کو مسلمانوں کی حماقت نے بنوایا ہے۔ ۱۹۳۷ میں یوپی میں کانگرسی وزارت بنی تو کانگرس نے کانگرسی مسلمان (حافظ ابراہیم) کو کیبنٹ میں لے لیا۔ جبکہ مسلم لیگ یہ چاہتی تھی کہ مسلم لیگی مسلمان (نواب زادہ لیاقت علی) کو کیبنٹ میں لیا جائے۔ اس پر مسلم لیگ کے لیڈر اتنا برہم ہوئے کہ ملک کے بٹوارہ کا جھنڈا لے کر کھڑے ہو گئے۔

یہ سراسر ایک احمقانہ فعل تھا۔ قوموں کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ اس طرح کے شخصی واقعات پر نہیں ہوتا، بلکہ وسیع تر حقائق کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ جو لوگ اس بنیادی حقیقت کو نہیں جانتے، وہ آخر سیاست کے میدان میں کیوں کودتے ہیں۔

۲ جولائی ۱۹۹۰

ایک صاحب نے حالات کی ناموافقت کی شکایت کی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے خلاف یہ کیا جارہا ہے، ہمارے خلاف وہ کیا جا رہا ہے۔ ایسے سخت حالات میں بھلا کس طرح کوئی کام کیا جاسکتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں آپ سے صرف ایک بات کہتا ہوں۔ اس کو اپنی ڈائری میں لکھ لیجئے۔ آج سے پچاس برس بعد بھی اگر آپ نے اپنی ڈائری کا یہ صفحہ کھولا تو وہ آپ کو پتھر کی لکیر کی طرح صداقت نظر آئے گی۔ وہ بات یہ ہے:

اس دنیا میں وہی لوگ کوئی بڑا کام کرتے ہیں جو کام نہ کرنے والے حالات میں کام کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ جو لوگ کام کرنے کے لئے موافق حالات کا انتظار کریں، وہ کبھی کوئی بڑا کام نہیں کرسکتے۔

۳ جولائی ۱۹۹۰

کلکتہ کے تین مسلمان ملاقات کے لئے آئے۔ تینوں نوجوان طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے

طارق زکی صدیقی سے پوچھا کہ آپ ڈاکٹر مقبول احمد (ایف آر سی ایس) کو جانتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ خوب اچھی طرح۔ میں نے کہا کہ کلکتہ کے مسلمان ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بہت بری رائے۔ تفصیل پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ ایک اچھے سرجن ہیں۔ مگر ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ آپریشن کو بیچ میں روک کر کہتے کہ پہلے پیسہ لاؤ۔ اب آدمی مجبور ہو کر ان کے مطالبہ کو پورا کرتا ہے۔ مزید پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ خود میرے چچا کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ میرے چچا کا اپنڈکس کا کیس تھا۔ ان کو وہ اپنے آپریشن تھیٹر میں لے گئے اور نشتر سے پیٹ کو چیر دیا اور اس کے بعد کہا کہ پہلے دس ہزار روپیہ لاؤ پھر آپریشن مکمل کریں گے۔ اس وقت بارش ہو رہی تھی۔ میرے والد بھاگ کر گئے اور بڑی مشکلوں سے پیسہ جمع کر کے لائے۔ تب انھوں نے آپریشن کیا۔

مجھے یہ بات کامن سنس کے خلاف معلوم ہوئی۔ اس لئے کہ جب پیٹ پر نشتر چلا دیا جائے تو اس کے بعد تحفظاتی تدبیروں کے باوجود آدمی کا خون نکلتا رہتا ہے۔ اس کے بعد ضروری ہوتا ہے کہ بلا تاخیر جلد سے جلد آپریشن کو مکمل کیا جائے ورنہ آدمی خون کے اخراج کی وجہ سے مر جائے گا اور خود ڈاکٹر کے خلاف قتل کا کیس بن جائے گا۔

میں نے بقیہ دو صاحبان سے مزید پوچھ گچھ کی۔ آخر کار معلوم ہوا کہ اصل بات یہ ہے کہ ڈاکٹر مقبول احمد آپریشن سے پہلے پیشگی طور پر رقم جمع کراتے ہیں (ایسا غالباً بعض تلخ تجربات کی بنا پر ہوا ہے)۔ پیشگی طور پر آپریشن کی فیس وصول کرنے کے بعد آپریشن کرتے ہیں ورنہ معذوری ظاہر کر دیتے ہیں۔ اسی بات کو مذکورہ غلط صورت میں مشہور کر دیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ خبر کی تحقیق نہایت ضروری ہے۔ تحقیق کے بغیر آدمی کو کبھی صحیح صورت حال معلوم نہیں ہو سکتی۔

۴ جولائی ۱۹۹۰

مسٹر وی وی گری (۱۸۹۴-۱۹۸۰) مدراس کے رہنے والے تھے۔ وہ ۱۹۶۹ سے ۱۹۷۴ تک انڈیا کے پریسیڈنٹ رہے۔ اطہر صدیقی صاحب نے ان کا ایک واقعہ بتایا۔

راشٹر پتی بھون (نئی دہلی) کے اندر ایک مسجد ہے جو برٹش دور سے چلی آ رہی ہے۔ جمعہ کے دن اس میں باہر کے لوگ بھی نماز پڑھتے ہیں۔ ایک بار جب کہ مسٹر وی وی گری دہرہ دون گئے

ہوئے تھے، ان کے سیکورٹی اسٹاف کے ایک ہندو افسر نے مسجد کو بند کروا دیا۔ اس سے وہاں کے مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہوگئی۔

اگلے دن مسٹر گری واپس آئے تو راشٹرپتی بھون کے ایک مسلمان ملازم (عبدالحمید صاحب) ان سے ملے اور کہا کہ آپ کی غیر موجودگی میں راشٹرپتی بھون کی مسجد کو بند کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں کو بہت دکھ ہے۔

یہ رات کا وقت تھا اور مسٹر گری ابھی ابھی سفر سے واپس آئے تھے۔ انھوں نے اس کے بعد فوراً سکورٹی اسٹاف کے مذکورہ ہندو افسر کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ تم نے مسجد کیوں بند کرادی۔ اس نے کہا کہ حفاظتی نقطۂ نظر سے ایسا کرنا ضروری تھا۔ مسٹر گری اس جواب پر غصہ ہوگئے۔ انھوں نے کہا: مجھے اس سے بالکل اتفاق نہیں۔ تم ابھی جاکر مسجد کو کھول دو۔ اور کل سے تم راشٹرپتی بھون میں نہیں ہوگے۔ اس کے بعد انھوں نے تعزیری تبادلہ (Punitive transfer) کے طور پر اگلے ہی دن اس کو لداخ بھیج دیا۔

یہ واقعہ علامتی طور پر بتا رہا ہے کہ ہندوؤں میں اگر کچھ افراد تعصب اور تنگ نظری کا شکار ہیں تو اسی کے ساتھ انھیں ہندوؤں میں ایسے افراد بھی ہیں جو بے تعصب اور انصاف پسند ہیں۔ مزید یہ کہ ثانی الذکر افراد اس پوزیشن میں ہیں کہ وہ اول الذکر افراد کی کارروائیوں کو کالعدم کر سکیں۔ جیسا کہ مذکورہ واقعہ میں ہوا۔

۵ جولائی ۱۹۹۰

استانبول (ترکی) سے ہمارے یہاں ایک انگریزی پرچہ آتا ہے۔ اس کا نام "نیوز لیٹر" ہے۔ اس کے شمارہ دسمبر ۱۹۸۹ میں ایک صفحہ پر جلی حرفوں میں یہ شعر لکھا ہوا ہے:

کل علم لیس فی القرطاس ضاع کل سر جاوز الاثنین شاع

ہر علم جو کاغذ میں نہ ہو وہ ضائع ہو گیا۔ ہر راز جو دو تک پہنچ جائے وہ عام ہو گیا۔

۶ جولائی ۱۹۹۰

۴ جولائی کو عید الاضحی کی نماز میں نے تبلیغی جماعت کی مسجد میں پڑھی۔ وہاں انسانوں کا ہجوم تھا۔ وہاں کے ماحول کو دیکھ کر ایک بات ذہن میں آئی۔

دین کے دو پہلو ہیں۔ ایک معنی کے اعتبار سے، اور دوسرا شکل کے اعتبار سے۔ دین کے ان دونوں پہلوؤں کا تسلسل امت میں جاری رہے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔ میرا احساس یہ ہے کہ تبلیغی تحریک، موجودہ زمانہ میں، دین کے شکلی پہلو کا تسلسل ہے، اور الرسالہ کا مشن دین کے معنوی پہلو کا تسلسل۔ تبلیغ کے لوگ اس تقسیم کو ہرگز نہیں مانیں گے۔ مگر میرے نزدیک حقیقت واقعہ یہی ہے۔

۷ جولائی ۱۹۹۰

مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی (۱۹۵۲ - ۱۸۷۵) کے زمانہ میں ایک بار جامعۃ الازہر (قاہرہ) کے امیر الشیخ مصطفیٰ المراغی ہندستان آئے۔ ان کی ملاقات مفتی کفایت اللہ صاحب سے ہوئی۔ ان کو دیکھ کر شیخ مراغی نے کہا: ینبلج العلم والوقار من جبینہ (ان کی پیشانی سے علم اور وقار چمک رہا ہے)

سید جمال الدین افغانی کی ملاقات پہلی بار امیر شکیب ارسلان (۱۹۴۶ - ۱۸۶۹) سے ہوئی تو وہ ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے کہا: انا اھنئ ارض الاسلام التی انبتتک (میں اسلام کی اس سرزمین کو مبارک باد دیتا ہوں جس نے تم کو جنم دیا)۔

مولانا اقبال احمد سہیل (۱۹۵۵ - ۱۸۸۷) جس زمانہ میں علی گڑھ میں ایم اے کے طالب علم تھے، خواجہ کمال الدین وہاں آئے۔ ایک موقع پر انھوں نے یونین ہال میں مولانا سہیل کی تقریر سنی۔ اس سے اتنا خوش ہوئے کہ انھوں نے کہا: اگر تمہارے جیسا آدمی مجھے کام کرنے کے لئے مل جائے۔ تو میں یورپ کی سب سے بلند چوٹی پر اسلام کا جھنڈا لہرادوں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں کیسے کیسے اعلیٰ صلاحیت کے لوگ مسلمانوں کے اندر پیدا ہوئے۔ مگر یہ تمام اعلیٰ صلاحیتیں سیاست میں ضائع ہوگئیں۔ ان میں سے کوئی شخص بھی دعوت کے اصل کام میں استعمال نہ ہوسکا۔

۸ جولائی ۱۹۹۰

حیدرآباد سے دو صاحبان تشریف لائے۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد (آئی اے ایس) اور ایم کے عارف الدین (ایڈوکیٹ) ان لوگوں سے حیدرآباد کی بلڈنگ کے سلسلہ میں پہلے سے بات ہورہی

تھی۔ آج کی گفت گو میں فائنل کیا گیا۔ عارف الدین صاحب نہایت تیز آدمی ہیں۔ اس کے ساتھ وہ ہر قسم کے وسائل بھی رکھتے ہیں۔ انھوں نے پوری ذمہ داری لی کہ حیدرآباد کی بلڈنگ کو ہاشم القاسمی صاحب کے قبضہ سے نکالیں گے۔ مجھے قوی امید ہے کہ وہ ایک سال کے اندر اپنے مشن میں کامیاب ہوجائیں گے۔

حیدرآباد کی عمارت کا مسئلہ آخری حد تک سنگین ہوچکا تھا۔ ہاشم القاسمی نے اپنی بد دیانتی کو چھپانے کے لئے ہر قسم کی تدبیریں اختیار کیں۔ مولانا علی میاں، صلاح الدین اویسی، منت اللہ رحمانی، سید شہاب الدین اور دوسرے اکثر "اکابر ملت" براہ راست یا بالواسطہ طور پر ان کے مددگار بن گئے۔ بظاہر ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہم اس عمارت کو ہاشم القاسمی صاحب کے ناجائز قبضہ سے نکالنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے عارف الدین صاحب کو کھڑا کر دیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں قرآن کے وہ الفاظ صادق آنے والے ہیں کہ ان کی سازشیں ہرگز کامیاب ہونے والی نہیں وان کان مکرھم لتزول منہ الجبال۔

۹ جولائی ۱۹۹۰

جون ۱۹۸۷ میں افریقہ کے ایک سفر میں تھا۔ اس دوران ٹرانزٹ پسنجر کے طور پر میں ۲۴ گھنٹے کے لئے کراچی میں ٹھہرا تھا۔ یہاں کچھ مسلمانوں سے ملاقات ہوئی جو سندھ کے ہندوؤں میں خاموشی کے ساتھ تبلیغی کام کر رہے ہیں۔ یہ غیر معروف قسم کے عام مسلمان تھے۔ یہ ضروری کام پاکستان کے کسی مشہور عالم نے تو نہیں کیا۔ البتہ کچھ گمنام مسلمان اس کو انجام دے رہے ہیں۔

کراچی کے مسعود احمد انصاری (فون: ۶۵۶۱۹۴) کے خط سے معلوم ہوا کہ اب تک کی کوششوں سے کل ۲۳۶۷ ہندو اسلام قبول کر چکے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ بھاولپور میں ان کے ادارہ کی چھ ایکڑ زمین ہے۔ یہاں وہ ایک مرکز بنانا چاہتے ہیں جس میں نومسلموں کی تعلیم و تربیت کے لئے مدرسہ، مسجد، ہوسٹل، سپتال، رہائش گاہ وغیرہ ہوگی۔ فی الحال مسجد کی تعمیر سے انھوں نے اس کی ابتدا کر دی ہے۔

یہ بلاشبہ ایک صحیح اسلامی کام ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مدد فرمائے۔

۱۰ جولائی ۱۹۹۰

سید لیاقت علی (پیدائش ۱۹۵۶)، ناگپور کے رہنے والے ہیں۔ وہاں ان کا آفسٹ پرنٹنگ پریس

ہے۔ وہ ملاقات کے لئے آئے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ آپ کا تعلق ناگپور سے ہے اور ناگپور آر ایس ایس کا گڑھ ہے۔ آپ ذاتی واقفیت کے مطابق آر ایس ایس کے بارہ میں کچھ بتائیے۔

انھوں نے کہا کہ جس علاقہ میں میں رہتا ہوں، وہاں بہت سے آر ایس ایس کے لوگ آباد ہیں اور میں ۲۰ برس سے ان کو جانتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے تو انھیں نہایت اچھا انسان پایا۔ میرے کہنے پر انھوں نے دوسری ڈائری میں یہ سطریں لکھیں:

"میں خود یہ بات کہتا ہوں کہ ناگپور میں جن آر ایس ایس والوں سے میرا تعلق اور میرے خاندان کا تعلق تقریباً ۲۰ برسوں سے ہے، ان سے زیادہ شریف لوگ ہم نے نہیں پایا۔"

انھوں نے ان کی شرافت اور اصول پسندی کے بہت سے واقعات سنائے۔ میں نے کہا کہ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ آر ایس ایس دراصل ایک پرو ہندو (ہندو نواز) تنظیم ہے۔ اس کو مسلمانوں نے اینٹی مسلم (مسلم دشمن) تنظیم فرض کر لیا۔ اسی غلط فہمی سے تمام خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔ لیاقت علی صاحب نے اتفاق کیا۔

۱۱ جولائی ۱۹۹۰

اقبال کا ایک شعر ہے۔ اس میں وہ خدا سے کہتے ہیں کہ اگر تو حشر کے دن میرا حساب لینا ضروری سمجھتا ہے تو محمد مصطفیٰ کی نگاہوں سے چھپا کر میرا حساب لینا۔

گر تو می بینی حسابم ناگزیر　　از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر

اقبال کے ایک معتقد نے اس شعر کو پڑھ کر کہا کہ یہ شعر اقبال کے عشق رسول کو بتاتا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ عشق رسول کو بتاتا ہوگا مگر وہ خوف خدا کو نہیں بتاتا۔ اور عشق رسول بہر حال خوف خدا کے تابع ہے۔

۱۲ جولائی ۱۹۹۰

جنوری ۱۹۸۳ میں میں ایک کانفرنس کی دعوت پر مالدیپ گیا تھا۔ وہاں میری ملاقات اقبال کے صاحبزادے جاوید اقبال سے ہوئی۔ جاوید اقبال سے میں نے کہا کہ اقبال موجودہ مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ ہیں۔ ان کے اشعار نے مسلمانوں کے اندر نہایت غلط ذہن پیدا کیا جس کی قیمت وہ ہر محاذ پر ادا کر رہے ہیں۔ مثلاً اقبال کا ایک شعر ہے:

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ   ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو ہر مقام پر غیر اقوام کے مقابلہ میں شکست ہوئی ہے۔ مثلاً ۱۸۳۱ میں سید احمد بریلوی کی شکست سکھوں کے مقابلہ میں۔ ۱۸۵۷ میں علماء ہند کی شکست انگریزوں کے مقابلہ میں۔ ۱۹۴۸ میں حسن البناء اور ان کے ساتھیوں کی شکست یہودیوں کے مقابلہ میں۔ پھر کیا یہ سارے لوگ ایمان سے خالی تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان شکستوں کا سبب ناکافی تیاری تھی نہ کہ ناکافی ایمان۔ اقبال کی پوری شاعری اسی قسم کی غیر حقیقی باتوں سے بھری ہوئی ہے اور مسلمانوں کے ذہن کو غیر حقیقت پسند بنانے میں اس کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔

۱۳ جولائی ۱۹۹۰

پاکستان کی تحریک کے زمانہ میں اس کے حامی یہ کہا کرتے تھے کہ: پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ۔ پاکستان بننے کے بعد سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اعلان کیا کہ پاکستان اسلام کے نام الاٹ ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے میثاق (جولائی ۱۹۹۰) میں لکھا ہے کہ یہ دنیا کا واحد ملک ہے جس کی ولدیت اسلام ہے۔ حضرت سلمان فارسی اپنا نام بتاتے ہوئے کہا کرتے تھے "سلمان ابن اسلام" اسی طرح یہ ملک پاکستان ابن اسلام ہے۔ (صفحہ ۳۵)

یہ سب لفظی شعبدہ بازی ہے نہ کہ کوئی حقیقی بات۔ اور افسوس یہ ہے کہ مسلمان ایک سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے اسی قسم کی لفظی شعبدہ بازیوں کے فریب میں پڑے ہوئے ہیں۔

۱۴ جولائی ۱۹۹۰

شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۶۲ - ۱۷۰۳) نے اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "مصطفوی شریعت کے لئے وقت آگیا ہے کہ برہان اور دلیل کے پیراہنوں میں ملبوس کرکے اس کو میدان میں لایا جائے":

ان سطروں کے لکھے ہوئے ڈھائی سو سال گزر گئے مگر ابھی تک صحیح معنوں میں مذکورہ قسم کی مدلل کتاب اسلام پر نہ لکھی جا سکی۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب (حجۃ اللہ البالغہ) روایتی انداز کی کتاب ہے۔ شیخ حسین جسر کی کتاب (قصۃ الایمان بین العلم والفلسفۃ والقرآن) فرضی مکالمہ کے روپ میں ہے جو

ایک غیر علمی طریقہ ہے۔ شبلی نعمانی کی کتاب (الکلام) قدیم کلامیات کا اردو زبان میں اعادہ ہے۔ سید قطب، اقبال، ابو الاعلیٰ مودودی، ابو الحسن علی ندوی وغیرہ کی کتابوں میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں جس کو جدید استدلالی معیار پر رکھا جاسکے۔

غیر مسلموں نے البتہ اس موضوع پر قابل قدر کام کیا ہے۔ مثلاً فرانس کے ڈاکٹر موریس بکائی۔

۱۵ جولائی ۱۹۹۰

مسٹر محمد علی جناح نے جس پاکستان کا نقشہ پیش کیا تھا اس کا نصف حصہ مشرق میں تھا اور نصف حصہ مغرب میں تھا۔ اور دونوں کے درمیان اسی " دشمن ملک " کا ایک ہزار میل کا رقبہ حائل تھا۔ جس سے الگ ہونے کے لئے مسٹر جناح اپنا پاکستان بنا رہے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ تحریک کے زمانہ میں ایک انگریز نے مسٹر جناح سے سوال کیا کہ آپ پاکستان کی صورت میں ایک علیحدہ ملک بنانا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ جغرافیہ کا قانون واضح طور پر آپ کے خلاف ہے۔ اس کے جواب میں مسٹر جناح نے اپنی ایک تقریر میں کہا:

'Some people are talking about some Geographical difficulties in the way of Pakistan. May I ask them by what rule of Geography are they here."

کچھ لوگ کہہ رہے ہے کہ پاکستان کی راہ میں کچھ جغرافی مشکلیں ہیں۔ کیا میں ان سے پوچھ سکتا ہوں کہ جغرافیہ کے کس قانون کے تحت وہ یہاں ہیں۔

انگریز انگلینڈ اور انڈیا کو ایک ملک نہیں کہتے تھے۔ ان کی حیثیت حاکم کی تھی جو اپنی برتر طاقت کے ذریعہ انڈیا پر حکومت کر رہی تھی۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش)، مسٹر جناح کے بیان کے مطابق، دونوں ملک ایک تھے۔ ان دونوں بعید الوقوع خطوں کو ایک ایسے واحد ملک کی حیثیت دی جارہی تھی جہاں صرف ایک قوم بستی تھی۔

مسٹر جناح کا یہ جواب ظاہری حسن کے باوجود بالکل لغو تھا۔ مگر آجکل کے زمانہ میں وہی شخص لیڈر بنتا ہے جو ایسے الفاظ بول سکے جو بظاہر خوبصورت مگر حقیقۃً بالکل بے معنی ہوں۔

۱۶ جولائی ۱۹۹۰

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک تقریر ماہنامہ میثاق (جولائی ۱۹۹۰) میں چھپی ہے۔ اس

تقریر میں وہ کہتے ہیں کہ:

"قیام پاکستان کے ۳۳ برس بعد ۱۹۸۰ میں پہلی مرتبہ بھارت گیا ہوں تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ علی گڑھ کے مسلمانوں کی باتوں سے کس طرح میرا کلیجہ شق ہوا ہے۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ ۱۹۷۱ء تک ہمارا یہ خیال تھا کہ پاکستان ہمارا محافظ ہے، لیکن اب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان اپنی حفاظت ہی کر لے تو بڑی بات ہے۔ ہمیں اپنی حفاظت خود کرنی ہے۔ اب ہم بھیڑ بکریوں کی طرح نہیں مریں گے، بلکہ مار کر مریں گے۔"

مجھے نہیں معلوم کہ علی گڑھ کے کن مسلمانوں نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے مذکورہ بات کہی۔ تاہم ان کی پہلی بات بھی بے معنی تھی اور دوسری بات بھی بے معنی۔ ہندستان کے مسلمانوں کی حفاظت نہ پاکستان کر سکتا ہے اور نہ ان کا "مار کر مرنے" کا مزاج۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ کا حل صرف ایک ہے، اور وہ حقیقت پسندی ہے۔ مسلمانوں کی جذباتیت ان کا مسئلہ ہے اور حقیقت پسندی ہی وہ چیز ہے جو ان تمام مسائل کو حل کر سکتی ہے۔

۱۷ جولائی ۱۹۹۰

کچھ ہندستانی اخبار نویس ہندستان کی شمالی سرحد پر لے جائے گئے۔ وہاں ان کی ملاقات چار کشمیری دہشت گردوں سے کرائی گئی، جن میں سے ایک سلیم زرگر (پروفیسر مشیر الحق کا قاتل) بھی تھا۔ اس کی رپورٹ دہلی کے ۷ جولائی ۱۹۹۰ کے اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔

رپورٹ کے مطابق، چار میں سے تین دہشت گردوں نے اپنی تحریک کے بارے میں مایوسی کا اظہار کیا۔ سلیم زرگر نے اخبار نویسوں کے ایک جواب میں کہا "ہم کو پاکستان نے دھوکہ دیا۔ انھوں نے کہا تھا کہ تحریک تم شروع کرو، جنگ ہم کریں گے۔ لیکن نہ جنگ ہوئی اور نہ ہم کامیاب ہوئے۔"

یہ بات بظاہر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ پاکستان کے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے میثاق (جولائی ۱۹۹۰) میں پر جوش طور پر کہا ہے کہ پاکستانی قوم کشمیر کے معاملہ میں "انتہائی بزدل" ہو گئی ہے۔ آج کشمیر کے معاملہ میں ہمارا اجماع ہے کہ "دیکھنا، کوئی ایسی حرکت نہ کرنا کہ بھارت کو جنگ چھیڑنے کا موقع مل جائے"۔ یہ ہے ہمارے خوف کا عالم اور ہمارے لرزہ براندام ہونے کی کیفیت۔" مجاہد اول" سے لے کر "مجاہد آخر" تک سب جنگ سے خائف ہیں۔ مجاہد اول کی ساری مجاہدانہ

تقریریں ہباً منثورا ہوگئی ہیں۔ اوراب وہ ایک ہی بات کہہ رہے ہیں کہ احتیاط، احتیاط، احتیاط۔ مجاہد آخرہ قاضی حسین احمد (امیر جماعت) کا حال یہ ہے کہ ایک ہی سانس میں دو باتیں کہتے ہیں، جہاد و قتال کی بھی اور جنگ سے گریز کی بھی۔ (صفحہ ۲۳-۲۴)

یہ غیر ذمہ داری کی انتہا ہے کہ جذباتی تقریریں کرکے قوم کے نوجوانوں کو لڑنے بھڑنے پر لگادیا جائے، حالاں کہ خود جنگ لڑنے کا کوئی حقیقی ارادہ نہ ہو۔

۱۸ جولائی ۱۹۹۰

ڈائری کے صفحہ ۲۰ اپریل ۱۹۹۰ میں پروفیسر مشیر الحق کے قتل کا ذکر ہے۔ ان کو عین روزہ کے دن سرینگر میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ان کا قاتل ۲۵ سالہ سلیم زرگر تھا۔ کشمیر کی پولیس نے اس کو گرفتار کرلیا ہے۔ ۱۴ جولائی ۱۹۹۰ کو وہ اخبار نویسوں کے سامنے لایا گیا۔

قومی آواز (۱۷ جولائی ۱۹۹۰) کا نمائندہ لکھتا ہے کہ کشمیر کے شمالی علاقہ میں بارڈر سیکورٹی فورس کے ایک انٹروگیشن سنٹر میں چار گرفتار دہشت گردوں سے ملنے کا موقع ملا۔ ان میں سے ایک پست قد نوجوان سلیم زرگر تھا۔ اس نے مشیر الحق جیسے مسلمان کو ہلاک کرنے کے لئے پندرہ گولیاں ان کے سینہ میں اتار دیں۔ سلیم سے پوچھا گیا کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ اس نے کہا کہ اسلام کا نظام قائم کرنے کے لئے۔ جب میں نے کہا کہ مشیر الحق تو اسلامیات کا ماہر تھا۔ وہ باقاعدہ نماز روزہ کرتا تھا، پھر اس کو کیوں مارا۔ بولا کہ حکم جو ملا تھا۔ میرے کمانڈر کا حکم تھا، اس لئے میں نے ایسا کیا۔

سلیم زرگر کی تصویر اخبارات میں چھپی ہے۔ اس کے چہرہ پر داڑھی نظر نہیں آتی۔ کشمیر کے یہ جنگجو نوجوان اقبال اور خمینی اور مودودی کے افکار سے متاثر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم بندوق کی گولی کے زور پر اسلام لائیں گے، پہلے کشمیر میں اور پھر ساری دنیا میں۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو خود چنگیزی کر رہے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم چنگیزی کو مٹانا چاہتے ہیں۔

۱۹ جولائی ۱۹۹۰

موجودہ صدی میں مسلمانوں کے اندر جتنی بھی بڑی بڑی تحریکیں اٹھی ہیں، وہ سب کی سب خارجی اشو پر مبنی تھیں۔ خلافت کا اشو، تقسیم کا اشو، ہندو خطرہ کا اشو، بابری مسجد کا اشو، وغیرہ۔ ہر بار مسلمان کسی نہ کسی خارجی مسئلہ پر بھڑک کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

مگر اس قسم کی تمام تحریکیں بالکل بے فائدہ ہیں۔ اصل تحریک وہ ہے جو افراد قوم کو باشعور بنانے کے لئے اٹھائی جائے۔ مگر (الرسالہ مشن کے سوا) اس قسم کی کوئی تحریک پچھلی پوری صدی کے اندر نہیں اٹھی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اینٹ نہ بنائی جائے البتہ چھت کھڑی کرنے کے لئے دھوم مچائی جائے۔

۲۰ جولائی ۱۹۹۰

"تجدید واحیاء دین" مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے فکر کی بنیادی کتاب ہے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ Revivalist movement in Islam کے نام سے چھپا ہے۔ موجودہ زمانہ کے تمام مفکرین اپنی تحریکوں کو "احیاء اسلام" یا "تجدید دین" کا نام دیتے ہیں۔ مگر ان کی کتابوں کو پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ ان لوگوں کے نزدیک احیاء (Revival) سے مراد اسلامی غلبہ کا احیاء ہے نہ کہ اسلامی دعوت کا احیاء۔

یہ بنیادی غلطی ہے جس میں موجودہ زمانہ کے تمام مفکرین مبتلا رہے ہیں۔ اسلامی احیاء کی تحریک صرف وہ ہو سکتی ہے جو اپنا کام وہاں سے شروع کرے جہاں سے اسلام شروع ہوا۔ اسلام مکہ میں دعوت توحید اور انذار آخرت سے شروع ہوا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مفکرین کی تحریریں بتاتی ہیں کہ وہ دعوت إلی اللہ کے حقیقی تصور سے بالکل ناآشنا تھے۔ وہ صرف اسلام کے دور حکومت کو جانتے تھے اور کسی ایک یا دوسری شکل میں اسی دور حکومت کے احیاء کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

۲۱ جولائی ۱۹۹۰

ڈاکٹر عابد سعید (بجرامی) نے الرسالہ کی صبر و اعراض کی پالیسی کی شکایت کی۔ پھر گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ میرا ایک لڑکا انجینئر ہے۔ وہ سعودی عرب میں کام کرتا ہے۔ ایک روز اس کے ڈائریکٹر نے اس کے کام کی تعریف کی۔ اس نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ آپ اپنی ڈیوٹی پوری مستعدی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ ہم آپ کے کام سے خوش ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ مذکورہ دفتر میں ایک سعودی شخص منیجر ہے۔ وہ کچھ کام نہیں کرتا۔ ڈاکٹر عابد سعید کے صاحبزادہ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ فلاں صاحب تو صرف اپنی کرسی پر بیٹھے

ہوئے سگرٹ پیتے رہتے ہیں۔ اس سے دفتر میں کام کا ماحول خراب ہوتا ہے۔ یہ سنتے ہی ان کا ڈائرکٹر سنجیدہ ہوگیا۔ اس نے کہا کہ وہ اعلیٰ سعودی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ کچھ نہ کرنے ہی کی قیمت پاتا ہے۔ آپ کو اس کی سرگرمیوں پر اعتراض کی ضرورت نہیں:

He is paid for doing nothing. You are not supposed to object about his activities.

میں نے کہا کہ پھر آپ نے اپنے صاحبزادہ کو کیا مشورہ دیا۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے کہا کہ تم اس کی فکر چھوڑ دو، اپنا کام کرو۔ میں نے کہا کہ اسی طرز عمل کا نام صبر و اعراض ہے۔ صبر و اعراض زندگی کا ایک اصول ہے۔ اس کی ضرورت ہر جگہ ہے، عرب میں بھی اور ہندستان میں بھی۔ میں مسلمانوں سے صرف یہ کہتا ہوں کہ تم جس طرح دوسرے ملکوں میں صبو اعراض اور ایڈجسٹمنٹ کے ذریعہ رہتے ہو اسی طرح ہندستان میں بھی رہو۔

۲۲ جولائی ۱۹۹۰

آج کا انسان اصول کے معاملہ میں انتہائی بے حس مگر ذات کے معاملہ میں انتہائی حساس ہے — ایک منظر آنکھوں کے سامنے سے گزرا۔ اس کے بعد یہ الفاظ میری زبان پر آگئے۔ آج کے انسان کا حال یہ ہے کہ اس کی اپنی ذات زد میں آئے یا اس کا اپنا مفاد خطرہ میں پڑ جائے تو وہ آخری حد تک بے چین ہو جائے گا۔ لیکن اگر حق و صداقت کا اصول مجروح ہو رہا ہو تو اس کے بارہ میں اس کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

آج سب سے بڑا کام یہ ہے کہ انسان کے اس مزاج کو بدلا جائے۔ اگر یہ حالت زیادہ دیر تک باقی رہی تو یقینی ہے کہ ساری انسانیت خدا کے غضب کی مستحق ہو جائے گی۔ اور اس کے بعد اس کو کسی درخت کا سایہ بھی نہ ملے گا جہاں وہ پناہ لے سکے۔

۲۲ جولائی ۱۹۹۰

مولانا شبلی نعمانی نے ۱۹۱۴ میں کہا تھا:

زوال دولت عثماں زوال شرع و ملت ہے — عزیزو فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک

اس شعر کے بعد "دولت عثمانی کا زوال آخری حد تک پہنچا۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۴ میں اس کا خاتمہ ہوگیا۔

اگر شبلی کی یہ بات صحیح ہوتی تو اس کے بعد شریعت اور ملت کا بھی خاتمہ ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر آج شریعت و ملت پہلے سے زیادہ طاقت ور حالت میں قائم ہیں۔

مگر مسلمانوں کے نادان لکھنے اور بولنے والوں نے اس سے کوئی سبق نہیں لیا۔ وہ بار بار اسی قسم کی باتیں دہراتے رہے۔ مثلاً ملک کی تقسیم کے بعد کہا گیا کہ اردو زبان مسلمانوں کی حیات ملی کی علامت ہے۔ اگر اردو گئی تو ملت بھی گئی۔ اس کے بعد کہا گیا کہ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کے ملی بقا کی علامت ہے۔ اگر مسلم یونیورسٹی کا مسلم کردار ختم ہوا تو مسلمان بھی اس ملک سے ختم ہو جائیں گے۔ اس کے بعد کہا گیا کہ پرسنل لا کا مسئلہ مسلمانوں کے ملی وجود کی علامت ہے۔ اگر پرسنل لا محفوظ نہ رہا تو مسلمان بھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اب آجکل یہی حیثیت بابری مسجد (اجودھیا) نے لے لی ہے۔ مثال کے طور پر اس کے ایک پرجوش تحریری نقیب مولانا مجیب اللہ ندوی لکھتے ہیں :

"بابری مسجد کا مسئلہ صرف ایک مسجد کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ علامت ہے ہندستان میں شعائر اسلامی کی حفاظت کی جدوجہد کی۔ اگر ہم اس محاذ پر پیچھے ہٹ گئے تو پھر نہ جانے کتنے محاذوں پر ہمیں پیچھے ہٹنا پڑے گا (الرشاد جولائی ۱۹۹۰، صفحہ ۲)

یہ سب بالکل لغو باتیں ہیں۔ اور ان کی لغویت کا یہ ثبوت کافی ہے کہ ان تمام علامتی محاذوں پر مسلمان بار بار شکست کھا رہے ہیں۔ اس کے باوجود اسلام پوری طرح قائم اور محفوظ ہے۔

۲۴ جولائی ۱۹۹۰

آج عشاء کی نماز کسی قدر دیر سے پڑھی۔ نماز ختم کی تو اچانک موت کا خیال آتے ہی جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دل نے کہا کہ موت کسی شخص کے لئے بلاشبہ سب سے زیادہ سنگین واقعہ ہے۔ اس کی سنگینی کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ وہ دار العمل سے ابدی انقطاع ہے اور دار الجزاء میں ابدی داخلہ۔ کس قدر بھیانک ہے یہ حقیقت۔ مگر دنیا میں شاید کوئی ایک آدمی بھی نہیں جو اس بھیانک حقیقت کا واقعی احساس رکھتا ہو۔

۲۵ جولائی ۱۹۹۰

جھینگر کی قسم کا ایک کیڑا ہے جو زیادہ تر گرم ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کو انگریزی میں مینٹس (Mantis) کہا جاتا ہے۔ وہ چھوٹے بڑے مختلف قدر کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کی ایک

ہزار سے زیادہ قسمیں دریافت کی گئی ہیں۔ اس کیڑے کی ایک قسم وہ ہے جو اپنے اگلے پاؤں اس طرح رکھتی ہے جیسے نماز پڑھنے والا نماز کے وقت ہاتھ باندھتا ہے، چنانچہ اس کو عبادت گزار کیڑا (Praying Mantis) کہا جاتا ہے۔

مگر یہ بات صحیح نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر جھینگر خدا کی عبادت کرتا ہے تو شیر اور ہاتھی جیسے جانور بھی اسی طرح خدا کی عبادت کیوں نہیں کرتے۔ کیا خدا کی عبادت گزاری صرف جھینگروں اور پتنگوں کے لئے ہے۔

یہ صحیح ہے کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں خدا کی عبادت کرتی ہیں۔ مگر اس عبادت کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مسجد کے نمازی کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کے مقرر کئے ہوئے قوانین پر چلتی ہیں۔ اس اعتبار سے کائنات کی ہر چیز کامل عبادت گزار ہے، خواہ وہ آسمانی چیزیں ہوں یا زمینی چیزیں۔

۲۶ جولائی ۱۹۹۰

جمعیۃ علماء ہند کے تحت ایک اردو ہفت روزہ "الجمعیۃ" کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ ۲۰ - ۲۶ جولائی ۱۹۹۰ میں "حافظ سہارنپوری" کی ایک نظم چھپی ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے :

ہو رہا ہے یہ تقاضا گردش ایام کا ۔۔۔ لے کے جھنڈا ہم اٹھیں اپنے خدا کے نام کا

اس کو پڑھ کر خیال آیا کہ اللہ کا مطلب مسلمانوں نے یا تو یہ سمجھا کہ لفظ اللہ کو لے کر اسے رٹا جائے۔ چنانچہ بے شمار لوگ گوشوں میں بیٹھ کر "اللہ، اللہ" کی لفظی تکرار کر رہے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نام پر اقوام غیر سے جنگ چھیڑ دی جائے۔ اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر لوگوں کے اوپر حملہ کر دیا جائے۔

یہ دونوں ہی باتیں لغو ہیں۔ صحیح بات تکبیر رب اور دعوت الی اللہ ہے۔ تکبیر رب کا مطلب ہے اللہ کی عظمت و کبریائی کو اپنے شعور میں داخل کرنا۔ اللہ کے وجود، اس کی صفات کمال اور اس کے آلاء کی یاد میں جینا۔ اپنے اندر ایک ربانی انسان کی پرورش کرنا۔

دعوت الی اللہ اسی عمل کا خارجی رخ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے جس خدائے

برتر کو پایا ہے، اس سے دوسروں کو باخبر کرے۔ وہ لوگوں کو بتائے کہ اس دنیا کا خالق و مالک ایک اللہ ہے۔ موجودہ دنیا کو اس نے امتحان کے مقصد سے بنایا ہے۔ موت کے بعد وہ ہر آدمی کا حساب لے گا اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق انعام یا سزا دے گا۔

۲۷ جولائی ۱۹۹۰

اس دنیا میں سب سے نادر چیز "کامل انسان" ہے۔ کامل انسان وہ ہے جو متوازن شخصیت کا حامل ہو۔ جو عقد نفسی سے خالی ہو۔ جو ایک بے زور دلیل کے آگے اس طرح جھک جائے جس طرح کوئی شخص زور کے آگے جھکتا ہے۔ جو بات کو بات کے اعتبار سے دیکھے، نہ اس اعتبار سے کہ وہ اس کے موافق ہے یا اس کے خلاف۔ جو ارنا الاشیاء کما ھی کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جو اعلیٰ ترین صلاحیت رکھنے کے باوجود آخری حد تک متواضع بن جائے۔ جس کا دل ہر قسم کے منفی جذبات سے خالی ہو۔ جو اپنے اور غیر کا فرق کئے بغیر حقیقت کو دیکھ سکتا ہو۔ جو ذاتی مفاد اور شخصی محرکات سے آخری حد تک بلند ہو۔ جو اپنی ذات میں جینے کے بجائے برتر حقائق میں جیتا ہو۔

خدا بلاشبہ ہر ہر انسان کو کامل انسان بنا سکتا ہے۔ مگر اسباب کے دائرہ میں ایسے کسی انسان کا ظہور میں آنا اس دنیا کا سب سے زیادہ کمیاب واقعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے ذریعہ صحرائے عرب میں ایک نسل پیدا کرنے کی جو منصوبہ بندی کی، اس میں اگرچہ ہزاروں اور لاکھوں قیمتی انسان پیدا ہوئے۔ مگر ڈھائی ہزار سال کی لمبی مدت میں انسان کامل صرف تین پیدا ہو سکے:

محمد بن عبد اللہ	اول الثلاثۃ
ابو بکر بن ابی قحافہ	ثانی الثلاثۃ
عمر بن الخطاب	ثالث الثلاثۃ

۲۸ جولائی ۱۹۹۰

پاکستانی ماہنامہ میثاق کا شمارہ اکتوبر ۱۹۸۷ دیکھ رہا تھا۔ اس میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک تقریر چھپی ہے جو انھوں نے ۱۴ اگست ۱۹۸۷ کو لاہور کی مسجد دار السلام میں کی تھی۔ اس کا

ایک حصہ یہ ہے:

"کراچی کے قریباً نصف حصہ پر کرفیو نافذ ہے۔ شہری زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ کروڑوں روپیہ کے کاروبار کا روزانہ نقصان ہو رہا ہے۔ اس بگاڑ کی شروعات کی یہ بات ہے کہ وہاں کی ایک گنجان آبادی اور پولیس کے مابین تصادم سے صورت بگڑ گئی۔ پولیس نے لوٹ مار کی اور بڑی بے دردی کے ساتھ فائرنگ کی اور لوگوں کو قتل کیا۔ کراچی کی پولیس میں پنجابیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ فرض کیجئے، کہیں کوئی مظاہرہ یا ہنگامہ ہوتا ہے اور پولیس اس پر قابو پانے اور اسے فرو کرنے کے لئے وہاں پہنچتی ہے۔ اب مجمع کے اندر کچھ تخریب کار بھی ہیں۔ انھوں نے نشانہ لیا اور دو چار پولیس والے مار دئے۔ حالاں کہ وہاں پولیس آئی تھی نظم ونسق کو بحال رکھنے کے لئے۔ لیکن جب تخریب کاروں نے پولیس کے خلاف فائرنگ کھول دی تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ پولیس کی طرف سے ردعمل کی صورت میں ہوگا۔ اور یہ ہنگامے عوام بمقابلہ (versus) پولیس رخ اختیار کر لیں گے۔ اور چونکہ پولیس میں زیادہ نفری پنجابیوں کی ہے اور کراچی میں عوام کی اکثریت مہاجرین پر مشتمل ہے، لہٰذا بڑی عیاری سے تخریبی عناصر کی جانب سے پنجابی ۔ مہاجر تصادم کا رنگ دیدیا جاتا ہے" صفحہ ۶۹

ٹھیک یہی کہانی ہندستان میں بھی دہرائی جاتی ہے۔ نزاع کے موقع پر پولیس نظم ونسق کی بحالی کے لئے آتی ہے۔ مگر مسلمان مشتعل ہو کر پولیس کے خلاف اقدام کر بیٹھتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ جو مسئلہ پہلے پولیس اور فسادیوں کے درمیان تھا، وہ پولیس اور مسلمانوں کے درمیان ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہی کچھ پیش آتا ہے جو کراچی میں پیش آیا۔

۲۹ جولائی ۱۹۹۰

حج کے مراسم میں ایک رمی جمار ہے۔ یہ مقام منیٰ میں ہے۔ منیٰ کا علاقہ پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ آٹھ سال پہلے سعودی حکومت نے منیٰ جانے کے لئے ایک پہاڑی کو کاٹ کر سرنگ بنادی جس کو المعیصم کہا جاتا ہے۔ یہ سرنگ ۵۴۷ میٹر لمبی اور ۱۸ میٹر چوڑی ہے۔ اس سے حاجیوں کے لئے ۲ کیلومیٹر کا فاصلہ کم ہو جاتا ہے۔ ۲ جولائی ۱۹۹۰ کو حج کے موقع پر اس سرنگ میں حاجیوں کی بھگدڑ ہوگئی۔ اس سے ۱۴۲۶ حاجی دب کر مر گئے۔ بہت سے زخمی ہوئے۔

ڈاکٹر اشفاق احمد انجینئر (مقیم آسٹریلیا) کا بیان نئی دنیا (۱۳ - ۱۹ جولائی ۱۹۹۰) میں چھپا ہے وہ خود اس سال حج کرنے گئے تھے اور حادثہ کے وقت اس سرنگ میں موجود تھے۔

ڈاکٹر اشفاق احمد نے بتایا کہ سرنگ میں ایک ہی راستہ آنے اور جانے کے لئے ہے، اس لئے دوطرفہ آمد ورفت کی وجہ سے سرنگ میں کافی بھیڑ جمع ہو گئی۔ ۸ بجے صبح ملیشیا اور انڈونیشیا کے حاجیوں کا ایک بڑا ہجوم سرنگ میں داخل ہوا۔ دوسری جانب ترک حاجیوں کا ایک بڑا گروپ واپس آرہا تھا۔ اس کے نتیجہ میں سرنگ کے اندر بیک وقت ۵۰ ہزار حاجی اکٹھا ہو گئے۔ ان میں سے کوئی پیچھے ہٹنے یا دوسروں کو راستہ دینے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ اور اس کو انانیت کا مسئلہ بنالیا۔ یہاں تک کہ دھکا مکی شروع ہو گئی۔ حاجیوں نے افراتفری میں اپنا راستہ بنانے اور سرنگ سے نکل جانے کے لئے ایک دوسرے پر مکوں اور گھونسوں اور چھاتوں کی نوک سے حملے کرنے شروع کر دئے۔ شیطان کو کنکری مارنے والے انسانیت سوز حرکت پر اتر آئے۔ اس کے نتیجہ میں بہت سے لوگ نیچے گر پڑے اور بھیڑ نے انھیں روند ڈالا۔ بھگدڑ میں لوگ کچل کر مر گئے (صفحہ ۹)

اس واقعہ نے دراصل مسلمانوں کی حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے۔ یہی انانیت مسلمان ہر جگہ دکھا رہے ہیں۔ اس کی آخری حدیہ ہے کہ حج کا اجتماع بھی اب اس سے محفوظ نہیں رہا۔

۳۰ جولائی ۱۹۹۰

پاکستانی اخبار نوائے وقت (۲۲ جون ۱۹۹۰) نے لندن کے اخبار (Observer) سے مسٹر ہیملٹن (Adrian Hamilton) کا مضمون نقل کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے — وقت آگیا ہے کہ اسلام کے بھوت کو دفن کر دیا جائے:

Time to bury the bogy of Islam

اس میں مضمون نگار نے کہا ہے کہ ترک دوبارہ وائنا کے دروازہ پر پہنچ رہے ہیں۔ کمیونزم ہو سکتا ہے کہ مر گیا ہو۔ مگر اب جو حقیقی خطرہ ہمارے لئے ہے وہ اسلام کا ہے:

Communism may be dead, but what we really need to fear is a resurgent Islam.

یہاں اسلام کا لفظ مسلمان کے معنی میں ہے۔ مہذب دنیا کے لوگ تشویش محسوس کر رہے ہیں کہ مسلم دیوانوں کے ہاتھ میں اگر ایٹم بم آجائے تو وہ اس کو استعمال کر ڈالیں گے، خواہ اس کے نتیجہ میں وہ خود بھی برباد ہوں اور ساری دنیا کو مصیبت میں مبتلا کر دیں۔ کسی وقت اسلام سے لوگوں کو رحمت ملی تھی۔ آج دنیا کو اسلام سے صرف زحمت کا اندیشہ مل رہا ہے۔ کیسے عجیب ہیں یہ مسلمان، جن کے پاس نہ اسلام ہے اور نہ عقل، اس کے باوجود انھیں اصرار ہے کہ وہ احمقانہ ہنگاموں کا بازار ضرور گرم کریں گے۔

۳۱ جولائی ۱۹۹۰

۲۹ جولائی ۱۹۹۰ کے تحت میں نے حج کے حادثہ کی بابت ڈاکٹر اشفاق احمد صاحب کا بیان نقل کیا ہے۔ اس کی مزید تائید عبد الماجد ندوی صاحب کے بیان سے ہوئی۔ وہ کشمیر (پونچھ) سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ بھی اس سال حج کے لئے گئے تھے اور وہ سرنگ کے اندر خود بھی پھنس گئے تھے۔ بڑی مشکلوں سے وہ باہر آئے۔ واپسی کے بعد وہ ہمارے دفتر میں آئے اور ڈاکٹر اشفاق کے بیان کی تائید کی۔

مگر اس سے پہلے اس واقعہ کے بارہ میں ایرانیوں کے حوالے سے جو خبر پریس میں چھپی وہ سراسر اس سے مختلف تھی، ایرانی چوں کہ اس سال بطور احتجاج حج کے لئے نہیں گئے۔ اور ان کا مطالبہ ہے کہ مکہ اور مدینہ کو مسلم ممالک کی بین اقوامی نگرانی میں دیدیا جائے۔ اس لئے انھوں نے اس حادثہ کے بعد ایک جھوٹی رپورٹ تیار کی تاکہ ان کے دعوے کی تائید فراہم ہو سکے۔

ان کے بیان کے مطابق، مذکورہ تاریخ کو سرنگ میں حاجیوں کی بڑی تعداد اکھٹا ہوگئی اس وقت کچھ حاجیوں نے جوش میں آکر "اللہ اکبر" کا نعرہ لگا دیا۔ اس نعرہ کو سن کر سعودی پولیس یہ سمجھی کہ سرنگ کے اندر ایرانی گھس گئے ہیں اور وہی یہ نعرہ لگا رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بجلی بند کر دی۔ بجلی بند ہونے سے سرنگ کے اندر اندھیرا چھا گیا اور ایئر کنڈیشنر رک جانے کی وجہ سے آکسیجن کی سپلائی کم ہوگئی۔ اس کو دیکھ کر حاجیوں میں بھگدڑ مچ گئی اور بہت سے لوگ دب کر مر گئے۔

یہ ساری خبر بالکل فرضی تھی۔ عبد الماجد صاحب نے بتایا کہ روشنی سرنگ کے اندر موجود رہی۔ حادثہ کا سبب صرف یہ تھا کہ دونوں طرف سے بڑی تعداد میں حاجی گھس آئے۔ اور دونوں میں سے کوئی پیچھے ہٹنے پر راضی نہ ہوا، اس لئے یہ حادثہ پیش آیا۔

یکم اگست ۱۹۹۰

عباس محمود العقاد (۱۹۶۴ - ۱۸۸۹) ایک مصری ادیب اور صحافی ہیں۔ سیرت پر ان کی ایک مشہور کتاب ہے جس کا نام عبقریۃ محمد ہے۔ اس کتاب کا سبب تالیف انھوں نے کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی مجلس میں کارلائل کی کتاب کا تذکرہ تھا جس نے پیغمبر اسلام کو نبیوں کا ہیرو (بطل) قرار دیا ہے۔ اس پر حاضرین میں سے ایک غیر مسلم شخص کہہ اٹھا کہ پیغمبر اسلام کا ہیروانہ کردار تلوار اور خون پر بنی تھا (ان بطولۃ محمد انما ھی بطولۃ سیف ودماء) اس تبصرہ کا عباس محمود العقاد پر اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے اپنی مذکورہ کتاب لکھ ڈالی۔

یہ صرف العقاد کی بات نہیں۔ یہی مسلمانوں کی عام نفسیات ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم یہ کہہ دے کہ اسلام تلوار کا مذہب ہے یا محمد نے تلوار کے ذریعہ اسلام کو پھیلایا تو تمام مسلمان بھڑک اٹھیں گے۔ مگر یہی مسلمان تمام دنیا میں تلوار کے ذریعہ اسلام کو نافذ کرنے پر تقریر کر رہے ہیں رشدی فتنہ کا مقابلہ تلوار سے کرنا، کشمیر میں تلوار کے ذریعہ اسلام نافذ کرنا، مصر میں تلوار کے زور پر انقلاب لانا، یہ سب کیا ہے، یہ دنیا کے سامنے گویا یہ اعلان کرنا ہے کہ محمد کا مذہب تلوار کا مذہب تھا۔ کیسے عجیب ہیں وہ مسلمان جنھیں خود اپنے تضاد کی خبر نہیں۔

۲ اگست ۱۹۹۰

۲۸ جولائی کو میں سوویت یونین (ماسکو) گیا تھا۔ آج وہاں سے واپس آیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ سب سے زیادہ عظمت اور تقدیس لینن کو حاصل ہے۔ اس کی لاش مومیائی کرکے شیشہ کے کیس میں رکھی ہوئی ہے۔ اس کے شاندار مقبرہ پر بے شمار عظیم اہتمامات کئے گئے ہیں۔ ساری مملکت میں اس کے شاندار مجسمے لگے ہوئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

سوویت یونین کمیونسٹ نظریہ پر عقیدہ رکھتا ہے۔ کمیونزم کا عقیدہ خدا کے انکار پر قائم ہوا تھا۔ مگر لینن کی عظمت و تقدیس دیکھ کر خیال آیا کہ اشتراکی دنیا نے خدا کو چھوڑا نہیں، صرف خدا کو بدلا ہے۔ خدا کا عقیدہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اگر انسان خالق کو چھوڑے تو اس کے بعد مخلوق کو اسے خدا کی جگہ پر بٹھانا پڑے گا۔

۲ اگست ۱۹۹۰

۲۰ مارچ ۱۹۹۰ کو میں طرابلس (لیبیا) میں تھا۔ وہاں ایک انٹرنیشنل کانفرنس کے تحت مختلف ملکوں کے لوگ آئے تھے۔ ان میں سے ایک جناب ایس آئی حسن تھے۔ وہ آزاد کشمیر کے لیڈر تھے اور پاکستان کے وفد کے ساتھ آئے تھے۔

ایس آئی حسن صاحب مجھ کو تنہائی میں لے گئے اور کہا کہ میرے ضیاء الحق صاحب سے بہت قریبی تعلقات تھے۔ وہ ایک مرد مومن تھا۔ ضیاء الحق صاحب کہا کرتے تھے کہ انڈیا کو ہمیں (disintegrate) کرنا ہے، ورنہ وہ ہمیں جینے نہیں دے گا۔ انھوں نے پاکستانی کشمیر میں فوجی ٹریننگ کے کیمپ بنائے اور وادی کشمیر کے نوجوانوں کو بلا کر وہاں انھیں فوجی ہتھیار استعمال کرنے کی تربیت دینا شروع کیا۔ یہی تربیت یافتہ نوجوان ہیں جو اس وقت کشمیر میں "جہاد آزادی" کی تحریک چلا رہے ہیں۔ موجودہ کشمیری تحریک کا کریڈٹ ضیاء الحق کو جاتا ہے۔

یہ روایت اگر درست ہے تو یہ ایک بدترین کام ہے جو ضیاء الحق صاحب نے کیا۔ یہ صرف تخریب کاری کا ایک کام ہے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ ضیاء الحق اگر واقعۃً اسلام کو جانتے تو وہ پاکستانی کشمیر میں دعوتی تربیت کے کیمپ کھولتے۔ وہ کشمیری نوجوانوں کو وہاں بلا کر انھیں سچا داعی بناتے۔ وہ ان کے اندر یہ جذبہ بھرتے کہ وہ اولاً کشمیر کے ہندوؤں میں اور پھر سارے ہندستان کے غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کریں۔

مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ضیاء الحق صاحب یا کوئی اور لیڈر اس قسم کا تربیتی کیمپ کھولے تو ایسا کیمپ خالی پڑا رہے گا۔ فوجی کیمپ کو بھرنے کے لئے نفرتِ ہندو کا سرمایہ درکار ہے، اور وہ موجودہ مسلمانوں میں افراط کے ساتھ موجود ہے۔ مگر دعوتی کیمپ کو بھرنے کے لئے محبتِ ہندو کی ضرورت ہے، اور اس سے موجودہ زمانہ کے تمام مسلمان خالی ہو چکے ہیں۔

۴ اگست ۱۹۹۰

مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک کتاب امام حسین اور ان کی شہادت کے بارہ میں ہے۔ اس کا نام "شہید اعظم" ہے۔ یہ غالباً ان کا مفصل مقالہ تھا جو بعد کو کتاب کی صورت میں شائع کر دیا گیا۔

امام حسین کے بارہ میں عام تاثر یہی ہے۔ سید سلیمان ندوی نے ان کی شہادت پر مضمون لکھا تو اس کا عنوان "شہادت کبریٰ" قرار دیا۔ اسی طرح ہر لکھنے اور بولنے والا ان کی شہادت کی بابت بڑے بڑے الفاظ بولتا ہے۔ مگر یہ قرآن کی صراحت کے سراسر خلاف ہے۔ کیوں کہ یہ قرآن (الحدید ۱۰) سے براہ راست ٹکراتا ہے۔ قرآن کی اس آیت کے مطابق، فتح مکہ سے پہلے جو لوگ شہید ہوئے وہ درجہ میں ان لوگوں سے "اعظم" تھے جو فتح مکہ کے بعد لڑیں یا شہید ہوں۔ پھر حضرت امام حسین جو فتح مکہ کے ۵۳ سال بعد شہید ہوئے، وہ شہید اعظم کیسے قرار دئے جاسکتے ہیں۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے لکھنے اور بولنے والے کس طرح مسلمانوں کو صحیح رہنمائی نہ دے سکے۔ انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے مسلمانوں کے اندر غلط ذہن پیدا کر دیا۔ اسی غلط رہنمائی کا یہ نتیجہ ہے جو آج ہر جگہ مختلف صورتوں میں نظر آرہا ہے۔

۵ اگست ۱۹۹۰

۲ اگست ۱۹۹۰ کو عراق نے اپنی فوجیں کویت کے اندر داخل کر دی تھیں۔ اب تک کی خبر کے مطابق، وہ سابقہ حالت پر واپس جانے کے لئے راضی نہیں۔ ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ عراق نے کویت کے کچھ گم نام قسم کے چھوٹے فوجی افسروں کو لے کر عراق نواز انقلابی حکومت کویت میں قائم کر دی ہے۔ عراقی حکمراں صدام حسین نے اعلان کیا ہے کہ کویت کے جابر الاحمد الصباح یا ان کی فیملی کے لئے اب کویت واپس آنے کا کوئی سوال نہیں۔

اس معاملہ میں آئندہ کیا ہوگا، کچھ نہیں معلوم۔ مگر میرے نزدیک یہ سراسر بزدلانہ حرکت ہے۔ اگر عراق بہادر اور طاقت ور ہے تو وہ اپنی فوجیں اسرائیل میں کیوں نہیں داخل کرتا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان، خواہ وہ افراد ہوں یا حکومتیں، ان کا عام حال یہ ہے کہ وہ اپنوں کے لئے سخت اور دوسروں کے لئے نرم بن گئے ہیں۔ ہر ایک موقع پا کر اپنے بھائیوں کو روند رہا ہے۔ مگر ان میں سے کسی کی یہ ہمت نہیں کہ وہ غیر مسلم طاقتوں کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی کرے۔ یہ ایک علامت ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ مسلمان اپنے زوال کی آخری حد پر پہنچ چکے ہیں۔

۶ اگست ۱۹۹۰

پاکستان کے دانشوروں اور اسلام پسندوں کو ایک لفظ بہت پسند ہے، اور وہ "نظریۂ پاکستان" ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پاکستان ایک نظریہ کے تحت وجود میں آیا، اور وہ نظریہ اسلام تھا۔ اس لئے اسلام اور پاکستان دونوں لازم اور ملزوم ہیں۔

مگر میری رائے اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کا مطالبہ اور پاکستان کا قیام اسلام کی نفی کے ہم معنی تھا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے جب پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تو اس کی دلیل یہ دی گئی کہ متحدہ ہندستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہوگی۔ جمہوری نظام کے تحت غیر منقسم ہندستان میں مسلم اقلیت ہندو اکثریت کی محکوم ہو جائے گی۔ اس لئے مسلمانوں کو ایک علیحدہ خطہ درکار ہے، جہاں ان کی اپنی حکومت ہو اور وہ اپنے اسلامی عقیدہ کے مطابق وہاں زندگی گزار سکیں۔

۱۹۴۷ سے پہلے مسلمانوں کے پاس ایک علیحدہ قومی جغرافیہ یا علیحدہ قومی حکومت موجود نہ تھی۔ مگر اسلام اس وقت بھی پوری طرح ان کے پاس موجود تھا۔ ایسی حالت میں اس مطالبہ کے معنی واضح طور پر یہ تھے کہ اسلام مسلمانوں کو بچانے کے لئے کافی نہیں۔ مسلمانوں کے تحفظ کے لئے اس کے علاوہ ایک چیز درکار ہے، اور وہ مسلمانوں کی قومی حکومت ہے۔

اس قسم کا مطالبہ بلا شبہ اسلام کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار تھا۔ اور جو تحریک اسلام کے خلاف عدم اعتماد کی بنیاد پر اٹھے، اس سے ہرگز اسلام کا نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نصف صدی کی مدت گزرنے کے بعد بھی پاکستان سے اسلام برآمد نہیں ہوا۔

۷ اگست ۱۹۹۰

ایک پاکستانی مسلمان سے کشمیر کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی تقسیم اس بنیاد پر

اصول پر ہوئی تھی کہ ہندو آبادی والا علاقہ بھارت میں شامل ہوگا اور مسلم آبادی پاکستان میں۔ اس اعتبار سے کشمیر پاکستان کا حصہ ہے۔ مگر بھارت دھاندلی کرکے کشمیر پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔

میں نے کہا کہ اس اصول کو سب سے پہلے خود پاکستان نے توڑا۔ ۱۹۴۷ میں جوناگڈھ کے مسلم نواب نے پاکستان سے الحاق کی درخواست کی۔ پاکستان نے اس کو منظور کرلیا۔ حالاں کہ اصولی موقف یہ تھا کہ پاکستان یہ کہہ کر انکار کر دیتا کہ جوناگڈھ میں ہندو اکثریت ہے، اس لئے اس کا الحاق بھارت سے ہونا چاہئے۔ میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت دونوں نے دھاندلی کی۔ فرق یہ ہے کہ بھارت کی دھاندلی چل گئی، پاکستان کی دھاندلی نہیں چلی۔

انھوں نے کہا کہ جواہر لال نہرو نے وزیر اعظم ہند کی حیثیت سے اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ کشمیر میں ریفرنڈم کرائیں گے۔ مگر انھوں نے اور ان کے بعد بھارت کے حکمرانوں نے اس وعدہ کو پورا نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ پاکستان نے تو خدا سے کئے ہوئے وعدہ کو پورا نہیں کیا۔ پھر اگر انڈیا نے اقوام متحدہ سے کئے ہوئے وعدہ کو پورا نہیں کیا تو اس میں تعجب یا شکایت کی بات کیا ہے۔

پاکستانیوں نے خدا سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس نے انھیں علیحدہ ریاست دیدی تو وہ وہاں اسلام کو قائم کریں گے۔ مگر پاکستانیوں نے اپنا یہ وعدہ آج تک پورا نہیں کیا۔ پاکستان کے لوگوں نے اس طرح یہ گواہی دی ہے کہ خدا کے ساتھ بھی وعدہ خلافی کی جاسکتی ہے، پھر اگر بھارت اقوام متحدہ کے ساتھ وعدہ خلافی کرے تو اس پر پاکستان کے لوگوں کو شکایت کیوں۔

۸ اگست ۱۹۹۰

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ آپ الرسالہ میں مسلم بادشاہوں پر تنقید کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ مسلم بادشاہ اس ملک میں مسلمانوں کی عظمت ماضی کا نشان ہیں۔ اس طرح تو مسلمانوں کے اندر احساس کمتری پیدا ہو جائے گی۔

میں نے کہا کہ آپ کے سامنے عظمت مسلم کا مسئلہ ہے اور میرے سامنے عظمت خداوندی کا۔ اگر مسلم بادشاہوں نے غلطی کی ہے تو ان کی غلطی کو غلطی کہئے، تاکہ اسلام کی صداقت لوگوں کی نظروں میں باقی رہے۔ اگر آپ نے مسلم بادشاہوں کی غلطی کو غلطی نہ کہا، جب کہ لوگ اچھی طرح ان کا غلط ہونا

جاتے ہیں، تو اسلام ایک قومی مذہب بن جائے گا۔ اس کے بعد وہ لوگوں کی نظر میں کامل صداقت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔

۹ اگست ۱۹۹۰

دعوتی کلام وہ ہے جس میں ابہام اور پیچیدگی نہ ہو۔ اس کو ایسا ہونا چاہئے کہ داعی کہے اور مدعو فوراً سمجھ جائے۔ کلام کی اسی خصوصیت کو وضوح (clarity) کہا جاتا ہے۔

کلام میں وضوح کی صفت کا تعلق حساسیت سے ہے اور حساسیت کا تعلق مصیبت سے۔ مصیبتیں انسان کو حساس بناتی ہیں اور جو آدمی حساس ہو، اس کی زبان سے واضح کلام ظاہر ہوتا ہے۔ اس معاملہ میں اصول یہ ہے کہ جتنی زیادہ مصیبت اتنی ہی زیادہ حساسیت، اور جتنی زیادہ حساسیت اتنا ہی زیادہ واضح کلام۔

حقیقت یہ ہے کہ واضح کلام مشکل ترین عمل ہے۔ وہ مشکل ترین عمل اس لئے ہے کہ اس کی قیمت اتنی زیادہ دینی پڑتی ہے کہ عام آدمیوں کے لئے اس کی قیمت کی ادائگی ممکن ہی نہیں۔

۱۰ اگست ۱۹۹۰

نوائے وقت (۳۱ جولائی ۱۹۹۰) میں یہ خبر پڑھی کہ "روسی مسلمانوں کا ایک وفد آجکل پاکستان آیا ہوا ہے۔ ان کے اعزاز میں ایک تقریب کے موقع پر وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے روسی مسلمانوں کی مدد کے لئے ایک کروڑ روپے کی منظوری کا اعلان کیا ہے۔ اس رقم سے روس کی وسط ایشیا کی مسلمان جمہوریتوں میں مساجد اور مدارس تعمیر کئے جائیں گے اور روسی مسلمانوں کو اسلامی لٹریچر فراہم کیا جائے گا۔"

اس قسم کی خبریں آجکل سوویت یونین کے بارہ میں آتی رہتی ہیں۔ کچھ سال پہلے تک یہ ناقابل گمان تھا کہ باہر کا کوئی ملک روسی مسلمانوں کو اس مقصد کے لئے رقم دے کہ وہ وہاں اس کو دینی مقاصد میں استعمال کریں۔ یہ ایک نیا انقلاب ہے۔ اس انقلاب میں کسی بھی مسلم شخصیت یا مسلم تنظیم کا کوئی دخل نہیں۔ یہ براہ راست خدائی نصرت کے تحت ظہور میں آیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے خلاف خارجی رکاوٹیں، خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہوں، وہ خدا کی طرف سے ختم کر دی جائیں گی۔ ہمیں رکاوٹوں کے خلاف فریاد و احتجاج کرنے کے بجائے اسلام کا مثبت کام

کرنے میں مصروف رہنا چاہئے۔

۱۱ اگست ۱۹۹۰

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۹ اگست ۱۹۹۰) نے افغانی مجاہدین کے لیڈر برہان الدین ربانی کا انٹرویو چھاپا ہے۔ گفتگو کے دوران انٹرویور (عبد اللہ المجلی) نے پوچھا، کیا آپ کا خیال ہے کہ جہاد افغانستان کی تحریک اشتراکیت کے انہدام کا سبب بنی ہے۔ (هل ترى ان حركة الجهاد الافغاني كانت سببا في انهيار الشيوعية)، برہان الدین ربانی نے کہا کہ ہاں، ہمارا یقین یہی ہے۔

انٹرویور نے دوبارہ پوچھا کہ پھر کیا وجہ ہے کہ نجیب کی حکومت ابھی تک بدستور باقی ہے۔ اس کا خاتمہ ممکن نہ ہوسکا۔ برہان الدین ربانی کا جواب یہ تھا کہ روسی فوجیں اگرچہ افغانستان سے واپس چلی گئی ہیں، مگر ہوائی جہازوں کے ذریعہ اب بھی وہ نجیب حکومت کے لئے ہتھیار بھیج رہے ہیں۔

میرے نزدیک یہ جواب بالکل لغو ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب روس اپنی فوجوں اور اپنے ہتھیاروں سے کلی طور پر نجیب کی مدد کر رہا تھا، اس وقت، اپنے دعوے کے مطابق، افغانی مجاہدین نے روسیوں کو شکست دیدی۔ اب جب کہ روسی فوجیں افغانستان سے واپس جا چکی ہیں، اور روس صرف جزئی طور پر نجیب اللہ کی مدد کر رہا ہے تو افغانی مجاہدین اس کو زیر کرنے سے کیوں عاجز ہو گئے۔

اصل یہ ہے کہ پہلے امریکہ مکمل طور پر افغانی مجاہدین کی مدد کر رہا تھا۔ امریکہ کی مدد سے افغانی مجاہدین نے روسی فوجوں کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ اب امریکہ نے اپنی مدد واپس لے لی تو افغانی مجاہدین عاجز ثابت ہو رہے ہیں۔

۱۲ اگست ۱۹۹۰

مولانا انیس لقمان ندوی مالیگاؤں کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ پچھلے کئی سال سے مالیگاؤں میں کوئی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا۔ اس کی وجہ مالیگاؤں کے ایک مقامی مسلم لیڈر نے یہ بتائی کہ جب بھی ہندو حرکت میں آتے ہیں تو مسلمان ان کو چہرا دکھاتے ہیں۔ اس طرح وہ ڈر کر بیٹھ

جاتے ہیں اور فساد برپا کرنے سے باز رہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ بات صحیح نہیں۔ مالیگاؤں کے مسلمان اپنی اسی روش کی بنا پر اپنے خلاف زیادہ بڑا فساد کروا رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے مالیگاؤں کو حکومت نے نظر انداز کر رکھا ہے۔ وہاں کوئی ترقی کا کام نہیں کیا جاتا۔ مزید یہ کہ مالیگاؤں کے مسلمانوں کی اقتصادیات کا انحصار پاور لوم پر تھا۔ حکومت نے پاور لوم پر ایسی پابندیاں لگا دیں کہ مسلمانوں کی معاشیات تہس نہس ہو کر رہ گئیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ "جوابی" فساد کے مسئلہ کا صرف وقتی حل ہے، وہ مستقل حل نہیں۔ مسلمانوں نے کئی جگہ ایسا کیا۔ مثال کے طور پر بھاگلپور میں۔ مگر ہندوؤں نے اس کے بعد یہ کیا کہ اندر اندر منصوبہ بندی کی۔ انھوں نے پولیس اور ایڈمنسٹریشن کو مسلمانوں کی مبالغہ آمیز کہانیاں سنا کر اپنا طرف دار بنا لیا۔ اس کے بعد انھوں نے پولیس کو ساتھ لے کر ایسا فساد کیا کہ مسلمانوں کی تمام چھرے بازی اس کے مقابلہ میں ناقابل ذکر ہو کر رہ گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ بھائی کی طرح مل کر رہیں۔ اختلافی باتوں سے اعراض کریں۔ اپنے معاملات کو حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ حل کریں نہ کہ چھرے اور بندوق سے۔

۱۳ اگست ۱۹۹۰

عراق کے صدر صدام حسین نے ۲ اگست ۱۹۹۰ کو اپنی فوجیں کویت میں داخل کر دیں۔ ۸ اگست کو انھوں نے عراق کے ساتھ کویت کے انضمام کا اعلان کر دیا۔ اپنے اعلان کے مطابق، اب صدام حسین اس مشترک ملک کے صدر ہیں۔ عراقی حکومت نے کویتی افسروں کو پکڑا اور انھیں بغداد لے جا کر گولی مار دی۔ بہت سی سرکاری عمارتوں کو بم سے اڑا دیا۔ ان کے سفاکانہ عمل سے صرف کویت کا تیل اور اس کے متعلقات بچے ہیں۔ کویت کی زمین کے نیچے دنیا کے محفوظ تیل کے ذخیرے کا ۲۰ فیصد حصہ موجود ہے اور صدام حسین کو اس تیل کی شدید ضرورت ہے۔ کیوں کہ وہ عراق۔ ایران جنگ (۸۸۔ ۱۹۸۰) میں تقریباً ۵۰ بلین ڈالر کے مقروض ہو چکے ہیں۔ ۹ اگست کو اگرچہ اقوام متحدہ نے متفقہ طور پر اس انضمام کو خلاف قانون اور کالعدم قرار دیا ہے اور امریکہ نے اپنی فوجیں کویت سے ملی ہوئی سعودی سرحد پر اتار دی ہیں۔ مگر صورت حال

ابھی تک غیر یقینی نظر آتی ہے۔

واشنگٹن میں کویت کی عالی شان ایمبیسی ہے۔ ایک امریکی صحافی اس ایمبیسی میں گیا۔ اس سلسلہ میں اس نے بڑی سبق آموز رپورٹ تیار کی جو ہندستان ٹائمس (۱۰ اگست ۱۹۹۰) میں صفحہ ۱۳ پر نقل کی گئی ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ کویت کے سفیر شیخ سعود الناصر الصباح (۴۵ سال) اس شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو ۲۵۶ سال سے کویت پر حکومت کر رہا تھا۔ اس خاندان کے تقریباً ایک ہزار افراد ہیں اور یہی حکومت کے تمام اعلا شعبوں پر قابض ہیں۔

امریکی صحافی کی ملاقات ایمبیسی میں سفیر کے صاحبزادہ نواف سے ہوئی جو پرنسٹن یونیورسٹی کے ایک طالب علم ہیں۔ چند دن پہلے تک وہ کویت کی حکمراں فیملی کے ایک خوش قسمت فرد تھے۔ مگر آج وہ زمین پر اپنے آپ کو بے جگہ محسوس کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے ملک میں واپس جائیں۔ اگر ضرورت ہو تو وہ کویت کے لئے لڑ کر مر جائیں گے۔ انھوں نے جذبات سے بھری ہوئی آواز میں کہا کہ ایک ملک کے بغیر میرا کوئی انسانی وجود نہیں:

Without a country, I am not a man.

اس کو پڑھ کر میں نے سوچا کہ شہزادہ نواف نے اس وقت بظاہر صرف ملک کھویا ہے۔ بقیہ تمام چیزیں اب بھی ان کے پاس موجود ہیں۔ پھر آخرت میں انسان کا حال کیا ہوگا جب وہ اپنا ملک بھی کھودے گا اور اسی کے ساتھ بقیہ تمام چیزیں بھی۔

۱۴ اگست ۱۹۹۰

لاہور سے ایک ماہنامہ "اشراق" کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ اگست ۱۹۹۰ میں شذرات (اڈیٹوریل) کے تحت درج ہے: "پاکستان میں سیاسی خود مختاری حاصل کر لینے کے بعد ہمارا فرض ہے کہ ہم یہاں اپنے نظام پر دین حق کی بالادستی قائم کریں۔ ہر حکم جو قرآن میں ہے اسے بہر حال نافذ قرار پانا چاہئے۔ اس قوم کی معیشت، معاشرت، سیاست، قانون، تہذیب، ثقافت ہر چیز کو لازماً ان اصول وضوابط کا تابع ہونا چاہئے جو قرآن وسنت میں بیان ہوئے ہیں۔ اسی طرح یہاں وہ انقلاب برپا ہوگا جس کو اسلامی انقلاب کہا گیا ہے" صفحہ ۴

پاکستان کے تمام اسلام پسند اسی بات کو ایک یا دوسرے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

مگر یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اسلامی نظام کا قیام، پاکستان کے قیام کا اگلا مرحلہ نہیں ہے۔ اسلامی نظام کا قیام، ایمان کے قیام کا اگلا مرحلہ ہے۔

پاکستان کے اسلام پسندوں نے یہ ترتیب اختیار کی کہ پہلے ایک علیحدہ خطۂ زمین (پاکستان) حاصل کرو، اس کے بعد وہاں اسلامی نظام قائم کرو۔ یہ ترتیب بالکل لغو ہے۔ صحیح ترتیب یہ ہے کہ پہلے افراد کے اندر ایمانی انقلاب لاؤ، اس کے بعد ملک کے نظام میں وہ ہر چیز برپا ہوگی جس کو اجتماعی انقلاب کہا جاتا ہے۔

پاکستان کے لوگ جس ترتیب سے کام کرنا چاہتے ہیں، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کو جاہل رکھے۔ اس کے بعد وہ بازار میں ایک دکان لے اور اس پر "کلنک" کا بورڈ لگا کر اپنے جاہل بیٹے سے کہے کہ میں نے دکان حاصل کر لی ہے، اب تم وہاں باقاعدہ مطب شروع کر دو۔

۱۵ اگست ۱۹۹۰

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اکتوبر ۱۹۸۹ سے باقاعدہ وائس چانسلر کے بغیر ہے۔ وہ ایکٹنگ وائس چانسلر کے اوپر چل رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کا پرشور مطالبہ ہے کہ وہ کسی "بیوروکریٹ" کو وائس چانسلر کی حیثیت سے قبول نہیں کریں گے۔ جب کہ مسلمانوں میں قحط الرجال کا عالم یہ ہے کہ بیوروکریٹوں کو اگر چھوڑ دیا جائے تو وائس چانسلر کے لئے پانچ ناموں کا وہ "پینل" نہیں بنتا جو صدر جمہوریہ کے پاس از روئے قاعدہ بھیجنا ضروری ہے (تفصیل کے لئے: سید حامد آئی اے ایس کا مضمون جو تین قسطوں میں قومی آواز ۱۲-۱۳-۱۴ اگست ۱۹۹۰ میں چھپا ہے)

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ حقائق سے بے خبر رہتے ہیں۔ انھیں صرف سطحی ظواہر دکھائی دیتے ہیں جن پر وہ بے معنی ہنگامہ کرتے ہیں۔ اسی کی ایک مثال مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر میں صرف ذاتی اہلیت کو دیکھنا چاہئے، نہ یہ کہ وہ بیوروکریٹ ہے یا ٹکنوکریٹ۔ سرسید احمد خاں مسلم یونیورسٹی کے بانی تھے، وہ خود ایک بیوروکریٹ تھے۔ اولاً مغل سلطنت اور اس کے بعد برطانی سلطنت میں وہ ۴۰ سال تک

ملازمت کرتے رہے۔ سرسید کے نہایت اہم ساتھیوں میں بھی کئی بیورو کریٹ تھے مثلاً محسن الملک اور وقار الملک۔ اس قسم کے لایعنی ہنگاموں نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو جو نقصان پہنچایا ہے وہ "دشمنوں" کے پہنچائے ہوئے نقصانات سے ہزاروں گنا زیادہ ہے۔

۱۶ اگست ۱۹۹۰

ندوہ (لکھنؤ) سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکلتا ہے جس کا نام "تعمیر حیات" ہے۔ اس کے صفحہ اول پر جلی حرفوں میں مولانا سید سلیمان ندوی کی ایک عبارت سیرۃ النبی (جلد ۶) سے نقل کی گئی ہے۔ اس کا پہلا جملہ یہ ہے: "حقیقت میں نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعلیم محمدی نے اخلاق کی اہمیت کو عبادات سے بھی زیادہ بڑھا دیا ہے"۔

اسی طرح کوئی کہتا ہے کہ اسلام میں عبادت سے بھی زیادہ اہمیت علم کی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اسلام میں عبادت سے بھی زیادہ اہمیت حکومتی انقلاب کی ہے۔ وغیرہ۔

اس قسم کی باتیں کہنے کا سبب یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن میں عبادت کا جو تصور ہے اس کے لحاظ سے عبادت انھیں علم اور اخلاق اور اقتدار سے کم تر محسوس ہوتی ہے۔ وہ عبادت کو مراسم ظاہری کا ایک مجموعہ سمجھتے ہیں۔ اس تقابل میں ان کو عبادت چھوٹی چیز دکھائی دیتی ہے اور دوسری چیزیں بڑی معلوم ہوتی ہیں۔

مگر یہ تقابل غلط ہے اور اس غلطی کا سرچشمہ عبادت کا ناقص تصور ہے۔ عبادت اپنی حقیقت کے اعتبار سے عظیم تر فعل ہے۔ عبادت ظاہری حرکات وسکنات کا مجموعہ نہیں۔ وہ خداوند ذو الجلال کی معرفت سے پیدا ہونے والا عمل ہے۔ عبادت اگر حقیقی طور پر کسی شخص کی زندگی میں آجائے تو اس کے نتیجہ میں ہر دوسری چیز اپنے آپ آجاتی ہے۔ مذکورہ عبارت میں صاحب تحریر نے اخلاق کا تقابل عبادت سے کیا ہے۔ مگر زیادہ صحیح لفظوں میں یہ اخلاق کا تقابل عبادت کے ظاہری ڈھانچہ سے ہے۔

۱۷ اگست ۱۹۹۰

عراق کی آمدنی کا ۹۵ فیصد ذریعہ تیل کی قدرتی دولت ہے۔ عراق کے موجودہ فوجی صدر صدام حسین نے ۱۹۵۸ میں شاہ کے خلاف فوجی انقلاب کرکے عراق پر قبضہ کرلیا۔ صدام

حسین نے عراق کو زرعی یا صنعتی ترقی نہیں دی۔ البتہ اس کی تیل کی دولت سے مضبوط فوج بنالی۔ ایران کے خلاف ناکام جنگ (۸۸ - ۱۹۸۰) میں عراق کا ۱۲۰ بلین ڈالر کا نقصان ہوا۔ وہ ۸۰ بلین ڈالر کا مقروض ہو گیا۔ دونوں طرف کے ایک ملین آدمی مارے گئے۔ مگر صدام حسین کو عرب لیڈر بننے کا جنون ہے۔ چنانچہ انھوں نے ۲ اگست ۱۹۹۰ کو پڑوسی ملک کویت میں ایک لاکھ سے زیادہ فوج داخل کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ آجکل امریکہ کی قیادت میں مختلف ممالک کی فوجیں عراق کی ناکہ بندی کئے ہوئے ہیں۔

اخبارات میں آجکل روزانہ صدام حسین کے بارہ میں خبریں ہوتی ہیں۔ ہندستان ٹائمس (۱۷ اگست ۱۹۹۰) میں انگریزی صحافی فرینکل (Glenn Frankel) کی ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس نے لندن میں مقیم عراقیوں سے مل کر یہ رپورٹ مرتب کی ہے۔ ان عراقیوں کا کہنا ہے کہ عراق میں فوجیوں اور غیر فوجیوں میں کثرت سے صدام حسین کے مخالف ہیں۔ مگر صدام حسین نے نہایت بے رحمانہ انداز میں انھیں کچل دیا ہے۔

ریاض ابراہیم ایک عراقی تھے۔ انھوں نے لندن میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۸۲ میں وہ عراقی حکومت میں ہیلتھ منسٹر مقرر ہوئے۔ اس زمانہ میں عراق ایران کی جنگ کا مسئلہ عراق کے لئے پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا۔ امن کی بات چیت کے لئے ایران کی شرط یہ تھی کہ پہلے صدام حسین کو صدارت سے ہٹایا جائے۔ ان حالات میں بغداد میں ایک کیبنٹ میٹنگ ہوئی۔ صدام نے لوگوں کے سامنے یہ سوال رکھا کہ ایسی حالت میں کیا کیا جائے۔

ابتداءً تمام منسٹروں نے یہ کہا کہ صدام حسین کو صدارت کے عہدے پر قائم رہنا چاہئے۔ صدام نے آخر میں پیش کش کی کہ میں صدارت سے استعفا دے دوں تاکہ ایران سے امن کی بات چیت شروع ہو سکے۔ اس موقع پر ریاض ابراہیم نے یہ تجویز پیش کی کہ صدام حسین عارضی طور پر صدارت کے عہدے سے ہٹ جائیں۔ یہاں تک کہ امن کا معاہدہ (Peace Accord) فائنل ہو جائے۔ صدام حسین نے ریاض ابراہیم کا شکریہ ادا کیا۔ مگر اس کے بعد ہی صدام نے حکم دیا کہ انھیں گرفتار کر لیا جائے۔ اس کے بعد ریاض ابراہیم کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اور ان کی لاش ایک کالے تھیلے میں بھر کر ان کے گھر کے سامنے پھینک دی گئی۔

۱۸ اگست ۱۹۹۰

ایک صاحب سے گفت گو کے دوران میں نے کہا کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ اسلام میں جنگ کسی اتفاقی سبب سے آتی ہے، وہ اسلام کا کوئی مستقل حصہ نہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے تو اسلام کو بھکشوؤں کا مذہب بنا دیا۔

یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا عام ذہن ہے۔ ان مسلمانوں کو نہ تو قرآن والے دین کا پتہ ہے اور نہ انھیں جدید کی کوئی خبر ہے۔ وہ صرف اسلام کے فاتحانہ قصوں کو جانتے ہیں جن کو وہ شاعرانہ اور خطیبانہ انداز میں پڑھتے اور سنتے رہے ہیں۔ ان حالات نے مسلمانوں کی ذہن سازی کے کام کو پہلا کام بنا دیا ہے، مگر یہی وہ کام ہے جس کا آج کہیں وجود نہیں۔ آج مسلمانوں میں بے شمار سرگرمیاں جاری ہیں، مگر کوئی بھی ایسی نہیں جس کو ذہن سازی کی مہم کہا جا سکے۔

۱۹ اگست ۱۹۹۰

ہندستان ٹائمس کے شمارہ ۱۵ اگست ۱۹۹۰ میں ڈاکٹر گوپال سنگھ (۱۹۹۰ - ۱۹۱۷) کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ تقسیم (۱۹۴۷) کے وقت ضلع گورداسپور میں ۵۰ فیصد سے کچھ کم کی آبادی میں مسلمان نصف سے کچھ زیادہ (50.4 per cent) اور ہندو نصف سے کچھ کم (49.6 per cent) تھے۔

اب سوال یہ تھا کہ گرداسپور کو انڈیا سے ملایا جائے یا پاکستان سے۔ باؤنڈری کمیشن کے واحد ممبر (Mr. Radcliffe) کو ہندو نمائندہ نے مسلم علما کا فتویٰ دکھایا جس میں قادیانیوں کو کافر اور اسلام سے خارج قرار دیا گیا تھا۔ اس کے مطابق، گورداسپور کے قادیانیوں کو مسلم تعداد سے الگ کر دیا۔ اور پھر گورداسپور کو انڈیا سے ملا دیا گیا۔ یہی گورداسپور ہے جس نے انڈیا کو کشمیر کے لئے راستہ (Road link) دیدیا۔ ورنہ انڈیا کے لئے کشمیر تک پہنچنا ہی ناممکن تھا۔

مسلم علما کی تکفیر بازی کے مشغلہ نے ملت اسلام کو بے شمار نقصان پہنچائے ہیں، انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے۔

۲۰ اگست ۱۹۹۰

میری عمر جب ۱۵ سال تھی۔ اس وقت ستمبر ۱۹۳۹ میں جرمن ڈکٹیٹر ہٹلر نے اپنی فوجیں پولینڈ

میں داخل کر دیں اور نہایت تیزی سے پولینڈ پر قبضہ کر لیا۔ مجھے یاد ہے کہ اچانک ایک دن انگریزی اخبار (پانیر) میں صفحہ اول کی پہلی سرخی یہ تھی :

پولینڈ جرمنی کے قبضہ میں

اب پچاس سال بعد ۲ اگست ۱۹۹۰ کو اچانک یہ خبر ساری دنیا میں پھیل گئی کہ عراق کے حکمراں صدام حسین نے ایک لاکھ طاقتور فوج کویت کے اندر داخل کر دی اور اس پر قبضہ کرکے اس کو عراق میں شامل کر دیا۔ ٹائمس آف انڈیا کا عنوان ہے :

Iraq overruns Kuwait.

آجکل روزانہ اخبارات کے صفحۂ اول کی سب سے اہم سرخی یہی ہوتی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ دنیا میں سب سے کم جو چیز ہے وہ ہے تاریخ سے سبق لینا۔

۲۱ اگست ۱۹۹۰

مالدیپ کے ایک سفر میں میری ملاقات احمد دیدات صاحب سے ہوئی۔ وہ ساؤتھ افریقہ میں رہتے ہیں۔ اور عیسائیوں سے مناظرہ کرکے انھوں نے کافی شہرت حاصل کی ہے۔ عربوں سے انھیں کافی مالی تعاون ملا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ساؤتھ افریقہ میں اپنا ایک بہت بڑا سنٹر قائم کر لیا ہے۔

مالدیپ کے ایک ہوٹل میں احمد دیدات صاحب کو میں نے ایک بار دیکھا کہ وہ کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے قریب کی کرسی خالی تھی۔ میں بھی وہاں جاکر بیٹھ گیا۔ بات چیت کے دوران میں نے کہا کہ ایک سوال میں اکثر لوگوں سے کرتا ہوں وہی سوال میں آپ سے بھی کر رہا ہوں۔ آپ اس کے بارے میں مجھے کچھ بتائیں۔ پھر میں نے کہا کہ مجھے بتائیے کہ آپ کی خاص دریافت (Discovery) کیا ہے۔

انھوں نے میرے سوال کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اور کسی قدر غیر سنجیدہ انداز میں اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا : یہ سب موشگافی (Hair splitting) ہے۔ میں نے اس کے بعد ان سے مزید گفتگو نہ کی۔ کیوں کہ میں نے محسوس کیا کہ اس قسم کا سوال ان کی شعوری سطح سے باہر کی چیز ہے۔

عجیب بات ہے کہ موجودہ مسلمانوں کو گہرے سوالات سے کوئی دلچسپی نہیں۔

۲۲ اگست ۱۹۹۰

ایک عربی پرچہ میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس میں بتایا گیا تھا۔ سوڈان کے جنوبی علاقہ میں کس طرح مسیحی مبلغین مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں سرگرم ہیں۔ جنوبی سوڈان میں ۱۸ فیصد مسلمان ہیں۔ ۷ فیصد مسیحی ہیں اور بقیہ بت پرست ہیں۔ عیسائی مبلغین کا کام زیادہ تر انھیں مسلمانوں میں ہورہا ہے۔ یہ مسلمان بیشتر بے پڑھے لکھے اور غریب ہیں۔ چنانچہ مضمون کا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا گیا تھا کہ مسیحی مبلغین سیدھے سادے مسلمانوں کا استحصال کر رہے ہیں:

النصاریٰ یستغلون البُسَطاء

مسیحی مبلغین کے سلسلہ میں مسلمان اکثر اسی قسم کی بات کرتے ہیں۔ مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ اس لئے کہ اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو یہی بات خود مسلم مبلغین پر بھی اسی طرح صادق آتی ہے۔ قرآن میں ہے کہ پیغمبر کی تبلیغ پر جو لوگ ایمان لائے ان کو اہل شرک اَرَاذِلُنَا کہتے تھے ۔ ہندستان میں جن ہندوؤں نے اسلام قبول کیا وہ زیادہ تر نچلی سطح کے لوگ تھے۔ اونچی ذات کے ہندوؤں نے بہت کم اسلام قبول کیا۔ امریکہ میں آجکل بہت سے لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں مگر وہ سب زیادہ تر سیاہ فام (Black Americans) ہوتے ہیں جو امریکہ کا سب سے زیادہ پست طبقہ شمار ہوتا ہے۔ وغیرہ

۲۳ اگست ۱۹۹۰

سعودی عرب کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۳ صفر ۱۴۱۱ھ ، ۲۳ اگست ۱۹۹۰) میں ایک عرب اہل قلم یوسف البدری کا مضمون چھپا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے بتایا ہے کہ جس زمانہ ایران اور عراق کے درمیان جنگ جاری تھی ، اس زمانہ میں خمینی کے حامیوں کا کہنا تھا کہ قدس کا راستہ بغداد ہو کر جاتا ہے۔ (الطریق الی القدس یمرّ ببغداد) دوسری طرف صدام کے حامی یہ نعرہ لگا رہے تھے کہ قدس کا راستہ تہران ہو کر جاتا ہے (الطریق الی القدس یمرّ بطہران)

ایران و عراق کی جنگ ۸ سال (۱۹۸۸ - ۱۹۸۰) باہمی کشت و خون کے بعد ختم ہو گئی ۔ قدس تک پہنچنے کا کارنامہ نہ امام خمینی انجام دے سکے نہ صدام حسین۔ اب صدام نے دوبارہ اپنے

پڑوس کے مسلم ملک کویت پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ دوبارہ صدام اور ان کے حامیوں کا نعرہ ہے کہ قدس کا راستہ کویت ہو کر جاتا ہے (الطریق الی القدس یمر بالکویت)

اس قسم کے الفاظ صرف یہ ثابت کرتے ہیں کہ مسلم حکمرانوں کو قدس کی بازیابی سے کوئی حقیقی دلچسپی نہیں۔ ان کا واحد مقصد صرف یہ ہے کہ قدس کا نام لے کر مسلمانوں کا استغلال کریں اور ان کے اوپر اپنی قیادت قائم کریں۔

۲۴ اگست ۱۹۹۰

پاکستانی تحریک کے لیڈر مسٹر محمد علی جناح نے ۲۷ مارچ ۱۹۴۷ کو میمن چیمبر آف کامرس، بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا: پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ اور برادرانہ سلوک کیا جائے گا۔ اس کے ثبوت میں ہماری تاریخ شاہد ہے۔ اسلامی تعلیمات نے ہم کو یہی سکھایا ہے (نوائے وقت ۲۱ اگست ۱۹۹۰)

مسٹر جناح نے جس "منصفانہ اور برادرانہ" سلوک کا دعوی غیر مسلموں کے بارہ میں کیا تھا وہ سلوک پاکستان کے لوگ خود اپنے مسلم بھائیوں سے بھی نہ کر سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کا اقتدار "اسلامی تاریخ" کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی ایک زوال یافتہ نسل کے ہاتھ میں ہے۔ تاریخ کے الفاظ تاریخ کے صفحات سے نکل کر کبھی واقعہ نہیں بنتے۔ یہ دراصل افراد ہیں جو واقعات کو ظہور میں لاتے ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے تمام قائدین نے یہی کیا کہ وہ تاریخ کا حوالہ دے کر شاندار تقریریں کرتے رہے۔ ان میں سے کسی نے بھی موجودہ مسلم نسلوں کی ذہنی تعمیر اور اخلاقی اصلاح کے لئے کوئی حقیقی کوشش نہ کی۔

۲۵ اگست ۱۹۹۰

۱۹۸۹ کے لئے امن کا نوبیل انعام دلائی لاما کو دیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ملنے والی رقم کو انھوں نے فوراً غریبوں کے لئے وقف کر دیا۔ نوبیل انعام کے بعد ۱۹۹۰ میں امریکہ سے ایک کتاب موجودہ دلائی لاما کے بارہ میں چھپی ہے جو چودھویں دلائی لاما ہیں۔ یہ خوبصورت کتاب ۱۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا نام ہے:

The Dalai Lama: A Policy of Kindness

اس کتاب میں مائیکل گڈ مین (Michael Goodman) کا ایک تبصرہ دلائی لاما کے بارہ میں نقل کیا گیا ہے۔ اس نے دلائی لاما کے حلیہ کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ بات کہ دلائی لاما کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ مصیبت کے سامنے بھی مسکرا ئیں جس کا تجربہ انھیں پچھلے تیس برسوں سے ہو رہا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے آدمی ہیں جس نے اندرونی امن کو پالیا ہے :

That he is able to laugh in the face of adversity after all he has experienced during the past three decades, suggests that he is a man who has found inner peace.

داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کی زیادتیوں کو نظر انداز کرے۔ اس کا ایسا کرنا دوسروں کی نظر میں اس کی یہ تصویر بناتا ہے کہ وہ ایک پایا ہوا انسان ہے نہ کہ کھویا ہوا انسان ۔

۲۶ اگست ۱۹۹۰

عبد الہادی علیم (۷۰) بستی کے رہنے والے ہیں۔ پچھلے رمضان میں وہ بمبئی سے بستی جانے کے لئے ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔ ایک ہندو نوجوان سے ٹرین میں ملاقات ہوئی۔ وہ کانپور کا رہنے والا تھا۔ اس کا نام و پتہ یہ ہے :

Jetandra Gupta
405/8, Shastri Nagar, Kanpur 208 005

گفتگو کے دوران ہندو نوجوان نے کہا کہ ہم کو مسلمانوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ البتہ ہم کو ان مسلمانوں سے نفرت ہے جو ہندستان میں رہ کر پاکستان کی بات کرتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ ابھی کانپور میں ایک مسلمان نے کہا کہ آنے والے کرکٹ میچ میں اگر پاکستان ہار گیا اور ہندستان جیت گیا تو میری عید کی ساری خوشی ختم ہو جائے گی۔

یہ بات بالکل صحیح ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی اسی قسم کی نادانیوں نے اس ملک میں ہندو مسلم مسئلہ پیدا کیا ہے۔ دوسری کوئی چیز اس کا سبب نہیں۔

۲۷ اگست ۱۹۹۰

عراق کے حکمراں صدام حسین نے ۲ اگست کو فوجی کارروائی کرکے کویت پر قبضہ کرلیا۔ قاہرہ کی جامعۃ الازہر کے شیخ جادالحق نے اس کو غدر قرار دیا اور کہا کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ صدام حسین سے جنگ کریں۔ مصر کے مفتی اعظم محمد سید طنطاوی نے بھی شیخ الازہر کی تائید کی۔ اسی طرح ہندستان اور دوسرے تمام ملکوں کے علما نے صدام کے خلاف سخت بیانات دئے ہیں۔ دوسرا طبقہ جو صدام حسین سے برہم ہے وہ ملوک کا طبقہ ہے۔ ان کے علاوہ عرب عوام کی اکثریت صدام حسین کے اقدام پر خوش ہے۔

ملوک کی برہمی اس لئے ہے کہ ان کا اقتدار چھن رہا ہے۔ علما کے ردعمل کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تمام دنیا کے علما انھیں ملوک کے مالی تعاون پر زندہ ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ عرب عوام کی رائے ان سے مختلف کیوں ہے۔

ٹائم میگزین (۲۷ اگست ۱۹۹۰) کی ٹیم عرب ملکوں میں گئی اور وہاں اس نے براہ راست ربط کے ذریعہ عرب عوام کا تاثر معلوم کیا۔ اس کی رپورٹ یہ ہے کہ عرب عوام کے اوپر سب سے زیادہ جو احساس چھایا ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ یہودی اور عیسائی قوموں نے ان کے قومی وقار کو مجروح کیا ہے۔ وہ اپنی اس عظمت کو واپس لانا چاہتے ہیں جو ماضی میں انھیں حاصل تھی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ صدام حسین اگر طاقتور ہو جائے تو وہ عرب عظمت کو دوبارہ واپس لائے گا۔ چنانچہ وہ صدام حسین کو صلاح الدین ایوبی کا ظہور ثانی (Reincarnation) سمجھتے ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ عرب یوسف کواش نے ٹائم کے نامہ نگار سے کہا کہ میں کسی بھی عرب قائد کو پسند کروں گا جو عربوں کو متحد کر دے، خواہ بذریعہ طاقت۔ ہم ایک بڑی عرب سلطنت دیکھنا چاہتے جو ہمارے کلچر کو قدیم عظمت پر قائم کر دے:

I love any Arab Leader who will unite the Arabs, even by force. We want to see one empire restoring our culture to its former glory (p. 20).

۲۸ اگست ۱۹۹۰

ڈاکٹر گوپال سنگھ گوا اور ناگالینڈ کے گورنر تھے۔ گورنر کی حیثیت سے ان کو اپنی حکومت

کی طرف سے بہت سے تلخ تجربات ہوئے جن کا ذکر انھوں نے اپنے مضمون مطبوعہ ہندستان ٹائمس (۱۲ اگست ۱۹۹۰) میں کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ہندستان کی سیاست میں منافقت اتنی بڑھ گئی ہے کہ اب کسی کی بات کا کوئی اعتبار نہیں۔ مثلاً ایک بار ایک مرکزی وزیر نے مجھ سے نہایت عمدہ باتیں کیں اور چند ہی دن بعد مرکز سے یہ حکم موصول ہوا کہ یا تو استعفا دو، ورنہ برخاست کر دیا جائے گا۔ انھوں نے اپنے انگریزی مضمون میں اردو کا یہ شعر نقل کیا ہے:

آگے کانٹوں سے ڈر لگتا تھا   اب پھولوں سے ڈر لگتا ہے

جس ملک میں گورنر کا یہ حال ہو، وہاں عام انسان کی حالت کیا ہوگی، اسی واقعہ سے اس کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

۲۹ اگست ۱۹۹۰

ٹائمس آف انڈیا (۲۹ اگست ۱۹۹۰) میں ایک خبر عمان کے اخبار (Jordan Times) کے حوالہ سے چھپی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ یکم اگست اور ۲ اگست ۱۹۹۰ کی درمیانی رات کو ۱۲ بجکر ۱۰ منٹ پر کویت کے امیر شیخ الصباح کے محل میں یہ خبر پہنچی کہ عراق کی فوجیں کویت میں داخل ہوگئی ہیں۔ امیر کویت نے اپنے محکمۂ خفیہ سے پوچھا تو وہ اس پوزیشن میں نہ تھا کہ اس خبر کی تصدیق یا تردید کرسکے۔ مصری ذرائع نے کہا کہ حملہ اتنا طاقت ور ہے کہ اس کا مقابلہ کویت کے لئے ممکن نہیں۔ چنانچہ الصباح فیملی کے افراد کاروں اور ہیلی کاپٹروں کے ذریعہ سعودی عرب اور بحرین پہنچ گئے۔

یہ خبر اگر صحیح ہے تو بے حد تعجب خیز ہے۔ کویت ایک انتہائی چھوٹا ملک ہے۔ تاہم اس کے پاس دولت کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اگر ان کا انٹلی جنس کا محکمہ اتنا کمزور تھا تو آخر وہ کس لئے قائم تھا اور وہ کیا کر رہا تھا۔

۳۰ اگست ۱۹۹۰

پاکستانی اخبارات نہایت فخر کے ساتھ مسٹر محمد علی جناح کا یہ جملہ نقل کرتے ہیں۔ انھوں نے ۱۴ جولائی ۱۹۴۷ کو ایک پریس کانفرنس میں غیر مسلم صحافیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا: جب آپ جمہوریت کی باتیں کرتے ہیں تو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ آپ نے اسلام کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ ہم نے جمہوریت تیرہ سو سال پہلے سیکھ لی تھی۔ (نوائے وقت، ۱۳ اگست ۱۹۹۰)

پاکستان بننے کے بعد "اسلامی جمہوریت" ایک دن کے لئے بھی پاکستان میں قائم نہ ہوسکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں جمہوریت اس طرح قائم نہیں ہوسکتی کہ تیرہ سو سال پہلے کی تاریخ اپنے آپ آکر یہاں نافذ ہوجائے۔ پاکستان میں جمہوریت کو وہاں کے موجودہ مسلم باشندے نافذ کریں گے اور پاکستان کے موجودہ باشندے اپنے زوال کے بدترین دور میں ہیں۔ وہ ایک مردہ قوم ہیں، اور مردہ قوم کبھی کوئی زندہ کارنامہ انجام نہیں دیتی۔

۳۱ اگست ۱۹۹۰

لیوس ویلس (Lewis Wallace) ۱۸۲۷ میں پیدا ہوا۔ ۱۹۰۵ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا ایک قول ہے کہ کسی آدمی کی سب سے زیادہ آزمائش کا وقت وہ ہوتا ہے جب کہ بہت زیادہ خوش قسمتی اس کے حصہ میں آگئی ہو:

A man is never so on trial as in the moment of excessive good-fortune.

مشکل حالات میں آدمی کے لئے بہکنے کا اندیشہ نسبتاً کم رہتا ہے۔ لیکن اگر آدمی کو بڑی کامیابی حاصل ہوجائے تو بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ بہکنے سے بچ جائے۔

اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ یہاں کوئی اچھی چیز بہت زیادہ دیر تک کسی ایک شخص یا ایک گروہ کے پاس نہ رہے۔ جوانی کچھ دنوں کے بعد ڈھل جاتی ہے۔ دولت کبھی آتی ہے اور کبھی چلی جاتی ہے۔ سیاسی اقتدار بار بار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جاتا رہتا ہے۔ کبھی کسی ایک کا دور دورہ رہتا ہے اور کبھی کسی دوسرے کا۔

یہ بگاڑ کے خلاف ایک فطری چیک ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ لوگ ایک حد کے اندر رہیں۔ لوگ بہت زیادہ بگڑنے نہ پائیں۔

مزید یہ کہ یہ صورت حال آدمی کی ذاتی اصلاح کے لئے بہت زیادہ معاون ہے۔ حالات کی تبدیلی بار بار لوگوں کو سبق دیتی ہے۔ اس سے ہر آدمی کو یہ موقع ملتا رہتا ہے کہ وہ اپنی حیثیت واقعی کو جانے۔ وہ اپنے آپ کو سرکشی اور غرور سے بچائے۔ وہ اس حقیقت سے آشنا ہو کہ اس دنیا میں حالات کا سرا اس کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اختیار اور عظمت کا مالک صرف خدا ہے۔ اس کے سوا کسی اور کے لئے نہ حقیقی عظمت ہے اور نہ حقیقی اختیار۔

یکم ستمبر ۱۹۹۰

ڈاکٹر شمس الآفاق صاحب نے کہا کہ عراق کے صدام حسین نے ایران کے ساتھ اپنے تمام جھگڑے ختم کر دئے ہیں ــــــ پانچ ہزار ایرانی قیدیوں کو واپس کر دیا۔ زیر قبضہ ایرانی علاقوں کو خالی کر دیا۔ شط العرب کے بارہ میں اپنا مطالبہ ختم کر دیا۔ صدام حسین کا یہ اقدام "صلح حدیبیہ" والی تکنیک کی مثال ہے۔ انھوں نے کہا کہ صدام حسین کا منصوبہ یہ ہے کہ وہ کویت، سعودی عرب اور دوسرے ممالک پر قبضہ کر کے ایک عظیم مسلم سلطنت بنائے اور پھر یہودیوں اور عیسائیوں سے مسلم دنیا کو پاک کرے۔

یہ صرف ڈاکٹر آفاق صاحب کی بات نہیں۔ آجکل مسلم دنیا کے بیشتر لوگ اسی انداز میں سوچتے ہیں۔ چنانچہ ملوک کو چھوڑ کر بیشتر مسلمان صدام حسین کے حامی ہیں۔ وہ صرف امریکہ سے کہہ رہے ہیں کہ تم عرب دنیا سے اپنی فوجیں واپس لے جاؤ۔ وہ صدام حسین سے یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ وہ کویت سے اپنی فوجیں واپس بلالے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کویت پر صدام حسین کے قبضہ کو مسلمان قدیم سلطنت بغداد کے احیاء کی طرف اقدام سمجھتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسلمان کس قدر خوش فہم ہیں۔ مسلمان اپنی خوش فہمی میں بے وقوفی کی حد تک پہنچ چکے ہیں۔ دور عباسی کی سلطنت بغداد کا احیاء حقائق تاریخی کو جمع کرنے سے ہوگا، وہ کویت پر قبضہ کرنے سے نہیں ہوگا۔ صدام حسین کے موجودہ اقدام سے مسلم دنیا کو کچھ ملنے والا نہیں۔ البتہ اس کو جو کچھ حاصل ہے، اس کا ایک حصہ وہ ضرور کھو دیں گے۔

۲ ستمبر ۱۹۹۰

مولانا انیس لقمان ندوی نے بتایا کہ مالیگاؤں میں ایک انگریزی تعلیم یافتہ ہیں۔ انگریزی میں ان کا اچھا مطالعہ ہے مگر وہ فکر کے اعتبار سے ایک سیکولر آدمی ہیں۔ انیس لقمان صاحب نے ان کو میری کچھ کتابیں پڑھنے کے لئے دیں۔ پڑھنے کے بعد انھوں نے کہا کہ میں برٹرینڈ رسل کے انداز تحریر سے بہت متاثر تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس انداز پر لکھنے والا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ مگر یہ کتابیں عین اسی انداز پر لکھی گئی ہیں۔

میں نے کہا کہ برٹرینڈ رسل اگرچہ ایک ملحد آدمی تھا۔ مگر اس کی تحریر میں ایک خاص صفت

ہوتی ہے جو نہ انگریزی میں کسی کے یہاں ہے اور نہ اردو یا عربی میں۔ اس اسلوب کو ایک لفظ میں، ترتیب حقائق (Arrangement of facts) کہہ سکتے ہیں۔ عام طور پر لوگ بیانیہ انداز میں لکھتے ہیں جس کو بیان حقائق کہا جاسکتا ہے۔ ترتیب حقائق کے انداز میں لکھنے والا میرے علم میں برٹرینڈ رسل کے سوا اور کوئی نہیں۔

میرا انداز ترتیب حقائق کا انداز ہوتا ہے۔ مگر یہ برٹرینڈ رسل کی تقلید میں نہیں ہے۔ یہ میری فطرت اور کثرت مطالعہ سے بنا ہے۔

۳ ستمبر ۱۹۹۰

مدن کمیشن کی رپورٹ میں پسماندہ ذاتوں کے لئے گورنمنٹ سروسوں میں ۲۷ فی صد رزرویشن کی سفارش کی گئی ہے۔ اس کے خلاف آج کل متشددانہ تحریک چل رہی ہے۔ کچھ مسلمان وزیر اعظم وی پی سنگھ سے ملے اور کہا کہ مسلمانوں کو بھی سروسوں میں ریزرویشن دیا جانا چاہئے، کیوں کہ خود سرکاری جائزہ کے مطابق، مسلمان اس ملک میں اقتصادی اور تعلیمی اعتبار سے سب سے زیادہ پچھڑے ہوئے ہیں۔ وی پی سنگھ نے اس مانگ کو قابل لحاظ قرار دیا۔

اس پر بھارتیہ جنتا پارٹی کے پریسیڈنٹ مسٹر ایل کے ایڈوانی نے سخت رد عمل ظاہر کیا ہے۔ ہندستان ٹائمس (۳ ستمبر ۱۹۹۰) کی رپورٹ کے مطابق، انھوں نے کہا کہ مسلم اقلیت کو رزرویشن دینا ملک کو دوبارہ تقسیم کی اجازت دینے کے ہم معنی ہوگا:

It would invite unwanted second partition of the country.

اسی طرح مسٹر گری لال جین نے اس سے پہلے بابری مسجد۔ رام جنم بھومی تنازعہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کے مطالبہ کو ماننا ہندوؤں کے لئے دوسری شکست (second defeat) قبول کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ اور ہندو کبھی اس کے لئے راضی نہیں ہوسکتے۔

یہ ایک بے حد نازک صورت حال ہے۔ پاکستانی سیاست کے نتیجہ میں اس ملک میں جو صورت حال بنی ہے، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان اگر کسی معاملہ میں شدید ہوتے ہیں تو فوراً ہندو کے ذہن میں پچھلی تاریخ تازہ ہو جاتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ پارٹیشن پسند مسلمان اب سکنڈ پارٹیشن کا منصوبہ

بنا رہے ہیں۔ مسلمانوں کی اس قسم کی کسی کامیابی کو ہندو "سکنڈ ڈیفیٹ" کے ہم معنی سمجھنے لگتا ہے۔ اس صورت حال کا واحد علاج یہ ہے کہ مسلمان اس ملک میں مطالبہ کی سیاست بالکل ختم کر دیں۔ وہ محنت کی سیاست اختیار کریں۔

۴ ستمبر ۱۹۹۰

میری زندگی کی داستان بڑی عجیب ہے۔ میری پیدائش کے صرف پانچ سال بعد میرے والد کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد میں پورے معنوں میں یتیم ہوگیا۔ اس وقت سے اب تک میری زندگی مسلسل محرومی کی زندگی ہے۔ حتی کہ مجھے خیال ہوتا ہے کہ شاید دنیا میں کوئی شخص نہیں جس کو اتنا زیادہ محرومی کا تجربہ ہوا ہو۔

ایسا کیوں ہوا۔ میرے ان اعصاب شکن تجربات میں ایک پہلو ایسا ہے جس میں اس کا ایک جواب ملتا ہے۔ وہ یہ کہ دنیا کی ہر محرومی مجھ کو آخرت کی محرومی کی یاد دلاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے اندر کوئی چوکیدار بیٹھا ہوا ہے جو ہر تجربہ میں مجھ کو آخرت کی تصویر دکھاتا رہتا ہے۔ جو میرے ہر تجربہ کو اخروی تجربہ میں کنورٹ کر دیتا ہے۔ یہ میرے مزاج کی ایک انوکھی صفت ہے جو میں نے اپنے علم کے مطابق، کسی کے اندر نہیں پائی۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر بے شمار کام جاری ہیں۔ مگر "اعلان آخرت" کا اہم ترین کام ساری دنیا میں کہیں نہیں ہو رہا تھا۔ لوگ دنیا کی چھوٹی محرومیوں میں اتنا گم ہیں کہ انھیں آخرت کی بڑی محرومی کی خبر نہیں۔ مجھ کو دنیا کی محرومیوں میں شاید اس لئے ڈالا گیا تاکہ میں اس حقیقت کا شدت کے ساتھ احساس کروں اور لوگوں کے سامنے اس کا منذر بنوں۔ مجھ کو چھوٹی محرومی کا اس لئے تجربہ کرایا گیا تاکہ میں لوگوں کو بڑی محرومی کی چیتاونی دے سکوں۔

۵ ستمبر ۱۹۹۰

عرب لیگ ۱۹۴۵ میں قائم ہوئی۔ اس وقت اس کے دو درجن ممبر ہیں۔ مگر عرب ملکوں کے باہمی اختلاف نے عرب لیگ کو عملاً بے معنی بنا دیا ہے۔ ۲ اگست ۱۹۹۰ کو عراق نے کویت پر حملہ کر دیا اور اس پر قبضہ کرکے اس کو عراق میں شامل کر دیا۔ اس مسئلہ پر ۱۰ اگست کو قاہرہ میں عرب ملکوں کی کانفرنس ہوئی۔ مگر کوئی متفقہ فیصلہ نہ ہو سکا۔

عرب لیگ کے چارٹر کے مطابق ، وہی فیصلہ عرب لیگ کا فیصلہ کہا جائے گا جو تمام وابستہ عرب ملکوں کے اتفاق رائے سے کیا جائے گا۔ مصر کے اجلاس میں ۱۲ ملکوں نے مذمت کی قرارداد پر دستخط کی اور بقیہ ملک مختلف وجوہ سے اس پر دستخط نہ کر سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عرب برادری اس کھلی ہوئی جارحیت کے خلاف لفظی مذمت پر بھی متفق نہ ہو سکی۔ عملی طور پر عراق کا مقابلہ کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

امریکہ اور روس اور چین کے بعد صدام حسین کے پاس اس وقت سب سے بڑی فوج موجود ہے۔ اگر امریکہ اپنے حلیفوں کو لے کر مقابلہ پر نہ آگیا ہوتا تو اب تک صدام حسین کئی عرب ملکوں کو نگل چکے ہوتے۔ حتی کہ خود سعودی عرب کو بھی۔

۶ ستمبر ۱۹۹۰

آج کی خبروں میں سے ایک خبر، ٹائمس آف انڈیا، ۶ ستمبر ۱۹۹۰ کے مطابق یہ ہے کہ پی ایل او کے چیئرمین مسٹر یاسر عرفات کے ذاتی جہاز کو ابوظبی کے ہوائی اڈہ پر اترنے کی اجازت نہیں دی گئی حالاں کہ اس کا پٹرول بہت کم ہو گیا تھا :

The PLO Chairman, Mr. Yasser Arafat's personal jet was refused permission to land at Abu Dhabi although it was running short of fuel.

عراق کے حکمراں صدام حسین نے ۲ اگست کو کویت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد جب ساری دنیا کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ عراق فوراً کویت کو خالی کرے تو صدام حسین نے بیان دیا کہ اسرائیل فلسطین کے مقبوضہ علاقوں کو خالی کرے تو میں بھی کویت کو خالی کر دوں گا۔ اس بیان کے بعد تمام فلسطینی صدام حسین کے طرف دار ہو گئے۔ ہر ملک میں فلسطینیوں نے صدام کی موافقت میں مظاہرے شروع کر دئے۔ فلسطینیوں کے اس رویہ کی بنا پر عرب ممالک ان سے سخت بیزار ہو گئے ہیں۔ یاسر عرفات سعودی عرب کا دورہ کرنا چاہتے تھے۔ مگر سعودی ذمہ داروں نے ان کو اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

فلسطینی اس سے پہلے اپنی نادان سیاست کے نتیجہ میں مصر، شام، اردن، لبنان، ہر جگہ سے نکالے گئے تھے۔ تاہم اخلاقی ہمدردی پھر بھی پورے عالم عرب میں انھیں حاصل تھی۔

اور بے شمار مالی تعاون انھیں حاصل ہو رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے موجودہ رویہ کی بنا پر وہ عرب دنیا کی اخلاقی ہمدردی بھی کھو دیں گے۔

۷ ستمبر ۱۹۹۰

پاکستان کے ایک صاحب تشریف لائے۔ گفتگو کے دوران پاکستان کے سابق صدر جنرل ضیاء الحق صاحب کا ذکر آیا۔ انھوں نے ان کی اسلامیت کی تعریف کی۔ میں نے کہا کہ یہ بتائیے کہ آپ کے ارشاد کے مطابق جب وہ اتنے اسلامی تھے تو انھوں نے اپنا وعدہ کیوں نہیں پورا کیا۔ انھوں نے جب فوجی بغاوت کرکے حکومت پر قبضہ کیا تو انھوں نے کہا کہ میں صرف ریفری کے طور پر حکومت میں آیا ہوں۔ الیکشن کرانے کے بعد میں دوبارہ فوجی بیرک میں واپس چلا جاؤں گا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ۹۰ دن میں لازماً پاکستان میں الکشن کرائے جائیں گے۔ مگر انھوں نے الکشن نہیں کرایا اور ساڑھے گیارہ سال تک حکومت پر قابض رہے۔ یہاں تک کہ فضائی حادثہ میں ان کا خاتمہ ہو گیا۔

پاکستانی بزرگ نے کہا کہ اصل بات یہ ہوئی کہ پاکستان کی تمام جماعتوں (بشمول جماعت اسلامی) نے یہ مطالبہ کیا کہ آپ الکشن ملتوی کر دیں اور پہلے لیڈروں کا احتساب کریں۔ اس لئے عمومی دباؤ کے تحت انھوں نے الکشن ملتوی کر دیا۔

میں نے کہا کہ مگر یہی ضیاء الحق صاحب تھے جنھوں نے ذوالفقار علی بھٹو کو معافی دینے کے معاملہ میں ساری دنیا کا دباؤ قبول نہیں کیا۔ پاکستانی بزرگ نے کہا کہ وہ ایک مجرم کو سزا دینے کا معاملہ تھا۔ اور خدا کا حکم ہے کہ مجرم کو اس کے جرم کی سزا دو۔ میں نے کہا کہ جس خدا نے مجرم کو سزا دینے کا حکم دیا ہے اسی خدا نے یہ حکم بھی دیا ہے کہ وعدہ کو ضرور پورا کرو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ضیاء الحق صاحب نے ایک معاملہ میں خدا کے حکم کو پورا کیا اور دوسرے معاملہ میں خدا کے حکم کو نظر انداز کر دیا۔

۸ ستمبر ۱۹۹۰

جناب سرفراز نواز صاحب (پیدائش ۱۹۵۹) ۴ ستمبر کو ہمارے دفتر میں آئے۔ وہ مغل سرائے کے رہنے والے ہیں۔ وہ وہاں بزنس کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے یہاں کا ایک واقعہ بتایا۔ جس میں بڑا سبق ہے۔

غالباً ۱۹۸۴ کا واقعہ ہے۔ مغل سرائے (اسلام پور) کے مدرسہ میں تعطیل تھی۔ کچھ مسلمان لڑکے اس کے میدان میں کھیل رہے تھے۔ اتفاق سے وہاں ایک ہریجن لڑکی آگئی۔ مسلمان لڑکے اس کو پکڑ کر اندر لے گئے اور زبردستی اس کے ساتھ بدکاری کی۔ اس فعل کا اصل مجرم ایک مسلمان لڑکا تھا۔

لڑکی روتی پیٹتی ہندو محلہ میں گئی۔ آناً فاناً خبر پھیل گئی۔ اس کے بعد ہندو تقریباً ۵۰۰ کی تعداد میں جمع ہو کر مسلمانوں کے محلہ (اسلام پور) میں گھس آئے۔ وہ غصہ میں تھے اور مسلمانوں کو جلانا پھونکنا چاہتے تھے۔

سرفراز نواز صاحب اور وہاں کے کئی دوسرے لوگ کئی سال سے الرسالہ کا پابندی سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کی کوشش سے یہ ہوا کہ مسلمان باہر نہیں آئے۔ ہندو مجمع اگرچہ اشتعال انگیز نعرہ لگا رہا تھا۔ مگر مسلمان اعراض کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے گھروں میں خاموش رہے۔ البتہ فوری طور پر انھوں نے یہ کیا کہ ایک مقامی ہندو لیڈر منی لال گپتا (سابق گرام پردھان) کو خبر کر دی۔ وہ تھوڑی دیر میں آگئے۔ آتے ہی وہ مجمع کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ وہ مجمع کو پیچھے ہٹا کر ایک میدان میں لے گئے اور وہاں اس کے سامنے تقریر شروع کر دی۔ انھوں نے کہا کہ اگر ایک مسلمان لڑکے نے شرارت کی ہے تو کیا تم اس کی سزا سارے مسلمانوں کو دینا چاہتے ہو۔

منی لال گپتا نے اسی کے ساتھ یہ کیا کہ فوراً پولیس کو خبر کر دی کہ یہاں ہندوؤں کا مجمع اکٹھا ہے اور فساد کا سخت اندیشہ ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد پولیس آگئی اس نے مجمع سے منتشر ہونے کو کہا۔ جب وہ منتشر نہیں ہوئے تو پولیس نے ان پر لاٹھی چارج کر دیا۔ اس کے بعد وہ لوگ بھاگ گئے۔

اس طرح کے مواقع پر بہترین عقلمندی یہ ہے کہ مسئلہ کو ہندو مسلم مسئلہ نہ بننے دیا جائے۔ بلکہ اس کو ہندو اور پولیس کا مسئلہ بنا دیا جائے۔ اگر ایسا کیا جائے تو ہر جگہ وہی ہوگا جو مغل سرائے میں ہوا۔

۹ ستمبر ۱۹۹۰

ہندستان ٹائمس (۹ ستمبر) میں سابق وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی کا ایک بیان چھپا ہے۔ انھوں نے کہا کہ (میری حکومت کے زمانہ) میں بوفورس کے معاملہ میں جس بدعنوانی کا الزام لگایا

جاتا ہے اس کی مقدار ۶۰ ـ ۷۰ کروڑ روپیہ تھی۔ مگر موجودہ وی پی سنگھ کی حکومت کے زمانہ میں اکسائز ڈیوٹی کے سلسلہ میں جو اسکینڈل ہوا ہے اس میں ۳۵۰ کروڑ روپیہ خورد برد کیا گیا ہے۔

اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ "میں نے تو صرف ۷۰ کروڑ روپیہ کی رشوت لی تھی۔ اور تم نے ۳۵۰ کروڑ روپیہ کی رشوت لے رکھی ہے"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان کی سیاست کتنی پست اور کتنی گندی ہو چکی ہے۔

۱۰ ستمبر ۱۹۹۰

سلمان رشدی کی کتاب کے خلاف اسلام آباد (پاکستان) میں ۱۲ فروری ۱۹۸۹ کو ایک جلوس نکالا تھا۔ جلوس نے تشدد کا مظاہرہ کیا۔ اس کے نتیجہ میں پولیس نے فائرنگ کی۔ فائرنگ میں سات مسلمان مارے گئے اور سو سے زیادہ افراد زخمی ہوئے۔ اس فائرنگ کی تحقیقات کے لئے پاکستانی حکومت نے ایک کمیشن مقرر کیا تھا۔ اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے نوائے وقت ۲۸ اگست ۱۹۹۰ میں یہ ادارتی نوٹ شائع ہوا ہے: "کمیشن نے بالکل درست کہا ہے کہ اسلام کے خلاف ایسی کتاب کی اشاعت پر غم وغصہ کا اظہار مسلمانوں کا حق تھا۔ کمیشن کے اس فیصلہ کے بعد یہ ضروری ہے کہ انتظامی عہدوں پر فائز جن افراد نے فائرنگ کے احکام دئے تھے ان کا احتساب کیا جائے۔ بالخصوص انتظامیہ سے متعلق افراد کا جنھوں نے صبر وتحمل کے بجائے زیادتی کی۔ انتظامیہ جلوس کے موقع پر دانش مندی کا مظاہرہ کرتی تو حالات پر قابو پایا جا سکتا تھا" (صفحہ ۱۰)

اخبار کے اڈیٹر کے پاس دو معیار ہیں۔ ایک مسلمانوں کے لئے اور دوسرا انتظامیہ کے لئے۔ انتظامیہ سے تو اس کا مطالبہ ہے کہ وہ صبر اور دانش مندی سے کام لیں۔ مگر مسلمانوں کے لئے نہ صبر کی ضرورت ہے اور نہ دانش مندی کی۔ انتظامیہ کو ناپنے کے لئے اس کے یہاں ایک باٹ ہے اور مسلمانوں کو ناپنے کے لئے دوسرا باٹ۔

۱۱ ستمبر ۱۹۹۰

بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور (۱۹۴۱-۱۸۶۱) نے اپنے بارہ میں کہا تھا ـــــ ساری عمر بینا کے تاروں کو درست کرنے میں بیت گئی۔ انتم گیت جو میں گانا چاہتا تھا وہ میں نہ گا سکا۔ ٹیگور نے یہ بات کسی شاعرانہ مفہوم میں کہی ہوگی۔ مگر اسی قسم کی ایک بات میری زبان سے بے اختیار خدا

کی نسبت سے نکل جاتی ہے۔

میری زبان پر بے تابانہ یہ الفاظ آجاتے ہیں کہ خدایا، میں تیری حمد کا ترانہ گانا چاہتا تھا مگر میں نہ گا سکا۔ میرا عجز، میرے سقیم حالات، دنیا کی محدودیت اور الفاظ کی بے مائگی، اس میں حائل ہو گئے کہ میں تیری حمد کا ترانہ گاؤں۔ اب تو مجھے جنت کے باغوں کا ایک پنچھی بنا دے۔ میں جنت کے باغوں میں اڑوں اور ابد تک تیری حمد کے ترانے گاتا رہوں۔

۱۲ستمبر ۱۹۹۰

ڈاکٹر انور عباس امروہہ (یوپی) کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے دہلی کے ہمدرد طبی کالج سے بی یو ایم ایس (BUMS) کا کورس کیا اور اس کے بعد اپنے وطن امروہہ میں مطب شروع کیا۔ ان کے کلنک کے سامنے بورڈ پر "ڈاکٹر انور عباس، بی یو ایم ایس" لکھا ہوا تھا۔

شروع میں ان کا مطب چل نہیں رہا تھا۔ اس کے بعد ان کے بھائی نے یہ کیا کہ مطب کے سامنے ایک بینر لگا دیا۔ اس پر موٹے حرفوں میں لکھا ہوا تھا "ڈاکٹر دہلی والے"۔ اس کے بعد ان کا مطب تیزی سے چل پڑا۔ وہ شہر میں "دہلی والے ڈاکٹر" کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ان کے یہاں مریضوں کی بھیڑ لگنے لگی۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام پسند بولی کا مطلب کیا ہے۔ آجکل کی دنیا میں بڑی کامیابی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی عام پسند کی بولی بولنا جانتا ہو۔ آجکل کے تمام مقبول لیڈر اسی تدبیر کو اختیار کر کے مقبول بنے ہوئے ہیں۔ مگر مجھے عام پسند بولی بولنا بالکل نہیں آتا۔ میں لاجک اور ریزن کی زبان میں کلام کرتا ہوں، اور آجکل کی دنیا میں جو زبان سب سے کم سمجھی جاتی ہے وہ یہی لاجک اور ریزن کی زبان ہے۔

۱۳ستمبر ۱۹۹۰

رابطۃ العالم الاسلامی کا ہفت روزہ اخبار العالم الاسلامی (مکہ) کا شمارہ ۱۴ صفر ۱۴۱۱ھ مطابق ۳ستمبر ۱۹۹۰ء) آج کی ڈاک سے ملا۔ اس کے صفحہ اول کی خبروں میں سے ایک خبر کی سرخی یہ ہے کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کویت پر عراق کے جارحانہ حملہ کی مذمت کی ہے۔ (الشیخ ابوالحسن الندوی یدین العدوان العراقی علی الکویت)

خبر میں بتایا گیا ہے کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ملک فہد بن عبد العزیز کے نام ایک ٹیلیگرام روانہ کیا ہے۔ اس میں انھوں نے اس واقعہ کی مذمت کی ہے اور اس پر اپنے گہرے رنج کا اظہار کیا ہے کہ عراق نے کویت پر حملہ کرکے اس کو اپنے قبضہ میں لے لیا ہے۔ انھوں نے اس امید کا اظہار کیا کہ جلد از جلد عراق اپنے قبضہ کو ختم کرکے کویت سے واپس چلا جائے گا:

پانچ سال پہلے ٹھیک اسی قسم کا واقعہ ہمارے خلاف حیدرآباد میں ہوا۔ ہاشم القاسمی صاحب نے وہاں ہمارے مرکز کی عمارت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ اس معاملہ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کو توجہ دلائی گئی تو انھوں نے اس کی مذمت کرنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ عملاً ہاشم القاسمی صاحب کے سرپرست بن گئے۔ وہ خود ایک استقبالیہ پروگرام میں شرکت کے لئے مغصوب عمارت میں گئے اور اس طرح بالواسطہ طور پر اس غصب کی تائید فرمائی۔ دوسری طرف عراق کے قبضہ غاصبانہ کے معاملہ میں وہ سعودی کنگ کو از خود مذمت کا ٹیلی گرام بھیج رہے ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کن جذبات کے تحت حیدرآباد کے غاصبانہ قبضہ کی مذمت نہیں کی اور کن جذبات کے تحت وہ کویت کے قبضۂ غاصبانہ پر مذمت کا ٹیلیگرام بھیج رہے ہیں، اس کو کوئی بھی انسان سمجھ سکتا ہے۔ پھر کیا خدا ایک عام انسان سے بھی کم عقل رکھتا ہے جو دونوں کی حقیقت کو نہ سمجھے۔

۱۴ ستمبر ۱۹۹۰

۱۱ ستمبر کو تمام اخباروں کے پہلے صفحہ کی ایک نمایاں سرخی یہ تھی ـــــ صدام کی طرف سے تیسری دنیا کے ملکوں کو مفت تیل کی پیش کش:

Saddam offers free oil to Third World

صدام حسین کی طرف سے بغداد ٹیلی ویژن پر یہ پڑھا گیا کہ موجودہ بحران کی وجہ سے تیسری دنیا کے ملکوں کو تیل کی پریشانی ہو رہی ہے۔ ہم پیش کش کر رہے ہیں کہ تیسری دنیا کے ممالک ہمارے یہاں سے جس قسم کا اور جتنا تیل چاہیں، مفت لے جائیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ خود اپنا ٹینکر لیکر آئیں۔ اور اپنے ٹینکر میں تیل لے جائیں۔

اگلے دن واشنگٹن میں امریکی حکومت کے ترجمان نے بجا طور پر کہا کہ یہ صدام حسین کی ایک

چال (gimmick) ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ انھیں ایک بیرل تیل بھی کسی کو مفت دینا نہیں پڑے گا۔ کیوں کہ اقوام متحدہ کی تجویز کے مطابق، امریکہ اور دوسرے ملکوں نے عراق کی جو ناکہ بندی کر رکھی ہے، اس میں تیل کے ٹینکر بھی شامل ہیں۔ تیل کا کوئی جہاز نہ عراق کی طرف جا سکتا اور نہ عراق سے آسکتا۔

اسی طرح اس سے پہلے صدام حسین نے اعلان کیا کہ ہم کویت خالی کرنے کے لئے تیار ہیں، بشرطیکہ اسرائیل فلسطین کے مقبوضہ علاقوں کو خالی کر دے۔ یہاں بھی صدام حسین جانتے ہیں کہ اسرائیل فلسطین کو خالی نہیں کرے گا۔ اور نہ امریکا ایسا کرے گا کہ وہ اس مقصد کے لئے اسرائیل پر دباؤ ڈالے۔ صدام حسین کا اصل مقصد یہ تھا کہ مفت تیل کی پیش کش سے وہ تیسری دنیا کے لوگوں کے درمیان خوش نام ہو جائیں اور کویت کے مسئلہ کو اسرائیل کے مسئلہ سے جوڑ کر عربوں اور فلسطینیوں کی حمایت حاصل کر لیں۔ اور اس مقصد میں وہ کم از کم وقتی طور پر کامیاب ہو گئے۔

۱۵ستمبر ۱۹۹۰

حکیم محمد ابراھیم صاحب (پیدائش ۱۹۰۳) جے پور کے رہنے والے ہیں۔ آزادی کی تحریک کے زمانہ میں انھوں نے جواہر لال نہرو اور ابوالکلام آزاد کے ساتھ کام کیا ہے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ ہندستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہماری اس زبوں حالی کا سبب یہ ہے کہ ہندستان میں ڈیموکریسی کا نظام رائج کیا گیا۔ اس کے تحت ہم اقلیت میں آگئے۔

انھوں نے کہا کہ ڈیموکریسی کا نظام ان ملکوں کے لئے درست ہے جہاں صرف ایک مذہب کے لوگ رہتے ہوں۔ ہندستان میں چھ مذہب (ہندوازم، اسلام، مسیحیت، سکھ ازم، بدھ ازم، پارسیت) کے ماننے والے ہیں۔ یہاں کے لئے صحیح نظام یہ ہے کہ ایک سپریم کونسل بنائی جائے جس میں ہر مذہب کا ایک ایک نمائندہ ہو۔ ان چھ ممبروں کو اعلیٰ اختیار حاصل ہو۔ اس طرح اس ملک میں برابری کا نظام قائم ہو جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ میں اس تجویز کو وزیر اعظم وغیرہ کے پاس بھیجنے والا ہوں۔

یہ "تجویز" سن کر مجھے حیرت ہوئی کہ مسلمان بھی کتنے زیادہ نادان ہیں۔ یہ نادانی صرف حکیم ابراہیم تک محدود نہیں ہے۔ اس میں مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے اکابر

بھی شریک ہیں۔ ان حضرات نے مدنی فارمولا اور آزاد فارمولا کے نام سے ۱۹۴۷ سے پہلے جو تجویز پیش کی، وہ بھی باعتبار نوعیت یہی تھی۔ اس میں یہ تجویز کیا گیا تھا کہ مرکزی اسمبلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ممبران برابر کی تعداد میں ہوں۔

ان حضرات نے اپنی خوش فہمی کی بنا پر اس سادہ سی بات کو نہیں سمجھا کہ جو چیز زندگی کی تشکیل کرتی ہے وہ لفظی تجویزیں نہیں ہیں بلکہ سماجی حقیقتیں اور تاریخی طاقتیں ہیں۔

۱۶ ستمبر ۱۹۹۰

مولانا اکبر الدین قاسمی (مجلس علمیہ، حیدرآباد) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ حیدرآباد میں ایک محمد بہار الدین صاحب ہیں۔ وہ ریلوے گارڈ سے ریٹائر ہوئے ہیں اور یاقوت پورہ حیدرآباد میں رہتے ہیں۔ وہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے معتقد اور مرید ہیں۔ انھوں نے مولانا علی میاں کا یہ قول میرے بارہ میں نقل کیا کہ " اگر ہم نے کچھ غلطی کی تھی تو وحید الدین خاں ہم سے اس کا بدلہ لیتے، وہ پوری قوم سے کیوں اس کا بدلہ لے رہے ہیں"۔

اس کا قصہ یہ ہے کہ مولانا علی میاں کے والد محترم حکیم سید عبدالحی صاحب کی کتاب " ہندستان اسلامی عہد " ۱۹۷۳ میں ندوہ سے چھاپی گئی۔ اس پر مولانا علی میاں کا بسوط مقدمہ ہے جس میں مولانا نے کتاب کے اندراجات کی تصویب فرمائی ہے۔ اس کتاب میں ' بابری مسجد اجودھیا" کے ذیل میں لکھا ہوا ہے کہ " کہا جاتا ہے کہ سیتا کا یہاں ایک مندر تھا، اسی جگہ بابر نے ۹۲۳ھ میں یہ مسجد تعمیر کی" (۱۴۱)

یہ کتاب جو ۱۹۷۳ میں چھپی تھی، کہیں سے مسٹر ارن شوری کو مل گئی۔ اس نے انڈین اکسپرس میں اپنے مضمون میں اس کا حوالہ دیا۔ اس کے بعد ہندوؤں نے اس کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً رام جنم بھومی مکتی کمیٹی کے نائب صدر داؤ دیال کھنہ نے کہا کہ " لکھنؤ کے دار العلوم ندوۃ العلماء سے ایک کتاب ہندستان اسلامی عہد میں کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے بیان سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ بابری مسجد اسی جگہ تعمیر کی گئی جہاں رام مندر تھا" (قومی آواز ۲ ستمبر ۱۹۹۰)

مولانا علی میاں اور ان کے حلقہ کا خیال ہے کہ یہ کتاب میں نے ہندوؤں کو فراہم کی ہے۔ یہ سراسر بہتان ہے۔ میں نے مولانا اکبر الدین قاسمی سے کہا کہ قرآن کے حکم کے مطابق، مولانا علی میاں کو

چاہئے تھا کہ اتنا بڑا الزام لگانے سے پہلے وہ اس کی تحقیق کرتے۔ بلا تحقیق اس قسم کا الزام لگانا سراسر ناجائز ہے۔ پھر میں نے کہا کہ اس معاملہ میں میں مولانا علی میاں سے مباہلہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اگر وہ اپنے کو برحق سمجھتے ہیں تو مجھ سے مباہلہ کریں۔

۱۷ستمبر ۱۹۹۰

۱۶ستمبر کی رات کو دہلی میں خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک چوڑا راستہ ہے۔ اس کے دونوں طرف تقریباً قد آدم دیوار بنی ہوئی ہیں۔ یہ راستہ اور دیوار اپنے طرز کے اعتبار سے ویسا ہی ہے جیسا ریلوے اسٹیشن پر دو طرفہ اونچے پلیٹ فارم کے درمیان گزرنے والا راستہ ہوتا ہے۔ میں اور ثانی اثنین بائیں طرف کنارے کنارے چل رہے ہیں۔ میں آگے ہوں اور ثانی اثنین میرے پیچھے۔ اتنے میں سامنے ایک بہت بڑا ہاتھی نظر آیا۔ وہ دوسرے کنارے سے چلتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا۔

ہاتھی جب قریب آگیا تو وہ اس طرح گھوما کہ اس کا سونڈ دیوار کی طرف تھا اور اس کا پچھلا حصہ راستہ کی طرف۔ اس وقت میرے ذہن میں آیا کہ ہاتھی پیچھے کی طرف سے آکر آدمی کو اس طرح دباتا ہے کہ آدمی ہاتھی کے جسم اور دیوار کے درمیان کچل کر رہ جاتا ہے۔ اس وقت ثانی اثنین کی آواز میرے کان میں آئی کہ ہاتھی ہم لوگوں کو دبانا چاہتا ہے۔ یہ سن کر میں نے ایک لمحہ کے لئے سوچا اور پھر بائیں طرف دیوار پر چڑھنے لگا۔ چڑھنے میں تھوڑی سی زحمت ہوئی۔ مگر ایک منٹ کے اندر میں دیوار کے اوپر چڑھ گیا۔ غالباً ثانی اثنین نے بھی ایسا ہی کیا۔ ہم دونوں ہاتھی کی زد سے باہر آگئے (خواب ختم)

اس خواب کی تعبیر سوچ رہا تھا کہ آج ہی انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا میں ہاتھی پر ایک باتصویر مضمون دیکھا۔ اس میں ہاتھی کو سب سے بڑا دودھیلا جانور (Largest mammal on land) بتایا گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید اس خواب کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کے پاس جو آخری سب سے بڑا حربہ ہے، اس کو وہ میرے خلاف استعمال کرے گا۔ اور اگرچہ اس وقت کوئی میری مدد کرنے والا نہ ہوگا، مگر انشاء اللہ اس کا حربہ کارگر نہیں ہوگا، اور میں اللہ کی مدد سے اس کا نشانہ بننے سے محفوظ رہوں گا۔

۱۸ستمبر ۱۹۹۰

ایک مسلمان لیڈر سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ موجودہ مسلمانوں کی سب سے بڑی مصیبت آپ لوگوں کے اخباری بیانات ہیں۔ جب بھی کوئی ہندو مسلم معاملہ پیدا ہوتا ہے، فوراً آپ لوگ ایک تند و تیز بیان تیار کر کے اخباروں میں شائع کر دیتے ہیں۔ ان بیانوں سے مسلمانوں کا ذہن خراب ہوتا ہے۔ اگر آپ لوگ اس قسم کا بیان نہ دیں تو مسلمانوں کی فطرت ان کی رہنمائی کرے گی۔ مگر آپ لوگوں کے بیانات مسلمانوں کو غلط رہنمائی دے کر انھیں فطرت کے راستہ سے ہٹا دیتے ہیں۔

مسلمان لیڈر نے کہا: "ایسے معاملات میں اگر ہم چپ رہیں تو ہم عوام سے کٹ جائیں گے"۔ میں نے کہا کہ اگر آپ چپ رہتے تو آپ خدا سے جڑ جاتے۔ مگر جب آپ بولے تو آپ عوام سے تو جڑے مگر آپ خدا سے کٹ گئے۔

۱۹ستمبر ۱۹۹۰

ایک مقام پر ہندو مسلم فساد ہوگیا۔ وہاں کے ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ فساد کیسے شروع ہوا۔ اور اس کا ابتدائی سبب کیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ہندوؤں کا جلوس مسلمان محلہ سے گزرا وہ نعرہ لگا رہا تھا" بابر کی سنتان، تم سب جاؤ قبرستان" اس پر مسلمان مشتعل ہوگئے اور ہندوؤں پر پتھر پھینکے۔ اس کے بعد فساد شروع ہوگیا۔

میں نے کہا کہ اصل مسئلہ ہندوؤں کا اشتعال انگیز نعرہ نہیں ہے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر احتساب خویش کا مادہ ختم ہوگیا ہے۔ اگر مسلمانوں کے اندر احتساب خویش کی صفت ہوتی تو وہ سوچتے کہ ہندو ان کے خلاف جو بات کہہ رہے ہیں، وہ بطور واقعہ بالکل درست ہے۔ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد اس ملک میں ہزاروں مسجدوں کے ساتھ اسی قسم کا قصہ پیش آیا ہے جو اجودھیا کی بابری مسجد کے ساتھ پیش آیا ہے۔ ہریانہ، راجستھان، پنجاب میں آج بھی کوئی شخص جا کر اس کو دیکھ سکتا ہے۔ مگر ان ہزاروں مسجدوں کی بے حرمتی اور انہدام پر مسلمانوں میں کبھی کوئی پرشور تحریک نہیں اٹھی۔ اور اجودھیا کی مسجد کی بے حرمتی پر سارے ہندستان کے مسلمانوں میں ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ کیوں کہ اس کے ساتھ شہنشاہ بابر کا نام جڑا ہوا تھا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ "خدائی" مسجد سے مسلمانوں کو وہ لگاؤ نہیں ہے جو ان کو "بابری" مسجد سے ہے۔ پھر بابر تو ایک فانی انسان تھا وہ قبر میں چلا گیا۔ اس لئے غیر مسلم اگر مسلمانوں کے بارہ میں مذکورہ تجربہ کے بعد ایسا کہتے ہیں کہ بابر قبر میں گیا، تم بھی قبر میں جاؤ تو اس میں ان کی کیا غلطی ہے۔

۲۰ ستمبر ۱۹۹۰

پاکستان کے اخبار میں پڑھا کہ وہاں جنرل محمد ضیاء الحق کی یاد میں جلسہ ہوا تو اس موقع پر نعرہ لگایا گیا: "مرد مومن مرد حق، ضیاء الحق، ضیاء الحق"۔ دوسرا جلسہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی یاد میں منعقد ہوا۔ وہاں نعرہ لگایا گیا: سیدی مرشدی، مودودی مودودی"۔

اس خبر کو پڑھ کر میں نے سوچا کہ جس طرح آج ضیاء الحق اور ابوالاعلیٰ مودودی کی وفات ہوئی ہے، اسی طرح صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں بھی ہزاروں لوگوں کی وفات ہوئی۔ مگر ان لوگوں نے کبھی اس قسم کے نعرے نہیں لگائے۔ سوچتے ہوئے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ صحابہ و تابعین خدا میں جینے والے لوگ تھے۔ وہ لوگ ہمیشہ خدا کی یاد میں مشغول رہتے تھے۔ اس کے برعکس موجودہ مسلمان اپنی شخصیتوں میں جیتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنی شخصیتوں کے نعرے لگا رہے ہیں۔

۲۱ ستمبر ۱۹۹۰

ایک صاحب تشریف لائے۔ انھوں نے چند سوالات کئے۔ ایک سوال یہ تھا کہ قرآن میں سورہ النساء میں کہا گیا ہے کہ اے ایمان لانے والو ایمان لاؤ (آیت ۱۳۶) اس کا مطلب کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی تشریح قرآن کی دوسری آیت کر رہی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، کہو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اطاعت کی۔ (الحجرات ۱۴)

مذکورہ آیت سورہ النساء میں ہے جو کہ مدنی سورۃ ہے۔ اصل یہ ہے کہ مکہ کے دور میں حالات بہت سخت تھے۔ وہاں کفر و شرک کا اتنا زیادہ دباؤ تھا کہ وہی شخص ایمان قبول کرتا تھا جو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ یہ فیصلہ کرتا تھا کہ اسے ایمان والی زندگی اختیار کرنا ہے۔ اس لئے ایمان لاتے ہی فوراً وہ باعمل مومن بن جاتا تھا۔ مگر مدنی دور میں حالات مختلف ہو گئے۔ اب فضا اتنی بدلی کہ لوگوں کے اوپر خود اسلام کا دباؤ پڑنے لگا۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے حالات کے دباؤ کے تحت اسلام کا کلمہ پڑھ لیا۔

مگر ان کی زندگیوں میں اس طرح اسلام نہیں آیا جس طرح مکی دور کے مسلمانوں میں آیا تھا چنانچہ ان سے کہا گیا کہ جب تم نے ایمان قبول کیا ہے تو اب ایمان کے عملی تقاضے بھی پورے کرو۔ ایک شخص کا ایک لڑکا ہو مگر وہ اپنے لڑکے کے معاملہ میں پدرانہ حقوق ادا نہ کر رہا ہو تو اس معاملہ میں اس کو توجہ دلانے کا ایک اسلوب یہ ہے کہ آپ اس سے کہیں کہ تم باپ ہو تو باپ کے فرائض اور حقوق ادا کرو۔ دوسرا اسلوب یہ ہے کہ اس کو مختصر کرکے یوں کہیں کہ جب تم باپ ہو تو باپ بن کر رہو۔

یہی معاملہ مذکورہ آیت کا ہے۔ کہنے کا ایک اسلوب یہ ہے کہ اے ایمان لانے والو، ایمان کے عملی تقاضوں کو پورا کرو۔ دوسرا اسلوب یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ اے ایمان والو، ایمان والے بنو۔ یہاں یہی دوسرا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

۲۲ ستمبر ۱۹۹۰

فیروز آباد کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ فیروز آباد میں قدیم زمانہ سے چوڑیوں کی صنعت ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے یہاں کی صنعت پر مسلمان چھائے ہوئے تھے۔ اب وہاں ہندو چھائے ہوئے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ فرق کیسے ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اس کا ایک خاص سبب مسلمانوں کا اسراف ہے۔ مسلمان جو کماتا ہے اس کو خرچ کر ڈالتا ہے۔ وہ بچا کر نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس ہندو اپنی کمائی میں سے تھوڑا خرچ کرتا ہے اور زیادہ حصہ بچا کر رکھتا ہے۔

قدیم زمانہ میں پوری صنعت دستکاری پر مبنی تھی، اس لئے مسلمان اپنے اسراف کے باوجود صنعت پر قابض رہے۔ موجودہ زمانہ مشینی زمانہ ہے۔ اب صنعت کو ترقی دینے کے لئے ہر جزء میں زیادہ رقم درکار ہوتی ہے۔ ہندو کے پاس پس انداز کیا ہوا سرمایہ تھا، اس نے سرمایہ لگا کر صنعت کو بڑھالیا۔ مسلمان کے پاس سرمایہ نہیں تھا، اس لئے وہ مشینی مقابلہ میں پیچھے ہوگیا۔

اسراف سے بچنا اور اعتدال کے ساتھ خرچ کرنا اصلاً ایک عبادت اور ایک دینی عمل ہے۔ لیکن اگر مسلمان اس پر عمل کریں تو وہ دیکھیں گے کہ اسی دینی عمل میں ان کا دنیوی فائدہ بھی چھپا ہوا ہے۔

۲۳ ستمبر ۱۹۹۰

پاکستان کے روزنامہ نوائے وقت (۲۳ ستمبر ۱۹۹۰) میں مسٹر محمد علی جناح کی ایک تقریر کا

اقتباس نقل کیا گیا ہے۔ یہ تقریر انھوں نے ۱۹۳۹ میں عربک کالج دہلی میں کی تھی۔ اقتباس یہ ہے: تمام دشواریوں کے باوجود مجھے یقین ہے کہ مسلمان کسی دوسرے فرقہ کی بہ نسبت بہتر سیاسی دماغ رکھتے ہیں۔ سیاسی شعور مسلمانوں کے خون میں ملا ہوا ہے، وہ ان کی رگوں اور شریانوں میں دوڑ رہا ہے۔ اور اسلام کی تاریخی عظمت ان کے سینوں میں دھڑک رہی ہے۔

مسٹر جناح کی یہ بات ایک تبدیلی کے ساتھ صحیح ہے۔ مسلمانوں کے اندر "سیاسی شعور" تو موجود نہیں، البتہ حکومت پسندی ضرور ان میں مبالغہ آمیز حد تک موجود ہے۔ اور مسلمانوں کا یہی بگڑا ہوا مزاج موجودہ زمانہ میں ان کی تمام مصیبتوں کا اصل سبب ہے۔

۲۴ ستمبر ۱۹۹۰

میرا خط معروف اصطلاح کے مطابق پختہ نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ میرا اندازہ یہ ہے کہ جب میں کوئی مضمون لکھتا ہوں تو میں اس میں بہت کاٹ چھانٹ کرتا ہوں۔ میں سمجھتا تھا کہ جس شخص کی تحریر پختہ نہ ہو وہ غالباً زیادہ کاٹتا ہے۔ مگر یہ مفروضہ درست نہیں۔

لندن سے ایک کتاب چھپی ہے اس کا نام ہے (Writers at work) اس کا ساتواں سلسلہ (Seventh series) میرے سامنے ہے۔ ۳۳۰ صفحہ کی اس کتاب میں انگریزی کے ۱۳ مصنفین کے ادبی حالات درج ہیں۔ ہر شخص کے حالات کے ساتھ اس کے خط کا نمونہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ صفحہ ۱۵۱ پر لارکن (Philip Larkin) کا نمونۂ تحریر درج ہے۔

اس نمونہ کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ لارکن کا خط نہایت پختہ تھا، مگر وہ بہت زیادہ کاٹتا تھا۔ اس کے جس صفحہ کی تصویر کتاب میں شامل کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس نے آدھے صفحہ میں ایک مضمون لکھا پھر اس کی تصحیح کی۔ پھر اس عبارت کو کاٹ کر از سر نو بقیہ صفحہ پر نئی عبارت لکھی۔ حقیقت یہ ہے کہ خط کی پختگی یا ناپختگی کا کاٹ چھانٹ سے کوئی تعلق نہیں۔

۲۵ ستمبر ۱۹۹۰

۲۴ ستمبر کے تحت میں نے ایک کتاب کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب سے مزید ایک بات معلوم ہوئی۔ میں نے اپنی کتاب (کاروان ملت) میں پروفیسر ہاکنس کا ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ اس میں ایک عورت کا قصہ ہے جس نے ایک لکچر ہال میں کہا تھا کہ زمین کچھوے کی پیٹھ پر ٹھہری

ہوئی ہے۔ پروفیسر ہاکنس نے لکچر دینے والے کا نام، برٹرینڈرسل اور مقام کا نام لندن لکھا ہے۔ مگر اس کتاب میں آرتھرکوئسلر کے حوالے سے لکچر دینے والا کا نام اس کے بجائے ٹامس گولڈ (Thomas Gold) بتایا گیا ہے۔ یہ برطانی سائنس داں تھا اور اس نے یہ لکچر امریکہ میں دیا تھا۔ (صفحہ ۳۶)

۲۶ ستمبر ۱۹۹۰

جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ کے تحت ہونے والی چوتھی مؤتمر عام کے سلسلہ میں میں طرابلس میں تھا۔ ہندستان سے چند دوسرے حضرات بھی اس مؤتمر میں شریک تھے۔ حیدرآباد کے مسٹر ایم خان نے ۲۶ ستمبر کے اجلاس میں انگریزی میں ایک تقریر کی۔ اس میں انھوں نے بابری مسجد کا مسئلہ اٹھایا اور حکومت ہند کو اور ہندوؤں کو کنڈم کیا۔

میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ اسٹیج پر اس کا مظاہرہ ہو کہ کسی ملک کا وفد آپس میں مختلف الرائے ہے۔ اس لئے میں اسٹیج پر خود اپنے ملک کے کسی آدمی کے خلاف بولنا پسند نہیں کرتا۔ مگر اجلاس کے بعد میں مسٹر خان سے ملا۔ اس وقت ان کے ساتھ مسٹر باب الدین خاں (تھرڈ کانسپٹ ویکلی) بھی تھے۔ میں نے باب الدین صاحب کی موجودگی میں ان پر سخت تنقید کی۔

میں نے کہا کہ اپنے ملک کے نازک مسائل کو باہر کے پلیٹ فارم پر اٹھانا بنیادی طور پر غلط اور ایک سطحی فعل ہے۔ مزید یہ کہ آپ نے بھارتیہ جنتا پارٹی کی مخالفانہ باتوں کا تو ذکر کیا۔ مگر یوپی کے چیف منسٹر ملائم سنگھ کا بالکل ذکر نہیں کیا جو اس وقت فرقہ پرست ہندوؤں کے خلاف آہنی دیوار بنا ہوا ہے۔ ملائم سنگھ نے بار بار کھلے لفظوں میں اعلان کیا ہے کہ میں عدالتی فیصلہ کے خلاف اس معاملہ میں کسی کو کچھ نہیں کرنے دوں گا۔ جو لوگ بھی بابری مسجد کو ڈھانے کے لئے آئیں گے، ان کو میں سختی سے کچل دوں گا، وغیرہ۔ انھوں نے کہا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کا جو مخالفانہ کردار ہے وہ تو میٹر آف فیکٹ ہے۔ پھر اس کا کیوں نہ ذکر کیا جائے۔ میں نے کہا کہ چیف منسٹر ملائم سنگھ کا اعلان بھی تو میٹر آف فیکٹ ہے، پھر آپ نے اس کا اعلان کیوں نہیں کیا۔

مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والوں کا یہی طریقہ ہے کہ وہ ایک پہلو کا ذکر کرتے ہیں

اور دوسرا پہلو چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کی اس غلط رہنمائی نے مسلمانوں کو حقیقت پسندانہ طرز سے آخری حد تک دور کر دیا ہے۔

۲۷ ستمبر ۱۹۹۰

جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ (طرابلس) کے تحت ایک ہفتہ وار عربی پرچہ الدعوۃ کے نام سے نکلتا ہے۔ میرے سامنے اس کا شمارہ ۲۶ ستمبر ۱۹۹۰ ہے۔ اس میں جمعیۃ الدعوۃ کے ذمہ دار کی ایک تقریر ہے جو انھوں نے ایک اسلامی مؤتمر کے اجلاس میں کی۔ اس تقریر کے ایک جملہ کو بطور عنوان جلی حرفوں میں اس طرح لکھا گیا ہے: اننا نسیر دائماً فی طریق الحق (ہم ہمیشہ حق کے راستہ پر چلتے ہیں۔)

موجودہ زمانہ کے مسلم زعما رسب سے زیادہ جس چیز سے خالی ہو گئے ہیں وہ حساسیت ہے۔ مذکورہ جملہ صرف ایک بے حس قلب ہی سے نکل سکتا ہے۔ حساس قلب ایسے موقع پر کہے گا کہ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہماری مدد کرے اور ہم کو ہمیشہ حق کے راستہ پر چلائے۔

۲۸ ستمبر ۱۹۹۰

نوائے وقت (۲۸ ستمبر ۱۹۹۰) میں میاں محمد شفیع کی یادداشت چھپی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "حافظ عبدالمجید قابلیت کے دریا تھے۔ ان کی گراسپ اتنی زبردست تھی کہ ایک لحظہ میں معاملہ کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ وہ بالآخر ترقی کرتے کرتے (برطانوی) پنجاب کے چیف سکریٹری مقرر ہوئے۔ لیکن ایک معمولی غلطی پر قانون کی زد میں آگئے اور ان کا شاندار کیریئر ختم ہو گیا۔ آج (پاکستان میں) لوگ لاکھوں اور کروڑوں روپیہ ہڑپ کر جاتے ہیں اور ان کا بال بیکا نہیں ہوتا۔ لیکن حافظ عبدالمجید جیسے عظیم پبلک سرونٹ نے لاہور سے راول پنڈی کے سفر میں کرایہ ریل کے بجائے ہوائی جہاز کا وصول کر لیا تھا، اور اسی جرم کی بنا پر انھیں ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ (صفحہ ۸)

'برطانوی پاکستان' میں اخلاق کا معیار بلند تھا، اور 'اسلامی پاکستان' میں اخلاق کا معیار آخری حد تک گر گیا۔ اس گراوٹ کی سب سے بڑی ذمہ داری ان نام نہاد مسلم رہنماؤں پر ہے جنھوں نے اسلام کو سیاسی نعرہ کے طور پر استعمال کیا۔ ان لوگوں نے اپنی جھوٹی تحریکوں

کے ذریعہ مسلمانوں کی نفسیات کو بگاڑ دیا۔ انھوں نے اسلام کو "عمل" کا عنوان بنانے کے بجائے "مطالبہ" کا عنوان بنا دیا۔ یہی سب سے بڑا سبب ہے جس کی بنا پر ہم یہ عجیب وغریب منظر دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کی آوازوں سے فضا گونج رہی ہے اور افراد کی زندگیوں میں اسلامی کردار کا کوئی وجود نہیں۔

۲۹ ستمبر ۱۹۹۰

پاکستان بننے کے بعد سید ابو الاعلیٰ مودودی پاکستان (لاہور) چلے گئے۔ وہاں انھوں نے قانون اسلامی کے نفاذ کی مہم چلائی۔ پاکستان میں ان کی تقریروں کا انداز کیا ہوتا تھا، اس کا اندازہ ایک اقتباس سے ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی ایک انتخابی تقریر میں کہا:

"یہ ملک مارکس اور لینن اور ماؤ کی امت کا نہیں، یہ محمد عربی کی امت کا ملک ہے اور جب تک ہمارے سر ہماری گردنوں پر قائم ہیں اس وقت تک اس ملک میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظام نافذ نہیں کیا جا سکتا" (وفاق، لاہور، ۲۹ ستمبر ۱۹۹۰)

بظاہر یہ تعمیرِ اسلام کی تقریر معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقۃً یہ تخریبِ اسلام کی تقریر ہے۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی اگر پاکستان میں یہ تحریک چلاتے کہ یہ ایک اسلامی ملک ہے، اس لئے یہاں کے ہر باشندے کو اپنی زندگی میں اسلام کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ اگر وہ ایسا کہتے تو اس سے لوگوں کے اندر ایمان کی روشنی ابھرتی۔ ان کے اندر اسلامی عبادت اور اسلامی اخلاق کا داعیہ پیدا ہوتا۔ لوگ اپنے آپ کو مومن اور مسلم بنانے کی فکر میں لگ جاتے۔ مگر انھوں نے عمل کا رخ تمام تر حکومت کی طرف کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اور دوسرے تمام مسلمان بس حکمرانوں سے لڑنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ پاکستانی مسلمان تعمیر کے بجائے تخریب کے راستہ پر چل پڑے۔

۳۰ ستمبر ۱۹۹۰

وقف بورڈ کے ایک ذمہ دار نے بتایا کہ ہندستان میں اس وقت ۲ لاکھ سے زیادہ مسجدیں ہیں۔ مسلمانوں نے پچھلے دس برسوں میں "بابری مسجد" کے مسئلہ پر بے حساب وقت اور پیسہ لگایا ہے، اگر وہ ایسا کرتے کہ بابری مسجد کے معاملہ کو اللہ کے حوالے کر دیتے اور بقیہ ۲ لاکھ مسجدوں

کی حالت کو درست کرنے پر یہی وقت اور پیسہ لگاتے تو انھیں دس برسوں میں ملک کے اندر نیا انقلاب آجاتا۔

لیکن یہ "اگر" ایسا ہے جو موجودہ حالات میں ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر عمل کسی جذبہ کے تحت ہوتا ہے۔ بابری مسجد کے مسئلہ پر جو تحریک چلی اس کا محرک مثبت نہیں بلکہ منفی تھا۔ یعنی اس کے پیچھے حقیقۃً ہندو نفرت کا جذبہ تھا۔ اور ہندو نفرت کا جذبہ چوں کہ مسلمانوں میں نہایت افراط کے ساتھ موجود ہے۔ اس لئے انھوں نے اس مسئلہ پر دھواں دھار تحریک چلا ڈالی۔ اس کے برعکس مسجدوں کی حالت کو سدھارنے کے لئے دین سے محبت کا جذبہ درکار ہے، اور وہ موجودہ مسلمانوں میں سرے سے موجود ہی نہیں۔

یکم اکتوبر ۱۹۹۰

آج میں لیبیا (طرابلس) میں تھا۔ وہاں میرا قیام فندق باب البحر میں تھا۔ صبح کو نیچے اترا تو ریسپشن (استقبالیہ) کے وسیع ہال کی دیواروں پر مختلف نعرے لکھے ہوئے نظر آئے۔

ایک نعرہ ان الفاظ میں لکھا ہوا تھا: الثائر الاممی معمر القذافی صانع عصر الجماهيرية (عالمی انقلابی لیڈر معمر قذافی، جمہوریتوں کا دور پیدا کرنے والا۔)

اس کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ یہی موجودہ زمانہ کے تمام مسلم قائدین کا حال ہے۔ ان قائدوں نے یا ان کے معتقدوں نے اپنے گھر کی دیواروں پر اپنے لئے "نئے دور کا خالق" کے الفاظ لکھ رکھے ہیں۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ملک یا ایک گھر میں بھی کوئی نیا دور لانے والے نہ بن سکے۔ ہر آدمی اس کام کا کریڈیٹ لینا چاہتا ہے جس کو اس نے نہیں کیا (یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا)

۲ اکتوبر ۱۹۹۰

لیبیا میں اس وقت تقریباً چالیس ہزار ہندستانی ہیں۔ ان میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ طرابلس میں مقیم مسلمانوں نے ۲ اکتوبر کو "میلاد النبی" کا جلسہ کیا۔ اس میں مجھے تقریر کی دعوت دی گئی۔ وہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر سادہ انداز میں ایک تقریر کی۔ کلیۃ الدعوۃ الاسلامیۃ کے ہال میں اجتماع تھا۔ اس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی قابل لحاظ تعداد میں

موجود تھے۔

ڈاکٹر حیات اسماعیل نے بتایا کہ ہم لوگوں نے طے کیا ہے کہ طرابلس میں مقیم ہندستانی سفیر مسٹر بی آر گلیانی کو اجتماع میں بلایا جائے مگر ان سے تقریر نہ کرائی جائے۔ میں نے کہا کہ یہ طریقہ صحیح نہیں۔ ہندستانی سفیر اپنے عہدہ کے اعتبار سے یہاں انڈین کمیونٹی کا ہیڈ ہے۔ اس کو بلانا اور اس کو اسٹیج پر کھڑا نہ کرنا اس کے لئے توہین کے ہم معنی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ آج گاندھی جینتی کا دن ہے۔ کہیں وہ گاندھی کے بارہ میں بولنے لگے یا ہندو دھرم پر تقریر شروع کر دے۔

میں نے کہا کہ یہ اندیشہ بالکل بے بنیاد ہے۔ میں نے کہا کہ ہندستان میں ایک بار اٹل بہاری باجپئی کو مسلمانوں کے ایک اجتماع میں بلایا گیا۔ اٹل بہاری باجپئی نے وہاں بالکل اسلامی قسم کی باتیں کہیں۔ بعد کو کسی نے پوچھا کہ آپ تو مسلمانوں کے اور اسلام کے مخالف مشہور ہیں۔ پھر آپ نے ایسی تقریر کیسے کی۔ اٹل بہاری باجپئی نے کہا: اجی، آدمی نہیں بولتا، پلیٹ فارم بلواتا ہے۔

میرے کہنے پر ان لوگوں نے مسٹر گلیانی کو تقریر کے لئے کھڑا کیا۔ مسٹر گلیانی اسٹیج پر آئے تو سب سے پہلے انھوں نے "السلام علیکم" کہا۔ اس کے بعد پوری تقریر سیرت کے موضوع پر کی۔ حتی کہ آخر میں کہا کہ "محمد صاحب کے دکھائے ہوئے راستہ پر ساری دنیا چلے گی"

۳ اکتوبر ۱۹۹۰

طرابلس میں میری ملاقات محمد سلیمان القائد سے ہوئی۔ وہ ایم اے ہیں اور اس وقت طرابلس کی جامعۃ الفاتح میں استاذ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں قاہرہ گیا۔ وہاں جامعۃ القاہرہ کے ایک پروفیسر سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ وہاں عربی ادب کے استاد ہیں۔ میرا ذکر آیا تو مصری پروفیسر نے کہا کہ وحید الدین خاں نے دین کی ایک تعبیر کی ہے جو مودودی اور قطب سے مختلف ہے۔ مگر وحید الدین خاں ایک ہندی ہیں۔ ان کی عربی دانی پر مجھے اعتماد نہیں، اس لئے میں ان کی تعبیر کو بھی نہیں مانتا۔

محمد سلیمان القائد نے ان سے کہا کہ میں نے وحید الدین خاں کی کتابیں پڑھی ہیں۔ ان

سے کئی بار میری ملاقات بھی ہوئی ہے۔ وہ عربی زبان بخوبی جانتے ہیں اور پورے معنوں میں عربی عالم ہیں۔ کسی نے اب تک ان کی کتابوں میں زبان کی غلطی کی نشاندہی نہیں کی۔ مصری پروفیسر نے کہا کہ عربی دانی کا اصل معیار شعر ہے۔ آپ ان سے عربی اشعار کی بابت پوچھئے اور پھر دیکھئے کہ وہ عربی داں ہیں یا نہیں۔

میں نے کہا کہ استغفراللہ، لوگوں نے کیسے کیسے خود ساختہ معیار بنا رکھے ہیں۔ اگر اس معیار کو حتمی سمجھا جائے تو نعوذ باللہ پیغمبر اسلام بھی اس معیار پر پورے نہیں اتریں گے۔ کیونکہ قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شعر کا علم نہیں دیا۔ (یٰس ٦٩) روایات میں آتا ہے آپ کو اشعار یاد نہیں رہتے تھے اور شعر کو پڑھنے میں آپ اکثر غلطی کر جاتے تھے۔ لوگوں نے تصحیح کی تو آپ نے فرمایا کہ میں شاعر نہیں ہوں اور نہ وہ میرے لئے سزاوار ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے، تفسیر ابن کثیر ۳/۹ ۵۷۸ — ۵۷۹، التفسیر المظہری ۸/۹۷ — ۹۷ — ۹۶)

۴ اکتوبر ۱۹۹۰

ایک صاحب سے مسلمانوں کے موجودہ حالات پر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو جو سنگین حالات کا سامنا ہے، اس کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں کے سطحی رہنماؤں پر ہے۔ ان نام نہاد رہنماؤں نے سب سے بڑا جرم یہ کیا ہے کہ مسلمانوں کو خارجی احتجاج کے راستہ پر ڈال دیا۔ حالانکہ صحیح بات یہ تھی کہ انھیں داخلی تعمیر کے رخ پر سرگرم کیا جائے۔

ہندستان کے سطحی رہنماؤں کا یہ حال ہے کہ جب بھی کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو فوراً وہ "نکمی انتظامیہ" کا لفظ بول کر مسلمانوں کی سوچ کا رخ حکومت کی طرف کر دیتے ہیں۔ پاکستان میں نام نہاد اسلام پسند وہاں کی تمام خرابیوں کا ذمہ "غیر صالح حکمرانوں" کو ٹھہرائے ہوئے ہیں۔ وسیع تر عالم اسلام کو دیکھئے تو "انٹرنیشنل اسٹیج" پر بولنے والے تمام لوگ صلیبیوں اور صہیونیوں اور استعماری طاقتوں کے ظلم کے خلاف چیخ پکار کرنے میں مشغول ہیں۔

مسلمانوں کے لئے کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ وہ اپنی تمام طاقت داخلی تعمیر کے محاذ پر لگائیں۔ مگر مذکورہ بالا قسم کی رہنمائیوں نے ان کی توجہ داخلی محاذ سے ہٹا دی۔ اور تمام مسلمانوں کے ذہن کو خارج کی طرف پھیر دیا۔ میرے نزدیک آج کا سب سے بڑا مسئلہ یہی غلط

رہنمائی ہے۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۹۰

تہران سے ایک عربی ہفت روزہ نکلتا ہے۔ اس کا نام الشہید الدولی (شہید انٹرنیشنل) ہے۔ اس کی پیشانی پر یہ فقرہ لکھا ہوا رہتا ہے: صوت الثورۃ الاسلامیۃ (اسلامی انقلاب کی آواز) اس اخبار کے شمارہ ۶ ستمبر ۱۹۹۰ میں صفحہ اول پر ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سعودی عرب کی مسلم امت (الشعب المسلم فی المنطقۃ) "خادم الحرمین الشریفین" کی مخالف ہو گئی ہے۔

اس کے ثبوت میں یہ واقعہ درج کیا گیا ہے کہ سعودی عرب کے ایک بدو نے امریکی فوج میں کام کرنے والی ایک عورت سے کہا کہ تم نیم برہنہ رہتی ہو حالاں کہ تم کو پردہ کا اہتمام کرنا چاہئے۔ (دعا مجندۃ امیرکیۃ شبہ عاریۃ الی تقوی اللہ والالتزام بالحجاب) امریکی عورت نے ترجمان کی مدد سے بدو کو جواب دیا کہ کیا تم کو شرم نہیں آتی کہ تم اور فہد اپنے گھروں میں بیٹھے رہے اور تم نے امریکی عورتوں کو بلایا کہ وہ تمہارے ملک کا بچاؤ کریں۔ (الا تخجل انت وفہد حینما تجلسان فی بیوتکما وتسمحان للنساء الامیرکیات بالدفاع عن بلادکما)

جواب کا یہ انداز ایرانیوں کا ہے، وہ امریکیوں کا انداز کلام نہیں۔ اور اگر بالفرض یہ واقعہ صحیح ہو تو یہ بدترین جنرلائزیشن ہے۔ ایک بدو اور ایک امریکی عورت کی گفتگو کو پوری پوری قوم پر لاگو نہیں کیا جاسکتا۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۹۰

"اسلامی جمہوریہ" ایران کے اخبارات آجکل خلیجی بحران کے تذکرہ سے بھرے رہتے ہیں۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ "خادم الحرمین الشریفین" نے کافر امریکیوں کو عرب کی مقدس سرزمین میں داخل ہونے کی اجازت کیوں دی۔

یہ وہی چیز ہے جس کو کلمۃ حق ارید بہا الباطل کہا گیا ہے۔ ایران کے اخبارات بظاہر ایک حق بات کہہ رہے ہیں، مگر اس کلمۂ حق کے پیچھے ایک باطل مقصد چھپا ہوا ہے۔ وہ دراصل اس بحران سے فائدہ اٹھا کر سعودی عرب کو مطعون کر رہے ہیں جس کو وہ اپنا دشمن فرض کئے

ہوئے ہیں۔ اگر فی الواقع ان کے سامنے حق ہوتا تو وہ سب سے پہلے صدام حسین کی جارحیت کی مذمت کرتے۔ جس نے سعودی عرب کو مجبور کیا کہ وہ امریکہ سے مدد مانگے۔ اس صورت حال کی اصل ذمہ داری صدام حسین پر آتی ہے۔ مگر ایرانی اخبارات صدام حسین کے فعل پر خاموش ہیں۔ اور امریکہ کا حوالہ دے کر سعودی عرب کی مذمت کر رہے ہیں۔

کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو عملی سطح پر اسلامی انقلاب برپا کرنے کے مدعی ہیں، حالاں کہ لفظی تکلم کے درجہ میں بھی وہ ابھی تک اسلام کو اپنا دین نہ بنا سکے۔

۷ اکتوبر ۱۹۹۰

القرہ (ترکی) کے حوالے سے مکہ کے "اخبار العالم الاسلامی" شمارہ ۲۴ ستمبر ۱۹۹۰ میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے: ۵۹۲ جريدة يومية و اكثر من ٣ آلاف مجلة في العالم الاسلامی۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی دنیا میں اس وقت ۵۹۲ روزنامہ اخبارات نکلتے ہیں اور ۳۳۳۹ مجلات شائع ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ تعداد پاکستان میں ہے جہاں ۱۸۴۴ مجلات نکلتے ہیں اور ۱۱۹ روزنامہ اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ اسی طرح بنگلہ دیش، انڈونیشیا، الجزیا، نائجیریا، مغرب، ترکی، ایران، مالدیپ وغیرہ کے اعداد و شمار دئے گئے ہیں۔ برونائی کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ وہ اگرچہ نہایت دولت مند ملک ہے مگر وہاں سے کوئی بھی اخبار یا مجلہ شائع نہیں ہوتا۔ اسی طرح گامبیا، غلینیا، جزر القمر سے بھی نہیں۔ بتایا گیا ہے کہ اسلامی دنیا کا سب سے قدیم اخبار قاہرہ کا الاہرام ہے۔ وہ ۱۸۷۵ میں شروع ہوا۔ وہ تقریباً ایک ملین کی تعداد میں چھپتا ہے۔

مگر اس میں ہندستان کے مسلم اخبارات وجرائد کا کوئی ذکر نہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندستان معروف سیاسی اصطلاح کے مطابق "مسلم ملک" نہیں۔ میرے نزدیک یہ تقسیم بالکل غلط ہے۔ دنیا کے تمام "مسلمان" امت مسلمہ کا حصہ ہیں، خواہ وہ سیاسی اعتبار سے کسی مسلم ملک میں بستے ہوں یا غیر مسلم ملک ہیں۔

۸ اکتوبر ۱۹۹۰

تاریخ کی کتابیں بتاتی ہیں کہ مدینہ کے ۹۵ نام ہیں۔ مثلاً ـــــــ یثرب، طیبہ، دار الابرار

سیدۃ البلاد، دارالسلام، المحرمہ، المحروسہ، وغیرہ۔ ایک عربی مجلہ میں اس کا ذکر کرتے ہوئے یہ الفاظ درج ہیں: قالت کتب السیرۃ والتاریخ ان للمدینۃ المنورۃ ۹۵ اسماً واشارت الی ان ذالک یدل علی عظمۃ المسمی وفضلہ (سیرت اور تاریخ کی کتابیں کہتی ہیں کہ مدینہ منورہ کے ۹۵ نام ہیں۔ اس سے شہر مدینہ کی عظمت اور فضیلت ثابت ہوتی ہے)

ناموں کی کثرت سے یہ استنباط درست نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام ۹۵ سے کم ہیں۔ پھر کیا آپ کی ذات مدینہ سے کم افضل ہے۔ اسی طرح مکہ کے نام بھی نسبتاً بہت کم ہیں۔ مکہ کے نام تقریباً ۷ بتائے گئے ہیں ـــــ مکہ، بکہ، البلد الامین، البیت العتیق، البیت الحرام، ام القریٰ۔ پھر کیا مدینہ کے مقابلہ میں مکہ کی فضیلت وعظمت کم ہے۔ موجودہ مسلمانوں میں سائنٹفک طرز فکر نہیں۔ اس لئے وہ اکثر معاملات میں اسی قسم کی غیر منطقی باتیں کرتے ہیں۔

صحابہ وتابعین کبھی اس طرح کی باتیں نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ خدائے ذوالجلال کی عظمتوں میں گم تھے۔ ان کو ساری بڑائی صرف ایک خدا کی ذات میں نظر آتی تھی۔ اس لئے وہ اشخاص اور اماکن کی عظمتوں کی پیمائش بھی نہیں کرتے تھے۔

۹ اکتوبر ۱۹۹۰

میں بوڑھا ہو گیا ہوں، تمام بال سفید ہو گئے۔ اس مدت میں میں نے بے شمار صفحات لکھے۔ مگر ہر نئے دن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اب تک جو لکھا وہ صرف ابتدائی مشق کے طور پر تھا۔ لکھنے کا اصل کام اب شروع ہوگا۔ یہ احساس لامتناہی طور پر ہر آنے والے دن کو باقی رہتا ہے۔

اس تجربہ کی روشنی میں میرا خیال ہے کہ موجودہ دنیا صرف "مشق" کی جگہ ہے، وہ لکھنے اور بولنے کی جگہ نہیں۔ موجودہ دنیا میں آدمی صرف یہ سیکھ رہا ہے کہ وہ کیا بولے اور کس طرح لکھے۔ لکھنے اور بولنے کا حقیقی عمل صرف ان خوش قسمت افراد کے لئے مقدر ہے جن کو موت کے بعد خدا کی مغفرت حاصل ہو اور انھیں جنت کی معیاری دنیا میں رہنے کی اجازت دی جائے۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۹۰

محمد افضل لاڈی والا (بمبئی) سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ تبلیغی جماعت اور الرسالہ مشن میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا کہ دونوں کا مقصد افراد کے اندر دینی بیداری لانا ہے۔ مگر

فرق یہ ہے کہ تبلیغی جماعت خوش عقیدگی کو بیدار کرتی ہے اور الرسالہ مشن آدمی کے ذہن کو۔ ایک مسلمان سے جب آپ کہتے ہیں کہ "حضور والا مبارک طریقہ" تو اس کے اندر چھپا ہوا عقیدتمندی کا احساس جاگ اٹھتا ہے اور وہ "حضور والے عمل" کو اختیار کرنے کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں الرسالہ تدبر اور تعقل کی دعوت دیتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر وہ ذہنی انقلاب لانا چاہتا ہے جس کے بعد وہ خود ذہنی فیصلہ کے تحت ایمان واسلام کو اپنی زندگی میں اپنالے۔

۱۱ اکتوبر ۱۹۹۰

برٹرینڈرسل کی ایک کتاب ہے۔ ۸۰۰ صفحہ پر مشتمل اس کتاب کا نام مغربی فلسفہ کی تاریخ (History of Western Philosophy) ہے۔ اس کتاب میں وہ یہ سوال کرتا ہے کہ فلسفہ کے پیچیدہ مسائل میں آدمی اپنے آپ کو کیوں الجھاتا ہے۔ زندگی کی حقیقت کیا ہے اور کائنات کی توجیہہ کس طرح کی جاسکتی ہے۔ ان سوالات میں انسانی دماغ ہزاروں سال سے الجھا ہوا ہے۔ آخر اپنے آپ کو ان لاینحل سوالات میں مبتلا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا جواب برٹرینڈرسل نے ان الفاظ میں دیا ہے کہ یہ دراصل کائناتی تنہائی کی دہشتناکی (Terror of Cosmic Loneliness) ہے جو آدمی کو اس قسم کی فلسفیانہ تلاش پر مجبور کرتی ہے۔ (صفحہ ۱۴)

ایک پتھر کروروں سال تک زمین پر پڑا رہے تو اس کو کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہوگا۔ مگر انسان تنہائی کے احساس سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان عین اپنی پیدائش کے اعتبار سے ایک خدا پرست مخلوق ہے۔ انسان نفسیاتی اعتبار سے اپنے آپ کو نامکمل محسوس کرتا ہے۔ وہ صرف اس وقت احساس کی تکمیل سے دوچار ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے نفسیاتی خلا کو پر کرنے کے لئے اپنے باہر کسی چیز کو پالے۔

اس اعتبار سے انسانوں کی تین قسمیں ہیں (۱) فلسفی جو ہمیشہ اس کی تلاش میں رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ مر جاتا ہے (۲) مشرک انسان جو کسی اور چیز کو یہ مقام دے کر مصنوعی طور اپنے لئے اطمینان کا سامان کر لیتا ہے (۳) موحد انسان جو اس فطری سوال کے صحیح جواب کو پالیتا ہے۔ وہ اپنے احساس تنہائی کو عقیدۂ خدا کے ذریعہ پر کر لیتا ہے۔

یہی آخری انسان کامیاب انسان ہے۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۹۰

صلیبی جنگوں کے زمانہ کے ایک مجاہد ہیں۔ ان کا نام اسامہ بن منقذ الشیزری (۴۸۸ - ۵۸۴ ھ) ہے۔ ان کی ایک عربی کتاب الاعتبار ہے۔ یہ کتاب زیادہ تر جہاد و قتال کے واقعات و تاثرات پر مشتمل ہے۔ مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ خطرات کا مقابلہ نہ موت کو جلدی لاسکتا ہے اور نہ خوف اور احتیاط کی زیادتی لکھے ہوئے وقت کو دور کرسکتی ہے۔ ہر وقت مقرر ہے، زندگی کی ساعت مقرر ہے۔ خطرات میں گھسنا عمروں کو کم نہیں کرتا (رکوب الاخطار لا ینقص الاعمار)

بظاہر یہ ایک اسلامی ولولہ کی بات ہے۔ مگر مجھے اس سے کلی اتفاق نہیں۔ رکوب الاخطار اگر مطلق طور پر مطلوب ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے ہجرت کرنے کے بجائے وہاں دشمنوں سے لڑنا چاہئے تھا۔ غزوۂ احزاب میں آپ کو خندق کھودنے کے بجائے براہ راست مقابلہ کرنا چاہئے۔ حدیبیہ کے موقع پر صلح کرنے کے بجائے آپ کو تصادم کرنا چاہئے تھا۔ وغیرہ۔

میرا احساس ہے کہ پچھلے ہزار سال کے دوران جہاد بمعنی قتال کو ضرورت سے زیادہ گلوریفائی کیا گیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دعوت کا کوئی گلوری فیکیشن نہیں کیا گیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمان ہر جگہ لڑنے بھڑنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ کیوں کہ لڑائی انھیں ہیروانہ کام نظر آتی ہے اور صبر و برداشت کرتے ہوئے دعوت پہنچانے والا کوئی شخص ساری دنیا میں نظر نہیں آتا، کیوں کہ موجودہ حالات میں دعوتی کام میں "ہیرو" والی کشش نہیں۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۹۰

کویت پر صدام حسین کے قبضہ کے بعد تمام سنجیدہ مسلمان صدام حسین کی جارحیت کی مذمت کر رہے ہیں۔ مگر دنیا بھر میں مسلمانوں کی اکثریت صدام حسین کی حمایت میں بول رہی ہے۔ حتی کہ صدام حسین کو مجاہد اعظم اور صلاح الدین ثانی کا خطاب دیا جا رہا ہے۔ ٹھیک یہی واقعہ اس سے پہلے کمال اتاترک، جمال عبد الناصر، معمر القذافی اور آیت اللہ خمینی کے سلسلہ میں پیش آچکا ہے۔ ہر ایک کو اولاً عام مسلمانوں نے مجاہد اسلام کے روپ میں دیکھا۔ صرف بعد کو پیش آنے والے حالات کے بعد لوگوں کی سوچ میں تبدیلی آئی۔ چھوٹے پیمانے پر یہی چیز دہلی

کہ امام عبداللہ بخاری جیسے لوگوں کے بارہ میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

اس کی وجہ مسلمانوں کی شکست خوردہ نفسیات ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان ہزیمت کے احساس میں جی رہے ہیں۔ اس لئے جو شخص کھڑا ہو کر بڑی طاقتوں کو للکارتا ہے، وہ اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں، خواہ اس کا للکارنا اسٹیج کے لفظی شور و غل کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

اس صورت حال کے بے شمار نقصانات ہیں۔ اور اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان صرف لفظ باز لوگوں کو قیادت کا درجہ مل رہا ہے۔ جو لوگ سنجیدگی اور حقیقت پسندی کی بات کریں، انھیں مسلمان اپنا قائد بنانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۹۰

۱۴ اکتوبر کو میں رام پور میں تھا۔ وہاں میں نے "جامعة الصالحات" کو دیکھا۔ ۱۹۵۶ میں اس کو میں نے اس وقت دیکھا تھا جب کہ وہ محلہ کھنڈسار کے معمولی مکان میں قائم ہوئی۔ ۳۵ سال بعد وہ اسٹیشن سے شہر آنے والی شاہراہ پر بہت بڑے رقبہ میں قائم ہے۔ اور اس کی عالی شان عمارتیں بن چکی ہیں۔ معلوم ہوا کہ کویت کے ایک شیخ نے اس کو ۵ لاکھ روپے دئے۔ دکتور یوسف المقریف (سابق سفیر لیبیا) نے ۸ لاکھ روپے دئے۔ جدہ کے اسلامک ڈولپمنٹ بنک نے رقم دی۔ اس کے علاوہ دوسرے لوگوں سے برابر عطیات ملتے رہتے ہیں۔

میں بھی "۳۵ سال" سے ایک مشن چلا رہا ہوں۔ مگر مجھ کو اس قسم کے تعاون دینے والے لوگ نہیں ملے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "لڑکیوں کی تعلیم گاہ" لوگوں کے لئے ایک معلوم کام ہے۔ مگر دعوتی مشن لوگوں کے لئے معلوم و معروف کام نہیں جس کو لے کر میں اٹھا ہوں۔ یہ حدیث کے الفاظ میں غریب (اجنبی) کام ہے۔ پھر اس کے تعاون کے لئے لوگوں کے اندر جوش کیسے بیدار ہو سکتا ہے۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۹۰

دکتور عبدالعظیم محمود الدیب (پیدائش ۱۹۲۹) کی ایک کتاب ڈاک سے ملی۔ اس کا

نام المنہج فی کتابات الغربیین عن التاریخ الاسلامی ہے۔ وہ ۱۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور ربیع الثانی ۱۴۱۱ میں قطر سے چھپی ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ انیسویں صدی کے آغاز سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے وسط تک مستشرق علما نے ساٹھ ہزار کتابیں اسلام کے بارہ میں شائع کی ہیں۔ ان کتابوں کا مقصد کیا ہے۔ ان کا ایک خاص مقصد یہ ہے کہ مسلم نوجوانوں کو اسلام سے منحرف کر دیا جائے۔ اپنے اس مقصد میں وہ کافی کامیاب ہوئے ہیں۔ حتی کہ محمد محمد حسین مرحوم کے الفاظ میں ہمارے قلعوں کے لئے آج خود ہمارے اندر سے خطرات پیدا ہو گئے ہیں۔ (حصوننا مهددة من داخلها، صفحہ ۳۵)

یہ صحیح ہے کہ ہماری نئی نسل اسلام کے بارہ میں شک و شبہ میں مبتلا ہوئی ہے۔ مگر اس کی اصل وجہ مستشرقین کی کتابیں نہیں۔ اس کی زیادہ بڑی وجہ یہ ہے کہ خود مسلم علما اسلام کو وقت کے فکری ستوئی پر پیش نہ کر سکے۔ بیرونی خطرات ہمیشہ موجود تھے اور ہمیشہ موجود رہیں گے۔ لیکن اگر ہم طاقتور اسلوب میں اسلامی لٹریچر پیش کر سکیں تو اسلام کے خلاف ہر خطرہ اور ہر سازش انشاء اللہ غیر موثر ہو کر رہ جائے گی۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۹۰

یزید بن ہارون اسلمی (م ۲۰۶ ھ) مشہور تبع تابعی ہیں۔ وہ تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ تمام اسلامی علوم میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے۔ اس زمانہ کے تمام علما نے ان کے علم و فضل کی تصدیق کی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ ایک متقی انسان بھی تھے۔ تذکرۃ الحفاظ میں ان کی بابت ایک قول ان الفاظ میں درج کیا گیا ہے: کان من خیار عباد اللہ (۲۰۵/۱)

یزید بن ہارون نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن واسط میں حاصل کی۔ اس کے بعد علم کے حصول کے لئے دوسرے ملکوں کا سفر کیا۔ وہ اپنے بارہ میں کہتے ہیں کہ میں اس وقت علم سے آگاہ نہ ہو سکا جب تک میں واسط سے باہر نہیں نکلا (ما عرفتُ حتّٰی خرجتُ من واسطٍ)

یہ قول سفر کی اہمیت کو بتاتا ہے۔ میرا اپنا حال بھی یہی ہے۔ پچھلے ۲۰ برسوں میں میں

نے جو اسفار کئے ہیں ان سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے میرے لئے ان سفروں کی صورتیں پیدا فرمائیں۔ اگر یہ اسفار پیش نہ آتے تو یقیناً میں علم و معرفت کے معاملہ میں بہت ناقص رہتا۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۹۰

مرزا مظہر جانجاناں (۱۱۹۵-۱۱۱۱ھ) مشہور بزرگ ہیں۔ وہ شہنشاہ اورنگ زیب کے ہم زمانہ تھے۔ اورنگ زیب ہی نے ان کا نام "جانِ جاں" رکھا جو بعد کو جانجاناں ہوگیا۔ مرزا مظہر جانجاناں دہلی میں رہتے تھے۔ آئے دن سیاسی شورشوں کے واقعات ان کے کان میں پڑتے تھے۔ ان واقعات سے اکتا کر ایک بار انھوں نے کہا: از تشویشات ہر روزۂ دہلی تنگ آمدہ ام (دہلی کی روز روز کی تشویشناک خبروں سے میں تنگ آگیا ہوں)۔

مرزا مظہر جانجاناں ایک ایسے شخص تھے جو تحمل اور ایثار اور دنیا سے بے رغبتی میں ممتاز تھے۔ نیز یہ مسلم سلطنت کا زمانہ تھا۔ اس کے باوجود مذکورہ الفاظ ان کی زبان سے نکل گئے۔ پھر آج کے حالات میں اگر مسلمانوں کو مذکورہ قسم کی تشویشناکی کا تجربہ ہو تو اس پر احتجاج کرنے کے بجائے انھیں سوچنا چاہئے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ "مسلم سلطنت" میں بھی تشویش کے حالات تھے اور آج "غیر مسلم سلطنت" میں بھی تشویش کے حالات ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں اچھے برے ہر انسان کو آزادی ہے۔ اس لئے یہاں ہمیشہ ہر قسم کے واقعات ہوتے رہیں گے۔ موجودہ دنیا میں آئیڈیل زندگی کا بننا ممکن نہیں۔ اس لئے اس دنیا میں احتجاج کے بجائے حکمت اور تدبر کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے، اور اسی کے ساتھ بوقت ضرورت صبر کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۹۰

جدید سائنسی نظریہ یہ ہے کہ ہماری دنیا ایک جوڑے کی صورت میں ہے۔ یعنی موجودہ دنیا کے علاوہ اسی قسم کی ایک اور زیادہ بہتر دنیا ہے۔ وہ اگرچہ دکھائی نہیں دیتی مگر وہ کائنات کے اندر موجود ہے۔ مجھے یہ نظریہ درست معلوم ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کامل دنیا بنائی۔ پھر اس کا ایک وقتی اور غیر کامل مثنیٰ بنایا۔ آج انسان دنیا

کے اسی شتی پر ہے۔ وہ یہاں آزمائش کے لئے آیا ہے۔ جو افراد اپنے آپ کو خدا کی دنیا کا مطلوب شہری ثابت کریں گے، ان کو آئندہ اصلی اور کامل دنیا میں بسایا جائے گا تاکہ وہ وہاں ابدی طور پر راحت اور عیش کی زندگی گزارتے رہیں۔

مگر موجودہ انسان کو دیکھئے تو بڑی مایوس کن تصویر سامنے آتی ہے۔ انسان اپنی غلط کاری اور سرکشی کے ذریعہ یہ استحقاق کھورہا ہے کہ اس کو دوبارہ خدا کی پاک دنیا میں بسایا جائے۔ ہر آدمی اپنی نااہلی ثابت کرنے میں مشغول ہے، کوئی بھی شخص اپنی اہلیت ثابت کرنے والا دکھائی نہیں دیتا۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۹۰

ماہنامہ جامعہ (دہلی) کے شمارہ اگست ۱۹۹۰ میں ڈاکٹر محمد محمود فیض آبادی کا ایک مضمون چھپا ہے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ سیاسیات میں ریڈر ہیں۔ مضمون کا عنوان ہے :
" ڈاکٹر سید محمود اور قومی سیاست "

ڈاکٹر سید محمود (۱۹۷۱ - ۱۸۸۹) غازی پور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ سیاسی اعتبار سے وہ کانگرسی تھے۔ اس بنا پر مسلم لیگی ان کے سخت مخالف ہو گئے۔ مضمون کا ایک اقتباس یہ ہے :

" بہار میں کانگرس اور لیگ کی کش مکش کے نتیجہ میں سید محمود کو اور ان کے خاندان کو تقسیم ہند تک مسلم لیگ کے سماجی بائیکاٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ چھپرا سے اپنے خط مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۴ میں جواہر لال نہرو کو لکھتے ہیں ــــــ یہاں مسلم لیگیوں نے کنویسنگ کرکے لوگوں کو منع کر دیا کہ کوئی مسلمان میری خوش دامن کی تجہیز و تکفین میں شریک نہ ہو، کیوں کہ میرا خاندان کانگرس سے تعلق رکھتا ہے۔ گھر میں مستورات اور چند ملازموں کے سوا کوئی نہ تھا۔ جب میرے لڑکے وفات کے دوسرے دن پٹنہ سے یہاں پہنچے تو میت کو دفن کرنے کا انتظام ہو سکا۔ فقط خاندان کے دس پندرہ افراد شریک ہوئے۔ مسلمانوں میں کسی کی توہین کا اس سے بڑھ کر کوئی طریقہ سوچا نہیں جا سکتا " (صفحہ ۱۲)

یہ مزاج جو مسلم لیگیوں نے مسلمانوں میں پیدا کیا تھا، ۱۹۴۷ کے بعد ہندستان کے

حالات میں وہ کسی قدر دب گیا۔ مگر پاکستان میں مسلمانوں کے موجودہ باہمی جھگڑے تمام تر اسی مزاج کا نتیجہ ہیں۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۹۰

منڈل کمیشن نے سفارش کی تھی کہ ہریجنوں کو اور نچلے طبقات کو سرکاری ملازمتوں میں ۲۷ فیصد ریزرویشن دیا جائے۔ اس کے خلاف دہلی (اور دوسرے مقامات) میں اینٹی ریزرویشن تحریک چلی۔ حکومت نے اس پر توجہ نہ دی۔ چنانچہ درجنوں نوجوانوں نے خودسوزی کے ذریعہ اپنے آپ کو ہلاک یا زخمی کرلیا۔

اس کے بعد ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۰ کو دیوالی کی تاریخ تھی۔ "اینٹی منڈل کمیشن فورم" اور دوسری کئی ہندو تنظیموں نے اپیل جاری کی کہ پچھلے چند مہینوں میں اینٹی ریزرویشن تحریک کے دوران جن نوجوانوں نے اپنی جان دیدی ہے۔ ان کے لئے نشان احترام (mark of respect) کے طور پر اس سال دیوالی کا جشن نہ منایا جائے اور پٹاخہ بالکل نہ چھوڑا جائے (ہندستان ٹائمس ۱۷ اکتوبر) مگر دیوالی کی رات کو اس کے آگے اور پیچھے اسی دھوم کے ساتھ پٹاخے چھوڑے گئے۔ جس طرح اور سالوں میں چھوڑے جاتے تھے۔

اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ دیوالی میں پٹاخہ چھوڑنا محض بچوں کا ایک کھیل نہیں ہے، اس کا تعلق ہندوؤں کے مذہبی عقیدہ سے ہے۔ ہندو اپنے عقیدہ کے مطابق یہ سمجھتے ہیں کہ دیوالی کی رات کو پٹاخہ چھوڑنے سے دلدر نکلتا ہے اور لکشمی گھر کے اندر آتی ہے۔ ایسی حالت میں وہ کیوں کر اس سے باز رہ سکتے ہیں۔

دیوالی کی آتشبازی میں ہر سال سیکڑوں آدمی زخمی ہوتے ہیں یا مرجاتے ہیں۔ مسلسل شور کی وجہ سے رات کے وقت سونا مشکل ہوجاتا ہے۔ دھوئیں اور گیس کی وجہ سے فضا انتہائی کثیف ہوجاتی ہے۔ ہندستان ٹائمس (۱۳ اکتوبر) کے مطابق، نیشنل سوسائٹی فار دی پریونشن آف بلائنڈنس (NSPB) نے اور دوسری طبی تنظیموں نے اپیل جاری کی کہ پٹاخہ اور آتشبازی میں سخت احتیاط برتی جائے کیوں کہ وہ آنکھوں کے لئے سخت مضر ہے۔ دہلی میں ۱۵ مہینوں کی مدت میں ۱۹۳ آدمیوں کی آنکھ جانچی گئی۔ یہ مدت دیوالی کے دو تیوہاروں کو کور کررہی تھی۔ اس جانچ

میں پایا گیا کہ آتش بازی سے آنکھ خراب ہونے والوں میں تقریباً ۱۵ فیصد وہ تھے جن کی آنکھ دیوالی کی آتش بازی میں خراب ہوئی تھی۔

پیسہ کے اسراف کے علاوہ اس طرح کے مختلف نقصانات ہیں جو دیوالی کی پٹاخہ بازی سے وابستہ ہیں۔ مگر کوئی بھی تحریک اس کو بند کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ اس کا رشتہ مذہبی عقیدہ سے جڑا ہوا ہے۔ مشرکانہ مذاہب نے کیسے کیسے نازک مسائل انسان کے لئے پیدا کر دئے ہیں۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۹۰

ایک مصری مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ مصر کے مسلمانوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ: من نامَ واستراح، جاء النجاح فی الصباح (جو شخص سو جائے اور آرام کرے وہ صبح تک کامیاب ہو جائے گا۔) یہ دراصل طنز ہے۔ مصر کے عیسائیوں نے محنت کو اپنا شعار بنایا اور مسلمانوں نے کاہلی کو۔ اس پر یہ طنزیہ فقرہ کہا گیا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ فاطمیوں کے زمانہ (۱۱۷۱ - ۹۶۹) اور اس کے بعد عیسائیوں پر کچھ مظالم ہوئے۔ اولاً عیسائیوں نے ردعمل ظاہر کیا۔ مگر ان کا ردعمل ان کے لئے مزید ہلاکت کا سبب بنا۔ (۱۹۴۰/۶) اس کے بعد انھوں نے اپنی میٹنگ کی اور طے کیا کہ ہم کو ٹکراؤ چھوڑ کر صرف علم پر اپنی طاقت لگانا ہے۔ ہم کو ہر قیمت پر صرف پڑھنا ہے۔ ۲۵ سال تک انھوں نے اپنی پوری نسل کو پڑھنے پر لگایا۔ اس کے بعد تاریخ بدل گئی۔ آج مصر کے آٹھ ملین عیسائی مصر کی سب سے زیادہ خوش حال کمیونٹی ہیں۔ وہ مصر میں علمی اداروں، سروسوں اور تجارتوں میں اپنے عددی تناسب سے بہت زیادہ حصہ پر قابض ہیں۔

ہندستان کے مسلمانوں کو بھی یہی کرنا تھا۔ مگر ان کے یہاں کوئی ایسا رہنما نہیں اٹھا جو انھیں اس قسم کی رہنمائی دے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ بار بار ٹکراؤ کر کے یک طرفہ طور پر تباہ ہو رہے ہیں۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۹۰

جامی (۱۴۹۲ - ۱۴۱۴) ایک مشہور صوفی اور عالم تھے۔ ان کا ایک فارسی شعر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب بھی میں نماز کے لئے مسجد میں داخل ہوا اور سجدہ کیا تو اُدھر سے آواز آئی کہ تو نے

گھر کے باہر کیا کیا ہے جو تم گھر کے اندر داخل ہوئے ہو:

تو برون در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

میں نے اس مصرعہ کو پڑھا تو خیال آیا کہ یہی معاملہ انسان پر آخرت میں گزرے گا۔ انسان دنیا سے گزر کر آخرت کے عالم میں پہنچے گا کہ وہ اپنے رب کے قریب ہو اور اس کے پڑوس میں رہنے کے لئے ایک جگہ حاصل کرے۔ اس وقت خدا کہے گا کہ اے انسان، تونے دنیا میں میرے لئے کیا کیا کہ اب تم آخرت میں مجھ سے امیدوار بن کر آئے ہو۔ جب تم نے "باہر" کچھ نہیں کیا تو اب "اندر" بھی تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہاں سے نکل جاؤ اور ابد تک اندھیرے صحرا میں بھٹکتے رہو۔

۲۳ اکتوبر ۱۹۹۰

امریکہ کے صدر جارج بش نے پاکستان کو انتباہ دیا تھا کہ ۲۴ اکتوبر کو ہونے والے الکشن سے اگر بے نظیر بھٹو کو حصہ لینے سے روکا گیا یا منصفانہ الکشن کے بجائے rigged election کرایا گیا تو امریکہ اس کے بعد پاکستان کو ملنے والی ۶۰ کروڑ ڈالر سالانہ کی امداد بند کر دے گا۔ اس پر پاکستان کے صدر غلام اسحاق خاں اور جنرل مرزا اسلم بیگ نے سخت ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ یہ پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت ہے، اور ہم کسی قیمت پر مداخلت کو برداشت نہیں کریں گے۔

میں نے اس خبر کو پڑھا تو میں نے کہا کہ اسحاق خاں اور اسلم بیگ کے ہاتھ میں "عہدہ" کا قلم ہے، ان کے ہاتھ میں "تاریخ" کا قلم نہیں۔ اس سے پہلے یحییٰ خاں اور ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھ میں عہدہ کا قلم تھا۔ مگر انھوں نے سمجھ لیا کہ وہ تاریخ کے اوپر حاکمانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۷۱ میں مشرقی پاکستان الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔ اب اگر پاکستان کے موجودہ حکمراں یہ سمجھ لیں کہ وہ تاریخ کے حاکم ہیں تو دوبارہ وہ پاکستان کی ہلاکت کا سبب بنیں گے۔ ایک لیڈر جو کسی ملک میں عوامی مقبولیت کا درجہ رکھتا ہو، اس کو مصنوعی تدبیروں سے روکنا ایک ایسا فعل ہے جو ملک کی تباہی کے سوا اور کہیں نہیں لے جا سکتا۔

پاکستان کی بہترین خیرخواہی یہ ہے کہ الکشن پر اس کو بلا روک جاری رکھا جائے۔

لوگ دوسروں پر بریک لگانے کے لئے نہ دوڑیں بلکہ اپنے اپنے ممکن دائروں میں کام کریں۔ جو جیتے اس کی جیت کو تسلیم کیا جائے اور جو ہارے وہ اپنی ہار کو مان کر خاموش عمل میں مشغول ہو جائے۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۹۰

المجلہ ایک ہفتہ وار عربی میگزین ہے۔ اس کا ہیڈ آفس جدہ میں ہے اور وہ لندن سے شائع ہوتا ہے۔ وہ سعودی عرب کے خرچ پر نکل رہا ہے۔ اس وقت میرے ہاتھ میں اس کا شمارہ ۱۹ – ۲۵ ستمبر ہے۔ اس پورے پرچہ میں خلیج کے بحران پر مضامین ہیں۔ صدام حسین کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ انھوں نے بغداد میں ایک ہوٹل "الرشید" کے نام سے بنوایا۔ اس پر ۳۰۰ ملین ڈالر خرچ ہوئے۔ ایک ایک کمرہ پر ایک ایک ملین ڈالر خرچ کیا گیا۔ وہ ۱۹۸۲ میں ہونے والی حکمرانوں کی کانفرنس کے لئے بنایا گیا تھا۔ مگر یہ کانفرنس منعقد نہ ہو سکی۔ واضح ہو کہ ۱۹۸۲ میں عراق کے اوپر ۲۰ بلین ڈالر قرض تھا جو بڑھتا ہی جا رہا ہے (۳۲ – ۳۳)

مجلہ کے صفحہ ۲ – ۳ پر ونسٹن سگرٹ کا نمایاں اشتہار ہے۔ دو خوش پوش عرب نوجوان ہاتھوں میں جلتا ہوا سگرٹ لئے ہوئے مسکرا رہے ہیں۔ اس کے اوپر لکھا ہوا ہے: توج نجاحك بنكهة ونستون (اپنی کامیابی کو ونسٹن کی خوشبو کا تاج پہناؤ) اسی کے ساتھ اشتہار کے نیچے نسبتاً خفی خط میں یہ جملہ درج ہے:

تحذیر حکومی: التدخین یضر بصحتك وننصحك بالامتناع عنه۔
قانونی وارننگ: سگرٹ پینا آپ کی صحت کے لئے مضر ہے اور ہماری نصیحت ہے کہ آپ سگرٹ نہ پئیں۔

ایک طرف سگرٹ کو کامیابی کا راز بتانا اور دوسری طرف سگرٹ کو نقصان دہ بتا کر اس سے بچنے کا مشورہ دینا کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ مگر آج اکثر ملکوں میں یہ مضحکہ خیز صورتحال قائم ہے۔ صدام حسین کا مذکورہ ہوٹل بنوانا جتنا بے معنی ہے، اتنا ہی بے معنی سگرٹ کا یہ اشتہار بھی ہے۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۹۰

ہمارے علماء اور واعظین امت محمدی کو امت مرحومہ کہتے ہیں۔ یعنی وہ امت جس کے لئے

مستقل طور پر رحمت ومغفرت کا فیصلہ کر دیا گیا ہو جو ہر حال میں جنت میں جانے والی ہو۔ یہ درست نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ قرآن کی تصریح (النساء ۲۳) کے خلاف ہے۔

امتِ محمدی امت مرحومہ نہیں، البتہ وہ امت محفوظہ ہے۔ یعنی وہ خدا کے زیرِ حفاظت ہے۔ امت مرحومہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ آخرت کے اعتبار سے ایک بخشی ہوئی امت ہے۔ یہ ایک بے بنیاد عقیدہ ہے۔ "حفاظت" کا تعلق موجودہ دنیا سے ہے۔ امت محفوظہ کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے لیکر قیامت تک وہ محفوظ رہے گی۔ کوئی بھی طاقت اس پر قادر نہ ہوگی کہ وہ اس کو مٹا ڈالے۔

اس حفاظت کا تعلق امت کی فضیلت سے نہیں، بلکہ نبوت کے خاتمہ سے ہے۔ چوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ آپ کے دین کی حامل قوم کی حفاظت کی جائے۔ اگر یہ قوم مٹ جائے تو دوبارہ نبی کا آنا ضروری ہو جائے گا۔ یہی وہ خاص مصلحت ہے جس کی بنا پر امت محمدی کو محفوظ امت قرار دیا گیا ہے۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۹۰

۱۹۸۶ میں بابری مسجد ایکشن کمیٹی بنائی گئی۔ اس کے بعد مسجد کی بازیابی کے نام پر جو تحریک چلائی گئی وہ احمقانہ حد تک بے معنی تھی۔ اس جوشیلی تحریک سے مسلمان تو کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔ البتہ ہندوؤں کے اندر مسلم دشمنی کا جذبہ وسیع پیمانہ پر جاگ اٹھا۔ اب اکتوبر ۱۹۹۰ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر ایل کے ایڈوانی کی رام رتھ (رتھ یاترا) کے بعد ہندوؤں کا منفی ذہن اپنی آخری حد پر پہنچ گیا ہے۔ میں نے دہلی کے ایک مسلمان سے کہا: مسلمانوں کے جھوٹے لیڈروں نے مسلمانوں کو ان کی تاریخ کے انتہائی نازک موڑ پر پہنچا دیا ہے۔ اب اگر بابری مسجد ٹوٹے تو ہندوؤں کا حوصلہ بڑھے گا، اور اگر بابری مسجد نہ ٹوٹے تو ہندوؤں کا انتقام بڑھے گا۔

حکومتی دور میں مسلمانوں کے لئے برصغیر ہند میں بڑے بھائی بن کر رہنے کا موقع تھا۔ مگر وہ اس کی ذمہ داریوں کو نبھا نہ سکے۔ ۱۸۵۷ کے بعد انھیں موقع ملا کہ وہ یہاں بھائی بھائی

بن کر رہیں۔ اس کو بھی انھوں نے اپنی نادانی کے تحت کھو دیا۔ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد ان کے لئے موقع تھا کہ وہ چھوٹے بھائی کی حیثیت سے رہیں۔ اس پر وہ قانع نہ ہوسکے۔ اب ۱۹۹۰ میں یہ موقع بھی ختم ہوتا ہوا نظر آرہا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب انھیں اس ملک میں حقیر بن کر رہنے پر راضی ہونا پڑے گا۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۹۰

ایک صاحب نے کہا کہ مسلمان ملت کے کاموں میں پیسہ نہیں دیتے۔ میں نے کہا کہ یوں نہ کہئے۔ بلکہ یوں کہئے کہ کچھ مدوں میں دیتے ہیں اور کچھ دوسری مدوں میں نہیں دیتے۔ مثلاً موجودہ مسلمان مسجد اور مدرسہ میں خوب چندہ دیتے ہیں۔ وہ "بزرگوں" کو نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن اگر ان سے غیر مسلموں میں دین کے تعارف کے لئے پیسہ مانگئے، یا مسلمانوں کے اندر تعمیری شعور پیدا کرنے کی مہم میں تعاون کے لئے کہئے تو وہ ایسی مدوں میں پیسہ نہیں دیں گے۔

انھوں نے پوچھا کہ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا سبب جمود ہے۔ مسلمان ذہنی جمود میں مبتلا ہیں۔ ذہنی جمود کی وجہ سے وہ ان روایتی مدوں کو تو دینی کام سمجھتے ہیں جو پہلے سے ان کے درمیان چلی آرہی ہے اور جو تاریخی طور پر مسلّم مد کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ مگر وہ مدیں جن کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے ذہنی بیداری اور غور وفکر کی صلاحیت درکار ہے۔ ان کو سمجھ نہیں پاتے، اس لئے ایسی مدوں میں مالی تعاون دینے کا جوش بھی ان کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اول الذکر مدوں کو ثواب کی مد سمجھتے ہیں۔ مگر اپنے ذہنی جمود کی وجہ سے وہ نہ جان سکے کہ ثانی الذکر مدیں بھی دینی مدیں ہیں، بلکہ زیادہ اہم مدیں ہیں۔ ایسی حالت میں وہ ان مدوں میں کیسے پیسہ دے سکتے ہیں۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۹۰

ایک صاحب نے کہا کہ آپ سید ابوالاعلیٰ مودودی، سید قطب وغیرہ اکابر پر تنقید کرتے ہیں۔ دوسری طرف بال ٹھاکرے اور اس قسم کے دوسرے دریدہ ذہن لوگوں کے بارے میں خاموش رہتے ہیں۔ آخر اس فرق کی وجہ کیا ہے۔

میں نے کہا کہ میرا جواب وہی ہے جو اس قسم کے سوال پر محدثین کا جواب تھا۔ محدثین راویان حدیث پر سخت تنقید کرتے تھے۔ حتی کہ محدثین کے بارہ میں کہا جانے لگا کہ وہ لوگوں کی غیبت کرتے ہیں۔ دوسری طرف محدثین اپنے وقت کے امراء اور حکام وغیرہ کو نظرانداز کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ محدثین سے پوچھا گیا کہ آپ کیوں ایسا کرتے ہیں کہ ایک گروہ پر خوب تنقیدیں کرتے ہیں اور دوسرے گروہ کے بارہ میں خاموش ہیں۔

محدثین نے کہا کہ راویان حدیث کا معاملہ دوسروں سے سراسر مختلف ہے۔ ان پر ہم اس لئے تنقید کرتے ہیں کہ ان سے دین اخذ کیا جاتا ہے (لأنَّ الدين عنهم يؤخذ) جب کہ دوسرے لوگوں کو یہ حیثیت نہیں کہ وہ لوگوں کے لئے دین کا ماخذ ہوں۔

یہی میرا جواب بھی ہے۔ بال ٹھاکرے قسم کے لوگ بلاشبہ بہت سی لغو باتیں کرتے ہیں۔ مگر وہ لوگوں کے لئے دین خداوندی کا ماخذ نہیں ہیں۔ جب کہ وہ لوگ جن پر الرسالہ میں تنقید ہوتی ہے۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو بہت سے لوگوں کے لئے دین کا ماخذ بنے ہوئے ہیں۔ وہ لوگوں کے لئے شارح دین بن گئے ہیں۔ اور ایسا کوئی شخص جب غلطی کرے تو اس پر ضرور تنقید کی جائے گی۔ ایسے لوگوں پر تنقید نہ کرنا دین کی تصویر بگڑنے پر راضی ہونا ہے، اور یہ کسی طرح جائز نہیں۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۹۰

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۷ ربیع الثانی ۱۴۱۱ھ، ۲۵ اکتوبر ۱۹۹۰ء) میں مولانا مختار احمد ندوی (رئیس جمعیۃ اہلحدیث فی الہند) کا انٹرویو چھپا ہے۔ صدام حسین کے کویت پر حملہ (۲ اگست ۱۹۹۰) کے بارہ میں سوالات کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہم کو صدام حسین کے اسلام پر شک ہے۔ وہ بعثی سیکولر، ملحد ہے۔ اس نے نہ کبھی نماز پڑھی۔ اور نہ روزہ رکھا اور نہ کسی مسجد میں داخل ہوا۔ (ونحن نشك في إسلامه ... فصدام بعثي علماني ملحد ۔ لم يعهد عليه انه صلى وصام ولا دخل مسجداً) صفحہ ۱۹۔

کویت پر صدام حسین کے حملہ کو میں سراسر غلط سمجھتا ہوں۔ مگر صدام حسین کی مخالفت کا مذکورہ

انداز درست نہیں۔ ہم کو صدام حسین کے ظلم اور جارحیت کی مذمت کرنا ہے۔ اس کے اسلام پر فتویٰ دینا نہیں ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس کے اسلام پر فتویٰ دینا چاہتا ہو تو اس کو یہ کام کویت پر حملہ سے پہلے کرنا چاہئے تھا۔

اس سے پہلے جب صدام حسین نے ایران پر حملہ کیا تھا تو اس زمانہ میں ہمارے علما ر صدام کے بارہ میں اس قسم کے بیانات نہیں چھاپتے تھے۔ اس زمانہ میں اس قسم کے الفاظ آیت اللہ خمینی کے خلاف استعمال ہو رہے تھے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ہمارے علما کا محرک شاید باطل کی مذمت نہیں بلکہ خلیج کے ملوک کو خوش کرنا ہے۔ ورنہ ان کے یہاں یہ تضاد کیوں۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰

مولانا انیس لقمان ندوی سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ جو لوگ "محبت رسول" کے ہنگامے کھڑے کئے ہوئے ہیں وہ جانتے بھی نہیں کہ محبت رسول ہے کیا۔ میں نے کہا کہ محبت رسول کوئی عشق عاشقی کا معاملہ نہیں، محبت رسول خدا کے فیصلہ پر راضی ہونے کا نام ہے۔ یہ ایک عظیم الشان قربانی ہے نہ کہ کسی قسم کی لفظی نعت خوانی۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۹۰

مسٹر ارن شرما (انگلش جرنلسٹ) بابری مسجد (اجودھیا) کے مسئلہ پر انٹرویو لینے کے لئے آئے۔ میں نے کہا کہ آپ سب سے پہلے اس پر سوچئے کہ ۱۹۸۷ میں شاہ بانو بیگم کا اشو اٹھا تو اس میں مسلم علما نے لیڈرنگ رول ادا کیا۔ اس کے بعد بابری مسجد کا اشو اٹھا تو علما کا اس میں کہیں نام نظر نہیں آتا۔ اس اشو پر تمام ہنگامے وہ لوگ اٹھا رہے ہیں جن کا صحیح ترین نام Petty Politicians ہے۔

انھوں نے کہا کہ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بابری مسجد کا اشو شریعت کے اعتبار سے وہ اہمیت ہی نہیں رکھتا جو مسلمانوں کے سطحی لیڈروں نے اسے دے رکھا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ہندستان میں ۳ لاکھ سے کچھ زیادہ مسجدیں ہیں۔ پورے برصغیر میں تقریباً ۱۰ لاکھ مسجدیں ہیں۔ یہ سب کی سب مسجدیں یکساں درجہ کی ہیں۔ اسلام میں

دنیا کی تین مسجدیں ہی خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس کے بعد جتنی مسجدیں ہیں سب برابر ہیں۔

میں نے کہا کہ علما کا موقف یہ ہے کہ بابری مسجد کو مقامی مسئلہ کی حیثیت دو اور پرامن دائرہ میں محدود رکھتے ہوئے اس کی کوشش کرو۔ ۱۹۴۷ کے بعد ہریانہ، راجستھان پنجاب اور دہلی میں ہزاروں مسجدوں کے لئے اس قسم کے مسائل پیدا ہوئے۔ مگر ان مسجدوں کے لئے کبھی "ایکشن کمیٹی" نہیں بنی اور نہ ان کے لئے کبھی دھواں دھار تحریک نہیں چلائی گئی۔ پھر بابری مسجد کے لئے اس سے مختلف طریق کار کیوں۔

مزید یہ کہ اگر صورت حال ایسی بن جائے کہ ایک طرف مسجد ہو اور دوسری طرف تمام مسلمانوں کی جان اور مال اور عزت کا مسئلہ ہو تو یقیناً مسلمانوں کی حفاظت کے پہلو کو ترجیح دے جائے گی۔

یکم نومبر ۱۹۹۰

سورہ بلد میں نجدین کا لفظ ہے۔ یعنی دو بلندیاں۔ آیت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ دو بلندیوں سے مراد دو مطلوب چیزیں ہیں ـــــ اخلاقی نجد اور شرعی نجد۔ اخلاقی نجد سے مراد وہ بھلائیاں ہیں جو خود فطرت کے زور پر آدمی کو معلوم ہیں۔ اور شرعی نجد سے مراد وہ بھلائیاں ہیں جو وحی کے ذریعہ معلوم ہوتی ہیں۔

آجکل انسان جس طرح ظالم اور سرکش ہوگیا ہے، اس کو سوچ کر میری زبان سے نکلا: شرعی معیار پر جانچنا تو درکنار، یہ انسان تو اخلاقی معیار پر ہی اپنے آپ کو رد کر رہا ہے۔

۲ نومبر ۱۹۹۰

آج جمعہ کا دن تھا۔ مقامی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ اولاً خطبہ میں اور اس کے بعد دوسری رکعت کے آخر میں قنوت نازلہ پڑھی گئی۔ کافروں اور مشرکوں کے لئے ہلاکت اور بربادی کی بد دعا کی گئی۔ اس بد دعا کا پس منظر بابری مسجد کا مسئلہ ہے۔

بابری مسجد کے نام پر مسلمانوں نے "ایکشن کمیٹی بنائی۔ اس کے بعد دھواں دھار تقریریں کی جانے لگیں۔ بائیکاٹ، ریلی، جلوس، مارچ، اسلامی لشکر، آدم سینا وغیرہ کے پرشور

ہنگاموں کے ساتھ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ بابری مسجد کسی کو چھونے نہیں دی جائے گی۔ آخر میں بار بار اعلان کیا گیا کہ ہم نے مسلمانوں کے حفاظتی دستے تیار کر لئے ہیں۔ وہ ہر جگہ ہندوؤں کو روک دیں گے۔ مگر ان سب کے باوجود ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ کو ہندو بڑی تعداد میں اجودھیا کے اندر داخل ہو گئے۔ انھوں نے بابری مسجد کا ایک گنبد توڑ ڈالا۔ اس کے اوپر بھگوا جھنڈا لہرا دیا۔ وغیرہ۔ کوئی ایک مسلمان بھی بابری مسجد کی حفاظت کے لئے نہیں نکلا۔

اب ہر جگہ مسجدوں میں ہندوؤں کے خلاف بد دعائیں کی جا رہی ہیں۔ میرے نزدیک وہ بھی غلط تھا اور یہ بھی غلط ہے۔ پہلے مسلمانوں کو یہ کرنا تھا کہ وہ پر امن تحریک چلائیں۔ اور اب یہ چاہئے کہ وہ ہندوؤں کی ہدایت اور اصلاح کے لئے دعائیں کریں۔ مگر مسلمان نہ پہلے مرحلہ میں صحیح روش اختیار کر سکے اور نہ اب وہ صحیح روش اختیار کر رہے ہیں۔

۳ نومبر ۱۹۹۰

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کی شادی ان کے والدین نے کر دی تھی۔ اب وہ اپنی موجودہ بیوی سے غیر مطمئن ہیں، اور اس کو چھوڑ کر دوسرا نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس کی مخالفت کی۔ میں نے ان سے کہا:

زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے ہمیشہ ایک ایسی رفیقۂ حیات کی ضرورت ہوتی ہے جو اپنے شوہر کے ساتھ قربانی کی حد تک مساعدت کرے۔ اور کسی آدمی کے لئے ایسی رفیقۂ حیات صرف اس کی پہلی بیوی بن سکتی ہے۔ اس کی دوسری بیوی کبھی اس کے لئے ایسی رفیقۂ حیات نہیں بن سکتی۔

۴ نومبر ۱۹۹۰

آج کا انسان یعلمون ظاهراً من الحياة الدنيا وهم عن الآخرة هم غافلون کی تصویر بنا ہوا ہے۔ لوگوں کو شہروں کی رونقیں دکھائی دیتی ہیں۔ حکومتی ایوان کی بلندیاں نظر آتی ہیں۔ انٹرنیشنل کانفرنسوں کی دھوم کی انھیں خبر ہے۔ بڑے بڑے اداروں کے اونچے درودیوار کو وہ فوراً جان لیتے ہیں۔ مگر حقائق کو دیکھنے کے لئے ہر آدمی اندھا بنا ہوا ہے۔ معانی کی دنیا کے جلوے کسی کو نظر نہیں آتے۔ یہی وہ بے آنکھ والے لوگ ہیں جو آخرت میں اس طرح

اٹھائے جائیں گے کہ وہاں وہ اندھے ہوں گے۔

۵ نومبر ۱۹۹۰

قدیم زمانہ میں ترکی کے پاس بہت بڑا بحری بیڑا تھا۔ مگر جب بحری جہازوں کو بھاپ سے چلانے کا دور آیا تو وہ اتنا پچھڑ گئے کہ نئے طرز کی کشتیوں کو حاصل کرنے اور ان کو استعمال کرنے کو بھی وہ اپنے لئے خطرناک سمجھنے لگے۔

کہا جاتا ہے کہ سلطان عبد الحمید ثانی نے بھاپ کی طاقت سے چلنے والا بحری بیڑہ (اسطول) تیار کرایا تو ترکی کے علماء نے اصرار کیا کہ اس کو استعمال کرنے سے پہلے اس پر بخاری شریف کا ختم ہونا چاہئے۔ علماء کا اصرار جب بڑھ گیا تو کسی فوجی افسر نے ان پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ بحری بیڑہ بخار (بھاپ) سے چلتا ہے نہ کہ بخاری سے (اِنَّ الْاُسطُولَ یسیر بالبخار لا بالبخاری)۔

موجودہ زمانہ کے مسلم علماء نے اپنی روش سے جدید انسان کے لئے اسلام کو ایک مضحکہ بنا دیا۔ اگر وہ مسجدوں اور مدرسوں میں خاموش رہ کر اپنا روایتی کام کرتے تو یہ ان کے لئے اس سے بہتر تھا کہ وہ ناکافی لیاقت کے ساتھ مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے باہر نکل پڑیں۔

۶ نومبر ۱۹۹۰

گوئٹے (Goethe) ۱۷۴۹ میں جرمنی میں پیدا ہوا، اور ۱۸۳۲ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کی عظمت اتنی زیادہ ہے کہ اس کو لٹریری جائنٹ (literary giant) کہا جاتا ہے۔ اس کا ایک قول انگریزی میں میں نے ان لفظوں میں پڑھا کہ انسانیت قوموں کے اوپر ہے:

Mankind is above nations

گوئٹے کے زمانہ میں قومی تحریک کا زور تھا۔ لوگ یہ کہنے لگے تھے کہ میرا ملک خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر (my country, right or wrong) مگر گوئٹے کی فطرت انسانیت کو زیادہ بلند سمجھتی تھی، اس لئے وہ اس قسم کے تصور قومیت کو قبول نہ کر سکی۔ اسی طرح اگر کچھ

لوگ مذہب کا ایسا اڈیشن پیش کریں جس میں انسانیت کو بلند درجہ نہ مل رہا ہو تو لوگوں کی فطرت ایسے مذہب کا بھی انکار کر دے گی۔

۷ نومبر ۱۹۹۰

مصطفیٰ کامل پاشا (۱۹۰۸ - ۱۸۷۴) قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ وہ مصر کی النهضة الوطنية کے بانیوں میں سے تھے۔ وہ عربی کے علاوہ فرانسیسی اور انگریزی زبان بھی جانتے تھے۔ وہ ساحر البیان مقرر تھے۔ ان کے حیات اور کارناموں کے بارہ میں عربی میں کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ایک عربی مجلہ میں ان کا یہ قول نظر سے گزرا: ان انجلترا هي العدو الابدی للاسلام۔ عدو الامس واليوم والغد (انگلستان اسلام کا ابدی دشمن ہے، وہ کل بھی دشمن تھا اور آج بھی دشمن ہے اور آئندہ بھی دشمن رہے گا)

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا یہی عام ذہن رہا ہے۔ نہ صرف انگریزوں کو بلکہ تمام قوموں کو وہ اپنا دشمن سمجھے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان کوئی دعوتی تحریک ابھر نہ سکی۔ دوسرے دوسرے کاموں پر تو مسلمانوں نے ضرور "دعوت" کا لیبل لگا رکھا ہے مگر حقیقی دعوتی عمل کا ان کے درمیان کوئی وجود نہیں۔ دعوت کا کام ہمیشہ خیر خواہی کے جذبہ کے تحت انجام پاتا ہے۔ جب مسلمانوں نے اپنی مدعو قوموں کو دشمن کے خانہ میں ڈال رکھا ہو تو ان کے لئے کسی خیر خواہانہ عمل کا جذبہ مسلمانوں میں کیونکر پیدا ہو گا۔

۸ نومبر ۱۹۹۰

طرابلس میں كلية الدعوة الاسلامیہ کے نام سے ایک کالج ہے۔ اس کا ایک سالانہ مجلہ عربی زبان میں نکلتا ہے جس کا نام مجلة الدعوة الاسلامية ہے۔ اس کا شمارہ ۱۹۸۸ (العدد الخامس) پچھلے دنوں ملا۔ اس کے آخر میں ایک خبر درج تھی جو میرے لئے ایک ذاتی اہمیت رکھتی ہے۔

" الاستاذ الهوني في ذمة الله " کے عنوان کے تحت بتایا گیا تھا کہ عبداللہ محمد الهونی ۴ فروری ۱۹۸۸ کو انتقال کر گئے۔ وہ طرابلس کی جامعة الفاتح (فاتح یونیورسٹی) میں ذمہ دارانہ منصب پر فائز تھے۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ وہ نہایت مومن و مخلص آدمی تھے۔ اس

کے ساتھ وہ اعلیٰ علمی ذوق رکھتے تھے۔ وہ مصر کے شہر سلوم میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد وہ ہجرت کرکے لیبیا آئے۔ انھوں نے طرابلس یونیورسٹی سے ۱۹۷۱ میں ممتاز نمبروں کے ساتھ ایم اے پاس کیا تھا۔

خبر میں بتایا گیا تھا ان کی عظیم شخصیت کی کلید تمام لوگوں سے محبت کرنا تھا (کان مفتاح شخصیتہ العظیمۃ ھو الحب للجمیع) موصوف کا واقعہ میں نے اپنے سفرنامہ (۱/ ۴۰-۴۱) میں لکھا ہے۔ انھوں نے ہمارے مشن کو پھیلانے کے لئے ایک نہایت اہم اور خاموش رول ادا کیا۔ انھوں نے الاسلام یتحدی ہزاروں کی تعداد میں قاہرہ سے منگائی اور اس کو نہایت سستی قیمت پر لوگوں کے درمیان تقسیم کروایا۔ اس طرح یہ کتاب طرابلس کے تقریباً ہر پڑھے لکھے آدمی کے پاس پہنچ گئی۔

۹ نومبر ۱۹۹۰

اخبار العالم الاسلامی (مکہ) کے شمارہ ۱۱ ربیع الثانی ۱۴۱۱ھ، ۲۹ اکتوبر ۱۹۹۰ء کے صفحہ ۲ پر " رؤوس الفتنۃ" کے عنوان کے تحت ایک مضمون چھپا ہے۔ مضمون نگار عادل حسن جمدار لکھتے ہیں کہ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ کویت کی افتاد اور خلیج اسلامی اور وطن عربی بلکہ تمام عالم کی ساری مشکلات و مصائب یہود کی کارستانی ہیں (ولیس ھناك مبالغۃ فی القول بان مصیبۃ الکویت وکافۃ مصائب ومشکلات منطقۃ الخلیج الاسلامی والوطن العربی ثم العالم اجمع انما ھی فی الواقع من صنع الیھود)

اگر یہ صحیح ہو تو اسی کے ساتھ یہ اعلان کرنا چاہئے کہ حسن البنا سے لے کر اب تک ہمارے تمام علماء، تمام اکابر، تمام مفکرین، تمام قائدین اور تمام ادارے اور حکومتیں سب کی سب نااہل اور نالائق تھے۔ کیوں کہ بلا استثناء سب کے سب پچاس سال سے یہود کے فتنہ کو ختم کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور اب تک وہ اس فتنہ کو ایک فیصد بھی ختم نہ کرسکے۔

۱۰ نومبر ۱۹۹۰

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ کو ہندو نوجوان (کارسیوک) ہزاروں کی تعداد میں اجودھیا میں گھس گئے۔

وہ بابری مسجد کے اوپر چڑھ گئے۔ اس کے تینوں گنبدوں پر اپنا گیروا جھنڈا لہرا دیا اور ایک گنبد کو کسی قدر نقصان بھی پہنچایا۔ ان کا ایک نعرہ یہ تھا: تین نہیں اب تیس ہزار، نہیں بچے گا کوئی مزار۔

مسلمانوں کے نام نہاد لیڈر روزانہ پرجوش تقریریں کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اسلامی لشکر، آدم سینا اور حفاظتی دستے تیار ہیں۔ ۳۰ اکتوبر کو پانچ لاکھ مسلم نوجوان سڑکوں پر نکل آئیں گے اور ہندوؤں کو بابری مسجد میں داخل ہونے سے روک دیں گے۔ مگر جب تاریخ آئی تو پانچ مسلمان بھی سڑک پر موجود نہ تھا ـــــ بزدلی کا اتنا بڑا مظاہرہ شاید اس سے پہلے مسلمانوں نے کبھی نہیں کیا تھا۔

دوسرا بزدلی کا مظاہرہ یہ ہے کہ بنگلہ دیش اور پاکستان کی ہندو اقلیت کو وہاں کے مسلمانوں نے ستایا۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۰ نومبر ۱۹۹۰) کے مطابق، بنگلہ دیش کے مسلمانوں نے وہاں کے ہندوؤں کے خلاف فساد برپا کیا۔ اور صرف چاٹگام میں ۱۲۰ مندروں کو ڈیمیج کیا۔ پاکستان میں سندھ کے مختلف مقامات پر ہندو مخالف مظاہرے کئے گئے۔ ہندستان ٹائمس (۱۰ نومبر ۱۹۹۰) کے مطابق، انھوں نے سندھ کے ایک ہندو کو مار ڈالا اور کئی مندروں کو نقصان پہنچایا۔

یہ دونوں بلاشبہ بزدلی کے واقعات ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دونوں میں سے کس بزدلی کو میں زیادہ بڑی بزدلی قرار دوں۔

۱۱ نومبر ۱۹۹۰

ہندستان ٹائمس (۱۰ نومبر ۱۹۹۰) کے صفحہ ۱۲ پر یہ خبر ہے کہ سوویت یونین اپنے نام میں سے سوویت اور سوشلسٹ کا لفظ نکال دے گا اور اب اس کا نام یونین آف ساورین ریپبلکن ہوگا:

The Soviet Union will drop the words of "Soviet" and "Socialist" from its name and become the "Union of Sovereign Republics."

اشتراکی روس کی مارکسزم سے واپسی انسانی عقل کی نارسائی کا بڑا عجیب ثبوت ہے۔

۱۲ نومبر ۱۹۹۰

بھارتیہ جنتا پارٹی نے اجودھیا میں رام مندر کی تحریک چلائی تو ہندو عوام کی ایک بھیڑ اس کے گرد جمع ہوگئی۔ پارٹی کے صدر لال کرشن اڈوانی نے سومناتھ سے اجودھیا تک دس ہزار کیلومیٹر کی رتھ یاترا کی تو سارے راستہ میں ہندوؤں کی طرف سے انھیں زبردست استقبال ملا۔ مگر اس بھیڑ کی وجہ سے وہ غلط فہمی میں نہیں پڑے۔

انگریزی ہفت روزہ انڈیا ٹوڈے کے نمائندہ سے لال کرشن اڈوانی کی بات چیت ہوئی۔ انڈیا ٹوڈے کے نمائندہ کا کہنا ہے کہ تاہم مسٹر اڈوانی ہندوؤں کے پرجوش استقبال کو اپنی پارٹی کی مقبولیت کے ہم معنی نہیں سمجھتے۔ انھوں نے کہا کہ میں اس دھوکہ میں نہیں ہوں کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔ یہ استقبال تمام تر رام بھکتی کی وجہ سے ہے:

> Advani, however, does not see the enthusiastic response as an indication of his or his party's popularity. "I am under no illusion that the popularity of the BJP is on the upswing. The response is all because of Ram Bhakti," he said.

اسی کا نام حقیقت پسندی ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں میں یہ حقیقت پسندی مفقود نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے پاکستان میں غلاف کعبہ (۱۹۶۳) اور یوم شوکت اسلام (۱۹۷۰) کا جلوس نکالا۔ انھوں نے قادیانی مخالف تحریک (۱۹۷۵) میں دھواں دار حصہ لیا۔ ان کے اس قسم کے جلسے اور جلوسوں میں مسلمان بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ انھوں نے اس بھیڑ کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ پاکستان کے مسلم عوام ان کے ساتھ ہیں۔ اور وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ پاکستان میں حکومت بنا سکیں۔

اسی غلط فہمی کے تحت انھوں نے اپنی ساری طاقت بحالی جمہوریت کی تحریک (۱۹۶۵) میں لگا دی۔ مگر جب الکشن ہوا تو ان کے صرف چند آدمی پاکستان اسمبلی کے لئے منتخب ہو سکے۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۰ کے الکشن میں بھی جماعت اسلامی نے بڑے بڑے نعروں کے ساتھ حصہ لیا۔ مگر اس بار بھی اپنے صرف چند آدمیوں ہی کو وہ اسمبلی میں پہنچا سکے۔ اس تباہ کن جدوجہد کا اتنا فائدہ بھی نہیں ہوا کہ مولانا مودودی آخر میں اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے۔

۱۲ نومبر ۱۹۹۰

"جنگ کی تیاریاں" یا "جنگ کے لئے تیاریاں" دونوں فقرے اردو زبان میں استعمال کئے جاسکتے ہیں، اور دونوں ہی صحیح سمجھے جائیں گے۔ لیکن انگریزی میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ انگریزی میں اس مفہوم کے لئے preparations of war نہیں کہا جائے گا، بلکہ preparations for war کا جملہ استعمال کیا جائے گا۔

یہ ایک سادہ سی مثال ہے جو اردو اور انگریزی کے فرق کو بتاتی ہے۔ انگریزی میں ہر چیز کی معیار بندی ہو چکی ہے۔ معیار سے کم درجہ کی زبان وہاں قابل قبول نہیں ہوتی۔ جبکہ اردو میں اس قسم کی معیار بندی نہیں ہوئی۔ اس لئے اردو میں معیاری زبان اور غیر معیاری زبان دونوں ہی چل جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی زبان میں معیار سے کم درجہ کی کتابوں کا مارکٹ میں لانا سخت مشکل ہے۔ اس کے برعکس اردو دنیا میں یہ حال ہے کہ کم تر معیار کی کتابوں اور رجرائد کا ہر طرف انبار لگا ہوا ہے۔

۱۴ نومبر ۱۹۹۰

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی (استاد جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی) کا ایک مضمون حیدرآباد کے الفیصل نومبر ۱۹۹۰ میں چھپا ہے۔ اس میں موصوف لکھتے ہیں ـــــ عرب کی سرزمین وہ سرزمین ہے جس پر کائنات کے محسن اعظم، دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل حضرت محمدؐ کی بعثت مبارکہ ہوئی تھی، اور اقبال نے یہ کہہ کر ذرا بھی مبالغہ سے کام نہیں لیا کہ:

خیمہ افلاک کا ایستادہ اسی نام سے ہے   نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

قرآن میں اللہ تعالیٰ کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ ـــــ ان اللہ یمسک السماوات والارض ان تزولا ولئن زالتا ان امسکہما من احد من بعدہ (فاطر ۴۱) یعنی بے شک اللہ ہی آسمانوں اور زمینوں کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں، اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے سوا کوئی اور ان کو تھام نہیں سکتا۔ قرآن کے مطابق افلاک کے خیمہ کو کھڑا رکھنے والا صرف ایک اللہ ہے۔ مگر مسلمان اس کارنامہ کو اپنے پیغمبر کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔

لوگ اس طرح کی بے اصل بات کیوں کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر

احساس استعجاب (sense of awe) نہایت طاقت ور صورت میں موجود ہے۔ آدمی کو ایک ایسی ہستی چاہئے جس کو وہ انتہائی عظیم سمجھے، جس کا وہ غیر معمولی اعتراف کرے۔ یہ احساس آدمی کے اندر خدا وند ذوالجلال کے لئے تھا۔ مگر انسان خدا کو نہیں پاتا، اسی لئے وہ کسی انسان کو یہ برتر مقام دیدیتا ہے۔ اور اس کے حق میں غیر معمولی برتری کا اظہار کرکے اپنے دل کو تسکین دیدیتا ہے۔

۱۵ نومبر ۱۹۹۰

عراق نے صدام حسین کی قیادت کے تحت ۲ اگست کو کویت پر قبضہ کیا تھا۔ امریکہ ساڑھے تین مہینہ سے عراق اور کویت کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ مگر اب تک اس نے حملہ کرکے جنگ شروع نہیں کی۔ جنگ امریکہ کے لئے بے حد مہنگی پڑے گی۔ کیوں کہ ماہرین کے اندازہ کے مطابق، جنگ کی قیمت ایک بلین ڈالر روزانہ ہوگی۔ یہ بے پناہ خرچ اور دوسرے نقصانات کا اندیشہ امریکہ کو جنگ کا آغاز کرنے سے روکے ہوئے ہے۔

میں نے اخبار میں اس رپورٹ کو پڑھا تو اس کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ قرآن میں قوم کو ہلاک کرنے کا ذکر کرتے ہوئے یہ الفاظ کیوں آئے ہیں کہ: ولا یخاف عقبٰھا (الشمس) انجام کے اندیشہ سے بالاتر ہونا یہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ انسان کبھی انجام کے اندیشہ سے خالی نہیں ہو سکتا۔

۱۶ نومبر ۱۹۹۰

قومی آواز کے شمارہ ۶ نومبر میں پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ (۱۸۳۹ — ۱۷۸۰) پر کے کے کھلر کا مضمون شائع ہوا ہے۔ مضمون نگار نے بتایا ہے کہ رنجیت سنگھ نہایت روشن خیال تھا۔ اس نے پنجاب میں پہلا چھاپہ خانہ قائم کیا۔ راوی ندی میں بھاپ سے چلنے والی مشینی کشتی چلائی۔ اپنی فوج کو جدید یورپی انداز سے ٹریننگ دی۔ انھوں نے پنجاب میں انگریزی تعلیم رائج کرنے کی کوشش کی۔ بندوق اور کارتوس کا کارخانہ قائم کیا۔ وغیرہ۔

رنجیت سنگھ نہایت سادہ مزاج مہاراجہ تھا۔ وہ تخت کے بجائے معمولی نشست پر بیٹھتا تھا۔ اپنی ریاست میں سختی سے ظلم و زیادتی کو بند کر رکھا تھا۔ ہر مذہب کا احترام کرتا تھا۔

ایک مسلمان خوشنویس نے قرآن کا ایک نسخہ تیار کیا۔ وہ اس کا دس ہزار روپیہ چاہتے تھے۔ مگر رامپور، لکھنؤ اور حیدر آباد کے نواب اتنی رقم دینے پر راضی نہیں ہوئے۔ اس کے بعد وہ اس نسخہ کو لے کر لاہور پہنچے۔ اور رنجیت سنگھ کے سامنے اس کو پیش کیا۔ مہاراجہ اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ قرآن کو بوسہ دیا اور اسی وقت دس ہزار روپیہ کی ادائگی کا حکم صادر کر دیا۔

مہاراجہ کا وزیر خارجہ ایک مسلمان فقیر عزیز الدین تھا۔ اور بہت سے مسلمان اس کے یہاں اعلیٰ عہدوں پر تھے۔ رنجیت سنگھ ہندی اور پنجابی کے علاوہ اردو اور فارسی زبان بخوبی جانتا تھا۔ اس کے یہاں دفتر کی زبان فارسی تھی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حالات میں اس قسم کی چیزیں پڑھتا ہوں تو مجھ کو تعجب ہوتا ہے کہ سید احمد بریلوی کچھ خبروں اور افواہوں کو سن کر اس کے خلاف جنگ پر کیوں آمادہ ہو گئے۔ سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کو چاہئے تھا کہ پہلے رنجیت سنگھ سے ملتے۔ اس سے نہ صرف موصولہ خبروں پر بات کرتے بلکہ اس کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرتے۔ یہ کتنی بڑی نعمت تھی کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ فارسی اور اردو جانتا تھا۔ اس سے خود اپنی زبان میں مکمل گفت گو کی جا سکتی تھی۔ مجھ کو تو سید احمد شہید بریلوی کا اقدام جہاد محض بے معنی فعل معلوم ہوتا ہے۔

۱۷ نومبر ۱۹۹۰

پاکستان کے روزنامہ نوائے وقت کے میگزین (۲۱ ستمبر ۱۹۹۰) میں مسٹر محمد علی جناح کا ایک وکیلانہ کارنامہ شائع کیا گیا ہے۔ مضمون نگار محمد ظفر الحق ایڈوکیٹ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ انھیں کے الفاظ میں یہ ہے:

ایک ہندو ونکٹا شک نے بمبئی کی عدالت میں دعویٰ دائر کیا کہ وہ ایک ہندو مندر کا متولی ہے۔ اس نے عدالت سے کہا کہ اس کو ڈھول باجہ کے ساتھ مسجد کے سامنے سے جلوس کی شکل میں گزرنے کا مذہبی طور پر اختیار حاصل ہے۔ اس نے استدعا کی کہ سوری شناتھ کے تیوہار پر ہر سال اس کو اجازت ہونی چاہئے کہ وہ اپنے دیوتا کی پالکھی بھی مسجد کے

سامنے سے گزارے۔ اس ضمن میں ایک مسلمان عبد القادر کی درخواست پر سب ڈویژنل مجسٹریٹ نے جلوس کو مسجد کے سامنے سے گزارنے پر ضابطۂ فوجداری کے تحت حکم امتناعی جاری کر دیا کہ کوئی ہندو مسجد کے سامنے سے یا مسجد کے حدود میں باجہ ڈھول اور میوزک نہ بجائے اور نہ وہاں سے گزرے۔ یہ حکم متعلقہ ایس ڈی ایم نے ۲۴ نومبر ۱۹۱۰ کو جاری کیا۔

اس حکم کے بعد مذکورہ ونکٹا ئنک نے اپنا دعویٰ عبد القادر کے خلاف برائے استقرار حق بمبئی کی عدالت عالیہ میں دائر کیا۔ عدالت نے اس دعویٰ کو ناقابل سماعت قرار دیتے ہوئے خارج کر دیا۔ اس کے بعد مذکورہ ونکٹا ئنک نے ڈویژن بنچ کے سامنے اس حکم کے خلاف دوبارہ اپیل دائر کی۔ اس نے کہا کہ اس کا دعویٰ قابل سماعت ہے۔ اس کو بھی مذہبی آزادی اتنی ہی ہے جتنی کہ مسلمانوں کو ہے۔ لہٰذا وہ اس کا حقدار ہے کہ مسجد کے سامنے جلوس کی شکل میں ڈھول بجانے پر اور میوزک کے ساتھ گزرنے پر مسلمان کوئی اعتراض نہ کریں۔ اس اپیل کو مسٹر جایاکر ایڈووکیٹ نے دائر کیا۔ انھوں نے عدالت کے سامنے یہ دلیل دی کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس ڈی ایم کو ایسا حکم نامہ جاری کرنے کا حق نہ تھا۔

اس مقدمہ میں مسلمان عبد القادر کی پیروی مسٹر محمد علی جناح نے کی۔ انھوں نے عدالت کو بتایا کہ برسوں سے یہ روایت ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایسے اقدامات کریں گے کہ مذہبی تہواروں پر ایک دوسرے کے جذبات مشتعل نہ ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ۵۰ تا ۱۰۰ کے قریب میوزک اور ڈھول بجانے والے لوگ جب مل کر مسجد کے سامنے سے گزریں گے تو اتنا شور و غل برپا ہوگا کہ ہر مسلمان مشتعل ہو جائے گا۔ اس طرح لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔

اس مقدمہ کی سماعت مسٹر جسٹس بی مین اور مسٹر جسٹس ہرٹن نے کی۔ ان کا فیصلہ بمبئی لارپورٹ کے جرنل (جلد ۲۰) میں موجود ہے۔ یہ فیصلہ ۲۲ جنوری ۱۹۱۸ کو ہوا۔ عدالت نے مسٹر محمد علی جناح کے دلائل کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے فیصلہ میں کہا کہ ماتحت عدالت کا فیصلہ صحیح ہے کہ ہندوؤں کے جلوس کو ڈھول باجہ کے ساتھ مسجد کے سامنے سے گزرنے کی

اجازت نہ دی جائے۔ اس طرح ہندو کی اپیل خارج ہوگئی۔ مضمون نگار نے آخر میں یہ جملہ لکھا ہے: "قائد اعظم یہ اپیل مذہبی روایات کے خلاف اقدامات کرنے پر جیت گئے اور حق کا بول بالا ہوا۔"

مسٹر جناح نے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح ہونے اور ان کو مشتعل ہونے سے بچانے کے لئے ۱۹۱۸ میں جو عدالتی کامیابی حاصل کی تھی اس کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ مسلمان پچھلے ۷۰ سال سے زیادہ بڑے پیمانہ پر عین اسی مصیبت کا شکار ہو رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسٹر جناح کا مذکورہ واقعہ ان کی وکالت کا ثبوت ہے نہ کہ ان کی قیادت کا۔ مسٹر جناح اگر مسلمانوں کو یہ بتاتے کہ اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ تم اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہو تو یہ ایک رہنمائی ہوتی۔ مگر وہ اپنے آپ کو قائد ثابت کرنے کے بجائے صرف وکیل ثابت کر سکے۔

۱۸ نومبر ۱۹۹۰

برما میں عرصہ سے فوجی حکومت ہے۔ عوامی مطالبہ پر وہاں الکشن کرایا گیا۔ مئی ۱۹۹۰ میں ہونے والے اس الکشن میں نیشنل لیگ فار ڈیموکریسی (N.L.D.) بھاری اکثریت سے جیت گئی۔ مگر وہاں کے فوجی جنرلوں نے اقتدار منتقل نہیں کیا۔ انھوں نے لیگ کے لیڈروں کو جیلوں میں بند کر دیا۔ عوام پر ظلم کرنا شروع کیا۔ حتی کہ بدھوں کے عبادت خانوں میں بھی فوج گھس گئی۔ وغیرہ۔

ٹائم میگزین (۱۹ نومبر ۱۹۹۰) کی کور اسٹوری برما کے بارہ میں ہے۔ ٹائم نے اس پر یہ سرخی لگائی ہے کہ —— برما کے فوجی جنرل الکشن ہار گئے۔ مگر وہ ڈیموکریسی کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہیں:

They lost an election, but Burma's generals will not surrender to democracy.

دنیا میں آدمی کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ ہار کر بھی اپنی عظمت کا جھنڈا بلند رکھے۔ آخرت وہ مقام ہے جہاں آدمی یہ موقع کھو دے گا۔ وہاں عظمت صرف اس کو ملے گی جو واقعۃً عظمت کا

مستحق ہو نہ کہ وہ جس نے دھاندلی کے ذریعہ اپنے کو فرضی طور پر اونچا کر رکھا ہو۔

۱۹ نومبر ۱۹۹۰

نوائے وقت (۱۸ جولائی ۱۹۹۰) میں بتایا گیا ہے کہ ــــ امیر جماعت اسلامی پاکستان قاضی حسین احمد نے گزشتہ روز اپنے اعزاز میں دئے گئے استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ بھارت اور اسرائیل مسلمانوں کے بحر بیکراں میں دو چھوٹے چھوٹے جزیروں کی طرح ہیں۔ امت مسلمہ کے سیل رواں کو نہیں روکا جا سکتا۔ (صفحہ ۳)

یہ ایک غیر سنجیدہ کلام ہے، اور پھر یہود کے ساتھ ہندوؤں کو بریکٹ کرنا اس کی غیر سنجیدگی میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ پاکستانی دانشور اور رہنما عام طور پر یہی کرتے ہیں۔ مگر یہ نقطۂ نظر لغویت کی حد تک غلط ہے۔ یہودی قرآن کے مطابق ایک مغضوب قوم ہیں جبکہ ہندو ہمارے لئے مدعو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ سرکشی کی بات ہوگی کہ دونوں قوموں کو ایک درجہ دیا جائے۔

۲۰ نومبر ۱۹۹۰

۱۹ نومبر کو میں امریکہ کے سفر پر روانہ ہوا۔ اس سے ایک دن پہلے ریڈرس ڈائجسٹ (اکتوبر ۱۹۹۰) میں جیمز میکڈرموٹ (James McDermott) کا مضمون پڑھا۔ اس کا عنوان تھا:

Just Ten More Minutes

اس مضمون میں ایک امریکی ڈاکٹر ہوورڈ بالک (Howard Balick) کا قصہ بیان کیا گیا تھا۔ یہ بے حد دردناک قصہ تھا۔ اس کو میں نے آنسوؤں کی بارش کے درمیان پڑھا۔ ڈاکٹر بالک کے پاس پرائیویٹ پائلٹ کا لائسنس تھا۔ ۱۹ فروری ۱۹۸۸ کو انھوں نے چار سیٹوں کا ایک جہاز (Mooney 201) کرایہ پر لیا۔ یہ چھوٹا جہاز ایک انجن پر چلتا تھا۔

امریکہ کے ہوائی اڈہ (Old Bridge Airpot) سے انھوں نے جہاز اڑایا۔ جہاز بلند ہو کر ۱۶۰ کیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ رہا تھا کہ خراب موسم میں گھر گیا۔ اور آخر کار ایک دلدل میں گر پڑا۔ ڈاکٹر بالک شدید طور پر زخمی ہو گئے۔ وہ ٹوٹے ہوئے جہاز میں

پھنسے ہوئے کراہتے رہے۔ ان کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ بارش اور رات کے اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ انھوں نے بڑ بڑاتے ہوئے کہا کہ تم کیوں نہیں آرہے ہو (Why aren't you coming). یہاں تک کہ نو گھنٹے کے بعد پولیس کی ایک ٹیم وہاں پہنچی۔ بڑی مشکلوں سے وہ نکال کر اسپتال پہنچائے گئے۔ علاج کے بعد وہ دوبارہ تندرست ہوگئے۔

اس واقعہ کی المناک تفصیلات بیان کرنا ممکن نہیں۔ یہاں صرف یہ لکھنا ہے کہ جب میں اس قصہ کو پڑھ رہا تھا تو ایسا محسوس ہورہا تھا گویا یہ خود میرا ہی قصہ ہے۔ یہ میرے موجودہ حالات کی ایک خارجی تصویر ہے۔ میری زبان سے بے اختیار نکلا کہ خدایا، میں بھی اسی طرح شدید حالات میں پھنسا ہوا آپ کی نصرت کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں نے کہا: "خداوند تو کب آئے گا" اس پکار پر پچاس سال پہلے میری کہانی کا آغاز ہوا تھا، اور اب دوبارہ "خداوند تو کب آئے گا" کے اوپر میری کہانی کا اختتام ہورہا ہے۔ ڈاکٹر بالک کا جملہ میرے دل کی آواز بن گیا:

Why aren't you coming.

۲۱ نومبر ۱۹۹۰

ٹائمس آف انڈیا (۱۵ نومبر ۱۹۹۰) کے صفحہ ۳ پر ایک فوٹو چھپا ہوا ہے۔ اس میں ٹوپی پوش نوجوانوں کی ایک بھیڑ دکھائی دے رہی ہے۔ وہ کعبہ (مسجد حرام) کی ایک بہت بڑی تصویر اٹھائے ہوئے چل رہی ہے۔ یہ اس جلوس کا فوٹو ہے جو دہلی کے مسلم نوجوانوں نے ۱۴ نومبر ۱۹۹۰ کو نکالا تھا۔ یہ جلوس چاندنی چوک سے صدر بازار کے علاقہ تک گیا۔

یہ جلوس جس میں کچھ سکھ نوجوان بھی شریک تھے، اپنے اعلان کے مطابق، خاموش امن مارچ (Silent peace march) کے نام پر نکالا گیا تھا۔ مگر اس نے اشتعال انگیز نعرے لگائے۔ مثلاً اس کا ایک نعرہ یہ تھا: سکھ اور مسلم بھائی بھائی، ہندو قوم کہاں سے آئی۔ موتیا کھان پہنچ کر جلوس رکا۔ وہاں سخت اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں۔

اس قسم کی حرکتوں کے نتیجہ میں علاقہ کے ہندوؤں میں جوابی اشتعال پیدا ہوا۔ دونوں

فرقوں میں ٹکراؤ ہوا۔ آزادانہ طور پر پتھراؤ اور چھرے بازی ہوئی۔ پولیس نے گولی چلائی۔ اطلاع کے مطابق، اس میں آٹھ مسلمان مرگئے۔ سیکڑوں آدمی زخمی ہوئے۔

احمق لیڈروں کی اشتعال انگیز حرکتوں کے نتیجہ میں اس وقت پورا شمالی ہند بارود کے ڈھیر پر کھڑا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کا جلوس نکالنا بارود میں آگ لگانے کے ہم معنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے وقت میں مذکورہ قسم کا جلوس نکالنا پاگل پن سے بھی زیادہ برا فعل ہے۔ مگر اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ جلوس کی سیاست غلط اور نقصان دہ ہے۔ چنانچہ اب تمام مسلمان اس جلوس کو برا کہہ رہے ہیں۔ جامع مسجد دہلی کے امام عبد اللہ بخاری جلسہ اور جلوس اور پرجوش تقریر بازی کے شہنشاہ بنے ہوئے تھے۔ مگر عوامی دباؤ کے تحت انھوں نے بھی اپنی زبان بدل دی۔ انھوں نے سخت الفاظ میں اس جلوس کی مذمت کی اور اس کو سرپھرے لوگوں کی کارروائی بتایا (قومی آواز ۷ انومبر ۱۹۹۰)

ہندستان کی پچھلی پچاس سال کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اپنے لوگوں کے جلوس کی مذمت کر رہی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۹۰ کا خاتمہ مسلمانوں کے لئے نئے دور کا آغاز ہے۔ اب مسلمان جوش وخروش کی سیاست چھوڑ دینگے اور خاموش انداز میں زندہ رہنا سیکھیں گے۔

۲۲ نومبر ۱۹۹۰

نکولس بٹلر (Nicholas Murray Butler) ۱۸۶۲ میں پیدا ہوا۔ ۱۹۴۷ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا قول ہے کہ ماہر وہ شخص ہے جو کم سے کم کے بارہ میں زیادہ سے زیادہ جانے:

An expert is one who knows more and more about less and less.

موجودہ زمانہ میں کائنات کا مطالعہ نہایت وسیع پیمانہ پر کیا گیا ہے۔ مگر اس مطالعہ نے انسان کو صرف یہ بتایا ہے کہ کائناتی علم اتنا زیادہ ہے کہ کسی انسان کا دماغ اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ علم کو اجزاء اور پھر اجزاء کو مزید اجزاء میں تقسیم کرکے ان کا مطالعہ

کیا جاتا ہے۔ کتنا عظیم ہے خالق اور کتنا حقیر ہے اس کے مقابلہ میں انسان۔

۲۳ نومبر ۱۹۹۰

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ مسلم مفکرین کی لمبی فہرست گنانے لگے۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ جانتے ہیں کہ مفکر کس کو کہا جاتا ہے۔ ان کے پاس اس کا کوئی متعین جواب نہ تھا۔ میں نے کہا کہ مفکر وہ انسان ہے جو حقائقِ متفرقہ کو حقیقتِ واحدہ میں تبدیل کرسکے۔ آپ پہلے اس تعریف کو ذہن میں رکھئے اور اس کے بعد مسلم مفکر کا نام بتائیے۔ وہ کوئی نام نہ بتا سکے۔

۲۴ نومبر ۱۹۹۰

اللہ نے دو دنیائیں بنائیں۔ ایک موجودہ دنیا جہاں آدمی شیطان کے پڑوس میں ہے۔ دوسری، آخرت کی دنیا جہاں آدمی اللہ کے پڑوس میں ہوگا۔ آخرت میں خدا کا پڑوس اس شخص کو ملے گا جو دنیا میں شیطان کے پڑوس پر راضی نہیں ہوا۔ جو آدمی موجودہ دنیا میں شیطان کے پڑوس پر راضی ہو جائے، اس کے لئے یہاں بھی شیطان کا پڑوس ہے اور آخرت میں بھی شیطان کا پڑوس۔

۲۵ نومبر ۱۹۹۰

نومبر ۱۹۹۰ کے آخری عشرہ میں میں امریکہ میں تھا۔ اس قیام کے زمانہ میں اندازہ ہوا کہ یہاں کے مسلمانوں میں ایک نیا ماڈرن قسم کا اسلام پیدا ہو رہا ہے۔ یہاں مجھے ایک خصوصی تقریب میں لے جایا گیا۔ یہ ایک شاندار ہال میں نہایت اہتمام کے ساتھ انجام دی گئی تھی۔ میزوں پر کھانے کا انتظام تھا۔ ایک طرف مرد اور دوسری طرف عورتیں پوری زیبائش و آرائش کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد ایک نوجوان لایا گیا اس کی ملاقات ایک نوجوان لڑکی سے کرائی گئی۔ اس کے بعد اسٹیج پر تقریر ہوئی۔

تقریر میں بتایا گیا کہ یہ "خطبہ سریمنی" ہے۔ اور پھر ثابت کیا گیا کہ یہ عین سنت کے مطابق ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی خطبہ کا رواج تھا۔ اس سریمنی (تقریب) میں مذکورہ لڑکے کی منگنی ایک لڑکی سے کرائی گئی اور پھر اعلان کیا گیا کہ ایک سال کے اندر تاریخ مقرر کر کے زیادہ بڑی تقریب میں نکاح سریمنی منعقد کی جائے گی۔ میں نے

کہا کہ اسلام میں "خطبہ" تو ہے مگر "سرمنی" اسلام میں نہیں۔ خطبہ کا مطلب صرف انفرادی طور پر نکاح کا پیغام دینا ہے نہ کہ اس قسم کی عمومی تقریب منعقد کرنا۔ تاہم اس تقریب کو دیکھ کر ایک نئی بات ذہن میں آئی۔ اسلام میں سیکڑوں سال سے اس قسم کی بدعات کی جارہی ہیں، اس کے باوجود وہ اسلام کا جزء نہ بن سکیں جیسا کہ دوسرے مذہبوں میں پیش آیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک محفوظ مذہب ہے۔ اسلام میں ایک واضح معیار اور ایک واضح نمونہ موجود ہے جس پر کسی بھی عمل کو جانچا جا سکے اور اس کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کیا جا سکے۔ دوسرے مذاہب میں غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے یہ کسوٹی موجود نہیں۔ اس لئے دوسرے مذاہب میں ہر بدعت اس کا جزء بن جاتی ہے۔ مگر اسلام میں وہ اصل مذہب کا جزء نہیں بن سکتی۔

۲۶ نومبر ۱۹۹۰

امریکہ کے زمانۂ قیام میں میری ملاقات ایک عرب شیخ سے ہوئی۔ انھوں نے کویت پر عراق کے حملہ کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ عراقی ہمیشہ سے مفسد رہے ہیں۔ حجاج بن یوسف (وفات ۷۱۴ء) نے عراقیوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: یا اهل العراق، اهل الشقاق والنفاق (اے اہل عراق، جھگڑے اور منافقت والے) میں نے کہا کہ کویت پر عراق کے حملہ کو میں بھی اتنا ہی غلط سمجھتا ہوں جتنا آپ لوگ اسے غلط سمجھتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود مجھے آپ لوگوں کے طریقہ سے اتفاق نہیں۔ عراق کے اسی صدام حسین نے جب ایران پر حملہ کیا اور آٹھ سال تک ان سے جنگ لڑتا رہا تو آپ لوگوں کے درمیان وہ ہیرو بن گیا۔ آپ لوگوں نے بلینوں ڈالر سے اس کی مدد کی۔ اس زمانہ میں عرب اخبارات یکطرفہ طور پر صرف ایران کی مذمت سے بھرے ہوتے تھے۔ اب اسی صدام حسین نے کویت پر حملہ کیا تو آپ لوگ اس کو دنیا کا سب سے برا انسان بتا رہے ہیں۔ میں نے خدا کے فضل سے اس وقت بھی صدام حسین کو غلط سمجھا تھا اور آج بھی اس کو غلط سمجھتا ہوں۔ مگر آپ لوگوں کا حال یہ ہے کہ صدام حسین کی بندوق آپ کے مفروضہ دشمن کے خلاف ہو تو وہ جہاد ہے اور آپ کے اپنے خلاف ہو تو فساد۔

۲۷ نومبر ۱۹۹۰

امریکہ میں ۶ ملین مسلمان رہتے ہیں۔ ان میں ایک قابل لحاظ تعداد ہندستانی اور پاکستانی مسلمانوں کی ہے۔ یہ مسلمان تقریباً یہ رائے رکھتے ہیں کہ ہندستان کے فسادات وغیرہ میں یکطرفہ طور پر صرف ہندو قصوروار ہیں۔ مسلمان مکمل طور پر مظلوم ہیں۔ ہندستان سے جو لوگ امریکہ جاتے ہیں وہ اس کی تصدیق کرتے ہوئے مسلمانوں کی مظلومیت پر تقریریں کرتے ہیں اور وہاں سے بڑی بڑی رقمیں لاتے ہیں۔

ایک خصوصی اجتماع میں یہاں ہندستانی مسلمانوں کا ذکر ہوا۔ میں نے کہا کہ میری رائے بالکل برعکس ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ ہندستان میں مسلمان ظالم ہیں اور ہندو مظلوم۔ یہ سن کر لوگ حیرت کے ساتھ میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے کہا کہ ہندو اگر مسلمانوں کی دنیا چھین رہا ہے تو مسلمان ہندوؤں کی آخرت چھینے ہوئے ہیں۔ پھر زیادہ بڑا مظلوم کون ہے۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کو چاہئے تھا کہ وہ ہندوؤں کے سامنے اسلام پیش کرتے۔ وہ ہندوؤں سے داعی اور مدعو کا رشتہ قائم کرتے۔ مگر مسلمان اس کے برعکس ان سے عداوت کا رشتہ قائم کئے ہوئے ہیں۔ یہ بلاشبہ مسلمانوں کا ظلم ہے۔ اس معاملے میں وہ خدا کے یہاں پکڑ سے نہیں بچ سکتے۔

۲۸ نومبر ۱۹۹۰

جون ۶۲۱ء میں مدینہ سے ۷۲ مرد اور ۳ عورتوں کا قافلہ مکہ آیا۔ وہ رات کے وقت عقبہ کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کی۔ اس کو اسلام کی تاریخ میں بیعت عقبہ ثانیہ کہا جاتا ہے۔ اس بیعت میں مدینہ کے قبائل (اوس اور خزرج) کے جو افراد شریک ہوئے تھے، سیرت کی کتابوں میں ان کی مکمل فہرست نام بنام دی گئی ہے۔

یہ بظاہر ایک سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ دیکھیں کہ ساتویں صدی عیسوی میں یورپ کی تاریخ پر جو کچھ لکھا گیا، وہ انتہائی مبہم اور غیر متعین انداز میں تھا تو یہ تعیین و تحدید حیرت ناک حد تک مختلف معلوم ہوتی ہے۔ انگریز مصنف گائی ایٹن (Gai Eaton) نے لکھا ہے:

Considering how misty are the outlines of European history in the seventh century, it is remarkable how detailed are records of events in Prophet's life. *Islam and the Destiny of Man*, p. 113.

۲۹ نومبر ۱۹۹۰

صدام حسین کے کویت پر قبضہ کے بعد امریکہ کی فوجیں دو لاکھ کی تعداد میں سعودی عرب کی سرزمین پر اتر گئی ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ امریکہ کے مسلمان عام طور پر اس کے مخالف تھے کہ امریکہ اپنی فوجیں عرب کی مقدس سرزمین پر اتارے۔ ۲۹ نومبر کو سیکورٹی کونسل نے ایک رزولیوشن کے ذریعہ امریکہ کو یہ حق دے دیا کہ ۱۵ جنوری ۱۹۹۱ تک اگر عراق اپنی فوجیں کویت سے نہ نکالے تو امریکہ عراق کے اوپر حملہ کر سکتا ہے۔ اس کے بعد امریکہ کے مسلمانوں کا غصہ اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔

اس فیصلہ کے خلاف بیانات، تقریریں اور مظاہرے ہوئے۔ میں نے ایک مسجد میں تقریر سنی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہم نے جو حلف (Oath) لے کر امریکی شہریت قبول کی ہے اس میں لکھا ہوا ہے کہ جنگ کی صورت پیش آنے پر ہم امریکی فوج میں شامل ہو کر اس کے لئے لڑیں گے۔ اب اگر جنگ چھڑتی ہے تو امریکی مسلمانوں کو خلیج کے مسلمانوں کے خلاف لڑنے پر مجبور کیا جائے گا اور یہ اسلام میں حرام ہے۔

ان تجربات کے بعد میرا قیاس ہے کہ امریکہ کے ۶ ملین مسلمان جو امریکہ کو دنیوی جنت سمجھ کر یہاں مقیم ہو گئے تھے۔ اور شہریت کا حلف دے کر یہاں کے شہری بن گئے تھے اب یہاں ان کے لئے سنگین مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ جنگ کی صورت میں اگر وہ امریکی فوج میں شامل ہو کر لڑیں تو وہ شریعت کی خلاف ورزی کریں گے اور اگر وہ اس سے انکار کریں تو وہ امریکی حلف کی خلاف ورزی کے مرتکب قرار پائیں گے۔

مسلمان اب تک یہاں عزت کے ساتھ رہ رہے تھے۔ مگر مجھے اندیشہ ہے کہ اب وہ یہاں بے عزت ہو جائیں گے۔ برطانیہ کے مسلمان سلمان رشدی کے معاملہ میں تخریب کا انداز اختیار کر کے برطانیہ میں حقیر ہو چکے ہیں۔ اب امریکہ کے مسلمانوں کے لئے بھی غالباً یہی مستقبل ان کا انتظار کر رہا ہے۔ لاقدر اللہ۔

۳۰ نومبر ۱۹۹۰

۳۰ نومبر کو میں کیلی فورنیا (امریکہ) میں تھا۔ وہاں صغیر اسلم صاحب کی رہائش گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ یہاں کی اصطلاح کے مطابق یہ اجتماعی کھانا (Potlunch) کی تقریب کے تحت تھا۔ کھانے کے بعد مجھ سے تقریر کی فرمائش کی گئی۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا مسئلہ دشمنان اسلام کا مسئلہ نہیں۔ اس کی وجہ تمام تر مسلمانوں کی اپنی بے شعوری ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف تقابلی مثالیں دیں۔ ان میں سے ایک مثال یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے ذریعہ اسلام کا پہلا اسکول قائم کیا۔ حالانکہ یہ قیدی سب کے سب مشرک اور دشمن تھے۔ موجودہ زمانہ میں یہ حال ہے کہ نوبیل انعام یافتہ ڈاکٹر عبد السلام نے حکومت پاکستان کو یہ پیش کش کی کہ پاکستان میں اعلیٰ سائنسی تعلیم کے لئے ادارہ قائم کیا جائے۔ اور وہ کم معاوضہ پر اس میں اپنی خدمت انجام دیں گے۔ مگر حکومت پاکستان نے اس پیش کش کو اس بنا پر رد کر دیا کہ ڈاکٹر عبد السلام قادیانی ہیں۔

کچھ پاکستانی حضرات جواب امریکی شہری بن چکے ہیں انھوں نے کہا کہ "پاکستانی حکومت نے صحیح کیا۔ کیوں کہ ڈاکٹر عبد السلام کو اگر وہاں پروفیسر کی حیثیت سے بلایا جاتا تو وہ پاکستان میں قادیانیت پھیلاتے"۔ میں نے کہا کہ خود آپ لوگ پاکستان کو اسلام کا قلعہ بتاتے ہیں۔ پھر یہ کیسا قلعہ ہے جو ایک نہتے آدمی کے مقابلہ میں بھی اپنا بچاؤ کرنے سے عاجز ہے۔

یکم دسمبر ۱۹۹۰

ابوسفیان اصلاحی صاحب (علی گڑھ) پاکستان گئے۔ وہاں انھوں نے لاہور میں مولانا امین احسن اصلاحی سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں جو باتیں ہوئیں اس کا ایک جزء یہ تھا: مولانا امین احسن اصلاحی نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ایک مرتبہ جب مولانا حسین احمد مدنی مدرستہ الاصلاح میں آئے تو میں انھیں رخصت کرنے کے لئے اسٹیشن تک گیا۔ اس دوران سیاست ہی موضوع بحث رہی۔ میں نے مولانا سے کہا کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں، اس کے مسلمانوں پر اچھے اثرات نہیں پڑیں گے۔ اس کے جواب میں مولانا حسین احمد مدنی نے فرمایا کہ تم مجھے پہلے انگریزوں کو ٹھکانے لگانے دو، اس کے بعد سارے مسائل طے کر دوں گا

(حیات نو، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۰، صفحہ ۶۷)

یہی اس زمانہ میں تمام مسلم لیڈروں کا حال تھا۔ ان کا ایک طبقہ کہتا تھا کہ پہلے انگریزوں کو ملک سے نکال لینے دو، اس کے بعد تمام دوسرے مسائل حل ہو جائیں گے۔ دوسرا طبقہ یہ کہتا تھا کہ پہلے پاکستان بن جانے دو اس کے بعد تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ ۱۹۴۷ میں انگریز اس ملک سے چلے گئے اور پاکستان بھی مسلم لیڈروں کے مطالبے کے مطابق بن گیا۔ مگر ان "کامیابیوں" پر نصف صدی گزرنے کے باوجود برصغیر ہند میں مسلمانوں کا کوئی ایک مسئلہ بھی حل نہیں ہوا بلکہ مسائل میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

۲ دسمبر ۱۹۹۰

خلیفہ دوم عمر فاروق رضی کے زمانہ میں فلسطین فتح ہوا۔ یہ واقعہ ۱۶ھ (۶۳۷ء) کا ہے۔ حضرت عمر جب فلسطین سے واپس آرہے تھے تو مدینہ پہنچنے سے پہلے راستہ میں ایک خیمہ نظر آیا۔ آپ اونٹنی سے اتر کر وہاں گئے۔ اس کے اندر ایک بوڑھی عورت تھی۔ حضرت عمر نے اپنی شخصیت کو بتائے بغیر اس سے پوچھا کہ خلیفہ عمر کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ بوڑھی عورت نے کہا: لا جزاہ اللہ عنی (خدا عمر کو میری طرف سے بدلہ نہ دے)

حضرت عمر یہ فقرہ سن کر سہم گئے۔ پوچھا کہ عمر کی خطا کیا ہے۔ عورت نے کہا کہ اس نے اب تک میرا وظیفہ نہیں بھیجا۔ حضرت عمر نے کہا کہ پھر تم کو چاہئے تھا کہ خلیفہ کو خبر کرو۔ عورت نے کہا کہ یہ خلیفہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی رعایا کے حالات کو جانے۔ حضرت عمر کے پاس جو کچھ سامان تھا سب اسے دیدیا اور کہا کہ مجھے معاف کر دو۔ اس کے بعد حضرت عمر نے اس بوڑھی عورت سے کہہ کر اس سے تحریری معافی نامہ لیا۔ یہ تحریر ایک چرمی کاغذ پر عبد اللہ بن مسعود نے لکھی اور اس پر حضرت حسن اور حضرت انس نے اپنی گواہی درج کی۔ عورت نے اس پر اپنے انگوٹھے کا نشان لگایا (ازالۃ الخفاء)

۳ دسمبر ۱۹۹۰

سلطان شہاب الدین غوری اور امام فخر الدین رازی دونوں ہم عصر تھے۔ امام رازی ایک بار سلطان شہاب الدین کے دربار میں گئے۔ سلطان نے نصیحت کی فرمائش کی۔ انھوں نے کہا کہ

اے دنیا کے بادشاہ، نہ تمہاری بادشاہت باقی رہے گی اور نہ میری خوش کرنے والی باتیں۔ ہم دونوں کا لوٹنا اللہ ہی کی طرف ہے (یا سلطان العالم، لا سلطانك يبقى ولا تلبيس الرازي يبقى۔ وان مردنا الى الله)

امام ذہبی نے کتاب العبر میں یہ قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ بات سن کر سلطان بری طرح رو پڑا (فانتحب السلطان بالبكاء)

۴ دسمبر ۱۹۹۰

صحیحین کی مشہور روایت ہے: لا يؤمن احدكم حتى يحب لاخيه ما يحب لنفسه (تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے) اس حدیث کو اگر خالص لفظی مفہوم میں لیا جائے تو آج دنیا میں بہت ہی کم ایسے لوگ ملیں گے جو حقیقی معنوں میں اس معیار پر پورے اتریں۔ میں نے تو جن مسلمانوں کا تجربہ کیا ہے، ان کا حال عام طور پر یہ پایا کہ وہ سب ڈبل اسٹینڈرڈ تھے۔ وہ اپنے لئے کچھ پسند کر رہے تھے اور دوسرے کے لئے کچھ۔ میں نے اپنے تجربہ میں یہی حال اصاغر کا بھی پایا۔ اور یہی حال اکابر کا بھی۔

۵ دسمبر ۱۹۹۰

اورنگ آباد کے دو صاحبان ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ مہاراشٹر اسمبلی کے پچھلے الکشن میں شیو سینا کے لیڈر بال ٹھاکرے اورنگ آباد آئے۔ ان کی انتخابی تقریر ہونے والی تھی۔ وہ اجتماع گاہ میں آئے تو وہاں اخباری رپورٹر موجود نہ تھے۔ بال ٹھاکرے نے کہا: کوٹھا گیلے گھوبڑ (کہاں گئے گدھ)

یہ اخبار والوں کی سخت توہین تھی۔ چنانچہ وہ لوگ بگڑ گئے۔ خاص طور پر روزنامہ لوک مت جو مراٹھی، انگریزی اور ہندی میں نکلتا ہے، اس نے بال ٹھاکرے کے خلاف زبردست مہم چلائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسمبلی میں بال ٹھاکرے کی پارٹی صرف اپوزیشن کا مقام حاصل کر سکی۔ ورنہ عام خیال یہ تھا کہ اس بار وہ حکومت بنائے گی۔

جو لوگ خدا سے ڈرنے والے نہ ہوں، ان کی کامیابی انھیں گھمنڈ میں مبتلا کر دیتی ہے۔

اور اس طرح ان کی کامیابی انھیں ناکامی کے راستہ پر ڈالنے کا سبب بن جاتی ہے۔

۶ دسمبر ۱۹۹۰

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۱۹ جمادی الاولی ۱۴۱۱ھ، ۶ دسمبر ۱۹۹۰) میں موضوع الغلاف (کور اسٹوری) کے طور پر ایک مفصل مضمون عراق کی جارحیت کے مسئلہ پر چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے: آخر الدواء الحرب (آخری علاج جنگ ہے)

یہ بڑی مجاہدانہ بات ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ عراق کے فوجی حملہ کے خلاف یہ مجاہدانہ اقدام کون کرے گا۔ اس مجاہدانہ اقدام کی طاقت نہ کویت میں ہے اور نہ سعودی عرب میں۔ اس اقدام کا واحد ہیرو امریکہ ہے جس کو انھوں نے دعوت دے کر اس سرزمین پر بلایا ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا عجیب حال ہے۔ آج ساری دنیا کے مسلم رہنما اور دانشور جنگ کی باتیں کر رہے ہیں۔ حالاں کہ ان میں کوئی شخص بھی لڑنے کے لئے تیار نہیں۔ ہر آدمی خود ساحل پر کھڑا رہنا چاہتا ہے اور دوسروں کو اکسا رہا ہے کہ وہ جنگ کے سمندر میں کود پڑیں۔

۷ دسمبر ۱۹۹۰

انگریزی کا ایک مثل ہے کہ ــــــ گھمنڈ جب جاتا ہے تو وہ گھوڑے پر سوار ہو کر جاتا ہے اور جب واپس آتا ہے تو وہ پیدل واپس آتا ہے:

Pride goeth on horseback,
and cometh back on foot.

یہ وہی بات ہے جس کو اردو میں کہا جاتا ہے "بڑے بول کا سر نیچا" اس دنیا میں جو شخص تواضع اختیار کرے اس کو بلندی ملتی ہے۔ اور جو آدمی گھمنڈ میں مبتلا ہو اس کو آخر کار پستی کے سوا اور کہیں جگہ نہیں ملتی۔

۸ دسمبر ۱۹۹۰

مولانا یوسف بھوپالی ندوی نے بتایا کہ ندوہ کے طلبہ ندوہ کے طالب علم ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ اور وہ دیوبند والوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ میں نے مثال پوچھی۔ انھوں نے

کہاکہ ندوہ کے طلبہ کا یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ عربی زبان جانتے ہیں اور دیوبند کے طلبہ عربی نہیں جانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ جہاں ندوہ کا طالب علم أنَا أتَوَضَّأُ کہتا ہے، وہاں دیوبند کا طالب علم أنَا أفعَلُ الوَضُوء کہے گا۔ جہاں ندوہ کا طالب علم انا أُصلِّي کہتا ہے وہاں وہ انا اقرأ الصلاۃ کہیں گے۔ جہاں ندوہ کا طالب علم انا اصوم کہتا ہے وہاں وہ انا اضع الصوم کہیں گے۔ جہاں ندوہ کا طالب علم انا أحجّ کہتا ہے وہاں وہ انا افعل الحج کہیں گے۔ وغیرہ

میں نے کہا کہ یہ بات خلاف واقعہ بھی ہے اور اس کے ساتھ مومن کی تحقیر بھی۔ ندوہ کے طالب علموں نے شاید عربی ادب کو پڑھا مگر انھوں نے اس حدیث کو نہیں پڑھا کہ کفی بالمرء اثماً ان یحقر اخاہ المسلم (آدمی کے گنہ گار ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے)

۹ دسمبر ۱۹۹۰

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ، ۲۲ نومبر ۱۹۹۰ء) میں غالباً کسی ندوی کا مضمون ہندستان میں اسلام اور مسلمانوں کے بارہ میں چھپا ہے۔ صفحہ ۴۴ پر ہندستان کے اسلامی جرائد کا ذکر ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل تین پرچوں کا ذکر ہے جو کہ ندوہ (لکھنؤ) سے نکلتے ہیں:

الرائد ہفتہ وار، البعث الاسلامی ماہوار، تعمیر حیات پندرہ روزہ۔

الرسالہ کی تعداد اشاعت مذکورہ تینوں جرائد کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ اسی طرح اثرات کے اعتبار سے وہ ان تینوں جرائد کے مجموعی اثرات سے کئی گنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ مگر اس میں الرسالہ کا کوئی ذکر نہیں۔ یہی فعل اگر ہندو کرے تو وہ تعصب قرار دیا جائے گا۔ اور یہی فعل مسلمان کرے تو وہ عین حق وصداقت ہے۔

۱۰ دسمبر ۱۹۹۰

آج جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) کے کانفرنس ہال میں ایک سمینار تھا۔ اس کا موضوع تھا: "آزاد ہندستان میں سیکولرزم اور قومی یک جہتی" اس کے آرگنائزر نظر برنی صاحب کی دعوت پر میں بھی اس میں شریک ہوا۔ چیف گیسٹ کے طور پر حکومت ہند کے ہیلتھ منسٹر

جناب شکیل الرحمان صاحب آنے والے تھے۔

میں ہال کے اندر بیٹھا ہوا تھا ابھی جلسہ کی کارروائی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اچانک گیٹ پر شور وغل سنائی دیا۔ چند منٹ کے بعد مسلم نوجوانوں کا ایک غول وحشیانہ انداز میں اندر گھس آیا۔ وہ شکیل الرحمان ہائے ہائے، شکیل الرحمان مردہ باد، جیسے نعرے لگا رہا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ علی گڑھ، حیدر آباد وغیرہ مقامات پر مسلمانوں کے خلاف جو فسادات ہو رہے ہیں اور ایڈمنسٹریشن ان کو روکنے میں ناکام ثابت ہوا ہے، ان کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مسٹر شکیل الرحمان کو وزارت کے عہدہ سے استعفا دیدنا چاہئے۔ مسٹر شکیل الرحمان نے استعفا تو نہیں دیا، البتہ جلسہ شروع ہونے سے پہلے منتشر ہوگیا۔

میرے نزدیک یہ سراسر بزدلی کا مظاہرہ تھا۔ مسلمان اب ہندوؤں کے خلاف اقدام کی جرأت کھو بیٹھے ہیں۔ چنانچہ وہ مسلمانوں کے خلاف ہنگامہ کرنے میں مصروف ہیں۔

۱۱ دسمبر ۱۹۹۰

یکم دسمبر ۱۹۹۰ کو میں کیلی فورنیا کے مسلمانوں کی ایک میٹنگ میں شریک ہوا۔ اس میٹنگ میں لوگوں کو بتایا گیا کہ امریکہ کا دستور مذہب کی بنیاد پر کسی بھی قانون سازی کو غلط بتاتا ہے۔ اس لئے یہاں ہم یہ امید نہیں کرسکتے کہ ہمارے لئے "مسلم پرسنل لا" جیسا کوئی قانون بنایا جاسکتا ہے۔ ہم کو یہاں کے موجودہ قانونی ڈھانچہ ہی میں اپنے مسائل کا حل دریافت کرنا ہے۔

مقرر حضرات نے بتایا کہ امریکی قانون کے مطابق سب سے اہم چیز مالک کی وصیت (Will) ہے۔ اگر آدمی جائداد چھوڑ کر مرے تو اس کی جائداد کا چالیس فی صد حصہ حکومت کے قبضہ میں چلا جائے گا۔ بقیہ جائداد کا بھی بیشتر حصہ اس کی بیوی (spouse) کو مل جائے گا۔ اور نسبتاً کم حصہ اس کی اولاد کو ملے گا۔ یہ اسلام کے قانون وراثت کے خلاف ہے۔ مگر یہاں کے قانون میں وصیت (ول) کو تقسیم جائداد میں اہم ترین حیثیت حاصل ہے۔ ہم کو چاہئے کہ ہم اس قانونی گنجائش کو استعمال کریں۔ یعنی ہر مسلمان جس کے پاس جائداد ہے وہ موت سے پہلے ایک تحریری وصیت تیار کر دے اور اس وصیت میں وہ شرعی حقوق کے مطابق، ہر ایک کے لئے اس کا حصہ مقرر کر دے۔ جو لوگ اپنی موت کے بعد اس قسم کا وصیت نامہ

چھوڑیں گے۔ ان کی جائداد ان کی منشا کے مطابق اس کے شرعی وارثوں کو پہنچ جائے گی۔
میں نے کہا کہ مجھے اس بات سے پورا اتفاق ہے۔ آپ کو اسی طرح یہاں کے قانونی نظام سے ٹکرانے کے بجائے اس کے دائرہ کے اندر اپنا راستہ نکالنا چاہئے۔ مگر مجھے آپ لوگوں سے یہ شکایت ہے کہ آپ لوگ یہی بات ہندستان کے مسلمانوں کو نہیں بتاتے۔ ہندستان کے مسلمانوں کو آپ ٹکراؤ کا سبق دیتے ہیں اور خود آپ ایڈجسٹمنٹ پر عمل کر رہے ہیں۔

۱۲ دسمبر ۱۹۹۰

امریکہ کے سفر میں کیلی فورنیا کے ایک بڑے سرمایہ دار کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے اپنے یہاں کھانے پر بلایا تھا۔ کھانے کے بعد ان کے گھر والوں اور رشتہ داروں کی ایک مختصر میٹنگ ہوئی۔ اس میں میں نے کچھ باتیں کہیں۔ واپسی کے بعد ان کی اہلیہ کا ٹیلیفون آیا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔
۲۵ دسمبر کو وہ میری رہائش گاہ پر آئیں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے تنہائی میں گفت گو کرنا ہے۔ چنانچہ ایک الگ کمرہ میں ملاقات ہوئی۔ جب میں خاتون کے مکان میں گیا تھا تو وہاں وہ لوگوں سے نہایت ہنس ہنس کر ملاقات کر رہی تھیں، مگر جب دوسری بار وہ مجھ سے ملنے آئیں تو معاملہ برعکس تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے سوالات کیا ہیں۔ یہ کہتے ہی خاتون رونے لگیں اور دیر تک روتی رہیں۔ اس کے بعد انھوں نے کچھ مسائل بتائے۔
حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی سکھی نہیں۔ ہر آدمی کسی نہ کسی المناک تجربہ سے دوچار ہے۔ اس دنیا میں سکھ کی صورت صرف یہ ہے کہ آدمی قناعت کرنا سیکھ جائے۔

۱۳ دسمبر ۱۹۹۰

۵ دسمبر کی شام کو اسلامک سنٹر آرنج کاونٹی کے ہال میں مسلم، مسیحی اور یہودی کانفرنس (Trialogue) تھی۔ یہودی عالم اور عیسائی عالم کے بعد آخر میں ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی نے اسلام کے تعارف پر تقریر کی۔ اسلام اپنی ذات میں حد درجہ کشش رکھتا ہے۔ چنانچہ جب دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کو صحیح انداز میں پیش کیا جائے تو عین وہی منظر ہوتا ہے جو قرآن کی اس آیت میں ہے کہ: فاذا ھی تلقف ما یأفکون (الاعراف ۱۱۷، الشعراء ۴۵)

تقریر کے بعد غیر مسلم سامعین پر بہت اچھا اثر پڑا۔ حتی کہ اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک عیسائی نوجوان کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا کہ مجھے اپنے موجودہ عقیدہ پر شک ہوگیا ہے۔ اب مجھے اسلام کے بارہ میں پھر سے مطالعہ کرنا ہوگا۔

مگر تقریر ختم ہوتے ہی مسلمانوں نے اٹھ اٹھ کر بے معنی سوالات شروع کر دئے۔ یہ سوالات سب کے سب جارحانہ اور مناظرانہ قسم کے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر صدیقی کی تقریر سے جو فضا بنی تھی، وہ فضا بالکل برباد ہوگئی۔ حتی کہ میں نے دیکھا کہ کئی غیر مسلم اٹھ اٹھ کر چلے گئے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ "دشمنان اسلام" کی سازشیں نہیں ہیں بلکہ خود مسلمانوں کی یہ کمزوری ہے کہ ان کے اندر جارحانہ انداز پیدا ہوگیا ہے۔ یہ جارحانہ انداز اسلام کی اشاعت و ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ میرے نزدیک اس جارحانہ انداز کی سب سے بڑی ذمہ داری ان نااہل لیڈروں پر ہے جنھوں نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر دعوتی مزاج بنانے کے بجائے سیاسی اور جہادی مزاج بنایا۔

۱۴ دسمبر ۱۹۹۰

آج جمعہ کا دن تھا۔ میں نے مقامی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ آخری رکعت میں قنوت نازلہ پڑھی گئی۔ اس میں دوسری باتوں کے ساتھ یہ الفاظ بھی تھے: اَللّٰھمَّ اخرج الیھود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب (اے اللہ یہود و نصاریٰ کو عرب سے نکال دے)

پچھلے چار مہینے سے عراق کے صدر صدام حسین کی فوجیں کویت پر قبضہ کرکے بیٹھی ہوئی ہیں۔ عربوں کے بیان کے مطابق، وہ سعودی عرب پر بھی قبضہ کرنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ سعودی عرب اور کویت نے مشترکہ درخواست کے ذریعہ امریکہ (نصرانی قوم) کو اپنی حفاظت کے لئے عرب کی سرزمین پر بلایا ہے۔ سعودی عرب اور کویت کا خیال ہے کہ امریکہ کی موجودگی عرب دنیا میں ضروری ہے، ورنہ صدام حسین ہم کو کھا جائے گا۔ دوسری طرف ہماری مسجدوں میں یہ دعائیں ہو رہی ہیں کہ نصرانی قوم عرب کی سرزمین کو خالی کر دے۔

یہ باتیں مجھے اتنی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو کس خانہ میں رکھا جائے۔

۱۵ دسمبر ۱۹۹۰

آج صبح کو "روشن مستقبل" چھپ کر آئی تو میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہندستان کی پچھلی پچاس سالہ تاریخ میں پہلی بار ہندستان کے مسلمانوں کے سامنے ایک ایسی چیز آئی ہے جس میں ان کے لئے واضح رہنمائی ہے۔ ۱۹۴۸ میں مولانا ابو الکلام آزاد کے مسلم کنونشن سے لے کر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے حالیہ اجلاس تک مسلمانوں کے بے شمار جلسے ہوچکے ہیں۔ مگر ہر جلسہ کا خلاصہ صرف احتجاج اور مطالبہ ہوتا ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی قابل عمل رہنمائی۔

۱۶ دسمبر ۱۹۹۰

پاکستان کے روزنامہ نوائے وقت (۱۶ دسمبر ۱۹۹۰) کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۷۱ میں سقوط ڈھاکہ اور پاکستانی فوج کی شکست سے متعلق واقعات کی جانچ کے لئے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے مقرر کردہ حمود الرحمٰن کمیشن نے اپنی رپورٹ میں سابق صدر جنرل یحییٰ خاں اور ان کے نائب جنرل عبد الحامد سمیت چھ فوجی جنرلوں کو قصور وار ٹھہرایا ہے۔ یہ رپورٹ ۲۲ سال کی جانچ کے بعد سامنے آئی ہے۔ رپورٹ میں جنرل یحییٰ خاں، جنرل عبدالحامد جنرل عمر، جنرل گل حسن، جنرل پیرزادہ، اور جنرل مٹھا کے کورٹ مارشل کی سفارش کی گئی ہے۔ ان میں تین جنرلوں کا انتقال ہوچکا ہے۔

یہ رپورٹ مضحکہ خیز حد تک بے معنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۷۱ میں پاکستان کے ٹوٹنے کی اصل ذمہ داری مسٹر جناح پر ہے نہ کہ مذکورہ فوجی جنرلوں پر۔ تاریخ میں کبھی کوئی ایسا "ملک" نہیں بنا جس کے دو حصے ہوں۔ اور دونوں کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ ہو۔ مزید یہ کہ ان دونوں کے درمیان وہی "دشمن ملک" حائل ہو جس سے لڑ کر یہ پر عجوبہ ملک بنایا گیا ہے۔ ایسے ملک کو بہر حال ٹوٹنا تھا۔ اور وہ آخر کار ٹوٹ گیا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ مسٹر جناح تو بدستور "قائد اعظم" بنے ہوئے ہیں اور بے قصور لوگوں کو مجرم ٹھہرا کر ان کا کورٹ مارشل

کیا جا رہا ہے۔

۱۷ دسمبر ۱۹۹۰

قومی آواز (۱۴ دسمبر ۱۹۹۰) کے صفحہ اول پر یہ خبر تھی: حزب المجاہدین نے جو جماعت اسلامی کشمیر کی ذیلی دہشت گرد تنظیم ہے، کشمیر کے ۸۷ سالہ مولانا سید محمد مسعودی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ مولانا مسعودی طویل مدت سے بیمار تھے اور بستر مرگ پر تھے۔ وہ ۱۹۰۳ میں پیدا ہوئے۔ دو مسلم دہشت گرد ان کے بیڈروم میں زبردستی گھس گئے اور پستول سے ان پر فائر کر کے بھاگ گئے۔ اس سے پہلے ۱۱ اپریل ۱۹۹۰ کو بھی نام نہاد مجاہدین ڈاکٹر مشیر الحق کو اسی طرح ہلاک کر چکے ہیں۔

اسلام میں اس قسم کا قتل یقینی طور پر حرام ہے۔ بالفرض اگر مولانا مسعودی کشمیری مجاہدین کے خلاف ہوں تب بھی انھیں مارنا جائز نہیں۔ کیوں کہ بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو تو میدان جنگ میں مارنا بھی منع ہے، کجا کہ انھیں بستر مرض پر مارا جائے۔ میں نے غور کیا کہ اس کا سبب کیا ہے۔

اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ قطب اور خمینی اور مودودی جیسے لوگوں نے اسلام کی سیاسی تفسیر کر کے نوجوانوں کا ذہن بگاڑ دیا ہے۔ اس تفسیر میں اصل اہمیت یہ ہو گئی ہے کہ موجودہ نظام کو توڑا جائے۔ انسان کی عزت و احترام اور اس کے جان و مال کا تقدس اس وقت ثانوی بن جاتا ہے جب کہ نظام توڑنے کی راہ میں اس کا وجود حائل نظر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے لوگ ہر جگہ تشدد کا طریقہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ یہ بلاشبہ کمیونسٹ مزاج ہے نہ کہ اسلامی مزاج۔

۱۸ دسمبر ۱۹۹۰

ٹائمس آف انڈیا (۱۵ دسمبر ۱۹۹۰) میں شہر دہلی کی خبروں میں سے ایک خبر کی سرخی یہ ہے کہ امام جامع مسجد نے کہا کہ ملک کے فساد زدہ علاقوں میں اقوام متحدہ کی فوج متعین کی جائے:

Imam for UN force in riot-hit areas

رپورٹ کے مطابق جامع مسجد دہلی کے امام سید عبداللہ بخاری نے جمعہ کے خطبہ میں تقریر کرتے ہوئے اس کا مطالبہ کیا اور کہا کہ فساد زدہ علاقوں میں امن قائم کرنے کا یہی ایک راستہ ہے۔ اس پر مسجد میں موجود نمازیوں نے زور دار تالیاں بجائیں۔

اس قسم کا مطالبہ لغویت کی حد تک غیر سنجیدہ ہے۔ یہ کسی بھی درجہ میں مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔ اس کے باوجود مسلمانوں کے نام نہاد لیڈر کیوں اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کی باتیں کہنے میں بڑی معلوم ہوتی ہیں۔ اس پر عوام کی تالیاں ملتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر یہ نام نہاد لیڈر صبر و اعراض کی بات کریں تو کوئی ان کی تقریر پر تالی نہیں بجائے گا۔ کیوں کہ وہ کہنے میں بڑی معلوم نہیں ہوتی۔

۱۹ دسمبر ۱۹۹۰

سلمان رشدی کی کتاب "سیٹینک ورسز" کی اشاعت کے بعد میں نے کچھ مضامین لکھے تھے جو الرسالہ جون۔ جولائی ۱۹۸۹ میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کی تردید میں ۶۴ صفحات کی ایک کتاب دہلی سے چھپی ہے۔ اس کا نام "اسلام میں اہانت رسول کی سزا" ہے۔ اصل کتاب کے مصنف جناب محسن عثمانی ندوی ہیں اور اس میں مزید تین صاحبان کی تحریریں بطور افتتاحیہ اور پیش لفظ اور مقدمہ شامل ہیں۔ وہ ہیں ـــــ ماجد علی خاں ندوی ، عبداللہ عباس ندوی، سید اجتبا ندوی۔

یہ کتاب نہ صرف ناقص استدلال بلکہ غلط بیانیوں پر مبنی ہے۔ مثلاً اس میں میری طرف یہ عقیدہ منسوب کیا گیا ہے کہ میں آزادئ فکر کو خیر اعلیٰ سمجھتا ہوں (صفحہ ۹) اور پھر اس کو بنیاد بنا کر میرا حسب ذیل موقف برآمد کیا گیا ہے:

رسول کو برا کہنا آزادئ رائے ہے۔

اور ہر آزادئ رائے خیر اعلیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ

رسول کو برا کہنا خیر اعلیٰ کی حیثیت رکھتا ہے (صفحہ ۵۶)

یہ بلاشبہ بہتان ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں یہ لکھا تھا کہ جدید مغربی ذہن آزادی رائے

کو خیر اعلیٰ سمجھتا ہے۔ اس کو میری طرف منسوب کر کے کہہ دیا گیا کہ خود میں آزادی رائے کو خیر اعلیٰ سمجھتا ہوں۔ اور بنا رفاسد علی الفاسد کے طریق پر مذکورہ بالا موقف میری طرف منسوب کر دیا گیا۔

۲۰ دسمبر ۱۹۹۰

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا عام حال یہ ہے کہ انھیں رسول کی اہانت کا مسئلہ معلوم ہے، مگر انھیں ایک مسلم کی اہانت اور اس کے خلاف بہتان تراشی کا مسئلہ معلوم نہیں۔ اہانت رسول پر ان کا مشتعل ہونا اگر ان کی اسلامیت کی بنا پر ہوتا تو یہی اسلامیت انھیں مجبور کرتی کہ وہ کسی مسلمان کی اہانت اور بہتان تراشی کو گوارا نہ کریں۔ مگر اول الذکر کے بارہ میں ان کی حساسیت اور ثانی الذکر کے بارہ میں ان کی بے حسی سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا سرچشمہ اسلامیت نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اہانت رسول پر ان کے موجودہ اشتعال کا سبب ان کی ہیرو پرستی ہے۔ رسول کو انھوں نے اپنا ہیرو بنا رکھا ہے نہ کہ اپنا اسوہ۔ اس کا ایک کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے رسول کی اہانت پر تو فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں۔ مگر دوسرے پیغمبروں کی اہانت پر انھیں کبھی غصہ نہیں آتا۔ حالاں کہ فقہ میں اہانت رسول کا جو حکم بتایا گیا ہے وہ تمام پیغمبروں کے لئے ہے نہ کہ صرف پیغمبر اسلام کے لئے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلد ۵)

۲۱ دسمبر ۱۹۹۰

حالیہ بیرونی سفر میں ایک صاحب نے کہا کہ آپ لوگ کہتے ہیں کہ خدا پرستوں کو موت کے بعد جنت کا انعام ملے گا۔ مگر ہمارا تجربہ ہے کہ انسان کسی راحت سے بہت جلد اکتا جاتا ہے، پھر آدمی جب جنت کی راحتوں سے اکتا جائے گا تو وہاں وہ خوش کیسے رہے گا۔

میں نے کہا کہ اکتاہٹ کا سبب ہماری محدودیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان لامحدود طور پر راحت سے enjoy کرنا چاہتا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز آدمی کے لئے لذت ہو اس سے وہ کبھی سیر نہ ہو سکے۔ لذت پسندی بذات خود انقطاع نا آشنا صلاحیت ہے۔ اکتاہٹ ہماری لذت پسندی کی حد نہیں، وہ ہماری انجوائے کرنے کی capacity کی حد ہے۔

انسان جب اپنی کسی پسندیدہ چیز سے enjoy کرنا شروع کرتا ہے تو کچھ دیر کے بعد اس کی اپنی استعداد کی حد (limit) آجاتی ہے۔ یہ حد اس کو اس کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہے جس کو اکتاہٹ کہا جاتا ہے۔ آدمی جب کسی چیز سے اکتاتا ہے تو اس لئے نہیں اکتاتا کہ اس چیز میں اس کے لئے لطف باقی نہیں رہا تھا۔ وہ صرف اس لئے اکتاتا ہے کہ اس کی اپنی محدودیت اس کے لئے مزید enjoy کرنے میں رکاوٹ بن گئی تھی۔

جنت میں آدمی کو ابدی زندگی حاصل ہوگی۔ وہاں آدمی کی محدودیتیں (Limitations) ختم ہو جائیں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی کے اندر لذیذ چیزوں سے enjoy کرنے کی لامحدود طاقت پیدا ہو جائے گی۔ اس کے بعد اکتاہٹ میں مبتلا ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں۔

۲۲ دسمبر ۱۹۹۰

موتی رام صراف کے لڑکے برج بھوشن کا ۴۲ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ ہندو رواج کے مطابق آج ان کے یہاں "رسم پگڑی" تھی۔ میں نے اس میں شرکت کی۔

موتی رام کے مکان (قرولباغ) کے پاس ایک پارک میں شامیانہ لگایا گیا۔ اس کے نیچے لوگ جمع ہوئے۔ غالباً ایک ہزار کی تعداد میں ہوں گے۔ جب میں ان کے درمیان بیٹھا ہوا تھا تو مجھے خیال آیا کہ یہ ہندو بھائی اس ملک میں اتنی بڑی تعداد میں ہیں، مگر سیکڑوں سال سے مسلمانوں میں کوئی ایک بھی ایسی تحریک نہیں اٹھی جس کا مقصد یہ ہو کہ ہندوؤں تک خدا کے سچے دین کی دعوت پہنچائی جائے۔ البتہ ہر مسجد اور ہر اجتماع میں ان کی ہلاکت کی دعائیں ہو رہی ہیں۔ ہر جگہ اللہم اھلک الکفرۃ والمشرکین پر آمین کہی جارہی ہے۔

میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں نے کہا کہ خدا تو جنت کے دروازہ پر اپنے بندوں کے استقبال کے لئے کھڑا ہوا ہے، اور مسلمان ان کو جہنم میں دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ آہ وہ مسلمان جن کا حال یہ ہے کہ ہدایت کے لئے عملی محنت کرنا تو درکنار، وہ نیت کے درجہ میں بھی لوگوں کی ہدایت کے طالب نہیں۔

یہ سب دعوتی مزاج کے فقدان کا نتیجہ ہے۔

۲۳ دسمبر ۱۹۹۰

ہندستان ٹائمس (۶ دسمبر ۱۹۹۰) کے ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ سابق وزیر اعظم ہند جواہر لال نہرو سے پوچھا گیا کہ آپ لمبی مدت تک ہندستان کے وزیر اعظم رہے ہیں، اس ملک کے لئے آپ وزیر اعظم کی حیثیت سے اپنی سب سے بڑی کامیابی کیا سمجھتے ہیں۔ انھوں نے فوراً جواب دیا کہ ہندستانی عورت کو آزاد کرانا:

the emancipation of Indian women. (p. 11)

کہنے میں یہ بہت شاندار لفظ ہے، مگر حقیقۃً بالکل بے معنی ہے۔ نہرو کے دور میں جو ہوا وہ صرف یہ تھا کہ عورتیں جو پہلے زیادہ تر گھر سنبھالتی تھیں وہ دفتروں میں پہنچ گئیں۔ ہندستانی دفتروں میں جہاں جائیے عورتیں میز کرسی پر بیٹھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس چیز نے دفتری کام کو آخری حد تک بگاڑ دیا ہے۔ کیوں کہ ایک ہندستانی افسر کے الفاظ میں ـــــــ عورتیں دفتروں میں آتی ہیں تو یا تو وہ تفریحی باتیں کرتی ہیں یا اپنا دوپٹہ سنبھالتی رہتی ہیں۔

۲۴ دسمبر ۱۹۹۰

ایک مسلمان عالم ہیں۔ وہ ایک دینی مدرسہ چلاتے ہیں۔ انھوں نے ایک عرب ملک کو مالی امداد کی درخواست دی تھی۔ مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد ان کی درخواست منظور ہوگئی اور رقم دہلی کے مذکورہ عربی سفارتخانہ میں بھیج دی گئی۔ وہ دہلی آکر اپنی رقم لے گئے۔

میں نے ان سے کہا کہ آپ جیسے ہزاروں لوگ اس طرح کی امداد وصول کر رہے ہیں۔ کچھ وہ لوگ جو بڑی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں، وہ اس سے بھی زیادہ بڑے مواقع پا رہے ہیں۔ مگر میرے علم میں کوئی شخص نہیں جو اس کو خدا کی نعمت سمجھے اور علی الاعلان اس کا ذکر کرکے خدا کا اعتراف کرے۔ شکر دین کا خلاصہ ہے اور وہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں سے نکل گیا ہے۔

اللہ تعالٰی کو یہ مطلوب ہے کہ ہر زمانہ میں کچھ لوگ ہوں جو دین کا کام کریں۔ مسجد اور مدرسہ چلانا، دعوت اور تبلیغ کا کام کرنا، اسلامی علوم کی خدمت کرنا وغیرہ۔ اس

طرح کی خدمت کے ساتھ آدمی معاشی کام نہیں کر سکتا۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے بہت بڑے پیمانہ پر یہ انتظام کر دیا کہ ہر دور میں اہل دین معاش سے فارغ ہو کر دین کی خدمت میں مشغول رہیں۔

اس اعتبار سے اسلام کی تاریخ کے تین دور ہیں ــــ سیاسی دور، زراعتی دور، صنعتی دور۔ قدیم دور سیاسی دور تھا۔ اس زمانہ میں اس قسم کے خادمان دین کے لئے اسلامی حکومت سے باقاعدہ وظیفے جاری کئے جاتے تھے۔ اس کے بعد زمیندار، جاگیر دار اور نواب پیدا ہوئے جو گویا زراعتی دور کے سرمایہ دار تھے۔ یہ لوگ مستقل طور پر دینی خادموں کا مالی تعاون کرتے رہے۔

جدید صنعتی دور میں مسلمان اقتصادی اعتبار سے بالکل پسماندہ ہو چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کیا کہ عرب سرزمین کے نیچے تیل کا زبردست ذخیرہ پیدا کر دیا جو ان کے لئے صنعتی پس ماندگی کی تلافی بن گیا۔ یہی تیل کی دولت ہے جو دنیا بھر کے تمام دینی اداروں اور دینی شخصیتوں کو مالی امداد فراہم کر رہی ہے۔ لاکھوں لوگ اس سے غیر معمولی فائدے حاصل کر رہے ہیں۔ مگر میرے علم کے مطابق، کوئی بھی ایسا شخص نہیں جس کے سینہ میں اس نعمت خداوندی کی بنا پر شکر کا سمندر موجزن ہو گیا ہو۔

۲۵ دسمبر ۱۹۹۰

لما وصل مال کسریٰ وذخائرہ إلی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال إنّ قوماً أدّوا ھٰذا لأمناء۔ فقال لہ علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ: لما رأوك عفیفا عفوا (الشفا فی مواعظ الملوک والخلفاء)

ایران کی شکست کے بعد جب کسریٰ کا مال اور اس کا ساز و سامان خلیفہ عمر فاروق کے پاس مدینہ آیا تو اس کو دیکھ کر انھوں نے کہا کہ جن لوگوں نے یہ چیزیں دی ہیں وہ یقیناً امانت دار لوگ ہیں۔ حضرت علی نے اس کو سن کر کہا کہ چوں کہ انھوں نے آپ کو پاک باز دیکھا اس لئے وہ بھی پاک باز ہو گئے۔

یہ نہایت صحیح ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ قوم کا بناؤ اور بگاڑ حکمرانوں کے بناؤ اور

بگاڑ پر منحصر ہے۔ حکمراں اگر درست ہوں تو حکومتی عملہ اور افراد قوم بھی درست ہوں گے۔ اور حکمراں اگر بگڑ جائیں تو حکومتی عملہ اور افراد قوم بھی بگڑ جائیں گے۔

۲۶ دسمبر ۱۹۹۰

کراچی کے پندرہ روزہ یقین انٹرنیشنل (۲۲ اکتوبر ۱۹۹۰) کے عربی حصہ میں قبول اسلام کی ایک خبر ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جاپان کے مشہور باکسر اینتونی انوکی نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ ان کا اسلامی نام محمد حسین انوکی ہے۔ اخبار کی عربی رپورٹنگ کے مطابق، انھوں نے کہا: بحثتُ عن الامن والحق و ادّت محاولاتی ھٰذہٖ الیٰ دخولی فی حظیرۃ الاسلام (میں نے امن اور سچائی تلاش کی۔ میری اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گیا۔) انسان کو سب سے زیادہ جس چیز کی تلاش ہے، وہ اپنے داخل کے اعتبار سے سچائی ہے اور خارج کے اعتبار سے امن ہے۔ آج کا انسان ان دونوں چیزوں کے بارہ میں احساس محرومی میں مبتلا ہے۔ جب وہ اسلام کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کو اسلام میں ان دو چیزوں کا جواب مل جاتا ہے۔ اور بالآخر وہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔

۲۷ دسمبر ۱۹۹۰

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اسلام آباد (پاکستان) میں رہتے ہیں۔ آجکل وہ ہندستان آئے ہیں۔ ایک ملاقات میں انھوں نے بتایا کہ انھوں نے مولانا حمید الدین فراہی پر علمی ریسرچ کی ہے۔ مولانا فراہی کے حالات زندگی پر ان کی کتاب مکمل ہو چکی ہے۔ مولانا فراہی کے حالات کی تحقیق کرتے ہوئے انھیں اعظم گڈھ کی عدالت میں مولانا فراہی کا اپنا لکھا ہوا ایک بیان ملا جس میں انھوں نے اپنے حالات خود اپنے قلم سے تحریر کئے ہیں۔ اس تحریر سے معلوم ہوا کہ مولانا فراہی ۱۹۰۴ میں لارڈ کرزن کے ساتھ ترجمان کے طور پر خلیجی ملکوں میں گئے تھے۔

لارڈ کرزن ۱۸۹۸ سے لے کر ۱۹۰۵ تک غیر منقسم ہندستان کے وائسرائے تھے۔ عرب ملکوں سے بہتر تعلقات قائم کرنے کے لئے انھوں نے ۱۹۰۴ میں خلیج کا دورہ کیا۔ اس

وقت انھیں ترجمان کے طور پر ایک ایسے مسلمان کی ضرورت تھی جو عربی اور انگریزی دونوں زبانیں جانتا ہو۔ اس زمانہ میں ایسے لوگ بہت کم تھے۔ مولانا حمید الدین فراہی کا انتخاب ہوا تو وہ اس پر راضی نہیں تھے۔ آخر میں اپنے استاد مولانا شبلی نعمانی کے اصرار پر انھوں نے لارڈ کرزن کے ساتھ سفر کیا۔ مگر مولانا فراہی اور ان کے حلقہ کے لوگ اس واقعہ کو ہمیشہ چھپاتے رہے۔ کیوں کہ انگریز دشمنی کی بنا پر وہ اس کو پسند نہیں کرتے تھے کہ مولانا فراہی انگریز وائسرائے کے ترجمان بنیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا فراہی کے اندر ''تدبر قرآن'' کا ذہن تو تھا مگر ان کے اندر دعوت قرآن کا ذہن نہ تھا۔ اگر ان کے اندر دعوتی ذہن ہوتا تو اس موقع کو وہ اپنے لئے سنہری موقع سمجھتے اور اس نیت سے لارڈ کرزن کے ساتھ جاتے کہ مناسب موقع پر انگریز کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کریں گے۔

۲۸ دسمبر ۱۹۹۰

ابراہیم ذوق (۱۸۵۴ - ۱۷۸۸) اردو زبان کے مشہور شاعر ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے جو ضرب المثل کے طور پر عوام میں رائج ہے:

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

یہ شعر جو ڈیڑھ سو سال سے مسلمانوں میں رائج اور مقبول ہے سخت قابل اعتراض ہے۔ اس شعر میں کسی پرانے دوست کو حضرت مسیح علیہ السلام سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ یہ واضح طور پر ایک جلیل القدر پیغمبر کی توہین ہے۔ مگر مسلمان اس شعر کو ڈیڑھ سو سال سے دہرا رہے ہیں اور اس پوری مدت میں غالباً کسی ایک مسلمان نے بھی اس توہین کے خلاف احتجاج نہیں کیا۔ حالاں کہ اس شعر کے الفاظ اگر خدانخواستہ یہ ہوتے:

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا بہتر ہے ملاقات محمد و عمر سے

اگر شعر اس دوسرے انداز میں ہوتا تو تمام مسلمان اس کو توہین رسول قرار دے کر دیوان ذوق کی کاپیاں جلاتے اور اگر ذوق زندہ ہوتے تو مطالبہ کرتے کہ شتم رسول کے جرم میں اس کو قتل کر دیا جائے۔

توہین رسول یا شتم رسول کی جو سزا فقہا نے بتائی ہے، وہ ان کے بیان کے مطابق تمام پیغمبروں کے لئے ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمان اپنے پیغمبر کی توہین پر بھڑکتے ہیں اور دوسرے پیغمبروں کی توہین پر نہیں بھڑکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا بھڑکنا ہیرو پرستی کی بنا پر ہے نہ کہ حقیقۃً شرعی قانون کی بنا پر۔ اگر شرعی قانون اس کا محرک ہوتا تو وہ ہر پیغمبر کی توہین پر بھڑکتے نہ کہ صرف اس پیغمبر کی توہین پر جس کو انھوں نے اپنے قومی ہیرو کا درجہ دے رکھا ہے۔

۲۹ دسمبر ۱۹۹۰

زندگی میرے لئے اتنی کرب کی زندگی ہے کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں جینے کا تحمل نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود میں جئے چلا جا رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بار بار میرے سامنے ایسے نشانے آجاتے ہیں جس کی تکمیل کی خاطر دوبارہ میرے اندر جینے کی ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔

پچھلے دنوں میں سخت قسم کے ذہنی کرب میں مبتلا تھا۔ زندگی کا تحمل دشوار نظر آنے لگا تھا۔ مگر دسمبر کے آغاز میں ایک نئی کتاب کا خاکہ ذہن میں آگیا۔ میں ایک نئے حوصلہ کے ساتھ اس کتاب کی ترتیب میں مشغول ہو گیا۔ اس کتاب کا نام میں نے "الربانیہ" تجویز کیا ہے۔ اس کتاب نے آجکل مجھے اتنا زیادہ مشغول کر لیا ہے کہ مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ مجھے ابھی کچھ اور دن زندہ رہنا چاہئے تاکہ میں اس کتاب کی تکمیل کر سکوں۔ یہ صورت حال پچھلے ۲۵ برس سے بار بار پیش آتی رہی ہے۔

۳۰ دسمبر ۱۹۹۰

جان گالبریتھ (John Kenneth Galbraith) ۵ اکتوبر ۱۹۰۸ کو کناڈا میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۷ میں وہ امریکی شہری بن گئے۔ وہ ایک مشہور مصنف ہیں۔ ۶۳ - ۱۹۶۱ میں وہ انڈیا میں امریکہ کے سفیر رہ چکے ہیں۔ مساچوسٹس کے شہر کیمبرج میں مسٹر گوتم ادھیکاری نے ان کا مفصل انٹرویو لیا جو ٹائمس آف انڈیا (۳۰ دسمبر ۱۹۹۰) میں چھپا ہے۔

سفیر کے عہدہ کی تکمیل کے بعد مسٹر گال بریتھ نے انڈیا کے بارہ میں کہا تھا کہ وہ ایک

فنکشنگ انارکی (a functioning anarchy) ہے۔ گوتم ادھیکاری نے پوچھا کہ کیا اب بھی آپ کا خیال یہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ انھوں نے مزید کہا کہ میرا خیال ہے کہ انڈیا میں لڑائی جھگڑے بطور معمول جاری رہیں گے :

I take conflict to be normal in India.

انڈیا واحد ملک ہے جہاں اب بھی شرک زندہ حالت میں موجود ہے۔ یہ ہندو مذہب ہے۔ انڈیا کے سدھار کی واحد شرط یہ ہے کہ وہ اپنے مشرکانہ مذہب کو چھوڑ دے۔ جب تک انڈیا میں مشرکانہ مذہب باقی رہے گا، اس کا سدھار نہیں ہو سکتا۔

ہندو مذہب کو چھوڑنے کے بعد انڈیا کے لئے دو choice ہیں۔ ایک یہ کہ وہ پوری طرح مغربی سیکولرزم کو اختیار کر لے۔ دوسرا choice یہ ہے کہ وہ بڑے پیمانہ پر اسلام قبول کر لے۔ ان کے سوا کوئی تیسرا چوائس انڈیا کے لئے نہیں۔

۳۱ دسمبر ۱۹۹۰

انڈیا ٹوڈے (۳۱ دسمبر ۱۹۹۰) میں دو صفحہ کا ایک رنگین چھپا ہوا اشتہار ہے۔ اس کے اوپر موٹر کار کی ایک خوبصورت تصویر ہے۔ اس کے نیچے جو اشتہار درج ہے اس کی ایک لائن یہ ہے کہ مشینی حرکت، بلاشبہ انسان کی ایک عظیم ایجاد ہے :

Powered motion. Undoubtedly one of man's greatest inventions.

موٹر کار یا دوسری مشینی چیزوں کو ایجاد (invention) کہنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ یہ چیزیں درحقیقت دریافت (discovery) ہیں نہ کہ ایجاد۔ فطرت میں بے شمار طاقتیں چھپی ہوئی ہیں۔ ان میں سے کچھ چیزوں کو دریافت کر کے انسان انھیں استعمال کر رہا ہے۔ انسان ان چیزوں کا موجد نہیں، وہ ان کا دریافت کنندہ ہے۔

یہ محض لفظی فرق کی بات نہیں۔ یہ حقیقت کے فرق کی بات ہے۔ کیوں کہ 'ایجاد' کے لفظ سے انسانی عظمت کا تصور ابھرتا ہے۔ جب کہ 'دریافت' کے لفظ سے خدا کی عظمت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ایجاد کا لفظ بولنے سے فخر اور تکبر کا مزاج بنتا ہے، جب کہ دریافت کا لفظ بولنا آدمی کے اندر شکر اور تواضع کا مزاج پیدا کرتا ہے۔

خدا کی نسبت سے انسان کے اندر سب سے زیادہ جو کیفیت مطلوب ہے وہ شکر ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی حمد و شکر کے الفاظ بار بار اپنی زبان سے دہراتا رہے۔ اس قسم کا کوئی فعل صرف الفاظ کی تکرار ہے نہ کہ کیفی معنوں میں جذبۂ شکر کا پیدا ہونا۔

حقیقت یہ ہے کہ شکر کا سرچشمہ علم ہے۔ آدمی جب اپنے اندر اور اپنے باہر کی دنیا کو اس اعتبار سے دریافت کرے کہ وہ قدرت خداوندی کا ظہور ہے۔ جب وہ چیزوں کو خدا کے عطیات اور انعامات کی روپ میں جان لے تو اس کے بعد اس کے سینہ کے اندر جو اتھاہ جذبۂ اعتراف پیدا ہوتا ہے، اسی کا نام شکر ہے۔

کسی شکر کرنے والے کے اندر شکر کا جذبہ صرف ان چیزوں پر پیدا نہیں ہوتا جو اس کو ذاتی طور پر ملی ہوئی ہوں۔ بلکہ عالمی سطح پر انسانیت عامہ کو جو کچھ ملا ہوا ہے ان سب کو دیکھ کر وہ شکر کے جذبہ سے سرشار ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک چیز جو بظاہر اپنی کوشش سے ملی ہو اس کو بھی وہ سرتاسر عطیہ الٰہی کے خانہ میں ڈال دیتا ہے، کیوں کہ آخری سبب کے طور پر یہ خدا ہی تھا جس نے اس یافت کو اس کے لیے ممکن بنایا۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

کتاب	قیمت
تذکیر القرآن (مکمل)	400.00
اسلام: ایک تعارف	80.00
اللہ اکبر	45.00
پیغمبر انقلاب	50.00
مذہب اور جدید چیلنج	55.00
عظمت قرآن	35.00
عظمت اسلام	50.00
عظمت صحابہ	7.00
دین کامل	60.00
الاسلام	45.00
ظہور اسلام	50.00
اسلامی زندگی	30.00
احیاء اسلام	35.00
راز حیات	65.00
صراط مستقیم	40.00
خاتون اسلام	60.00
سوشلزم اور اسلام	40.00
اسلام اور عصر حاضر	30.00
الربانیہ	40.00
کاروان ملت	45.00
حقیقت حج	30.00
اسلامی تعلیمات	25.00
اسلام دور جدید کا خالق	25.00
حدیث رسول	40.00
سفر نامہ (غیر ملکی اسفار)	85.00
راہ عمل	25.00
تعبیر کی غلطی	85.00
دین کی سیاسی تعبیر	20.00
عظمت مومن	7.00
اسلام ایک عظیم جدوجہد	4.00
تاریخ دعوت حق	5.00

کتاب	قیمت
مطالعہ سیرت (کتابچہ)	12.00
ڈائری (جلد اول)	80.00
کتاب زندگی	65.00
اقوال حکمت	25.00
تعمیر کی طرف	8.00
تبلیغی تحریک	20.00
تجدید دین	25.00
عقلیات اسلام	35.00
قرآن کا مطلوب انسان	8.00
دین کیا ہے؟	7.00
اسلام دین فطرت	7.00
تعمیر ملت	7.00
تاریخ کا سبق	7.00
فسادات کا مسئلہ	5.00
انسان اپنے آپ کو پہچان	5.00
تعارف اسلام	5.00
اسلام پندرہویں صدی میں	5.00
راہیں بند نہیں	12.00
ایمانی طاقت	7.00
اتحاد ملت	7.00
سبق آموز واقعات	7.00
زلزلہ قیامت	10.00
حقیقت کی تلاش	8.00
پیغمبر اسلام	5.00
آخری سفر	7.00
اسلامی دعوت	7.00
حل یہاں ہے	10.00
سچا راستہ	8.00
دینی تعلیم	7.00
امہات المومنین	20.00
تصویر ملت	85.00

کتاب	قیمت
دعوت اسلام	50.00
دعوت حق	40.00
نشری تقریریں	80.00
دین انسانیت	60.00
فکر اسلامی	50.00
شتم رسول کا مسئلہ	45.00
طلاق اسلام میں	5.00
مضامین اسلام	60.00
حیات طیبہ	7.00
باغ جنت	7.00
نار جہنم	7.00
خلیج ڈائری	10.00
رہنمائے حیات	7.00
تعدد ازواج	7.00
ہندستانی مسلمان	40.00
روشن مستقبل	7.00
صوم رمضان	7.00
اسلام کا تعارف	4.00
علما اور دور جدید	8.00
سفر نامہ اسپین و فلسطین	60.00
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8.00
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	8.00
یکساں سول کوڈ	5.00
اسلام کیا ہے؟	8.00
میوات کا سفر	35.00
قیادت نامہ	35.00
مطالعۂ سیرت	60.00
منزل کی طرف	4.00
اسباق تاریخ	85.00

Al-Risala Book Centre

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013 • Tel. 4625454, 4611128 • Fax 4697333
e-mail: skhan @ndf.vsnl.net.in • http://www.alrisala.org